urdukutabkhanapk.blogspot
ناول
نولکھی کوٹھی
علی اکبر ناطق
اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

نولکھی کوٹھی

علی اکبر ناطق

علی اکبر ناطق کا خاندان 1947 کے فسادات میں فیروز پور سے ہجرت کر کے وسطی پنجاب کے شہر اوکاڑہ کے نواحی گاؤں 32 ٹو ایل میں آباد ہوا۔ یہیں علی اکبر ناطق 1977 میں پیدا ہوا اور اسی گاؤں میں موجود ہائی سکول میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ انگریز دور میں یہ مثالی گاؤں تھا۔ ایف اے کا امتحان گورنمنٹ کالج اوکاڑا سے پاس کیا۔ اُس کے بعد معاشی حالات کی خرابی اور کسمپرسی کی وجہ سے بی اے اور ایم اے کے امتحانات پرائیویٹ طور پر بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے پاس کیے۔ ناطق نے تعلیم کے ساتھ مزدوری کا سلسلہ جاری رکھا اور بطور میسن پندرہ سال تک کام کیا۔ اسی دوران اُن کا اردو نثر، شاعری، تاریخ اور سماج کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ 1998 میں کچھ عرصے کے لیے مزدوری کے سلسلے میں سعودی عرب اور مڈل ایسٹ بھی رہے۔ اِس سفر میں اُنھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ اسی دوران ایک افسانہ (معمار کے ہاتھ) لکھا، جو بہت مقبول ہوا اور اُس کا محمد حنیف نے انگریزی ترجمہ کیا، جو

امریکہ کے مشہور ادبی میگزین گرانٹا میں شائع ہوا۔ ناطق 2007 میں اسلام آباد آگئے، یہاں اِن کی ملاقات افتخار عارف سے ہوئی، جو اُن دنوں اکادمی ادبیات کے چیئرمین تھے، انھوں نے ناطق کو اکادمی میں ایک چھوٹی سی ملازمت دے دی، جو افتخار عارف کے اکادمی چھوڑ جانے کے بعد ختم ہو گئی۔ پھر تین سال کے لیے مقتدرہ قومی زبان میں رہے اور اُس کے بعد فیڈرل ڈائریکٹوریٹ ایجو کیشن میں چلے گئے۔ اب ایک نجی یونیورسٹی میں اُردو پڑھاتے ہیں۔ ناطق ادبی طور پر 2009 میں اُس وقت اچانک دنیا کے سامنے آیا، جب کراچی کے مؤقر ادبی رسالے، "دنیازاد" نے اُن کی ایک دم دس نظمیں شائع کیں اور ادبی رسالے "آج" نے پانچ افسانے چھاپے۔ ناطق کی تخلیقات نے اچھوتے اور نئے پن کی وجہ سے لوگوں کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ 2010 میں اُن کا پہلا شعری مجموعہ "بے یقین بستیوں میں" آج، کراچی سے چھپا اور یو بی ایل ایوارڈ کے لیے نامزد بھی ہوا۔ 2012 میں اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ "قائم دین چھپا، جسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا اور اِسے بھی یو بی ایل ایوارڈ ملا، 2013 میں ان کا دوسرا شعری " مجموعہ "یاقوت کے ورق "آج کراچی سے چھپا۔ یہ تمام کتابیں انگلش اور جرمن میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور پینگوئن انڈیا شائع کر چکا ہے۔ علی اکبر ناطق کے ناول "نولکھی کوٹھی" نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچائی ہے، پینگوئن انڈیا سے انگلش میں چھاپ رہا ہے، ہم لالٹین قارئین کے لئے یہی ناول سلسلہ وار شائع کر رہے ہیں۔

قسط نمبر 1

دور تک پھیلا سمندر منظر سے خالی ویسا ہی بے لطف تھا، جیسا کئی دنوں کی مسافت میں اُس کا وہ بڑا حصہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اُس کی وجہ سے وہ بیزار کر دینے والی تھکاوٹ میں مبتلا رہا۔ اب ساحل قریب آرہا تھا تو اُس پر جذباتی کیفیت طاری ہو گئی۔ آنکھوں کے پردوں پر وسطی پنجاب کی یادیں تصویریں بناتی چلی گئیں۔ مال روڈ پر موجود پُرآسائش بنگلہ، ماما ئیں، خادم اور دیگر ملازموں کی فوج ایک ایک کر کے یاد آنے لگی۔ آٹھ سال کا عرصہ کم نہیں تھا، جب وہ اپنے باپ، ماں اور گھر سے دور انگلستان کی اکتا دینے والی تعلیم اور ٹھٹھرا دینے والی سردی کے گھوروں میں بیٹھا انتظار کاٹتا رہا اور لڑکپن کی ہواؤں کو تصور میں لاتا رہا۔ ماما ئیں بابا لوگوں کو اپنے حصار میں لیے لارنس باغ میں آتیں۔ ایک ایک نخرے پر ہزار طرح سے جاں نثار ہوتیں۔ اُدھر جب بابا جان اور انگریزی سرکار کے افسر جیپوں پر دورے کو نکلتے تو

دیسی لوگوں پر کیسی حسرت طاری ہوتی۔ وہ اُن کی تمکنت کو سڑک کنارے کھڑے پچکے ہوئے چہروں پر ٹکی اور بھنچی ہوئی بے نور آنکھوں سے تکتے رہ جاتے۔ یہاں تک کہ جیپ زنّاٹے سے اُن کے سروں پر خاک چھینکتی نکل جاتی۔
اُسے یاد آیا، جب وہ اپنے والد کے ساتھ اُن کے دفتر جاتا تو کس طرح آفس میں کام کرنے والا عملہ خوشامد کو آگے بڑھتا۔ چاکلیٹ اور عمدہ مٹھائیوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ آدھا دفتر سب کام چھوڑ کر اسی فکر میں ہولیتا کہ بابا لوگ کی خوشی حاصل کرے۔ کیا عیاشیاں تھیں، ایسے ایسے پھل جن کی یورپ میں مہک تک نہیں پہنچی، بنگلے کے ڈرائنگ روم میں پڑے سوکھا کرتے۔ نہ کوئی فکر نہ فاقہ۔ ہر کام سے آزاد ایچی سن کالج کے برگدوں کی لمبی ٹہنیوں پر جھولا جھولتے سارا وقت کٹ جاتا۔ زندگی میں اُن دنوں سوائے مزے کے کچھ نہ تھا۔ پھر ایک دن جب بابا جان نے بتایا کہ اُسے اپنی تعلیم کے سلسلے میں انگلستان جانا ہے تو اُسے کتنا برا لگا۔ بہت رویا پیٹا لیکن بابا نے ضد کو پورا کیا۔ آج اُسے اُن کا فیصلہ ٹھیک نظر آرہا تھا۔ آٹھ سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا تھا۔ اگرچہ سردی اور روکھی پھیکی زندگی نے اسے کئی دفعہ بیزار کیا اور وہ فوراً ہندوستان بھاگنے کو تیار بھی ہوا لیکن کیتھی نے اُسے اِس حرکت سے باز رکھنے میں بڑا کردار ادا کیا اور آج جب وہ اسسٹنٹ کمشنر بننے کے لیے امتحان پاس کر کے ہندوستان میں داخل ہو رہا تھا تو کیسا سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ اُس نے سوچا دیسی لوگوں پر حکومت کرنے میں کتنا مزہ ہے۔ اِدھر انگلینڈ میں میں تو کوئی تمیز ہی نہیں۔ سب کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتے ہیں۔ کھٹ بھیّے اور بھنگی تک بات نہیں سنتے مگر جیسے ہی ہندوستان کی ہوا لگتی ہے، بندہ ایک دم نواب ہو جاتا ہے۔ زندگی کا لطف تو بس ہندوستان ہی میں ہے۔ اُس نے سوچا، اب میں کبھی انگلستان کا منہ نہیں دیکھوں گا۔ دو سال بعد کیتھی کو بھی بلالوں گا پھر ساری عمر مزے سے کمشنری کریں گے۔
دادا ہال رائیڈ کے بعد اُس کا باپ ڈپٹی کمشنر بنا اور اب اُسے بطورِ اسسٹنٹ کمشنر، لاہور سے اپنی پوسٹنگ کے آرڈر لینا تھے، جس کے لیے ابھی ایک سال مزید بطور ٹرینی ادھر اُدھر کی نوکری کرنی تھی لیکن یہ ایسی کڑی شرط نہیں تھی، جسے پورا نہ کیا جا سکتا۔ یہ ولیم کے لیے سرشار کر دینے والا خوش کن منظر تھا۔ آٹھ سال بعد اُسی جگہ وہ حکومت کرنے جا رہا تھا، جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ پھر اُسے نہری کوٹھیوں میں گزرے ہوئے دن یاد آنے لگے۔ اُس وقت وہ ابھی چھ سال کا تھا۔ اکثر اپنے دوست ایشلے کے ساتھ کھیلتے کھیلتے لڑ پڑتا۔ پھر آپ ہی آپ صلح ہو جاتی۔ وہ اکٹھے سکول بھی جانے لگے تھے اور ایک دوسرے کے بغیر اداس بھی ہو جاتے لیکن اب اُس نے کتنے برس ایشلے کے بغیر نکال لیے تھے۔ کیا موسم تھے، جب نہروں کے کنارے چھتنار درختوں کے سایوں میں مامائیں اُس کو لیے پھرتیں۔

برگد کے پیڑوں سے بندھے جھولوں پر پینگیں جھولاتیں۔ نہروں کا پانی، برگدوں سے لٹکے جھولے اور آموں کے باغوں سے پھوٹتی خوشبو اُسے کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ جب دادا مقامی لوگوں کے ہاتھوں بلوے میں قتل ہوا تو اُسے گوگیرہ چھوڑنا پڑا۔ گورنمنٹ نے اپنا ضلعی دفتر گوگیرہ سے اُٹھا کر منٹگمری منتقل کر دیا۔ پھر جب تین سال بعد جانسن کو منٹگمری کا ڈپٹی کمشنر بنا دیا گیا تو وہ اُسے اپنے ساتھ منٹگمری لے گیا اور وہاں چار سال تک رہا۔ اس عرصے میں جانسن کے ساتھ کئی بار گوگیرہ میں سیر کے واسطے آیا۔ یہاں آکر اُسے سکون مل جاتا۔ گوگیرہ جو اُس کے پردادا ہی کے نام پر تھا، اپنی دل فریبی میں اُسے کبھی نہ بھولا۔ وہ جانسن کے ساتھ گوگیرہ آتا تو اکیلا ہی ڈاک بنگلے سے نکل کر مضافات کی سیر کو نکل جاتا۔ اُس وقت کتنا مزا آتا، جب دیسی ملازم اور گارڈ فکرمندی میں حفاظت کے لیے اُس کے ارد گرد بھاگتے پھرتے۔ اُس وقت شرارتاً وہ اپنے گھوڑے کو ہلکے ہلکے بھگا دیتا اور لمبی سنگینوں والی بھاری بندوقیں پکڑ کر پیچھے بھاگتے ہوئے گارڈز کو دیکھ کر لطف اُٹھاتا۔ اُن میں سے کئی ہانپتے ہانپتے گر پڑتے تو وہ نظّارہ لوٹ پوٹ کر دینے والا ہوتا۔

کھیتوں میں کام کرنے والی عورتیں بھی اُنھیں دیکھتیں اور ہنس ہنس کر دوہری ہو جاتیں۔ آموں کا موسم تو اُسے کبھی فراموش نہیں ہو سکتا تھا، جس کے لیے اُس کے دادا نے خاص انتظام کیا تھا۔ وہ اُس کا تصور کرتے ہوئے دل ہی دل میں کہنے لگا، کیا جنت کا منظر تھا۔ تین نہروں کے درمیان دو سو ایکڑ پر موجود آموں کے گھنے سیاہ باغ۔ اگست ستمبر کے دنوں میں اُس باغ میں کوئلوں اور پپیہوں کی جان نکال دینے والی بولیاں اور راگنیاں جو تیز بارشوں میں کچھ اور تیز ہو جاتی تھیں، اُس کے لیے ایک ہری بھری جادو نگری تھی۔ اس جادو کی نگری کے بیچوں بیچ دو ایکڑ رقبے پر ان کا وہ سُرخ انیٹوں سے کھڑا کیا ہوا شاندار بنگلہ۔

دادا کہا کرتے تھے، بھلے وقتوں میں اُس پر نو لاکھ خرچ آیا تھا۔ جیسی بنگلے کی شان تھی، خیال ہے، یہ بھی کم بتاتے تھے۔ اُنھوں نے اُس کا نام نولکھی کوٹھی رکھ دیا تھا۔ دادا جان نے بڑی نہر سے ایک چھوٹی نہر کاٹ کر، جو سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی جاتی تھی، بنگلے کے صحن سے گزارتے ہوئے ایک کلومیٹر پرلے جا کر پھر اُسی نہر میں ڈال دیا تھا۔ لوئس نے دادا کے مرنے کے بعد اُس بنگلے کے پندرہ لاکھ لگا دیے لیکن بابا نے بیچنے سے انکار کر دیا۔ سچ پوچھیں تو اُس کی بہت خوشی ہوئی۔ بنگلے میں ہوا کا ایسا نظام تھا کہ چاروں طرف کے برآمدوں میں گھومتی ہوئی کمروں میں داخل ہوتی، جن کی چھتیں پچیس فٹ تک بلند تھیں۔ اس لیے گرمی کا ذرا احساس نہ رہتا۔

انہی سوچوں میں وہ آموں کے ذائقے بھی محسوس کرنے لگا۔ آم کھانے میں جو رغبت تھی، اُسے بیان کرنے سے قاصر تھا۔ بس چاندی کے بڑے تھال آموں سے بھر کر برف ڈال دی جاتی۔ چند لمحوں بعد ٹھنڈے ہو لیتے تو کیا میٹھے ذائقے زبان اور حلق سے ہوتے ہوئے سینے تک اُتر جاتے۔ لورین اور ماما تو اس موسم پر جان چھڑکتیں۔ آم کھا کر لسّی پی لیتیں پھر گھنٹوں سوتیں۔ ایسے میں کوئی اُنہیں انگلستان یاد دلاتا تو عجیب طرح سے منہ بسورتیں۔ خاص کر بابا اس وقت ضرور چھیڑتے کہ اگلے برس انگلستان چلے جائیں گے، تمہاری عادتیں خراب ہو رہی ہیں اور وہ آگے سے سو طرح کو ستیں۔ انگلستان کو سرد جہنم اور نہ جانے کیا بُرے بُرے خطاب دیتیں، پھر شوخی میں آکر بابا جان کو چمکاتیں کہ میں نہیں جاؤں گی۔ یہیں کسی نواب سے شادی کر لوں گی۔ اس پر بابا چمک کر ایک دم شٹ اَپ کہتے اور بڑھ کر ماما کا بوسہ لیتے۔ یہ منظر لورین اور میرے لیے محظوظ کیفیت پیدا کر دیتا۔ ویسے یہ سب تو چھیڑ خانی تھی، ورنہ بابا ہندوستان کو کسی قیمت چھوڑنے پر راضی نہ تھے۔ خاص کر وسطی پنجاب کے سرسبز میدانوں کو، جہاں اُن کے نوابوں کے سے ٹھاٹ تھے۔ ہزاروں مرغ، بٹیر اور گھوڑے پال رکھے تھے۔ بٹیر لڑانے کا شوق تو دادا کو بھی بہت تھا۔ حقے کا لپکا بھی اُنہی سے لگا۔ لوگ بابا کے اس شوق کو دیکھتے ہوئے ایک سے بڑھ کر ایک چاندی کا حقہ تحفہ میں لے کر آتے۔ کئی لوگوں نے اُسی تحفے کے عوض بابا سے کئی کئی زمینیں الاٹ کروالیں۔ خود اُنہیں بھی زمین خرید کر باغات لگوانے کا بے پناہ شوق ہے۔ راوی کے کنارے ہزاروں ایکڑ اُن کی ملکیت ہوں گے۔ اُس نے سوچا، سب سے پہلے نولکھی کوٹھی پر جاؤں گا۔ پھر کیتھی کے لیے بھی، جب وہ ہندوستان آجائے گی، تو اُسی کوٹھی میں رہائش کا انتظام کروں گا۔ دوسرے ہی لمحے اُسے پھر ماما کا خیال آگیا۔ وہ دل ہی دل میں اشلے، لورین، ماما اور باپ سے آٹھ سال بعد ہونے والی ملاقات کا تصور کر کے مزا لینے لگا۔ لورین کی شادی کی اطلاع اُسے انگلستان میں مل گئی تھی، جو بمبے میں ایک مشہور وکیل جیک سے تین سال پہلے ہوئی تھی۔ دونوں کلکتہ میں دو سال ایک ہی کالج میں پڑھے اور ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے لیکن اُس کے ذہن میں لورین کی وہی صورت بیٹھی تھی۔ باغ میں ناچتے موروں کے پر چُننے والی اور کبوتر اڑا کر اُن کے درمیان دور تک بھاگنے والی تتلی اور نرم و نازک۔ پھر کچھ دیر ولیم لورین کو تصور میں بھاگتے ہوئے دیکھنے لگا، سفید کپڑوں میں جیسے پری پھر رہی ہو۔

اِنہی خیالوں میں گم تھا کہ اُسے کپتان کی اناؤنسمنٹ سنائی دی، جو فاصلے، وقت اور جغرافیے کی معلومات دے رہا تھا۔ اعلان تو اُس نے غور سے نہیں سنا البتہ ماضی کی رَو سے چونک اُٹھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور شام بالکل قریب تھی۔

اُسے احساس ہوا، وہ مسلسل تین گھنٹے عرشے پر کھڑا ماضی میں جھانکتا رہا، جس میں وقت گزرنے کا پتا نہ چلا تھا۔ پورے سمندر پر ہولناک تاریکی چھا رہی تھی۔ پھر ایک دم بادل بھی چلے آئے اور بارش کا سامان بننے لگا۔ ہوا بھی تیز ہو چلی تھی۔ جہاز بمبے کی بندرگاہ کی طرف مسلسل بڑھ رہا تھا۔ وہ شاید کچھ دیر مزید عرشے پر کھڑا رہتا مگر سردی کی لہر تیز ہو چکی تھی اور بونداباندی بھی۔ وہ آہستہ سے عرشے کے زینے اُترتا ہوا کمرے میں آگیا۔ کیبن میں تین گھنٹے پہلے سِول سروس کے چھوکروں نے شراب پی کر جو ہلڑ بازی مچا رکھی تھی، وہ اب ختم ہو چکی تھی۔ ہر ایک خاموشی سے ڈنر کی تیاری میں مصروف تھا۔ وہ اس سارے ماحول سے سخت بور ہو چکا تھا مگر دو دن کا سفر تو اُسے بہر حال کرنا تھا کہ بمبئی ابھی دو دن کی مسافت پر تھا۔ وہ تھوڑی دیر کمرے میں بیٹھا پھر ڈنر کے لیے تیار ہونے لگا۔

2

مولوی کرامت گھر سے نکلا تو اُس کے قدم سیدھے نہیں پڑ رہے تھے۔ بار بار عصا پر دباؤ بڑھ جاتا۔ سَر میں شدید درد تھا۔ معدہ خالی ہونے کی وجہ سے اُس میں تبخیر پیدا ہو چکی تھی۔ اُسے رہ رہ کر فضل دین پر غصہ آرہا تھا، جو ابھی تک روٹیاں لے کر نہیں آیا تھا۔ مولوی کرامت کو ڈر تھا، نماز پڑھاتے ہوئے گر نہ پڑے۔ صبح کے وقت ایک گلاس گُڑ والی لسی پی کر ظہر تک نبھانا بہت مشکل تھا۔ نماز کے دوران بھی پتہ نہیں وہ کیا پڑھتا رہا۔ تلاوت کرتے ہوئے کسی جگہ کی آیت دوسری جگہ پڑھ گیا تھا۔ وہ تو خیر تھی کہ ظہر کی نماز میں تلاوت بلند آواز سے نہیں پڑھی جاتی ورنہ بہت رسوائی ہوتی اور مقتدی مولوی کے دماغ پر شبہ کر لیتے۔ سجدے، رکوع اور قیام کے دوران مولوی کرامت نے فضل دین کو نہ جانے کتنی صلواتیں سنائیں اور اِن گاؤں والوں کو بھی، جو آرام سے پیچھے آ کر نماز تو پڑھ لیتے مگر یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ وہ بھوکا ہے یا پیٹ بھرا۔ اسی خیال میں اُسے حدیث یاد آئی، اگر نماز اور کھانے کا وقت ایک ہو جائے ہو تو پہلے کھانا کھالو، بھوکے پیٹ نماز نہیں ہوتی۔

مولوی کرامت پچھلے تیس سال سے اس چھوٹے سے گاؤں کی مسجد کا پیش امام تھا۔ گاؤں کیا؟ یہی سو پچاس گھروں کی چھوٹی آبادی تھی۔ پہلے پہل مولوی کرامت کا پر دادا خدا یار چندہ مانگنے اور گداگری کرتے ہوئے یہاں آیا تھا۔ تب یہ مسجد خالی پڑی تھی۔ اُس نے اسی احاطے میں اپنی گُدڑی جما دی اور نماز پڑھنے لگا۔ گاؤں والے اول اول ترس کھا کر اُسے دو وقت روٹی دے دیتے۔ پھر رفتہ رفتہ دو چار لوگ اور بھی وہاں اُس کی دیکھا دیکھی نماز پڑھنے لگے۔ خدا یار نے ایک سال کسی مدرسے میں لگایا تھا۔ اس وجہ سے کچھ قرآن کی سورتیں یاد ہو گئیں اور نماز بھی آتی تھی۔ اُسی کے

سہارے امامت شروع کر دی اور خود بخود گاؤں کا مولوی بن بیٹھا اور مسجد کی عملی شکل ترتیب پانے لگی۔ اُس کے مرنے کے بعد مولوی کرامت کا باپ احمد دین جانشین بنا۔ وہ دن اور آج کا دن، یہ نسل در نسل یہیں کے رہ گئے۔ مولوی احمد دین نے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے کرامت کو ابتدائی قاعدے سپارے پڑھا کر باقاعدہ قصور کے ایک مدرسے میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔ یہاں مولوی کرامت نے چھ سال لگائے۔ پندرہ سال کی عمر کو پہنچنے تک عربی، فارسی اور اردو کا چنگا بھلا مولوی بن گیا۔ اسی اثنا میں مولوی کرامت کا باپ مولوی احمد دین ساٹھ سال کی عمر میں مر گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد مولوی کرامت نے کہیں اور جانے کی بجائے اسی گاؤں کی مسجد کو امامت کے لیے ترجیح دی۔ اب وہ پورے پچپن کا ہو چکا تھا۔

گاؤں کے سو فیصد لوگ حقیقت میں ایک ہی جد کی اولاد تھے، جو وقت کے ساتھ مختلف خاندانوں میں بٹ گئے تھے۔ یہ سب اَن پڑھ اور سادہ لوح تھے۔ لوگوں کے پاس ملکیتی زمین دو دو یا چار چار ایکڑ سے زیادہ نہیں تھی، جس میں سبزیاں اور چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں کاشت کرتے اور اُنہیں آٹھ میل پیدل، گدھیوں، گڈوں یا چھکڑوں پر لاد کر قصور شہر میں بیچ آتے۔ ساری آبادی غریب افراد پر مشتمل تھی، جن کا گزارہ بھی مشکل ہی ہوتا۔ اس لیے مولوی کرامت کو پیسے کون دیتا؟ اکثر اوقات اُس کی جیب خالی رہتی۔ البتہ عید کے روز قربانی کیے گئے جانوروں کی کھالیں، گاؤں کے مرنے والے بوڑھوں کے کپڑے، بستر اور چارپائیاں، شادی بیاہ میں نکاح کی فیس اور اِسی طرح سال کے سال گندم کی کٹائی پر تھوڑی بہت گندم ہر ایک اُن کو دے دیتا۔ مولوی کرامت یہ گندم شہر لے جا کر بیچ دیتا اور کچھ پیسے کھرے کر لیتا۔ اس کے علاوہ روزانہ صبح اور شام کرامت کا لڑکا فضل دین، جو ابھی تیرہ چودہ سال کا تھا، پورے گاؤں سے روٹیاں اکٹھی کر لاتا۔ ہر گھر نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا کہ وہ ایک روٹی فضل دین کو ضرور دے گا۔ اس طرح روزانہ مولوی کرامت کے گھر تیس چالیس روٹیاں جمع ہو جاتیں۔ اتنی روٹیاں وہ کھا نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ مولوی کے سوا اس کا بیٹا فضل دین اور بیوی شریفاں، یہ تین افراد کہاں تک کھاتے۔ باقی روٹیوں کو دھوپ میں سکھا لیا جاتا۔ مہینے بعد وہ سب اکٹھی کر کے بڑی بڑی بوریوں میں بھر کے شہر میں کھل بنولہ والوں کے ہاں بیچ آتے۔ جس سے اُن کے لیے مہینہ بھر کا نقد خرچ نکل آتا۔

گاؤں والوں سے روٹیاں اکٹھی کرنے کا کام فضل دین کرتا تھا۔ مولوی کرامت کی اُسے تاکید تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ گھروں میں جایا کرے تاکہ روٹیاں بڑی مقدار میں اکٹھی ہو جائیں مگر سو گھر کچھ کم نہ تھے۔ فضل دین بمشکل چالیس

پچاس گھر ہی پورے کر پاتا۔ ایک مصیبت فضل دین کے لیے یہ تھی کہ روٹیاں مانگنے جاتا تو لوگ اُس سے گھر کام کروانا شروع کر دیتے۔ کوئی عورت روٹیوں کا تھیلا رکھوا لیتی اور دوکان سے سودا لینے بھیج دیتی، کوئی گائے کو چارا ڈلوانا شروع کر دیتی۔ اس وجہ سے اُسے گھر پہنچنے میں کافی دیر ہو جاتی۔ گھر جاتا تو مولوی کرامت سیخ پا ہوتا کہ اتنی دیر کہاں کر دی؟ بعض اوقات دو چار چپتیں بھی لگا دیتا۔ ہر دو طرف سے فضل دین پر ہی مصیبت گرتی لیکن یہ تو اب معمول بن چکا تھا۔ فضل دین اس سب کچھ میں کوئی تکلیف محسوس نہ کرتا بلکہ گھر گھر کے طرح طرح کے کھانے شاید ہی کسی کو نصیب ہوں کہ فضل دین کے لیے نعمت سے کم نہیں تھے۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ فضل دین کا علمی ذخیرہ گاؤں کے کسی بھی فرد سے زیادہ تھا۔ پورے گاؤں کے حالات کی اُسے لحہ بہ لحہ خبر رہتی۔ لاشعوری طور پر وہ گھر گھر کی خبروں سے آگاہ ہو رہا تھا۔ کسی نے جو کچھ بھی گاؤں کے دوسرے فرد کے متعلق پوچھنا ہوتا، فضل دین کو بلا لیتا۔ کس کے گھر میں کون مہمان آیا ہے؟ کس نے کس کے اوپر کیا الزام لگایا ہے؟ اسی طرح کی اکثر باتیں اُس کو پتا ہوتیں۔ فضل دین کی وجہ سے مولوی کرامت کا تجربہ بھی بڑھ رہا تھا۔ اُسے پتہ چل جاتا کہ اس وقت احمد بخش کے گھر سے لہسن منگوایا جا سکتا ہے اور شیر محمد کے ہاں باسمتی کے چاول وافر پڑے ہیں اور یہ کہ اِس وقت اُس کا موڈ بھی ٹھیک ہے، مانگنے سے ضرور مل جائے گی۔ علاوہ ازیں آج خیر دین نے اپنے بیوی کو جھونٹوں سے پکڑ کر وہ تانبی (مارا) لگائی ہے کہ اللہ جانتا ہے، چور کو پڑتی تو وہیں مر جاتا۔ یہ سب باتیں ایک طرف، فضل دین اب اپنے باپ کے سوا گاؤں کے کسی بھی فرد سے زیادہ پڑھا لکھا بھی تھا۔ کئی آئتیں، سورتیں اور تعویذ گنڈے کی رمزیں اس عمر میں وہ سیکھ چکا تھا۔ پوری نماز، تراویح، حتیٰ کہ نماز جنازہ کی بھی کئی کئی دعائیں، جو اکثر مولویوں کو بھی نہیں آتی تھیں، وہ اِسے یاد تھیں اور مزید ترقی کر رہا تھا۔

اتنا زیادہ علم حاصل کرنے کا سبب یہ تھا کہ گاؤں میں کسی بھی فرد نے اپنی اولاد کو مولوی صاحب سے پڑھانے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ نہ ہی مولوی ایسی کسی بدعت کو رواج دینا چاہتا تھا۔ اس کے تمام علمی سرمائے کی منتقلی صرف فضل دین تک محدود تھی۔ کریماں، بوستان، گلستان، دیوانِ حافظ، عرفی و خاقانی کے قصیدے اور ان کے علاوہ عربی کی ابتدائی کتابیں، گرائمر و صیغہ جات۔ یہ سب آہستہ آہستہ فضل دین کی طرف منتقل ہو رہے تھے۔ مرغا ذبح کرنا، بچے کے کان میں اذان دینا تو فضل دین کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مردے کو نہلانا، قبر، کفن اور جنازے کی معلومات بھی اب اُس کے لیے غیب کی باتیں نہ رہیں۔ مولوی کرامت نے جو کچھ اپنے باپ مولوی احمد دین سے

پڑھایا جو اُسے خود نہیں بھی آتا تھا، وہ بھی اُلٹا سیدھا امانت کی طرح فضل دین کے سپرد کر رہا تھا، کہ اس خاندان کی بقا اسی پر تھی۔ ویسے بھی مولوی کرامت کا باپ کرامت سے اور کرامت کا دادا اُس کے باپ سے کم ہی پڑھے تھے اور ہر بعد میں آنے والا اُس علم میں اپنی ذاتی استعداد سے اضافہ کر رہا تھا۔

ہزار مشکل سے مولوی کرامت ظہر کی نماز پڑھا کر گھر آیا تو فضل دین روٹیاں لے کر آچکا تھا۔ مولوی کا غصہ انتہاؤں پر تھا۔ تیزی سے عصا لے کر فضل دین پر ٹوٹ پڑا۔ فضل دین نے عصا اُٹھتے دیکھا تو آگے بھاگ اُٹھا۔

ارے کم بخت کہاں جاتا ہے؟ ملعون صبح چھ بجے سے نکلا اور ظہر کر دی۔ خدا تجھے غارت کرے، تیرے جیسا حرام خور آج تک پیدا نہ ہوا" مولوی غصے سے بھاگتے ہوئے کانپ بھی رہا تھا"۔ تجھے خدا سمجھے یہاں گھر میں کچھ کھانے کو تھا؟ جو موت کے وقت واپس آیا۔

مولوی کو غصے میں دیکھ کر فضل دین سمٹ کر دیوار سے لگ گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا، کیا جواب دے کہ عصا چھپاک سے فضل دین کے چوتڑوں پر لگا۔ شریفاں نے اُسے پٹتے دیکھا تو فوراً دوسرا عصا پڑنے سے پہلے درمیان میں آگئی اور عصا ہاتھ سے کھینچ کر بولی، ہائے ہائے بد بخت بڈھے تیرے ہاتھ ٹوٹیں۔ خدا کوڑھی کر کے مارے، کیوں معصوم کی جان کا دشمن ہو گیا؟ سارا دن گلی گلی پھر کر تیرا دوزخ بھرتا ہے، پھر بھی تجھے صبر نہیں۔ مَیں جانتی ہوں، یہ لڑکا نہ ہوتا تو تُو بھوکا مر جاتا۔

شریفاں نے فضل دین کو بازو سے پکڑ کر اپنی بغل میں لے لیا، جو عصا کھا کر ہاتھ سے چوتڑ سہلا رہا تھا۔

ہاں ہاں مَیں بھوکا مر جاتا، مولوی تڑپ کر بولا، جب تُو نے اِسے نہیں جنا تھا، تب میں مٹی کھاتا تھا؟ پورے پچاس سال اسی گاؤں سے مَیں نے روٹیاں اکٹھی کی ہیں اور اب اگر اِسے لوگ دیتے ہیں تو میری ہی وجہ سے۔ مَیں نہ ہوں تو ماں بیٹا دونوں کسی روڑی (کچرا) سے چن کر کھا رہے ہوتے بلکہ وہ بھی نہ ملتی اور کتوں کی طرح باولے ہو جاتے۔ مولوی کرامت بِڑ بڑاتا ہوا چارپائی پر بیٹھ گیا، جس کی ادوائین ایک طرف سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ چارپائی کا بان سرکنڈوں کی باریک مونج سے بٹا ہوا تھا۔ گرمیوں میں سرکنڈوں کا بان جسم کو جس قدر راحت اور ٹھنڈک پہنچاتا ہے، اُس کی مثال نہیں۔ مولوی کو ٹھنڈا پڑتے دیکھ کر شریفاں فضل دین کی طرف پلٹی اور اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا، کیوں بے تُو اتنی دیر کہاں لگا دیتا ہے؟ تیرا اس طرح کام کرنا مجھے بالکل منظور نہیں۔ تیری نالائقی اور کام چوری کی وجہ سے ہم ایک دن ضرور دانے دانے کو ترسیں گے۔

اماں لوگ کام لینا شروع کر دیتے ہیں، فضل دین منہ بسورتے ہوئے بولا، میں کیا کروں؟ انکار کرتا ہوں تو روٹیوں کا تھیلا اُتار کر رکھ لیتے ہیں۔ تب مجھے بات ماننے ہی بنتی ہے۔

کون کون ایسا کرتا ہے؟ شریفاں نے فضل دین کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

اماں! ملک نظام کی بڑھی حاجن مجھے گھنٹہ گھنٹہ کام میں لگائے رکھتی ہے۔ یہ سب دیر اُسی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ وہ سارے گھر کے کام اکٹھے کر کے میرے انتظار میں رکھ چھوڑتی ہے، بس جاتے ہی کام پر لگا دیتی ہے۔ زیادہ دیر تو وہیں ہوتی ہے۔

سن رہے ہو کرامت؟ لڑکا کیا کہہ رہا ہے؟ سارے گاؤں کی مزدوری اور تیری جھڑکیاں سب اسی کی گردن پر۔ خبر دار جو آئندہ فضل دین کو کچھ کہا" شریفاں کا پارہ مسلسل چڑھ رہا تھا" نظام کو صاف صاف کہہ دے، وہ حاجن کو سمجھا دے۔ ہم سے اُس کی ونگاریں (مفت کے کام) نہیں کی جاتیں۔ جتنا کام وہ لیتی ہے، اتنا فضل دین منڈی میں جا کر کرے تو روز کے دو روپے کمائے۔

مولوی کرامت اب بھیگی بلی کی طرح چارپائی پر سمٹا بیٹھا تھا، کسمسا کر خلا کی طرف گُھورتے ہوئے بولا، نیک بختے اب جانے بھی دے۔ میں ملک نظام سے بات کروں گا لیکن یہ تو سمجھ، وہ گاؤں کا بڑا ہے، سب اُس کی عزت کرتے ہیں، کوئی بندہ کُبندہ دیکھنا پڑتا ہے۔ ہم سو چیزیں اُن سے لیتے ہیں۔ خیر چھوڑ اِن باتوں کو، جلدی اب کھانا دے، سر گھوم رہا ہے۔ پھر فضل دین کی طرف دیکھتے ہوئے تڑخ کر بولا، چل اُٹھ فضلو سورہ یٰسین میں جتنے متکلم حاضر کے صیغے استعمال ہوئے ہیں، یہاں میرے پاس بیٹھ کے مجھے ابھی ان صیغوں کا پتہ چلا کے بتا۔ آج اگر تو صحیح صحیح نہ بتا سکا تو دیکھ، مَیں تیری کیسے چمڑی اُدھیڑتا ہوں۔ تین مہینے ہو گئے، ابھی تک چودہ صیغوں پہ اٹکا ہے۔ مَیں نے یہ کام صرف دو مہینوں میں کیا تھا۔

مولوی کرامت کی جھڑکیاں کھا کر فضل دین نے اُٹھ کر لوٹے میں پانی لیا، وضو کیا۔ اُس کے بعد کمرے سے جا کر ریشمی غلاف میں لپٹا ہوا ایک بڑی تقطیع کا قرآن پاک اُٹھا لایا اور مولوی کرامت کے سامنے ٹوٹی پھوٹی چوکی پر بیٹھ کر سورہ یٰسین نکال لی۔ اِتنے میں شریفاں نے روٹی لا کے مولوی کرامت کے سامنے رکھ دی۔ مولوی روٹی کھانے کے ساتھ ساتھ فضل دین سے صیغوں کے بارے میں پوچھتا جاتا تھا اور ڈانٹتا جاتا تھا۔ بیچ میں مزید معلومات کی بہت

سی دوسری باتیں بھی بتاتا گیا۔ جہاں کہیں فضل دین غلطی کرتا، وہیں ہلکا سا عصا دائیں بائیں ٹکا دیتا۔

3

غلام حیدر گروہرسا ریلوے اسٹیشن پہنچا تو رفیق بگھی لیے وہاں موجود تھا۔ چراغ تیلی اور جانی چھینبا بھی اپنی چھویوں اور گنڈاسوں کے ساتھ پاس ہی کھڑے تھے۔ راستے میں دشمنوں کے گاؤں پڑتے تھے اس لیے رفیق نے انہیں ساتھ لے لیا تھا۔ غلام حیدر کے آنے کی خبر تو کسی کو نہیں تھی مگر یہ بات بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے والد شیر حیدر کی اچانک موت پر ضرور آئے گا۔ اس لیے دشمن کچھ بھی اوچھی حرکت کر سکتے تھے، جس کے لیے بہت سے جوانوں کا ساتھ ہونا ضروری تھا۔ اِسی خطرے کے پیشِ نظر غلام حیدر سے رفیق پاولی نے کہلا بھیجا تھا کہ وہ جلال آباد تک ریل میں آنے کی بجائے منڈی گروہرسا میں ہی اُتر جائے، ہم وہاں لینے کے لیے پہنچ جائیں گے تاکہ دشمن رستے میں ریل پر حملہ آور نہ ہوسکے۔ ریل بیسیوں گاؤں میں رُکتی ہوئی آتی تھی۔ دشمن کہیں بھی اُس میں سوار ہو کر نامناسب حرکت کر سکتے تھے، جس کے بعد پچھتاوے کے سوا کوئی تلافی نہ ہوتی۔ ریل سے نکلتے ہی غلام حیدر کو بیس افراد کے گروہ نے گھیر لیا۔ رفیق پاوٗلی نے اُسے گود میں کھلایا تھا، غلام حیدر اُسے چاچا کہہ کر مخاطب کرتا۔ ملتے ہی دونوں کے آنسو نکل آئے۔ پُشتینی ملازم ہونے کے ناتے رفیقے نے غلام حیدر کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دلاسا دیتے ہوئے کہا، پُتر صبر کر، یہ اللہ کے کام ہیں۔ شیر حیدر اللہ کی امانت تھا، وہ اُسے لے گیا، تُو حوصلہ رکھ، ہم تیرے ساتھ ہیں۔ پھر سب لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، غلام حیدر گھبرانا مت، یہ سب تیرے بازو ہیں۔ تیرے ایک اشارے پر مرنے کو تیار رہیں گے۔ اسی دوران بُوٹا تیلی غلام حیدر کی بندوق پکڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔ زندگی میں پہلی دفعہ بندوق کو ہاتھ لگایا تھا، اس لیے ہاتھ پھسلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد باری باری سب نے بندوق کو کاندھے پر رکھنے کی کوشش کی اور ہاتھوں میں تول تول کر وزن بھی ماپنے لگے۔ بالآخر رفیق پاولی نے بندوق اپنے کاندھے سے لٹکا لی۔ غلام حیدر نے آنسو ہتھیلی سے صاف کر کے پونچھ ڈالے اور بگھی پر سوار ہو گیا۔ اس کے بعد تینوں بگھیاں جلال آباد کی طرف دوڑنے لگیں، جن میں شیر حیدر کے اصطبل کے خاص گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ شیر حیدر جلال آباد کے تین گاؤں کا مالک تھا۔ جلال آباد میں اُس کی ذیلداری کسی بھی شک و شبے اور چیلنج سے بالاتر تھی۔ خاص تیس چالیس آدمی ہر وقت ڈانگ برچھی سے لیس اُس کے ڈیرے پر موجود رہتے لیکن عموماً وہ لڑائی بھڑائی سے پرہیز ہی کرتا۔ کوشش یہی ہوتی کہ معاملہ صلح صفائی سے حل ہو جائے۔ ویسے بھی اتنی بڑی طاقت سے

مخالفین دبکے رہتے اور بات آگے نہ بڑھ پاتی۔ اس کے علاوہ شیر حیدر کو انگریز سرکار سے جو ذیلداری کا پروانہ ملا ہوا تھا وہ بھی کم نہ تھا۔ بہت سے لوگ انگریز کا نام سن کر بھی گھورے میں چلے جاتے مگر شیر حیدر انگریزوں سے ربط ضبط ذرا کم ہی رکھتا۔ اُس کے تعلقات کی حدود فیروز پور کے بڑے زمین داروں اور چھوٹے نوابوں تک تھی۔
علاقے میں بڑی زمینوں کے مالک زیادہ تر سکھ ہی تھے۔ مسلمان یا تو مزارع تھے یا پھر بہت کم زمینوں کے مالک تھے۔ اگر کوئی بڑا زمیندار تھا، تو پھر وہ زیادہ ہی بڑا تھا، جیسے نواب افتخار ممدوٹ کا والد سر شاہنواز۔ البتہ اِکادُکا شیر حیدر جیسے بھی تھے، جو نواب تو نہیں لیکن مناسب درجے کے زمین دار ضرور تھے۔ اس طرح کے زمینداروں میں زیادہ کے پاس ذیلداری کا منصب بھی تھا، جو شیر حیدر کے پاس بھی تھا۔ شیر حیدر کا حریف مسلمانوں میں تو بالکل نہیں تھا، سوائے عبدل گجر کے، مگر وہ بھی زمیندار بہت چھوٹا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس وقت رنجش پیدا ہوئی، جب وہ شیر حیدر سے بیلوں کی دوڑ ہارا۔ اس دوڑ میں عبدل گجر شیر حیدر سے پچاس ایکڑ زمین ہار گیا۔
شیر حیدر کے زیادہ حریف سکھوں میں تھے لیکن وہ بھی کُھل کر سامنے نہیں آسکتے تھے، سوائے سودھا سنگھ کے۔ وہی ایک شیر حیدر کا مرکزی حریف تھا، جس کے ساتھ اُس کی گہری دشمنی تھی۔ یہ دشمنی پچھلی دو نسلوں سے چلی آرہی تھی، جب شیر حیدر کے والد سردار علی حسین بخش کے گاؤں شاہ پور اور سودھا سنگھ کے والد موہن سنگھ کے گاؤں جھنڈو والا کے درمیان کبڈی کا میچ ہوا۔ اس مقابلے میں اگرچہ سکھ مسلمان کھلاڑیوں کی کوئی تخصیص نہیں تھی، دونوں طرف ملے جلے پہلوان تھے مگر جب پھجا سنگھ کا گھٹنا جمال خاں کے ہاتھوں کھیلتے ہوئے تڑخ گیا تو نعرہ بازی شروع ہو گئی۔ نعرہ بازی کے دوران لڑائی کا سماں بن گیا۔ اس کے بعد دونوں طرف سے برچھیاں اور ڈانگیں نکل آئیں۔ لڑائی میں موہن سنگھ کے گاؤں کا ایک بندہ مر گیا۔ پھر دونوں طرف سے پرچے ہو گئے۔ چونکہ پورے پورے گاؤں لڑائی میں شامل تھے لہٰذا قتل ایسے ملوے میں بدل گیا جس کے قاتل کا پتہ نہ چل سکا۔ دونوں گاؤں میں بہت عرصے تک مقدمے بازی کے بعد عارضی طور پر صلح ہو گئی مگر دلوں کے اندر کینے کی آگ جلتی رہی، جو مستقل دشمنی کی شکل اختیار کر گئی۔ اس دشمنی میں دونوں پارٹیاں گاہے گاہے ایک دوسرے کا تھوڑا بہت نقصان کرتی رہیں۔
وہی دشمنی سودھا سنگھ اور شیر حیدر کو وراثت میں ملی اور اب شیر حیدر کی وفات کے بعد غلام حیدر کے کھاتے میں پڑ گئی۔ سردار سودھا سنگھ کی زمین شیر حیدر سے زیادہ تھی لیکن دو تین دفعہ کی لڑائی میں پلڑا شیر حیدر کا ہی بھاری رہا۔ عدالت کچہری میں بھی سودھا سنگھ کو کچھ برتری حاصل نہ ہو سکی، اس لیے اُس کے اندر انتقام لینے کی کسک موجود

رہی۔ اب جو اُس نے شیر حیدر کے مرنے کی خبر سنی تو باغ باغ ہو گیا۔ فوراً جگبیر سنگھ، شام سنگھ، پیت سنگھ اور فوجا سیئو کو بلا کر شراب کی محفل سجادی۔ پورے دو گھنٹے شراب پیتے رہے اور بکرے بلاتے رہے۔ نشہ اُترا تو مستقبل کے صلاح مشورے شروع کر دیے۔

سورج نے نیزے کی اَنی چھوڑ دی تھی اور سائے نے مشرق کی طرف قد بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ نیم کے پُرانے درخت نے احاطے کا سو فٹ قطر اپنے گھیرے میں لے کر دھوپ کو روک رکھا تھا۔ اس لیے چار پائیاں اور مُونڈھے مشرقی دیوار کے ساتھ لگ گئے کیونکہ وہاں ابھی دھوپ کافی تھی اور نیم کا سایہ دو گھنٹے تک وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ احاطے کا صحن بہت بڑا تھا اور باریک انیٹوں سے سارے کا سارا فرش کیا گیا تھا۔ اس لمبے چوڑے صحن کے ایک کونے میں پانی کا بڑا گہرا کنواں بھی تھا، جو نہ صرف سودھا سنگھ کی حویلی کی ضروریات کو پورا کرتا بلکہ سب گاؤں والے بھی اس کنویں کو استعمال کرتے اور کسی کو روک ٹوک نہ تھی۔

سردار سودھا سنگھ متروں کے ساتھ سردی کی دھوپ میں بیٹھ کر معاملات پر غور ہونے لگا۔ حویلی کے سب دروازوں کی بَلیاں چڑھادی گئیں۔ احاطے کی دیواریں پکی اینٹ سے چن کر بیس فٹ تک اونچی کی گئیں تھیں لیکن اُن پر کسی وجہ سے پلستر نہیں کیا گیا تھا۔ اینٹیں بارشوں اور زمانے کی ہواؤں کے سبب سیاہ ہو چلیں تھیں۔ دیواروں میں بھی پیپلیوں کی شاخیں نکل آئی تھیں۔ ویسے بھی دیواروں کو آرائش یا پلستر کرنا عموماً دیہاتوں میں ضروری نہیں سمجھا جاتا البتہ احاطے کے گیٹ یا مرکزی دروازے پر خاص توجہ دی جاتی ہے، وہ سردار سودھا سنگھ نے اپنی بساط کے مطابق اچھی خاصی دی تھی۔ شیشم کی پکی لکڑی کا دروازہ، جس کی رنگت پالش کے بغیر ہی اتنی سیاہ تھی کہ توے کی طرح چمکتی تھی۔ چوگاٹھ ڈیڑھ فٹ مربع چوڑے تھے اور تختے تین تین انچ موٹے۔ تختوں پر پیتل کے دو دو انچ موٹے سینکڑوں کیل اُس کی ہیبت میں اس طرح اضافہ کرتے کہ بیس فٹ اونچا اور بارہ فٹ چوڑا دروازہ اژدھے کی طرح نظر آرہا تھا۔ دروازے کی ڈیوڑھی کے اُوپر دائیں بائیں دو بُرج تھے۔ اُن پر پتھر کے دو شیر منہ کھولے کھڑے تھے، جیسے ابھی کچھ ہڑپ کرنے والے ہوں۔ نئے آنے والے کو تو بالکل اصلی دکھائی دیتے اور وہ ایک دفعہ سہم جاتا۔

سردار سودھا سنگھ نے اپنی مونچھوں کو رسی کی طرح بَل دے کر ہلکا سا جھٹکا دیا پھر فٹ بھر لمبی داڑھی کے اندر انگلیاں ڈال کر زور سے ٹھوڑی کھجائی اور سامنے پڑے مُونڈھے پر اپنی ٹانگیں پھیلاتے ہوئے چھدو کو آواز دے کر دروازوں کو پہرا بند کرنے کو کہا۔ اُدھر چھدو لنگڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا، اِدھر سودھا سنگھ نے جگبیر سنگھ کو

مخاطب کر کے اپنی بات شروع کی، جو پہلے ہی اس انتظار میں تھا کہ کب سودھا سنگھ اس سے اصل بات کی طرف آتا ہے۔

جگبیرے واہگرو نے اس سے اچھا موقع نہیں دینا، شیر حیدر کا مُنڈا (لڑکا) ابھی ندان (کم عمر) ہے۔ تکڑے (ہمت کر کے) ہو کے اپنا وار کر دیں، آگے کی شرماں گرو جی رکھو گے۔

جگبیر آگے کی طرف جھکتے ہوئے دھیمے دھیمے بولنے لگا، سردار جی میرا ایک مشورہ کبھی ضائع نہ کرنا، بانس کی کونپل زمین سے نکلتے ہی کاٹ دو ورنہ اُس کے نیزہ بننے میں دیر نہیں لگتی۔ چک جودھا پور میں آج ہی بندے بھیج کے غلام حیدر کی مونگی کی فصل وران (تباہ) کر دو۔ بیس ایکڑ مونگی کو پہلا دھکا ابھی لگا دو۔ جو گڈوں پر لاد کر لا سکتے ہیں، وہ لے آئیں، باقی کو آگ لگا دیں۔

پیت سنگھ، جس کے سَر کے بال گھنے ہونے کے ساتھ ڈب کھڑبے بھی ہو چکے تھے، اُس نے اپنے زانوؤں پر ہاتھ رکھ کر گفتگو میں حصہ لیا، سردار سودھا سنگھ! مُنڈے کو سر ہی نہ اُٹھانے دو۔ مَیں تو کہتا ہوں، دیر کرنا گرو جی کے ویریوں کا کام ہے۔ میرے تو جی میں ساہ اُس وقت آئے گا، جب شیر حیدر کے مُنڈے کو فلانگ (تباہ) کر دیں گے۔

ابھی پیتا سنگھ بول ہی رہا تھا کہ بیچ سے بیدا سنگھ نے اُس کی بات کاٹ کر کہا، سردار سودھا سنگھ! میری کرپان تو بڑے ورھوں سے پیاسی ہے۔ واہگرو جانتا ہے، مَیں نے اس دن کے لیے کتنی منتیں مانیں۔ روز اس کی دھار تیز کرتا ہوں۔ جب تک یہ کسی مُسلے کا لہو نہیں پی لیتی، واہگرو کی سونہہ اسے سہج نہیں ملے گی۔

فوجا سیوئیہ باتیں آرام سے بیٹھا سنتا رہا اور خاموشی سے داڑھی کھجاتا رہا۔ سودھا سنگھ نے فوجا سیوئے کو مسلسل خموش بیٹھے دیکھا تو مخاطب کر کے تائید کی خواہش کی۔ فوجا سئیو نے پہلے بائیں ہاتھ سے اچھی طرح کان میں کھجلی کی اور ایک دفعہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر چند منٹ خاموشی سے سودھا سنگھ کی طرف دیکھتا رہا اور آخر کار سہج سے بولا، سودھے آگے تیری مرضی، پر میری مانو تو یہ موقع ٹھیک نئیں۔ شیر حیدر کے بندے اس وقت زیادہ ہشیار ہوں گے۔ اگر وار اوچھا جا پڑا تو بڑی نموشی ہو گی۔ شیر حیدر کا مُنڈا ضرور ندان ہے پر فیقا اور اُس کے بیلی متر تو ندان نئیں۔ وہ تم سب سے زیادہ چاتر ہیں۔ ویسے بھی لوگ چنگا نئیں جانیں گے اور سرداری کو مِہنا آئے گا۔ تھوڑے دن ٹھہر کے حالات کی ٹوہ لے لو، پھر جو گرو جی کی منشا ہو گی۔ بڑے دن پڑے ہیں بدلہ لینے کو۔

پیت سنگھ بے صبری سے فوجا کی بات سن رہا تھا، ایک دم جوش میں آگیا، فوجے آج تک تُو نے بزدلی کے علاوہ کوئی مشورہ دیا ہے؟ واہگرو کی سونہہ، ہم اب تیری بات نئیں مانیں گے۔ فیقا چاتر ہے تو ہووے، آخر وہ ہے تو پاولی کا پاولی۔ سرداروں کے مُوت کے برابر اُس کی عزت نہیں۔ اُس کی عقل اُس وقت تک کام کرتی تھی جب تک شیر حیدر کا سر پر ہاتھ تھا۔ کمی کمین خود کچھ نہیں ہوتا۔ اُس کی دلیری اُس کتے جیسی ہوتی ہے، جو مالک کی ہلاشیری کے بغیر گیدڑ سے بھی ہولا ہوتا ہے۔ کہو تو فیقے پاولی کو کل ہی بودیوں سے پکڑ کر سردار سودھا سنگھ کے آگے پھینک دوں؟ باقی رہا سرداری کو مِہنا، تو اُس کے لیے ایک بات دھیان میں رکھ، جنگ میں سب جائز ہے۔

اَو پیتے بیٹھا رہ تُو، فوجا سیوۓ غصے سے بولا، پھر تُو تو ایک طرف ہو جائے گا، بھگتان تو سودھا سنگھ کو ہی دینا پڑے گا۔ تیرے سر میں بھیجا نہیں، بھوسا اور گوبر بھرا ہے۔ جب دیکھو ڈانگ برچھی اور کرپان کی باتیں کرتا ہے۔ کبھی چوہا تک نہیں مارا تو نے۔ دو گھونٹ کیا پی لیتے ہو، دُم پر کھڑے ہو جاتے ہو (سودھے کی طرف مخاطب ہو کر) دیکھ سردار سودھا سنگھ، مَیں تو تجھے یہ صلاح نہ دوں گا، آگے تیری مرضی۔

پیت سنگھ فوجے کا طعنہ سن کر سُرخ ہو گیا، فوراً کرپان کھینچ کر بولا، فوجے تجھے مَیں پِتا کے برابر جان کے لحاظ کرتا ہوں، پر تیری منشا عزت کروانے کی نہیں۔

او رہنے دے، فوجا دوبارہ بولا، تو نے اپنے پِتا کی عزت کبھی نہیں کی، میری کیا کرے گا۔ بے چارہ جیٹھ ہاڑ کی ننگی دوپہروں میں کنکاں گاہتے اور تتی زمین پر چوتڑ گھساتے سڑ سڑ کے مر گیا، تجھے تو دارو اور بوٹی کے سوا کوئی لہنا نہیں۔ فوجے مجھے غصہ نہ دلا ورنہ اسی وقت تیری رَت کے نگال بہادوں گا، پیت سنگھ ایک دم مونڈھے سے اُٹھا اور کرپان پکڑ لی۔

دونوں کو جھگڑتا دیکھ کر سودھا سنگھ نے بات کاٹ دی اور گرج کر پیت سنگھ کی طرف منہ کر کے بولا۔ ناں پر مَیں نے تمھیں آپس میں لڑائی کے لیے یہاں اکٹھا کیا ہے یا صلاح مشورے کے لیے؟ اپنی بکواس مکا کے غلام حیدر کا اُپا کرو بس۔

یہ کہہ کر سودھا سنگھ نے دوبارہ چھدو کو آواز دی، جو سودھا سنگھ کی سفید گھوڑی کو دانہ کھلانے میں مگن تھا۔ چھدو آواز سنتے ہی لنگڑاتا ہوا دوڑ کر سردار سودھا سنگھ کی چارپائی کے دائیں طرف آ کھڑا ہوا۔ چھدّو کو پتا چل چکا تھا سردار جی کیا کہنا چاہتا ہے مگر وہ پوری ہدایت لینے کے لیے باادب کھڑا رہا۔

سردار سودھا سنگھ نے اُسے متھا سنگھ کو بلا کر لانے کے لیے کہا تو اُس نے جلدی سے پیچھے مڑ کر دوڑ لگادی اور باہر نکل گیا۔ اُس کے باہر نکلنے کے بعد بیت سنگھ نے اُٹھ کر پھر دروازے کی بلّی گرادی اور پورے منصوبے پر غور کرنے لگے مگر فوجا سیوئ ہوں ہاں کے سوا چپ بیٹھا رہا۔

جاری ہے

قسط نمبر 2

(4)

ولیم کو انگلستان سے آئے ایک سال کے قریب ہو گیا لیکن ابھی تک اُسے خاص جگہ تعینات نہیں کیا گیا تھا۔ مختلف کمشنروں کے دفتروں میں ہی چھوٹے موٹے کاموں کی تربیت میں مصروف رکھا، تاکہ کام پر نکلے تو پورے حساب میں ہو۔ ایک سال کے بعد جب اُس کے باقاعدہ پوسٹنگ آرڈر تیار ہوئے تو وہ فیروز پور کی تحصیل جلال آباد میں بطور اسسٹنٹ کمشنر کے تھے۔ ولیم نے بہت کوشش کی اُسے مشرقی پنجاب نہ بھیجا جائے مگر اِن دنوں چیف سیکرٹری صاحب کے موڈ اچھے نہیں تھے اور کمشنر جیمس ویسے ہی ولیم کے باپ سے خار کھائے بیٹھا تھا۔ اس لیے وہ اُن سے کہنے کا رِسک نہیں لے سکتا تھا۔ جانسن نے پہلے ہی کہہ دیا تھا اِس معاملے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ولیم کو فیروز پور میں بطورِ اسسٹنٹ کمشنر اپنی پوسٹنگ کے آرڈر لینے ہی پڑے، بجز اس کے چارہ نہیں تھا۔

ولیم فیروز پور میں ڈسٹرکٹ آفس کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچا تو رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ ایک تو رات کی تاریکی تھی دوسرا پہلے اس علاقے میں آیا بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی شہر کے خط وخال اور رنگ ڈھنگ کو دیکھ نہ سکا۔ علاقے کا تحصیلدار اور دوسرے کئی دیسی افسر ریلوے سٹیشن پر اُسے لینے کے لیے آئے۔ سردرات کے اس پہر ولیم کے لیے اُن کی شکلیں بھوتوں کے سائے محسوس ہو رہے تھے۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی گیدڑوں کی ہاؤ ہُو اور کتوں کے بھونکنے کی آوازوں نے اُس کا استقبال کیا۔ ان کریہہ آوازوں نے ڈسٹرکٹ کمپلیکس تک اُس کو آزار پہنچایا۔ اس کے سبب ولیم کی بیزاری مزید بڑھ گئی۔ فیروز پور شہر جس قدر کھلا تھا اُسی قدر سنسان بھی تھا۔ جیپ سے اُترا تو اُس نے دیکھا ہر طرف سناٹے کا سماں ہے۔ پانچ چھ سکھ سنتری بندوقیں کاندھوں پر رکھے ستونوں کی طرح اٹینشن کھڑے تھے۔

غالباً اُنہیں بتا دیا گیا تھا کہ نئے صاحب آرہے ہیں۔ چوکیدار اور سنتریوں نے تیزی سے سلام کیا اور ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ولیم نے چاروں طرف غائر نظر ماری۔ گیس کے ہُنڈے جل رہے تھے، جن کی پیلی روشنی ہلکی دھند میں مزید ٹھنڈی اور دھندلی ہو رہی تھی۔ گاہے گاہے دُور سے بھونکتے کتوں اور چیختے گیدڑوں کی آوازیں اِس دُھند میں اور زیادہ اُداسی پھیلا رہی تھیں۔ ایک افسر نے ولیم کا اٹیچی کیس پکڑ لیا۔ دوسرا عملہ چوکیدار کے ساتھ مل کر جیپ سے بقیہ سامان اُتارنے لگا۔ اِسی اِثنا میں ولیم قدم بڑھاتا ہوا ریسٹ ہاؤس میں داخل ہو گیا۔ وہ کچھ دیر ضرور باہر کی ہوا دیکھتا مگر سفر کی تھکاوٹ اور ٹھہرے ہوئے موسم نے اُسے اِس بات پر آمادہ نہ ہونے دیا۔ جب سامان اندر آگیا

اور تحصیلدار سمیت تمام عملہ سلام کر کے رخصت ہو چکا تو چوکیدار سامان کو ترتیب سے ایک طرف جمانے لگا۔ اس معاملے میں اس کی مدد ایک سب انسپیکٹر از خود کر رہا تھا۔ اِسی بہانے اُس نے ایک بار ولیم سے گفتگو کرنے کی کوشش بھی کی لیکن ولیم اپنی ہدایات مسلسل چوکیدار ہی کو دیتا رہا۔ سامان پوری طرح ترتیب سے لگ گیا تو ولیم نے سب انسپیکٹر کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور آرام سے کرسی پر دراز ہو کر چوکیدار سے مخاطب ہوا۔

مسٹر آپ کا نام کیا ہے ؟

چوکیدار پورے جوش سے آگے بڑھتے ہوئے بولا، جی صاحب بہادر غلام کا نام نیاز دین ہے لیکن سب نجا کہتے ہیں۔ صاحب آپ حاکم ہیں، جس نام سے چاہیں بلالیں۔

ولیم نے بغیر تاثر اور کیفیت پیدا کیے کہا، نو نو نیاز دین، ہم آپ کو نیاز دین ہی کہیں گے۔ پھر فوراً کرسی سے اُٹھ کر بولا، نیاز دین ہمارے نہانے کا بندوبست کرو۔ ہم جلدی آرام کرنا چاہتے ہیں۔

صاحب جی، پانی گرم ہے۔ مجھے پتہ تھا آپ آرہے ہیں اس لیے مَیں نے آپ کے آرام کا پورا بندوبست کر دیا ہے۔ نیاز دین نے ایک کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ولیم کو داد طلب نظروں سے دیکھا مگر ولیم کا چہرہ سپاٹ رہا۔ وہ بغیر کچھ کہے واش روم کی طرف مُڑ گیا۔ نیاز دین کو ولیم کے اس عمل سے تھوڑا سا دکھ ہوا لیکن زیادہ تعجب نہ ہوا کیونکہ وہ اس ریسٹ ہاؤس میں کئی برسوں سے چوکیدار ہونے کے سبب انگریز افسروں کے سپاٹ رویوں کا عادی ہو چکا تھا۔ بلکہ وہ اس بات سے خوش تھا کہ ولیم نے اُس کے اصلی نام سے اُسے مخاطب کیا تھا۔

گرم پانی سے نہا کر ولیم کی طبیعت میں تازگی کا احساس در آیا۔ ابھی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ نیاز دین نے یاد دلایا، کھانا تیار ہے۔ ولیم نیاز دین کی اس تیز رفتاری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا مگر اپنے آپ کو جذبات سے باہر رکھتے ہوئے، جس کی تاکید سول افسر کو خاص طور پر دورانِ تربیت کی جاتی ہے، بولا، ویل ڈن نیاز دین اور کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے کی اندرونی ترتیب کا اہتمام خاص طور پر آرائش سے لے کر کھانے تک انگریزی اور ہندوستانی امتزاج سے بہت عمدہ کیا گیا تھا۔ کھانے کے دوران نیاز دین اور باورچی ہاتھ باندھے خدمت کے لیے تیار ایک کونے میں کھڑے رہے۔ ولیم نے باورچی کو نہ تو آواز دی اور نہ ہی نام پوچھنے کی ضرورت محسوس کی۔ البتہ ایک دفعہ نیاز دین کو تھینکس ضرور کہا۔

چائے پینے کے بعد ولیم ایک دفعہ پھر ریسٹ ہاؤس کے صحن میں نکل آیا اور آدھ گھنٹہ ٹہلتا رہا تاکہ کھانا ہضم ہو جائے اور اب تھکاوٹ دوبارہ اثر دکھانے لگی تھی۔ جس کی وجہ سے غنودگی طاری ہو گئی۔ وہ بیڈ روم میں آگیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔

اگلے دن ولیم کی آنکھ کھلی تو اُس نے انگڑائی لیتے ہوئے سامنے کے دیوار گیر کلارک پر نظر ڈالی۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ پورے نو گھنٹے سویا۔ اس قدر سکون کی نیند اُسے شاید ہی کبھی آئی تھی۔ مختصر یہ کہ ناشتہ کرنے اور پوری طرح سے تیار ہونے کے بعد دس بجے کمرے سے نکلا۔ دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ باہر قدم رکھتے ہی اُس کی نظر بغیر کسی رکاوٹ کے دُور تک چلی گئی۔ باہر نہ تو کوئی دیکھنے کو منظر تھا اور نہ زندگی کے آثار۔ کچے میدان اور خاکستری آسمان کے درمیان فقط چند اُجاڑ درخت ایک دوسرے سے دُور اور روٹھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اُن ٹُنڈ مُنڈ پیڑوں پر نہ کوئی پرندہ تھا، نہ گلہریوں کے آثار۔ ریسٹ ہاؤس کے گرد دو چار کیکر، ایک برگد اور بے شمار عک کے پودے تھے۔ جن کے اندر غالباً چوہیاں دوڑ رہی تھیں۔ کیکر کے پیڑوں کے نیچے تُکلوں کی پھلیاں بکھری پڑی تھیں۔ ایک جانب کچھ سرسوں کے کھیت اور دوسری طرف شہر کی اُجڑی عمارتیں تھیں۔ بازاروں کو وہ دُور ہونے کی وجہ سے نہ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اُسے یہ احساس ضرور ہو گیا کہ یہ شہر انسانوں سے زیادہ بھوتوں کا ہو گا۔ اُسے یہ سب دیکھ کر تعجب ہوا۔ کیا فیروز پور انگریزی سرکار کے ماتحت نہیں کہ اس کی جمالیات پر کوئی توجہ نہیں دی گئی؟ یا پھر یہ شہر ہی منحوس ہے۔ تحصیلدار جوزف اور ایک دو دیسی افسر اسے ویلکم کہنے کو ریسٹ ہاؤس کے باہر موجود تھے، جو صبح سات بجے ہی وہاں پہنچ گئے تھے اور تین گھنٹے تک وٹینگ روم میں بیٹھے ولیم کے نکلنے کا انتظار کرتے رہے۔ ولیم نے اُن سے ہاتھ ملا کر ہیلو کہنے کے علاوہ کچھ خاص بات نہیں کی، اپنے اُنھی خیالوں میں گم چلتا گیا مگر پھر اُس نے یہ خیال جھٹک دیا کہ خواہ مخواہ دماغ کو ہلکان کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔ کونسا اُس نے یہاں رہنا تھا، نہ ہر چیز ٹھیک کرنے کا اُس نے ٹھیکہ لیا تھا۔ اُس نے سوچا وہ کچھ وقت تک یہاں مہمان ہے۔ اُس کی بلا سے جائے جہنم میں۔ اُسے تو ڈپٹی کمشنر کے دفتر سے ہدایات وصول کرنا ہیں۔ وہ یہ کام جلد کر کے جلال آباد کی طرف نکل جانا چاہتا تھا، جہاں اُسے اپنے فرائض بطور اسسٹنٹ کمشنر ادا کرنے ہوں گے۔ لاہور سے جاتے ہوئے اُس نے خیال کیا تھا کہ دو چار دن کے لیے فیروز پور رُکے گا لیکن یہاں آکر جلد ہی اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ یہاں اگر کوئی شے اِن میں جاندار تھی تو وہ نیاز دین تھا، جس نے اُسے کل شام سے کچھ تکلیف نہ ہونے دی، لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا

ہے، فیروز پور آنا ولیم کی غلطی نہیں مجبوری تھی۔اس کے ساتھ ایک بات کا اُسے اطمینان بھی تھا کہ اُس کی پوسٹنگ ابھی فیروز پور ہی میں ہوئی تھی، نہ کہ لدھیانہ یا راجستان میں، جس کا پہلے بہت امکان تھا اور اُن کے نام ہی سے وہ بیزار تھا۔ پھر یہ بات اور بھی اطمینان بخش تھی کہ فیروز پور کی بجائے اُس کو تحصیل جلال آباد بھیجا جا رہا تھا، جو فیروز پور سے جنوب مغرب کی طرف ستر کلو میٹر پر تھی۔وہاں سے وسطی پنجاب محض پچاس کلو میٹر تھا، اُس کے خوابوں کا استھان۔

ولیم خیال کی انھی وادیوں سے گزرتا ہوا ڈپٹی کمشنر کے دفتر پہنچ گیا۔ نائب تحصیلدار وِکرم نے جیپ رُکتے ہی آگے بڑھ کر ولیم سے بریف کیس پکڑ لیا اور بڑے ادب سے ڈپٹی کمشنر کے کمرے کی طرف رہنمائی کرنے لگا۔اُس نے دیکھا بہت سے کلرک اپنے کمروں کے کھلے دروازوں سے جھانک رہے ہیں۔اِن میں اکثر کی گول شیشے والی عینکیں میلی چکٹ ڈوریوں سے بندھی، اُن کی ناکوں پر ترچھی جمی اُسے گھور رہی تھیں۔ کچھ کلرک اِن دھندلائے ہوئے شیشوں کے اُوپر سے دیکھنے کی کوشش میں تھے۔ولیم کو سرسری نظر میں بھی اُن کی باہر نکلی ہوئی توندیں اور بغیر بالوں کی چُندھیائیں دِکھنے سے باز نہ رہ سکیں۔ وہ جانتا تھا، یہ سب اُس کے گزر جانے کے بعد اُس پر رائے زنی شروع کر دیں گے۔ جس کا نہ اُنھیں کچھ فائدہ ہو گا اور نہ انگریز سرکار کو۔ مگر ہوا میں ضائع ہو جانے والے تبصرے وہ ہر حالت میں کریں گے۔ کلرکوں کے ایسے عمل سے اُسے شدید نفرت تھی مگر اِن کی مشترکہ عادات کو روکنا اُس کے بس کا روگ بھی نہیں تھا۔ وہ راہداریوں سے گزر کر جیسے ہی ڈپٹی صاحب کے دروازے پر پہنچا، ڈپٹی کمشنر ہیلے دروازے پر استقبال کرنے کے لیے موجود تھا۔

گڈ مارننگ سَر" ولیم نے ایک لمبا ڈگ بھرتے ہوئے ہیلے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

گڈ مارننگ ینگ مین، "ہیلے نے ولیم کا ہاتھ گرم جوشی سے دبایا اور کمرے میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

تحصیلدار جوزف کو ولیم نے باہر ہی سے رخصت کر دیا۔ نائب تحصیلدار وِکرم نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور اُس وقت تک دروازہ پکڑے کھڑا رہا جب تک دونوں کمرے میں داخل نہیں ہو گئے۔ہیلے نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہی سگار کا کش لیا اور ولیم کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

چند ثانیوں بعد ایک شخص کافی اور بسکٹ رکھ کر چلا گیا۔ پھر کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، نہ ولیم کچھ بولا اور نہ ہیلے۔ دونوں شاید ایک دوسرے کے جسمانی خدو خال سے دماغ کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگاتے رہے۔ چند ثانیوں کے اس وقفے کے بعد ہیلے نے گفتگو کا آغاز کر دیا۔ برطانیہ سے کب آئے؟

ولیم نے کرسی پر ٹھیک سے پہلو درست کیا اور جواب دیا، سر لندن سے آئے ایک سال سے اوپر ہو گیا لیکن آرام سے ایک دن نہیں بیٹھ سکا۔ آپ جانتے ہیں، اکیڈمیوں والے ایک کے بعد دوسری ٹریننگ کے چولہے میں جھونک دیتے ہیں اور سیکھا ہوا بار بار سکھاتے ہیں۔

اس باوجود بھی کچھ لوگ نہیں سیکھتے، ہیلے نے یہ جملہ چبھتے ہوئے انداز میں کہا، جسے ولیم محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا لیکن خاموش رہا۔

بات فوراً بدل کر اور وطن کی پوری محبت دل میں جمع کرتے ہوئے ہیلے دوبارہ بولا، لندن کیسا تھا؟

ولیم نے کاندھے اُچکاتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا، وہی پرانی برف، جو قیامت تک رہے گی۔

ہیلے کو ولیم کا جواب ناگوار لگا مگر وہ پی گیا اور گفتگو اپنے مطلب کی طرف لے آیا، فیروزپور کا سفر کیسے کٹا؟ میرا مطلب ہے کچھ تکلیف تو نہیں ہوئی؟

ولیم نے کافی کا گھونٹ پیتے ہوئے جواب دیا، بہت عمدہ سر، ریسٹ ہاؤس کا ملازم اچھا تھا۔

باتیں کرنے کے ساتھ ولیم کمرے کا جائزہ بھی لیتا جا رہا۔ ہیلے کی میز اور کمرے کی اندرونی ہیئت واقعتاً برطانوی ایمپائر کی ہیبت کی عکاس تھی۔ دس فٹ لمبی اور چھ فٹ چوڑی میز کے ایک کونے پر رکھا ہوا گلوب کچھ معنی رکھتا تھا۔ کمرہ انتہائی کھلا اور آرائش میں پروقار چیزوں کی نشاندہی کر رہا تھا۔ پردوں سے لے کر صوفوں تک اور سامنے کی دیوار پر برطانیہ کی وسیع سلطنت کے پھیلے ہوئے نقشے کسی بھی ملاقاتی کے دل پر حکومت کی جلالت اور اس کے نمائندے کی ہیبت پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔

ینگ مین آپ کب تک جلال آباد جانا چاہتے ہیں؟ ہیلے جلد ہی مطلب پر آ گیا۔

ولیم، جسے حال ہی میں انگلستان میں آٹھ سال گزارنے پڑے تھے، جواب دینے کے معاملے میں اس کی طبیعت میں ایک ٹھہراو تھا۔ کچھ دیر کافی کی چسکی لینے کے بعد کمرے کو چند ثانیے گھورتا رہا پھر اعتماد کے ساتھ بولا، سر میں آج ہی یہاں سے روانہ ہونا چاہتا ہوں۔ لیٹر جلد مل جائے تو خوشی ہو گی۔

ہیلے نے کچھ دیر ولیم کی نیلی آنکھوں میں، جن میں ہلکا سبز رنگ بھی گھلا تھا دیکھتے ہوئے ایک بھرپور خاموشی کا سوال کیا۔ جس کا مطلب تھا، جواب وضاحت طلب ہے۔

ولیم نے وضاحت کی ’سر میری طبیعت یہاں اُکتاہٹ کا شکار ہو رہی ہے اس لیے اپنے کام پر جلد پہنچنا چاہتا ہوں۔

او کے، ہم آپ کو آج ہی رخصت کر دیں گے۔ ہیلے نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا، بس کچھ ضروری معلومات آپ کے گوش گزار کرنا ہیں۔ جن میں سے کچھ کا تعلق زبانی ہے اور کچھ تحریری۔

کیا زبانی معلومات ابھی نہیں مل سکتیں؟ ولیم نے اب کے بے چینی کا مظاہرہ کیا۔

یس مسٹر ولیم، ہیلے نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

آپ کے متعلق میرے پاس خاصی معلومات ہیں، جو ہندوستان میں رہنے والے ایک انگریز افسر کے لیے خطرناک ہیں۔ رپورٹ کے مطابق آپ کمشنری کے لیے مناسب نہیں تھے۔ اُن کا کہنا ہے آپ کے مزاج میں شوریدگی اور بعض شاعرانہ قباحتیں ہیں۔ لیکن ہوم منسٹری نے آپ کے اجداد کی سابقہ خدمات کے پیش نظر اُس رپورٹ کو نظر انداز کر دیا اور پوسٹنگ لیٹر دے کر یہاں بھیج دیا۔ اب اُس رپورٹ کو غلط ثابت کرنا آپ کے ذمہ ہے۔

سر بات میری سمجھ میں نہیں آئی، ولیم نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

ولیم ہیلے دوبارہ بولا، اسٹیج پر آنے کے بعد اسٹیج سے باعزت اُترنا زیادہ اہم ہے۔ آپ ایک ایسے ناٹک کی طرف جا رہے ہیں جس میں ایک سین ایک ہی بار شوٹ ہوتا ہے۔ ری ایکٹ کرنے کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ پہلی ہی بار پرفیکٹ ہونا ضروری ہے۔ جہاں اسٹیج کے اصولوں کی خلاف ورزی کی، وہیں ذلت اُٹھاؤ گے۔ میرا خیال ہے، آپ ہوم منسٹری کی عزت رکھیں گے اور اپنے اجداد کی بھی۔

ولیم کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے ہیلے کی گفتگو سن رہا تھا۔ ہیلے کے چہرے کی سلوٹیں بھی غور سے دیکھ رہا تھا۔ جن میں ہر اُس افسر کی طرح، جب وہ سروس میں کچھ عرصہ گزار لیتا ہے، بقراطیت جھلکنے لگتی ہے۔

ہیلے نے دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر آگے جھکتے ہوئے گفتگو دوبارہ شروع کی، ولیم، تم ایک انگریز ہو۔ یہاں تمہاری حیثیت حاکم کی ہے۔ ہم یہاں کی زمین سے رومانس نہیں، حکومت کرنے آئے ہیں۔ جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے، آپ کی شاعرانہ طبعیت آپ کو مشکل میں ڈال سکتی ہے۔ یہاں آپ کا وجود ایک برتر سطح پر ہے۔ اس لیے آپ پر کئی ذمہ

داریاں عائد ہوتی ہیں۔ جو انگریز نوجوان برٹش سول سروس کو جوائن نہیں کرتے وہ ان حدود اور ذمہ داریوں سے ماورا ہیں۔

ولیم حاکم اور محکوم میں ایک فاصلہ ہوتا ہے۔ اُسے قائم رکھنا حاکم کی ذمہ داری ہے۔ دیسی لوگوں کو انصاف فراہم کرو لیکن عدل کے دوران تمہارا ظالم اور مظلوم سے فاصلہ برابر ہونا چاہیے۔ اُن کے درمیان فیصلہ کر کے دونوں سے بے تعلق ہو جاؤ۔ اگر مقامی سے سو دفعہ ملو تو ہر بار اجنبی کی طرح۔ کیونکہ تمہاری قربت اُسے تمھاری ہیبت سے باہر کر دے گی اور یہ بات قانون کو چھوٹا کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہی قانون جو ہماری ایمپائر کا حقیقی ستون ہے۔ (ہیلے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور گلوب کو دائیں ہاتھ کی انگلی سے گھما کر بات جاری رکھی) میرا خیال ہے ینگ مین، آپ میری بات کے سمجھنے میں مشکل محسوس نہیں کر رہے۔ ہندوستان ایک وسیع سمندر ہے جو انتہائی گہرا، تند و تیز موجوں سے بھرا ہوا ہے۔ حکومت یعنی ہم اس کی سطح پر ایک جہاز کی مانند تیر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی بقا کے لیے ہر طرف سے ہوشیار اور متحرک رہنا ہے۔ اس کی ہولناکیوں پر قابو پانے کے لیے بے رحم طاقت چاہیے۔ جہاز کا ہر تختہ دوسرے سے بغیر فاصلے کے جُڑا ہو، ورنہ سمندر کا اپنا وجود مستعار نہیں۔ وہ اپنی زمین پر کھڑا ہے۔ ہم اُسے اُٹھا کر نہیں لے جا سکتے۔ اس کی موجوں کو طغیانی سے نہیں روک سکتے۔ مَیں جانتا ہوں، ہم نے جہاز پر اتنا کچھ لاد لیا ہے جس کی گراں باری تختوں کے چوکھٹے ہلا رہی ہے۔ چنانچہ اُس وقت تک موجوں کی سرکشی کو بادبانوں پر رکھو جب تک تمہاری کشتیاں ٹھنڈے ساحلوں پر لنگر نہیں گرا لیتیں۔ ولیم، ہم ان تختوں کے ساتھ ڈوبنا نہیں چاہتے۔

آپ میری باتیں سن رہے ہیں؟ ہیلے نے اُسے دوبارہ مخاطب کیا۔

سَر آپ بات جاری رکھیں، ولیم دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

گُڈ۔ تو میں کہہ رہا تھا (اسی اثنا میں ہیلے نے سگار کا بھرپور کش لیا) ہمیں یہاں اپنا وجود ثابت کرتے رہنا ہے، جب تک اس جگہ موجود ہیں۔ مجھے نہیں معلوم، ہمارے مرکز میں کتنی طاقت ہے۔ لیکن تمہارے ہیٹ کی چوڑائی پگڑی سے زیادہ ہونی چاہیئے اور سگار کا دھواں حقے سے تلخ۔ تم ان کی آنکھوں میں دھواں بھرتے رہو تا کہ یہ صاف نہ دیکھ پائیں۔ اُس کے بعد جو تمہاری عینک اِنہیں دکھائے، یہ وہی دیکھیں۔ لیکن دھواں تمہاری اپنی آنکھوں کی طرف نہ آنا چاہیے۔

اس کے بعد ہیلے آرام سے کرسی پر بیٹھ کر کچھ دیر کے لیے خموش ہو گیا۔ اُس کی خموشی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ولیم نے کہا، سَر کیا آپ پسند کریں گے، مجھے جلال آباد کے متعلق سرسری معلومات مل جائیں؟

ولیم کے اس سوال نے ہیلے کو یاد دلایا کہ وہ اپنی پوسٹنگ سائیٹ میں دلچسپی رکھنے پر اکتفا کرے گا۔ ہیلے مسکرایا، اُسے محسوس ہوا ولیم کچھ زیادہ بے چینی میں ہے۔

وائے ناٹ، مسٹر ولیم، یو وِل ورک انڈر می اور میں آپ کے کام کا ذمہ دار ہوں۔ غور سے سنو، ہندوستان میں پنجاب واحد ایسا علاقہ ہے جہاں انسان جانوروں کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس لیے اکثر پتا نہیں چلتا، دونوں میں اصل جانور کون ہے؟ ان لوگوں کے پاس بیل اور بھینسیں بہت ہیں۔ یہ لوگ اطاعت کے وقت بھینس اور سرکشی کے وقت بیل بن جاتے ہیں۔ چنانچہ انھیں دوہتے وقت تھپکی دینا اور سرکشی کریں تو سینگوں سے دور رہنا۔ شاید برکلے کا انجام تمھیں یاد ہو۔ قبروں پر چراغ جلانے میں ہمیں کوئی دلچسپی نہیں۔ جلال آباد وسطی پنجاب کی سرحد پر فیروز پور کی آخری تحصیل ہے۔ اِن کے سینے دریاؤں کی طرح چوڑے اور مزاج اس کے بہاؤ کی طرح تیز ہیں۔ جنھیں کناروں میں رکھنا آپ کی ذمہ داری ہے۔

یہاں دو قومیں ہر وقت ایک دوسرے کے مقابلے پر رہتی ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے حریف سکھ اور پنجابی مسلمان ہیں۔ پنجابی مسلمان معقول اور بات کو جلد سمجھ لینے والے ہیں۔ جب کہ سکھ احمق اور ہر وقت اپنے ہی نقصان کے دَرپے رہتے ہیں۔ لیکن تمہارے لیے بہتر مددگار سکھ ہوں گے۔ کیونکہ مسلمانوں کے اندر سے نخوت اور منافقت ختم نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ اپنے پرائے کو کسی بھی وقت دھوکا دے سکتے ہیں۔ مَیں یہ نہیں کہتا، سکھوں کو بلا جواز مدد دینا۔ یہ تمہارے لیے خطرناک ہو گا لیکن مشکل کے وقت انھی سے کام لینا۔ یہ لوگ ہر کام بغیر سوچے کر گزریں گے۔ جب کہ مسلمان تمھارے کاموں میں اپنی رائے داخل کریں گے اور وہ ناقص ہو گی۔ بس یہی کچھ ہے جو میں زبانی آپ سے کہنا چاہ رہا تھا۔ اب آپ کچھ پوچھنا چاہیں تو مَیں بتانے کو بیٹھا ہوں۔

''صرف ایک بات سر'' ولیم نے دھیمے سے کہا

پوچھیے، ہیلے نے متوجہ ہو کر کہا۔

کسی معاملے میں اگر مَیں تنہا ہو جاؤں تو اس وقت آپ کی عینک کے شیشے سیاہ ہوں گے یا شفاف؟

دیکھو ولیم ہیلے نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ہر انچارج ہمیشہ دو عینکیں رکھتا ہے، ایک شفاف ایک سیاہ۔ شفاف عینک اُس کے ضمیر کی ہوتی ہے اور سیاہ اپنے مفاد کی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے سیاہ عینک لگانی پڑ جائے البتہ میں مدد سے گریز نہیں کرتا۔ پھر بھی آپ احتیاط سے کام لیتے رہیں۔ اتنا کہہ کر ہیلے کرسی پر دوبارہ بیٹھ گیا اور گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔

ولیم نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔

اتنے میں ایک آدمی جس کے سَر کے بال تقریباً اُڑ چکے تھے اور گول پاجامے سے پیٹ ڈھولکی کی طرح اتنا باہر نکلا تھا کہ اُس میں پاجامے کی بیلٹ چھپ چکی تھی۔ وہ ایک بڑی بھاری فائل لے کر اندر داخل ہوا۔ ہیلے نے اُسے ولیم کی طرف اشارہ کر دیا جس کا مطلب تھا یہ فائل صاحب کو دے دی جائے۔ جب فائل ولیم کے سامنے آئی تو ہیلے نے کہا، مسٹر ولیم، اس گزیٹر میں آپ کو بہت کچھ مل جائے گا۔ اور آخر میں ایک اور مگر سب سے اہم بات دھیان میں رہے۔ یہ کہہ کر ہیلے اُٹھ کر میز کی دوسری طرف سے ہوتے ہوئے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ولیم ہیلے کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہو گیا تو اُس نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا، ولیم تمھیں انگلستان کی برف ہندوستان کے گرم دریاؤں سے اور لندن کے سفید کوے آگرہ کے کبوتروں سے زیادہ عزیز ہونا چاہیئیں۔ بس اب آپ جا سکتے ہیں۔

ولیم نے ہیلے کے آخری جملے کی چبھن کو واضح محسوس کیا لیکن کچھ بولا نہیں، بلکہ اٹھنے کے لیے سلام کیا۔ ہیلے اُسے باہر تک چھوڑنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ دونوں پورے وقار کے ساتھ جیسے ہی دفتر کے مرکزی دروازے پر آئے دفتر کا پورا عملہ دورویہ قطار میں مقامی حیثیت کا اعلان کرنے کے لیے موجود تھا۔ جنہیں آگے بڑھ کر ہاتھ ملانے کا حوصلہ تو نہیں تھا البتہ اپنے ہاتھ ماتھوں پر ضرور لے آئے اور نائب تحصیلدار وِکرم کو رشک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ کیسے اِترا اِترا کر ولیم کا بیگ پکڑے چل رہا تھا۔ موتی چند کے پاس سے گزرا تو اُس نے کہنی مار کر بابو جلال سے کہا، بابو جی، یہ وِکرم بہت حرامی ہے۔ جلال آباد تک ولیم کے ساتھ جائے گا اور رستے میں صاحب کو شیشے میں اُتار لے گا۔

بابو جلال دھیمے سے تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولا، منشی جی یہ چپڑ قناتیا تحصیلدار ایسے ہی نہیں ہوا، موقعے کی تاڑ میں رہتا ہے۔ بھلا یہ بتاؤ کسے خبر تھی ولیم جلال آباد کا اسسٹنٹ کمشنر بن کر آ رہا ہے؟ سوائے اس حرام خور کے۔

ولیم جیپ میں بیٹھ چکا، جس کا انجن کچھ دیر پہلے ہی رسہ گھما کر سٹارٹ کر دیا گیا تھا، تو وِکرم بیگ پکڑ کر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر سمٹ گیا، پھر نہایت ادب سے بولا، سَر اگر حکم ہو تو غلام آپ کو فیروز پور کی سیر کروا دے۔

وِکرم، مَیں فیروز پور نہیں دیکھنا چاہوں گا۔ ولیم نے دوٹوک اور سپاٹ انداز میں وکرم کی فرمائش کو رد کر دیا اس کے بعد جیپ چل دی، جس کے پیچھے پولیس کی ایک جیپ مزید پروٹوکول کے لیے موجود تھی۔ اس میں چھ سپاہی اور ایک تھانیدار تھا۔ پروٹوکول جیپ کو قانوناً ولیم کے آگے چلنا چاہیے تھا لیکن کچی سڑک پر گرد کی بہتات اور ولیم کو مٹی سے بچانے کے لیے یہ جیپ پیچھے ہی رکھی گئی۔

(5)

شیر حیدر کی خواہش تھی اُس کا بیٹا غلام حیدر کلکٹر بنے۔ اس سلسلے میں اسے میٹرک کے بعد لندن بھی بھیجا گیا مگر غلام حیدر نے وہاں خاص کامیابی حاصل نہ کی اور دو سال بعد ہی لوٹ آیا۔ ویسے بھی ہندوستانیوں کا اِس معیار پر پورا اُترنا کچھ خالہ جی کا کھیل نہ تھا۔ البتہ تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور وہ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کر گیا۔ شیر حیدر نے اپنی زندگی میں ہمیشہ کوشش کی کہ غلام حیدر جلال آباد سے دُور رہے۔ وہ اُسے کسی طرح اقتدار کی حویلیوں تک لے جانا چاہتا تھا۔ جس کے لیے بڑے اور پڑھے لکھے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب کچھ جلال آباد کے دیہاتوں سے دُور رہ کر ہی آ سکتے تھے۔ اسی بات کے پیش نظر لاہور میں اس کے لیے ایک کوٹھی بنوا دی۔ جہاں دو چار ملازم بھیج دیے گئے۔ اس طرح لاہور میں طویل قیام نے غلام حیدر کے مزاج میں ایک تہذیبی رچاؤ داخل کر دیا۔ پیسے کی کمی نہیں تھی جس کے سبب اعلیٰ سوسائٹی اور کلبوں میں آمدورفت کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ انھی مشاغل میں بہت سے ایسے دوست نکل آئے جن کا تعلق اقتدار کے حلقوں سے تھا۔ ان میں خاص کر دو دوست میجر رچرڈ اور نواب افتخار غلام حیدر سے کچھ زیادہ ہی شیر و شکر ہو گئے۔ میجر رچرڈ جو بعد میں کرنل بن گئے تھے، ایک دفعہ غلام حیدر کے ساتھ سیر و شکار کے لیے جلال آباد بھی جا چکے تھے۔ نواب افتخار کی زیادہ زمین بھی اِسی طرف تھی۔ اس لحاظ سے یہ ربط وضبط ایک ثلاثہ کی حیثیت اختیار کر رہا تھا کہ اچانک نواب افتخار لندن چلا گیا اور چار سال تک اس کے واپس آنے کا امکان نہ رہا۔ جبکہ کرنل رچرڈ کی پوسٹنگ بنارس ہو گئی۔ اس طرح یہ سلسلہ بیچ ہی میں رہ گیا البتہ اتنا ہوا کہ وہ جاتے جاتے ایک ولایتی بندوق بمعہ لائسنس غلام حیدر کو تحفے میں دے گیا۔ یہ بات اس لیے بھی اہم تھی کہ اُس وقت ایک تو ولایتی بندوق کا دیسی آدمی کو ملنا مشکل تھا، دوم یہ کہ اُس کا لائسنس اِس سے بھی زیادہ ناممکن بات تھی اور یہ دونوں کام کرنل رچرڈ نے کسی نامعلوم طاقت ور وسائل کو استعمال کرتے ہوئے غلام حیدر کے لیے کر دیے۔ جن کی اجازت کم از کم نواب سے نیچے کسی کو ملنا ممکن نہیں تھی۔

اب شیر حیدر کی دفعتاً موت واقع ہوئی تو اس کا اکلوتا وارث ہونے کی وجہ سے غلام حیدر پر کافی ذمہ داریاں آ گئیں۔ چار ہزار ایکڑ رقبے کو سنبھالنا اور علاقے کے بُرے بھلے کی خبر رکھنا آسان کام نہ تھا۔ زمینداری اور زمینوں میں کام کرنے والی رعایا اور ان کے درمیان پیدا ہونے والے بیسیوں جھگڑوں کا بار بھی غلام حیدر کے سر آ پڑا۔ عمومی طور پر قتل اور ڈکیتی کی واردات کے علاوہ اتنے بڑے رقبے میں رہنے والی رعایا سے گورنمنٹ بے نیاز سی ہو جاتی۔ ویسے بھی بڑے زمیندار کچھ تو اپنی ذیلداری کا بھرم رکھنے کے لیے اور کچھ گورنمنٹ کی نظروں میں اعتبار پانے کی غرض سے اپنی رعایا کے فیصلے عام طور پر خود ہی عدل سے چکا دیتے۔ اس لیے زیادہ تر ایسے علاقوں میں امن و امان ہی رہتا۔ یا اگر کسی کے ساتھ زور زیادتی ہو بھی جاتی تو وہ صبر کر لیتا اور گورنمنٹ تک بات کم پہنچتی۔ پھر بھی مکمل طور پر ہر ایک کی خبر گیری کرنا کسی طرح آسان نہیں تھا۔ ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ غلام حیدر کو ان معاملات میں تجربہ کچھ نہیں تھا۔ اس کی زندگی کسی اور ہی تربیت کا نتیجہ تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ سب کاروبار رفیق پاولی کو سونپ کر چند دنوں بعد لاہور چلا جائے گا۔ رفیق خود ہی مزارعوں کے ساتھ حساب کتاب کرتا رہے گا۔ ویسے بھی شیر حیدر کی زندگی میں نوے فی صد کام رفیق پاولی نے اپنے ہی ذمے لے رکھے تھے اور اس سے زیادہ قابل اعتماد آدمی کوئی اور تھا بھی نہیں۔ شیر حیدر اسے چھوٹے بھائیوں کی طرح رکھتا تھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ رفیق پاولی نے کبھی اُس کے اعتماد کو ٹھیس بھی نہیں پہنچنے دی تھی۔

شیر حیدر کی وفات کو دو دن گزر چکے تھے۔ تمام برادری، شیر حیدر کے یار دوست اور غلام حیدر کے کچھ دوست۔ اس کے علاوہ ارد گرد کی رعایا۔ سینکڑوں لوگ حویلی میں جمع تھے۔

حویلی کیا تھی، ایک چھوٹا سا قلعہ تھا۔ جس کی چار دیواری پچیس فٹ اونچی ضرور ہو گی، جو چھوٹی سرخ اینٹوں سے تیار کی گئی تھی۔ اس پچیس فٹ اونچی اور تین فٹ چوڑی دیوار پر، جس پر گھوڑا بھی دوڑ سکتا تھا، جگہ جگہ برج بنے ہوئے تھے اور برجوں پر چھوٹی چھوٹی محرابیاں اور طاق تھے۔ جن میں رات کے وقت لالٹینیں روشن ہو جاتیں۔ مرکزی دروازے کے سامنے ڈیوڑھی سو فٹ لمبی اور چالیس فٹ چوڑی تھی۔ یہ پچیس فٹ اونچی چھت والی ڈیوڑھی بے شمار ڈاٹوں اور محرابوں کے سہاروں پر دور تک چلی گئی تھی۔ اسی طرح ڈاٹوں کے ساتھ بے شمار طاق اور محرابیں بنا دی گئیں۔ یہاں بھی یہ طاق زیادہ تر لالٹینیں جلانے کے کام آتے۔ لالٹینوں کے متواتر اٹھتے ہوئے دھوئیں سے سیاہ رنگ کا دبیز پلستر ڈیوڑھی کی دیواروں پر چڑھ گیا تھا۔ ڈیوڑھی چھوٹی سرخ اینٹوں سے تیار کی گئی تھی۔ مگر اب نہ کوئی

ان اینٹوں کا رنگ اور نہ ہی سائز بتا سکتا تھا۔ البتہ سیاہ دھوئیں نے اس آباد ڈیوڑھی کی ہیبت میں ایک طرح سے اضافہ ہی کیا تھا۔ ڈیوڑھی میں ہر وقت بیس چالیس لوگ بیٹھے رہتے۔ ان میں کچھ تو معذور اور بے گھر تھے۔ جن کا کام صرف تین وقت کھانا اور گپیں ہانکنا تھا۔ باقی اِدھر اُدھر سے مسافر یا داستان گو آن پڑتے۔ ان سب کا روزانہ کا کھانا شیر حیدر کے ذمہ تھا۔ ایک دیگ صبح پک جاتی ایک شام اور اِن کا پیٹ بھر جاتا۔ کپڑا لتّا بھی عید بقر عید یہیں سے مل جاتا اور نہانے دھونے کو رہٹ وہاں جگہ جگہ تھے۔

ڈیوڑھی کے علاوہ دیوار کے ساتھ ساتھ چاروں طرف سو کے قریب کمرے تھے۔ ان میں اجناس، غلہ اور ضرورت کی دوسری اشیاء بھری رہتیں۔ اسی احاطے کے درمیان سے ایک دیوار کھینچ دی گئی تھی، جس نے جنوبی سمت کے حصے کو پورے احاطے سے الگ کر دیا تھا۔ اس کے اندر شیر حیدر کے اپنے رہنے کے مکان تھے۔ ان مکانوں کی دیواریں بیرونی دیوار کی طرح مضبوط تو نہیں تھی البتہ آرائش کے اعتبار سے کہیں بہتر اور صاف تھیں۔

شیر حیدر کی عمومی مجلس زیادہ تر بیرونی احاطے میں رہتی۔ پیپل کے دو بڑے پیڑ حویلی کے بڑے صحن میں موجود تھے۔ اِن کا سایہ احاطے کے صحن کی آدھی جگہ گھیر لیتا۔ وہیں گرمیوں میں شیر حیدر کی پرانی چار پائی لگ جاتی۔ سینکڑوں مُوڑھے اور چار پائیاں سامنے پڑے رہتے۔ جن پر بیسیوں لوگ ہمہ وقت موجود خوش گپیوں میں اپنا وقت کاٹتے۔

یہ دن سردیوں کے تھے۔ اس لیے چار پائیاں پیپلیوں سے کافی ہٹ کے مغربی دیوار کے ساتھ لگی تھیں اور احاطہ ایک ایکڑ کھلا تھا۔

آج شیر حیدر کے سوم کا ختم تھا۔ اس لیے مہمان سینکڑوں کی تعداد میں جمع تھے۔ اُن کی تواضع کے لیے پچاس کے قریب دیگیں حویلی کے باہر قطاروں میں چڑھی ہوئی تھیں اور صبح نو بجے ہی کا وقت تھا۔ دھوپ کی تمازت میں غلام حیدر چار پائی پر بیٹھا چاروں طرف سے پُرسہ دینے والوں میں گھِرا تھا۔ سوم کے ختم کے بعد پگڑی باندھنے کی رسم تھی۔ جس کے لیے برادری والے سب دُور نزدیک سے اکٹھے ہو رہے تھے۔ اس پس منظر میں ایک ایسا ماحول بن گیا، جس کے پس پردہ تو الم کی کیفیت تھی لیکن ظاہری طور پر شادی کی سی فضا بن چکی تھی۔ ہر کوئی شیر حیدر کے سابقہ کارنامے گنوا رہا تھا۔ کسی کو اس کا عدل و انصاف یاد آنے لگا۔ کوئی رو رو کر بتا رہا تھا کہ کس طرح بہشتی نے اُس کی بیٹی کے جہیز کا بندوبست کیا۔ غلام حیدر سب کچھ بیٹھا خموشی سے سنتا رہا۔ زنانہ حصے سے بین کی آوازیں بھی کچھ

کچھ دیر بعد اُس کے کان میں پڑ جاتیں۔ یہ رونے والیاں گاؤں کی زیادہ تر وہ عورتیں تھیں، جو اُن کی رعایا میں شمار ہوتیں اور غلام حیدر کی والدہ کو خاوند کا پرسہ دینے آئی تھیں۔ سب کچھ دھیمے سے چل رہا تھا، اچانک رفیق پاوُلی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا غلام حیدر کی طرف آیا۔ چہرے پر پریشانی اور سراسیمگی نمایاں تھی۔ آتے ہی اُس نے چپکے سے غلام حیدر کے کان میں کچھ کہا۔ پھر وہ دونوں پیپل کے دوسری طرف مشرقی دیوار کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ غلام حیدر کی زندگی میں چونکہ اس قسم کا پہلا تجربہ تھا اس لیے اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے اور ایسی صورت حال میں کس ردعمل کا مظاہرہ کرے۔ اُس نے فیقے سے کہا۔

چاچا فیقے، اب آپ ہی بتاؤ، ایسے معاملے میں کیا کرنا چاہیے؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بابا شیر حیدر اگر ہوتے تو وہ کیا کرتے؟ اس کے سارے کام تو آپ ہی کرتے رہے ہیں۔

رفیق پاوُلی کے لیے یہ ایک سٹپٹانے والی کیفیت تھی۔ شیر حیدر کے وقت اگر وہ اپنی مرضی سے کچھ فیصلے کر جاتا تھا تو فقط اس امید پر کہ مالک سر پر موجود ہے۔ کچھ غلط بھی ہو گیا تو سنبھال لیا جائے گا۔ یعنی اس کے بُرے بھلے کی ذمہ داری شیر حیدر پر ہی ہوتی لیکن اب معاملہ بالکل برعکس تھا۔ رفیق پاوُلی نے سوچا کہ اب اگر وہ کوئی فیصلہ اپنی مرضی سے کر جائے اور اُس کا نتیجہ غلط نکل آیا تو پھر نہ جانے کیا ہو کیونکہ غلام حیدر ابھی ناتجربہ کار لڑکا ہی ہے۔ وہ لاکھ شہر میں رہتے ہوئے تجربہ کار ہو گیا ہو مگر شیر حیدر کی بات تو پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورت حال میں ظاہر ہے معاملے کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ کچھ دیر اُلجھن کے ساتھ سوچتا رہا۔

غلام حیدر معاملہ بہت گھمبیر ہو چکا ہے ''رفیق پاوُلی نے بے کسی اور بے چینی کی ملی جلی کیفیت میں پگڑی ایک طرف کر کے سر کھجایا'' سودھا سنگھ سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ اتنی اوچھی حرکت کرے گا۔ اس خنزیر نے عین پھوڑے کے اُوپر سٹ ماری ہے۔ اِدھر سارا شریکا جمع ہے۔ اگر بات پھیلی تو لوگ پوچھ پوچھ کر کے کان کھا جائیں گے۔

چاچا رفیق اب تو اُس نے جو کرنا تھا کر دیا ''غلام حیدر نے بے قراری سے کہا'' میں نہیں سمجھتا کہ اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ بیس ایکڑ مونگی کی تو خیر ہے لیکن چراغ دین کے قتل کا کیا کریں۔ وہ بچارا تو بڑا وفادار ملازم تھا۔ جلدی کوئی حل بتا۔ میرا دماغ تپنے لگا ہے۔

کچھ کرتے ہیں سردار غلام حیدر ''رفیق پاولی دوبارہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ پھر شریف کو آواز دی جو مہمانوں کو لسی پانی پلانے میں مصروف تھا۔ اس نے لسی کے جگ، گلاس وہیں رکھے اور بھاگ کر رفیق پاولی اور غلام حیدر کے پاس آ

گیا۔ رفیق نے اسے کہا کہ ایک چار پائی اٹھا کر یہاں لے آ اور دیکھ، نیاز حسین کو بھی یہیں پر بُلا لے۔ اُس سے کچھ بات کرنی ہے۔

شریف نے تھوڑی دیر میں چار پائی دہکتے ہوئے سُرخ کوئلوں کے پاس مشرقی دیوار کے ساتھ رکھ دی۔ غلام حیدر اور رفیق تسلّی سے اس پر بیٹھ کر معاملات پر غور کرنے لگے، اتنے میں نیاز حسین بھی آ گیا۔ غلام حیدر نے نیاز حسین سے کہا بیٹھ جا اور جو کچھ ہوا ہے اُس واقعے کی صاف صاف تفصیل بتا لیکن ایک بات نہ بُھولنا، تمہارے جھوٹ بولنے سے معاملہ خراب بھی ہو سکتا ہے۔ جو نقصان ہوا اور جس طرح چراغ دین کا قتل ہوا ہے، یہ بات بہت آگے تک بڑھے گی۔ اس لیے ابتدا ہی میں اگر غلطی ہو گئی تو کیس خراب ہو جائے گا۔ لہٰذا جو کچھ ہوا اور جیسے ہوا ہے وہ چھپانا نہیں۔ نہ ہی واقعے کو بڑھا چڑھا کر بتانے کی ضرورت ہے۔ ہم نے تمہارے چشم دید قصے پر ہی کیس کی بنیاد رکھنی ہے۔

نیاز حسین نے حقے کے دو تین کش لیے جس کا پانی کچھ ہی دیر پہلے تبدیل کیا تھا اور چلم میں نیا تمباکو ڈال کر اُس میں تازہ کوئلے رکھے گئے تھے۔ اُسے تمباکو کی کڑواہٹ ایک سرور سا دے گئی۔ مزید دھواں پھیپھڑوں میں لے جانے کے لیے اس نے دو تین کش مزید لے کر حقے کی نَے ایک طرف کر دی۔

بات بھائی جی یہ ہے، نیاز حسین نے واقعہ سنانا شروع کر دیا ”گیدڑوں اور سوئروں سے مونگی کی راکھی کے لیے مَیں اور چراغ دین روز کی طرح رات وہیں پر رُک گئے۔ سوئروں سے بچنے کے لیے کہ سوتے میں ہمیں پھاڑ ہی نہ کھائیں، چار بانس زمین میں گاڑ کر ہم نے اُس پر لکڑیاں باندھیں اور اُس کے اُوپر پرالی پھینک کر چھ فٹ اونچا چھپّر سا بنا لیا۔ اِس پر چڑھ کر رکھوالی کے لیے لیٹ جاتے۔ اِس میں ایک اور فائدہ بھی تھا کہ اونچا ہونے کی وجہ سے دور تک نظر جاتی تھی۔ میں پورے کھیت کا چکر لگا کر آ گیا تھا۔ پھر ریگلے سے دو تین پٹاخے بھی مار دیے کہ گیدڑ وِیدڑ بھاگ جائیں۔ رات کے دو پہر نکلے تھے۔ دُھند نے چاندنی ختم کر دی تھی۔ پٹاخے مار کر ابھی میں نے ریگلا چھپّر کے بانس کے ساتھ لگایا ہی تھا کہ دُور سے ہمیں کچھ کُھسر پھُسر سُنائی دی۔ یہ جانور نہیں تھے بلکہ انسانوں کی آوازیں تھیں۔ پہلے تو مجھے شک پڑا، کوئی راہ گیر ہیں مگر پھر جب تھوڑی ہی دیر بعد اندھا دُھند مونگی کے کھیت میں دبڑ دبڑ ہونے لگی تو میں نے کہا، چراغ دین دشمن آ گئے۔ اسی لمحے بے شمار قدموں کی آواز آنا بھی شروع ہو گئی۔ ایسے لگا مونگی میں درانتیاں چل رہی ہیں۔ ہم نے جلدی جلدی اپنی ڈانگوں پر چھویاں چڑھا لیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ منظر کچھ

واضح نہیں تھا۔ پھر بھی سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ بے شمار آدمی تھے۔ کچھ انھے مُنہ مُونگی کاٹ رہے تھے، کچھ مونگی کے گٹھڑ اُٹھا کر گڈوں پر لاد رہے تھے۔ ہم حیران کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ چراغ دین نے کہا، نیازے اِن کو للکار مار۔ سچی بات تو یہ ہے مجھے اتنے بندوں کو دیکھ کر حوصلہ نہ ہوا۔ مَیں نے کہا، بھائی چراغ دین ہم دو ٹیٹرو کیا کر لیں گے مگر وہ نہ مانا، کہنے لگا، نیازے یہ نہیں ہو سکتا۔ کل ہی ہمارا مالک فوت ہوا ہے اور آج اس کی فصل اُجڑ جائے ہماری آنکھوں کے سامنے، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ساری عمر شیر حیدر کا نمک کھایا ہے۔ میں تو انھیں جیتے جی مونگی نہ لے جانے دوں گا۔ کل کو لوگ کیا کہیں گے، دیکھو شیر حیدر کا عمر بھر کھاتے رہے، آج موقع آیا تو نمک حرامی کر دی۔ مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ کیا لوگوں کو بتائیں گے کہ ہم چوڑیاں پہن کے بیٹھے تھے؟

میں نے کہا، بھائی چراغ دین یہاں سوائے موت کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ یہ تو کوئی پچاس بندے ہیں۔ لیکن صاحب جی چراغ دین نہ مانا اُس نے سرہانے سے اپنا صافا اُٹھا کر اُسے کس کے سر پر باندھا، چھَوی چڑھی ہوئی ڈانگ پکڑی اور للکارتے ہوئے دشمنوں کی طرف چھلانگ مار دی۔ سردار غلام حیدر! میں سمجھ گیا تھا، چراغ دین کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ اُس نے میری ایک نہیں سُنی۔ جیسے ہی یہ بھاگ کر اُن کی طرف گیا، انہوں نے فوراً اُس پر بر چھیوں کا مینہ برسا دیا اور چراغ دین شوہدے پر لوہے کے پہاڑ گرنے لگے۔ بس ایک دو پَل میں ہی رَت کے پرنالے بہہ گئے۔ میرے تو ساہ سوکھ گئے اور میں بھاگ کے اُسی چھپّر کے نیچے پڑی چارپائی، جو اس لیے رکھی تھی کہ بارش وارش ہو تو چھپّر سے اُتر کر چارپائی پر لیٹ جائیں، مَیں اُسی کے نیچے چھپ گیا۔ کچھ اندھیرا اور کچھ دُھند، اس لیے میرا اُن کو کچھ پتا نہ چلا۔ بس میں خوف کے مارے چارپائی کے نیچے لیٹا ساہ دبائے اُن کے واہگرو اور ست سری اکال کے نعرے سنتا رہا۔ اسی طرح تین گھنٹے گزر گئے۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے مونگی کا اُجاڑا کرتے رہے اور گڈوں پر لادتے رہے۔ حتیٰ کہ صفایا کر کے چلتے بنے۔ میں گِن کے صحیح صحیح تو نہیں بتا سکتا مگر بیس چھکڑے ضرور تھے۔ اِدھر گڈے مونگی لے کر چلے، اُدھر میں چارپائی کے نیچے سے نکلا، بھاگ کر چراغ کے پاس آیا۔ بچارا اُلٹے مُنہ پڑا تھا۔ میں نے سیدھا کیا، دیکھا تو اُس کے ساہ پورے ہو چُکے تھے اور زمین پر خون کے ٹِکال جم گئے تھے۔ میں نے لاش کو ہاتھ نہیں لگایا اور فوراً چادر لپیٹ کر جودھا پور سے نکل پڑا۔ چوہدری صاحب، بھاگم بھاگ یہاں آ گیا۔ خدا گواہ ہے بارہ میل کی راہ میں سانس تک نہیں لی۔ جودھا پور کے یار محمد کو بتا آیا ہوں۔ وہ بندے لے کر لاش کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ایک بندہ تھانے اطلاع کے لیے بھیج دیا ہے۔ شاید پولیس بھی اب تک آ گئی ہو۔

نیاز حسین جیسے جیسے کہانی سناتا گیا، غلام حیدر کے چہرے کا رنگ کئی پرتوں میں بدلتا رہا اور شدید غصے سے کپکپاہٹ اس پر طاری ہوتی رہی۔ پھر ایک دم یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا، چاچا فیقے عصر تک یہ قل فاتحہ کو نپٹاؤ۔ اس سے زیادہ دیر نہ کرنا اُس کے بعد سودھا سنگھ کو ایک پیغام بھیج دو اور چراغ دین کے بچوں کے لیے پانچ سو روپیہ لیتے جاؤ۔ اُن کے سر پر ہاتھ رکھو۔ اِس طرح وارثوں کی ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ عصر کے فوراً بعد جودھا پور روانہ ہو جاؤ اور سب خبریں خود لے کر آؤ۔ میں تحصیل جا کر کمشنر صاحب سے بات کرتا ہوں۔

"سودھا سنگھ کو کیا پیغام دوں؟ رفیق پاولی نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا

یہی کہ سکھڑے اب واہگرو سے جو مدد مانگنا ہے مانگ لے کیونکہ موت اسے زیادہ مہلت نہیں دے گی۔ غلام حیدر نے غصے سے شدید نفرت پیدا کرتے ہوئے کہا، جیسے کہہ رہا ہو کہ میں تیرے واہگرو کو بھی دیکھ لوں گا۔

رفیق پاولی ایسی صورت حال میں جلد بازی کا قائل نہیں تھا۔ لیکن نیاز حسین نے میدان جنگ کا ایسا نقشہ کھینچا کہ غلام حیدر کے تیور جو تھوڑی دیر پہلے اعتدال پر تھے، بڑی حد تک بگڑ گئے۔ اس سے پہلے کہ رفیق غلام حیدر کو کچھ مشورہ دے وہ اٹھ کر جلدی سے حویلی کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں اس واقعے کی خبر مہمانوں سے لے کر گاؤں کے ہر چھوٹے بڑے کو ہو گئی۔ ماحول میں دوبارہ ایک ماتمی کیفیت کا احساس در آیا اور لوگ شیر حیدر کی داستانوں کو چھوڑ کر تازہ صورت حال پر تبصرے کرنے لگے۔ جس میں غلام حیدر کے رد عمل کا کوئی صحیح تعین نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ یہ طے تھا کہ حالات کسی بُری صورت کا رخ کرنے والے ہیں۔ ڈیوڑھی اور احاطے میں لوگوں کی تعداد، جو پہلے ہی کم نہ تھی، بڑھ کر دگنی ہو گئی۔ باتیں اس تسلسل میں گونجنے لگیں جیسے شہد کی مکھیوں کے غول اُڑ کر نکلے جا رہے ہوں اور ہر کام میں بے چینی در آئی۔ وہ تو خیر ہوئی چراغ دین کی لاش جودھا پور ہی میں تھی ورنہ وہ بھی سارے کا سارا گاؤں یہیں آ پڑتا۔ حویلی کے ہر کام میں ایک پُراسرار وحشت پیدا ہو گئی۔ نوکروں سے لے کر متعلقین تک کے قدموں میں بوجھل پن کی کیفیت تھی، جو اُن کے دلوں پر وزن بڑھا رہی تھی۔ خاص رفیق پاولی کی ذہنی حالت بہت تذبذب میں تھی۔ شیر حیدر کے ہوتے ہوئے اُسے اطمینان ہوتا کہ مشورے میں کجی بھی ہوئی تو فکر کی بات نہیں۔ کام غلط ہو جانے پر شیر حیدر سنبھال سکتا ہے مگر غلام حیدر کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ ابھی ان معاملات میں بالکل کورا تھا۔ اِس لیے رفیق پاولی کو اب اپنے کسی فیصلے پر اعتماد نہ تھا۔ شاید کچھ دن بعد وہ اعتماد لوٹ آتا مگر یہاں تو سر منڈلاتے ہی اولے پڑنے والی بات تھی۔ اِدھر وقت گزرنے

کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ رفیق پاولی کی نظر دیوار کے سائے پر تھی، جو صدیوں سے رُکا کھڑا تھا۔ وہ سر جھکائے اسی سوچ میں غرق تھا کہ آخر اچانک سودھا سنگھ کو کیا سوجھی؟ کچھ دم بھی نہ لینے دیا۔ اُسے اس قدر فکر مندی میں دیکھ کر نیاز حسین نے کہا فیقے بھائی آخر کیا ہوا؟ حوصلہ کر، ہمارے سر پر ابھی غُلام حیدر رہے نا۔ کیا ہوا جو شیر حیدر زندہ نہیں۔ غلام حیدر بھی تو اُسی کا بیٹا ہے۔ دیکھ لینا، سکھڑوں کو کیسا سبق دیتا ہے؟

نیاز حسین کی بات سُن کر رفیق پاولی نے سر اُوپر اٹھایا اور بولا نیاجے، تو نہیں جانتا، اب بات یہاں رُکنے والی نہیں ہے۔ یہ تو سودھا سنگھ نے ابھی للکار دی ہے۔ مَیں جانتا ہوں، اُس کے سینے میں کتنا کینہ بھرا ہوا ہے۔ اُسے دیکھ کر پتا نہیں کون کون سے سنپولیے سِریاں نکال لیں گے۔ مجھے تو غلام حیدر کی زندگی کی فکر پڑ گئی ہے۔ اتنا کہہ کر رفیق پاوٗلی اٹھ کھڑا ہوا اور جانی چھینبے کو پاس بُلا کر سارا پروگرام سمجھا دیا کہ پگ بندی کے بعد انھیں جودھا پور جانا ہے اس لیے وہ تیاری کر لیں۔

نیاز حسین نے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا فیقے ہمت کر ہم تیرے پیچھے ہیں۔ جو گزرے گی، مولا کے سہارے بھگتیں گے۔

اِسی عالم میں دو بج گئے۔ صحن میں دور تک دریاں اور چاندیاں بچھ گئیں۔ ختم نیاز کے لیے پھل اور چاولوں کی پراتیں الگ تھیں۔ جنھیں کاڑھے ہوئے ریشمی غلافوں سے ڈھانک دیا گیا۔ مولوی صاحب بھی آ چکے تھے۔ غلام حیدر سامنے بیٹھ گیا تو مولوی نے سورہ الحمد سے تلاوت شروع کی۔ تمام خلقت جو کم سے کم چھ سو کے لگ بھگ تھی، چاندنیوں پر بیٹھ گئی۔ آیات کی تلاوت نے پوری خلقت اور خاص کر غلام حیدر کے دل میں سوز کی کیفیت پیدا کر دی۔ قرأت کچھ اِس ملائمت سے جاری تھی کہ فی الوقت تکدّر دُور ہو گیا۔ غلام حیدر سمیت تمام لوگ تازہ حادثے کو بھول گئے اور طبیعتوں میں ٹھہراؤ سا آ گیا۔ اسی عالم میں شام کے تین بج گئے۔ غلام حیدر کے سر پر پگڑی باندھ دی گئی۔ رعایا اور رشتے داروں نے آگے بڑھ کر وفاداری کے حلف دیے۔ رفیق پاولی اس سارے عمل کے دوران سر خوشی کے عالم میں کھڑا تھا۔ دوسری طرف لوگ نیاز کھانے میں مصروف تھے، جو کئی دیگوں پر مشتمل تھی۔ چار بجے غلام حیدر اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے دلاور کے ساتھ صبح ہی شاہ دین کو تھانہ گروہر سا رپورٹ درج کروانے بھیج دیا تھا۔ لیکن یہ محض سرسری قانونی خانہ پری تھی جو غیر اہم ہونے کے ساتھ اہم بھی تھی۔

چار بجے ٹھیک رفیق پاولی شیدے، جانی چھینبے، سلام علی اور گامے کے ساتھ جودھاپور روانہ ہو گیا تاکہ معاملے کی پوری جانچ لے کر آئے اور چراغ دین کی بیوی کو غلام حیدر کی طرف سے پُرسہ بھی دے۔ اِدھر رفیق جودھاپور کی طرف روانہ ہوا، اُدھر غلام حیدر زنانے میں چلا گیا کیونکہ پانچ بج چکے تھے اور یہ تحصیل کا دفتری وقت نہیں تھا۔ اس کے علاوہ سارے دن کی کلکلِ اور شور شرابے سے دماغ بھی بوجھل ہو چکا تھا اور اب نیند کے جھولے آنے شروع ہو گئے تھے۔ اس لیے تحصیل جانے کا پروگرام کل پر ملتوی کر دیا گیا۔

یہ خبر غلام حیدر کو آج ہوئی کہ چودھراہٹیں کرنی کتنی مشکل ہیں۔ غلام حیدر گھر میں داخل ہوا تو رونے والیوں کا شور ایک دم بڑھ گیا۔ پہلے جو عورتیں غلام حیدر کی والدہ فاطمہ بانو کے گرد جمگھٹا کیے بیٹھی تھیں، اُٹھ کر غلام حیدر کے چوفیرے ہو گئیں۔ کوئی اُسے رو کر دِکھانے لگی، کوئی سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ کچھ ادھیڑ عمر اور بوڑھی عورتیں گلے لگ کر روئیں۔ عورتوں سے فارغ ہو کر وہ بڑی مشکل سے اپنی ماں کے پاس پہنچا، جو سفید چاندنی کے فرش پر سرتاپا سفید لباس میں سوگوار بیٹھی تھی۔ غلام حیدر ماں کے پاس بیٹھا تو وہ بھی بیٹے کے گلے لگ کے رونے لگی۔ لیکن یہ رونا دھونا چند ہی منٹ جاری رہا کیونکہ شیر حیدر کو فوت ہوئے آج تین روز ہو چکے تھے جس میں بہت کچھ غم ہلکا ہو گیا تھا۔ دوم بے شمار عورتوں کی مسلسل تعزیت اور پُرسہ داری نے فاطمہ بانو کو بھی تھکا دیا تھا۔ چنانچہ غلام حیدر چند منٹ بیٹھنے کے بعد سونے کے کمرے میں آ گیا۔

اگلے دن صبح چھ بجے غلام حیدر کی آنکھ کھلی۔ وہ نہا دھو کر باہر نکلا تو طبیعت بحال ہو چکی تھی۔ حویلی میں مہمان کچھ آگ کے گرد بیٹھے حقہ پی رہے تھے، کچھ چائے کی پیالیوں سے چسکیاں لے رہے تھے۔ غلام حیدر کو دیکھ کر سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ کر سلام کرنے لگے۔ فیقا ابھی تک نظر نہیں آیا تھا۔ غالباً وہ جودھاپور سے ابھی نہیں لوٹا تھا۔ غلام حیدر نے ملازم سے کہا، چارپائی آگ کے پاس لے آئے جہاں لوگ حقہ پینے میں مصروف تھے۔ تھوڑی دیر میں غلام حیدر سب کے ساتھ گھل مل گیا اور سانحات کو بھول کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ جبکہ دوسرے آدمی اُسے اُس کے باپ کے واقعات سنانے لگے حتیٰ کہ آٹھ بج گئے اور فیقا اپنے ساتھیوں سمیت حویلی میں داخل ہوا۔ اس کے بعد وہ، رفیق پاولی اور چھ سات خاص بندوں کو لے کر دوسرے کونے میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگا۔ تمام لوگ رفیق پاولی کے گرد جمع ہو گئے۔ ہر آدمی واقعے کو پہلے سے ہی جانتا تھا مگر رفیق پاولی کی حیثیت زیادہ معتبر تھی۔ اس

لیے لوگ مزید نئی خبر کی توقع رکھتے تھے، جو رفیق اُن کے خیال میں ہر حالت میں لے کر آیا ہو گا۔ جب ہجوم بہت زیادہ اُن کے گرد اکٹھا ہو گیا تو رفیق پاولی نے سب کو جھڑک کر پیچھے کر دیا۔

کوئلوں پر ہاتھ تاپتے ہوئے رفیق نے حقے کا کش لیا اور بولا، سردار غلام حیدر ایک بات تو طے ہے کہ حملہ سودھا سنگھ کے آدمیوں ہی نے کیا ہے اور چھپ چھپا کر نہیں، کھلے عام کیا ہے۔ اتنے زیادہ چھکڑے اور آدمی، سب کے کُھرے جھنڈو والا کی طرف جاتے ہیں۔ میں نے کھیم نگر سے کھوجی بھی ساتھ لے لیے تھے۔ ہر ایک نے غور سے اور جانچ کر کے یہی نتیجہ نکالا کہ اِس کا ذِمہ دار سودھا سنگھ ہے۔ چار بندوں کے پیروں کے نشان تو کھوجیوں نے پہچان بھی لیے، جو کئی جگہ چوری چکاری میں پکڑے گئے تھے۔ وہ خاص سودھا سنگھ کے ہی بندے ہیں۔ دتّا سنگھ، ہاسو وٹو، رنگا اور متھا سنگھ۔ متھا سنگھ مَنّا پروَنّا بدمعاش ہے، جس کے کُھرے کھوجی نہیں بھول سکتے۔ یہ خاص سودھا سنگھ کا بندہ، علاقے کا سب سے بڑا غنڈہ ہے۔ پولیس اس پر ہاتھ ڈالنے سے ڈرتی ہے۔ سودھا سنگھ ہر مشکل کام اسی سے لیتا ہے۔ سُنا ہے کئی بندوں کا قاتل ہے۔ ڈانگ سوٹے اور کرپان چلانے کا اتنا ماہر کہ اکیلے ہی دس دس بندوں کو پھڑکا کر کے صاف نکل جاتا ہے۔ باقی کے تین بھی بہت خطرناک ہیں۔ سودھا سنگھ کسی کو سٹ پھینٹ بھی انہی سے لگواتا ہے اور تھانے کچہری میں اُن کے پیچھے امداد بھی اِسی کی ہوتی ہے۔ باقی تین میں رنگا سب سے خطرناک ہے۔ سٹ مارنے میں ڈھیل نہیں کرتا۔ کھوجی اس کے قدموں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ اگر مزید پوچھ گچھ کرنی ہو تو میں اُنھیں ساتھ ہی لے آیا ہوں۔ ڈیوڑھی میں بیٹھے ناشتہ کر رہے ہیں۔ چاچا رفیق تم بھی ناشتہ کر لو" غلام حیدر نے اٹھتے ہوئے کہا" تھوڑی دیر آرام کر و پھر ہم نے تحصیل جا کر اسسٹنٹ کمشنر سے ملاقات کرنی ہے۔ سنا ہے، کچھ ہی دن پہلے ایک اسسٹنٹ کمشنر نیا نیا آیا ہے۔ میرا خیال ہے، ابھی اُس کے کسی سے تعلقات نہیں ہوں گے۔ ہمیں ٹھیک دس بجے تحصیل پہنچ جانا چاہیے۔ یہ کہہ کر غلام حیدر اٹھ کر حویلی کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔

دس بجے تین بگھیوں کے ساتھ مزید پانچ گھوڑوں پر سوار یہ قافلہ جلال آباد تحصیل کمپلیکس کی طرف چل دیا۔ غلام حیدر کے پاس بندوق تھی۔ باقی سب کے پاس ڈانگوں کا اسلحہ وافر تھا۔ برچھیاں اور کُلہاڑیاں البتہ ساتھ نہ رکھ سکتے تھے کہ اُن ہتھیاروں کی ابھی تک کھلی اجازت نہیں تھی اور تحصیل کچہری میں تو بالکل بھی نہیں تھی۔ قافلہ جیسے ہی تحصیل کی طرف روانہ ہوا، ہر طرف جوش و خروش کی لہر پھیل گئی۔ گاؤں والے گویا اپنی یتیمی کے احساس کو نئے

طاقت ور مالک کی آمد کے احساس میں دبا چکے تھے۔ وہ اس شان و شوکت کی سواری کو حویلی سے نکلتے دیکھ کر اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کرنے لگے اور شیر حیدر کے دکھ کو فی الحال بھول سے گئے۔

جاری ہے

قسط نمبر 3

(6)

سر چھوٹے چوہدری صاحب حاضر ہونا چاہتے ہیں۔" نجیب شاہ نے گول شیشوں کی عینک پاجامے سے رگڑتے ہوئے "ولیم کو مطلع کیا

ولیم کی آنکھیں نجیب شاہ کی عینک کے فریم پر جم گئیں جس کی ناک اور کانوں والی جگہ پر کپڑے کی دھجیاں لپیٹ رکھی تھیں۔اُن دھجیوں کو مَیل کی ایک دبیز تہہ نے مضبوطی سے جکڑ لیا تھا۔ولیم کو اس طرح کی عینکوں سے سخت چڑ تھی مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کم و بیش پندرہ بیس سال کے پرانے کلرکوں کے حُلیے اور عینکیں ایک ہی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔آدھے سر سے گنجے، توند نکلی ہوئی، عینک کے شیشے موٹے اور دھندلائے ہوئے، کان لمبے، زیادہ تر نیچے کی طرف لٹکے ہوئے۔چہرے کا ماس مسلسل اُسترے کے استعمال کی وجہ سے کراہت کی حد تک بے رونق اور بے جان جھُریوں میں تبدیل ہوا اور نتھنوں سے باہر نکلے ہوئے غلیظ بال۔اکثر فائلوں کے کیڑے مگر ان کا مطالعہ ہمیشہ عینک کے شیشوں سے اوپر کی طرف سے کرتے ہیں۔کند ذہن اور پرلے درجے کے کمینے۔کام روکے رکھنے کے ماہر اور صاحب بہادروں سے زیادہ چھوٹے اور بڑے چوہدریوں کے وفادار۔لیکن وہ اُن کی یہ ہیئت اور عادات بدلنے پر قادر بھی نہیں تھا۔اُسے اِن کو اِسی حالت میں برداشت کرنا تھا۔مگر اِس طرح بھی نہیں کہ اُنھیں اُن کی عادات کا، جو پختہ ہو چکی تھیں احساس بھی نہ دِلایا جائے۔ولیم نے فیصلہ کر لیا کہ وہ حتی الامکان اِنھیں اِس بدہیتی کا احساس دلاتا رہے گا۔

مسٹر نجیب میں نہیں جانتا، جلال آباد میں کون چھوٹے اور کون بڑے چوہدری ہیں۔میرے باپ نے میرا نام اِس لیے رکھا تھا کہ پہچاننے میں آسانی رہے، ولیم نے صاف لہجے میں کہا۔

سر وہ شیر حیدر کا بیٹا غلام حیدر" نجیب شاہ اپنے ہاتھوں کی لرزش کو چھپانے کے لیے اُنھیں پاجامے پر رگڑنے لگا' سرکار سے ملاقات کے لیے آیا ہے۔میں نے آج صبح آٹھ بجے ہی آپ سے اُس کے لیے ملاقات کا وقت لیا تھا سر۔

ٹھیک ہے انھیں بلا لو" ولیم نے نہایت بے پروائی سے جواب دیا" لیکن جیسے ہی نجیب شاہ واپس ہوا، ولیم نے کہا، اپنی عینک اور ہاتھوں کا پسینہ اندر آنے سے پہلے صاف کر لیا کرو چاہے اپنے پاجامے سے ہی۔

نجیب شاہ ولیم کے اس رویے سے بہت دل برداشتہ ہوا، مگر کیا کر سکتا تھا، فقط بے دلانہ سی مسکراہٹ دے کر باہر نکل گیا۔

ولیم نجیب شاہ کا مذاق اُڑانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اصل میں ولیم کو غصہ تو جلال آباد پوسٹنگ پر تھا، جس پر وہ ذرا خوش نہیں تھا۔ مگر اپنی بے بسی کا بدلہ اُس عملے سے پوری طرح چکانا چاہتا تھا جو سال ہا سال سے انہی بوسیدہ فائلوں میں گھِس گھِس کر بوڑھے ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ آفس کی ہر چیز سے ایسی وحشت ٹپکتی تھی، جسے دیکھ کر ولیم کو گھِن آنے لگی۔ میزیں، کرسیاں، قلم دان، پردے حتیٰ کہ دروازوں کی کیلیں تک زنگ آلودہو چکی تھیں۔ جنھیں آتے ہی اُس نے بدل دینے کا مکمل ارادہ کر لیا۔ مگر وہ اِن کلرکوں کا کیا کرتا، جن کے چہروں پر آفس کی کھڑکیوں سے زیادہ جالے پڑے تھے۔ وہ یہاں کچھ نیا نیا دیکھنا چاہتا تھا۔

پچھلے ڈیڑھ مہینے میں اُسے کسی شادابی کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ مسلسل چھوٹے بڑے چوہدریوں، جمعداروں اور ذیلداروں کی ملاقاتیں اور ان کی بیہودہ گفتگوئیں محض بیزاری میں اضافہ کرتی چلی جاتی تھیں، جو بغیر کسی کام کے اپنی مونچھوں کی چوڑائی اور پگڑیوں کا کلف دکھانے چلے آتے لیکن اُسے یہ سب خوشدلی سے برداشت کرنا تھا۔ کیونکہ اُس کی اِسی کارکردگی میں افسرانِ بالا کے لیے اطمینان تھا۔ مگر اِس سب کے باوجود ولیم نے اپنے ذہن میں ایک فیصلہ کر لیا کہ وہ کچھ اپنے اصول اور ضابطے الگ سے بنائے گا چاہے وہ ضابطے انگریزی حکومت کو خوش نہ بھی آئیں۔ اُسے لمبی اور گھنی داڑھیوں سے آنے والی چھاچھ کی بُو بہت ناگوار محسوس ہوتی اور اُس سے بھی بڑھ کر اُن کی بغلوں کے نیچے سے کپڑے کی تہہ پر جما ہوا گاڑھا زرد پسینہ اکثر اُبکائی کا باعث بنتا۔

اُس کے ساتھ ساتھ ولیم نے تحصیل کے کام پر تیزی سے توجہ دینا شروع کر دی اور آتے ہی تیسرے دن تمام نہری پٹواریوں اور زمینداروں کی میٹنگ بلوا کر اُنھیں باغات اور شجر کاری کے احکامات جاری کر دیے تھے۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اول تو یہ لوگ گندم کی سالانہ کاشت کے سوا کچھ کرنا نہیں چاہیں گے اور اگر کسی طرح اس پر سختی سے عمل شروع بھی ہوا تو ہزار ہا عذر کے پنڈورے کھل جائیں گے اور اس عرصے میں اس کی نئی پوسٹنگ کے آرڈر آ جائیں گے۔ پھر بھی اُس نے اپنی سی کوشش کرنے کا پورا ارادہ کر لیا تھا کہ جیسے بھی ہو، وہ جلال آباد میں اڑتے ہوئے بگولوں اور پھیلتی ہوئی ویرانی کو چھتنار درختوں کی چادروں سے کچھ نہ کچھ ڈھکنے کی کوشش کرے گا۔ اِسی منصوبے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جو بھی چوہدری یا سردار اُسے ملنے کے لیے آ رہا تھا، ولیم اُسے دبے لفظوں میں یہ بات

جتائے دے رہا تھا کہ اس کی خوشنودی چوہدری صاحب کو باغات لگانے کی صورت میں حاصل ہو جائے گی ورنہ صاحب بہادری اور سرداری میں فاصلہ برقرار رہے گا۔

غلام حیدر کمرے میں داخل ہوا تو ایک دفعہ ٹھٹھک سا گیا۔ یہ تو کوئی بالکل لڑکا سا اسسٹنٹ کمشنر ہو کر آگیا تھا۔ جو ایک سنہری حسن کا رچاؤ اور خودداری کی ملی جلی کیفیت ولیم میں نظر آ رہی تھی، غلام حیدر کو اپنے آپ میں کم محسوس ہوئی۔ اِدھر کم و بیش ولیم میں بھی تحیر کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ اُسے اُمید نہیں تھی کہ یہ چھوٹا چوہدری اِس قدر نفیس ہو گا۔ یہ تو شکل سے پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔ سفید بوسکی کی قمیض اور لٹھے کی تنگ گھیرے والی شلوار، پاؤں میں کُھسے کی بجائے کلکتہ شُو کمپنی کے لیدر والے بند جوتے، نہ سر پہ پگڑی نہ کاندھے پہ صافہ۔ ولیم نے سوچا، یہ تو بالکل اُلٹ ہوا۔ اُسے اِس طرح کے چھوٹے چوہدری سے پہلا واسطہ پڑا تھا، جس کے لباس کی وضع قطع سے لے کر کمرے میں داخل ہونے کے عمل تک میں نفاست کا طور موجود تھا۔ ولیم کو جب اپنے قائم کردہ تصور کے ٹوٹنے کا صدمہ ہوا تو اُس نے احتجاجاً غلام حیدر کے ساتھ وہی سلوک کرنے کا فیصلہ کر لیا جو وہ پہلے سوچے بیٹھا تھا، اس کا پہلا اظہار اُس نے یہ کیا کہ کرسی سے اُٹھے بغیر ہی بے دلی سے مصافحے کو ہاتھ بڑھا دیا، جسے دیکھ کر غلام حیدر کو تعجب تو ہوا مگر فی الحال وہ اُسے نظرانداز کر گیا۔

مسٹر حیدر تشریف رکھیں، میز کی دوسری طرف سے ولیم نے سامنے کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ میز اتنی لمبی اور چوڑی تھی جس کے درمیان میں پڑا گلوب اور میز پر بچھا برطانوی سلطنت کا وسیع و عریض نقشہ اُس کی لمبائی چوڑائی میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ اُس کی وجہ سے اسسٹنٹ کمشنر اور میز کی دوسری طرف بیٹھے مقامی چوہدری کا فاصلہ مزید بڑھ جاتا تھا۔

شکریہ جناب! غلام حیدر نے کرسی پر تسلی سے بیٹھ کر اپنے کُرتے کو زانوؤں پر درست کیا۔ سر کیسا لگا آپ کو جلال آباد؟ سنا ہے آپ کو یہاں آئے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ہے۔

مسٹر حیدر مجھے یہاں آئے ایک دن بھی ہوا ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، ولیم اُسی بے نیازی سے مخاطب ہوا، کوئی اپنے گھر میں پہلی دفعہ جا کر بھی گھر سے اجنبی نہیں ہوتا۔ وہ اُس کا مالک ہوتا ہے۔ نیا نہیں ہوتا۔

چھوڑیے سر آپ تو غصہ کر بیٹھے، غلام حیدر نے اپنے پہلے سوال کی سُبکی پر شرمسار ہوتے ہوئے کہا، میں تو آپ سے یہ بات رسمی طور پر پوچھ بیٹھا۔

حیدر، اگر مقابل والا آدمی ہم پایہ ہو تو ایسے جملے رسماً پوچھنے میں کوئی حرج نہیں۔ خیر مجھے اپنے فرائض کے سلسلے میں رہنا ہے۔ اس میں اچھے بُرے کو دخل نہیں، ولیم نے اپنے وقار پر سمجھوتا کیے بغیر جواب دیا۔

نہیں۔

ولیم کے "ہم پایہ" والے جملے سے غلام حیدر کا موڈ بالکل خراب ہو گیا تھا۔ غلام حیدر کو ولیم کے رویے کی آنچ نے فاصلے کی حد سمجھا دی اس لیے وہ بات کو اپنے مقصد کی طرف گریز دیتے ہوئے بولا، صاحب، تین دن پہلے میرا باپ فوت ہوا ہے کل چار بجے اس کا

آپ کے باپ کے مرنے کا افسوس ہوا لیکن حکومت سے اس معاملے میں آپ کو کیا شکایت ہو سکتی ہے؟ یقیناً اس میں میرا دخل نہیں اور میں اُن کو جانتا بھی نہیں تھا، ولیم نے لاپرواہی میں ایک اور گھاؤ لگا دیا

کمشنر صاحب یہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آپ کو نہیں جانتے مگر آج اگر آپ مر جائیں تو ان میں سے اکثر کے لیے آپ کو جاننا ضروری ہو جائے گا، غلام حیدر نے اب حالات کی بالکل پروا کیے بغیر ایک ایسا طنز کا نشتر رکھا جس کی چُبھن ولیم نے دل تک محسوس کی لیکن غلام حیدر نے اپنی بات جاری رکھی، رات تین بجے میرا ملازم چراغ دین قتل کر کے بیس ایکڑ مونگی کی فصل لوٹ لی گئی۔ غالباً جودھا پور کا یہ سنگیں واقعہ جلال آباد میں آپ کی پوسٹنگ کا مجھے پہلا تحفہ ہے۔ اگرچہ اس میں بھی آپ کا دخل نہیں مگر اس کے متعلق جاننا آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔ جودھا پور میرے باپ شیر حیدر کا گاؤں ہے جو تین دن پہلے فوت ہو گیا۔ جسے آپ نہیں جانتے اور اُس کے فوت ہونے کے تیسرے ہی دن یہ واقعہ پیش آ گیا۔

ولیم کو آج صبح یہ اطلاع مل چکی تھی لیکن نہ جانے کس نیم خوابی میں اُس نے یہ اطلاع سنی تھی کہ وہ بھول گیا تھا۔ حالانکہ اُسے اُس کے متعلق جلد ہی کچھ ہدایات دینا تھی، جو وہ ابھی تک نہ دے سکا تھا۔ اب اُسے یاد آیا کہ نجیب شاہ نے غلام حیدر کی ملاقات کا جب ذکر کیا تھا تو اِس واقعے کو منسلک کر کے بات کی تھی۔ ولیم نے غلام حیدر کے ساتھ آتے ہی سرد مہری کا رویہ اختیار کیا تو یہ ایک سخت غلطی تھی مگر کیا کیا جائے، تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب کسی بھی قسم کی معذرت یا وضاحت حکومت کے وقار کے خلاف تھی۔ اس لیے ولیم اسی بے نیازی کو اختیار کرنے پر مجبور تھا۔ حالانکہ دل میں اب وہ پوری طرح معاملے کی نزاکت کو سمجھ چکا تھا۔

مجھے آج صبح اطلاع مل چکی ہے۔ آپ اس معاملے میں بے فکر ہو جائیں۔ مَیں ابھی پولیس کو ضروری احکام جاری کر دوں گا۔ گورنمنٹ پورا انصاف برتے گی۔ حیدر صاحب، آپ جتنی جلدی ہو سکے، ایف آئی آر درج کروائیں۔ مَیں اس کیس کو اپنی نگرانی میں دیکھوں گا، ولیم نے معاملے کو جلدی قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
سَر اب میرا اِس کمرے میں شاید مزید کام نہیں رہ گیا'' غلام حیدر نے اُٹھ کر اپنی بوسکی کی قمیض کو درست کیا اور مصافحہ کو ہاتھ بڑھا دیا۔

ولیم کے لیے غلام حیدر کا یہ رویہ قطعاً غیر یقینی تھا۔ اُسے یہ احساس نہیں تھا کہ دیسی لوگوں میں بھی اچانک کچھ ایسے نکل آئیں گے، جن کے لہجے میں فولاد کی سختی اور سردی موجود ہو گی۔ پچھلے ڈیڑھ مہینے تک اُسے ایسے کسی شخص کا سامنا نہیں ہوا تھا اور نہ ہی بچپن میں ایسا واقعہ رونما ہوا جس میں اُس نے دیسی لوگوں کی خوشامدانہ عادات کے علاوہ کوئی عادت دیکھی ہو۔ غلام حیدر سے اس سرسری ملاقات کے بعد اُسے فوراً ہیلے کی وہ نصیحت یاد آگئی کہ اِن کے سینگوں سے ہمیشہ دُور رہنا۔ اُسے یہ سوچ کر جُھر جُھری سی آگئی۔ اِسی کے ساتھ ولیم نے عارضی طور پر غلام حیدر کے بارے میں یہ تصور بھی کر لیا کہ بہر حال یہ ابھی لڑکا ہے۔ جیسے جیسے سر پر ذمہ داریاں پڑیں گی اور عمر زیادہ ہوتی جائے گی، ویسے ویسے یہ بھی دوسرے چوہدریوں کی طرح ٹھنڈا ہوتا جائے گا۔ انھی خیالات کی رَو میں تھا کہ اُسے احساس ہوا، وہ کمرے میں اکیلا ہے۔ وہ کرسی سے اُٹھا اور کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ گفتگو انتہائی سرد مہری میں ہوئی تھی۔ جس کا اثر ولیم پر گہرا ہو رہا تھا۔ جس کی وجہ سے غلام حیدر کے لیے اُس کا احساسِ ہمدردی جاگنے لگا۔ یہ اِس لیے نہیں تھا کہ ولیم غلام حیدر سے ڈر گیا ہو یا کسی طرح کا لالچ شامل ہو بلکہ اِسے ولیم کی شرافت کہہ سکتے ہیں۔ انگریز میں چاپلوسی کو دخل تو ہے لیکن بات مختصر اور صاف ہو تو انگریز اپنی توہین کو ثانوی حیثیت دینے میں وقت نہیں لیتا۔ یہی اس وقت ہوا تھا۔

غلام حیدر کے جانے کے کچھ دیر بعد ولیم نے نجیب شاہ کو کمرے میں طلب کر لیا۔ اِس بار وہ عینک کی صفائی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اور ولیم کو یہ بات اچھی لگی۔ وہ پچھلی سرزنش جلد بھول جانے کا عادی نہیں تھا۔ یہی بات نجیب شاہ اور ولیم دونوں کے لیے بہتر تھی۔ نجیب شاہ نوٹ بک اور قلم لے کر میز کے دائیں پہلو کھڑا ہو گیا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا، ولیم اُسے کمرے میں بلا کر جان بوجھ کر نظر انداز کر رہا ہے۔ اس دوران اُس نے اپنے تیس فٹ لمبے اور بیس فٹ کھلے کمرے میں شرقاً غرباً پانچ چکر لگا لیے۔ بالآخر اِسی رفتار میں چلتے ہوئے بولا، نجیب شاہ مجھے غلام حیدر کے بار

ے میں کل تک پوری معلومات مل جائیں۔اِس کے علاوہ علاقے کے تھانیدار کو جلدی بلواؤ،ڈی ایس پی صاحب میرا خیال ہے، چھٹی پر ہے۔اُس کی غیر حاضری میں یہ معاملہ بگڑ نہ جائے۔میں اس معاملے میں دیر نہیں چاہتا۔
نجیب شاہ پر جو کچھ ولیم کا دبدبہ قائم ہو چکا تھا،اُس کے پیشِ نظر یہ قطعی تھا کہ اس سلسلے میں کوتاہی نہیں کرے گا۔

(7)

بگھیاں جو نہی جودھاپور پہنچیں،بڑوں چھوٹوں کی ٹولیاں بندھ بندھ کر اکٹھی ہونے لگیں۔یہ گاؤں بمشکل تین سو افراد کی آبادی پر مشتمل تھا، جو غلام حیدر کی ماں کو اپنے باپ کی وراثت میں ملا تھا۔دس بیس گھروں کو چھوڑ کر باقی آبادی غلام حیدر کی رعایا تھی۔کہنے کو تو یہ گاؤں تھا مگر اصل میں ساری آبادی چھوٹے موٹے کچے گھروں کا جمگھٹا سا تھی۔ لوگوں کی معاشی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ مکمل اور آزادانہ زندگی گزار سکتے اور عمدہ مکان بنا لیتے۔مگر یہ ضرور تھا کہ سارا گاؤں دو وقت کی روٹی آسانی سے کھا سکتا تھا۔جتنے لوگ یہاں رہتے تھے، سب کو شیر حیدر نے اپنا رقبہ برابر بانٹ رکھا تھا۔جسے وہ کاشت کرتے اور مالکانہ کا تیسرا حصہ شیر حیدر کو پہنچا دیتے۔کسی کو مجبوری پڑ جاتی اور وہ نہ دے سکتا تو شیر حیدر زیادہ سختی نہ کرتا۔مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ ہر ایک اپنی مرضی کرے۔منشی پورا حساب رکھتا تھا۔جس کے سامنے کوئی دو نمبری کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔
گاؤں کی گلیاں بہت تنگ تھیں، جو کچی ہونے کے ساتھ ساتھ کہیں کھائی اور کہیں سے ٹیلے کی طرح تھیں۔ویسے بھی گلیوں کی کوخاص ترتیب نہیں تھی۔اِدھر اُدھر مڑتی ہوئی بھول بھلیوں کی سی شکل اختیار کر لیتیں۔بارش کے وقت جن میں گزرنا ایک ناممکن سا عمل ہوتا۔البتہ ہر گھر میں ایک آدھ درخت ضرور تھا۔جن میں زیادہ تعداد لسوڑوں کی تھی۔گلیاں اتنی تنگ تھیں کہ اُن میں کسی درخت کا ہونا مشکل تھا۔البتہ پورا گاؤں ٹاہلیوں کے جنگل کے درمیان گھرا تھا، جن کے نیچے گاؤں والے مال مویشی اور بھیڑ بکریاں باندھ لیتے۔اِکا دُکا گدھے بھی تھے۔اُن پر چارا لاد کر لایا جاتا۔گاؤں کی واحد سہولت وہاں کی چھوٹی سی مسجد تھی، جہاں بچوں کو قاعدہ سپارہ پڑھا دیا جاتا۔اس کے علاوہ نہ کوئی مدرسہ نہ سکول اور نہ ماسٹر تھا۔تھانے کچہری میں آج تک انھیں نہ کام پڑا تھا، نہ وہ گئے۔اگر چھوٹا موٹا جھگڑا ہو بھی جاتا تو اس کا فیصلہ شیر حیدر کر دیا کرتا کہ سب کو اُس کا منظور کرنا لازمی ٹھہر جاتا۔مگر اس بار چراغ دین کے قتل اور بیس ایکڑ مونگی کی فصل کی بربادی نے پورے گاؤں کو ہراساں کر دیا تھا۔ہر طرف ایک خاموشی طاری تھی۔شیر حیدر زندہ نہیں تھا اور غلام حیدر سے یہ لوگ کچھ زیادہ واقف نہیں تھے۔چنانچہ اپنے آپ کو تنہا اور

لاوارث سا محسوس کرنے لگے۔ چراغ دین کے قتل کو آج چوتھا دن تھا۔ تھانیدار موقع واردات اور باقی تفصیلات کا جائزہ لے کر اُسی دن چلا گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے بیانات بھی دے دیے تھے لیکن ابھی تک کسی کو تسلی نہیں تھی کہ اِس ظلم کا کوئی جواب دیا جا سکے گا۔ لوگ اس لیے بھی ڈرے ہوئے تھے کہ سب کو سودھا سنگھ کی طاقت اور بدمعاشی کا علم تھا۔ اب ہر ایک نے غلام حیدر کو وہاں آئے دیکھا تو اُن کی جان میں ایک قسم کا دم آیا کہ وہ کسی اپنے کے پاس کھڑے ہیں۔ خاص کر جب لوگوں نے غلام حیدر کے کاندھے پر لٹکتی رائفل کو دیکھا تو انھیں بہت ہی حوصلہ ہوا کیونکہ ابھی تک دُور دُور کسی سردار کے پاس ریفل نہیں تھی۔ غلام حیدر کے ساتھ چھوّیوں اور برچھیوں سے لیس جوان بھی رعب اور دبدبے میں کم نہیں تھے مگر رائفل کی اپنی ہی شان تھی۔

لوگوں نے چارپائیاں جلدی سے نکال کر چوک میں مسجد کے سامنے ہی بچھا دیں۔ اس گاؤں میں بھی غلام حیدر کی اپنی چھوٹی سی حویلی تھی، جس میں ایک دو ملازم اور منشی الہ دُاد نے رہائش رکھی ہوئی تھی۔ وہ جودھاپور کی فصلوں کا حساب کتاب کرتا۔ غلام حیدر نے اپنی حویلی تک جانے کی بجائے چوک ہی میں بیٹھنے کو ترجیح دی لیکن اُس سے بھی پہلے وہ چراغ دین کے گھر کی طرف چلا گیا باقی لوگ کچھ ساتھ رہے اور کچھ وہیں کھڑے رہے۔ جیسے ہی وہ دہلیز سے اندر داخل ہوا، چراغ دین کی بیوی رحمت بی بی اس سے لپٹ گئی اور اونچی اونچی بین کر کے رونے لگی۔ اُسے دیکھ کر چراغ دین کی بیٹی بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، جس کے پاؤں میں نہ تو جوتے تھے اور نہ ہی سر پر دوپٹہ۔ چراغ دین کا گھر بھی کیا تھا، محض ایک کمرہ اور چھوٹا سا کچا صحن، جس کے دائیں پہلو چھوٹی سی کچی دیوار کے ساتھ مٹی کا چولہا تھا۔ اس کی سرد راکھ اور گھر کی ویرانی اور اُس پر چراغ دین کی خستہ حال بیوی اور بچی کو دیکھ کر غلام حیدر کے نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو نکل آئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُسے اِس منظر کے دیکھنے سے پہلے واقعے کی سنجیدگی کا احساس تو تھا مگر اس قدر غم کی شدت نہ تھی۔ رحمت بی بی بچیوں کی طرح رو رہی تھی۔ غلام حیدر نے ایک اضطراری کیفیت کے تحت اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور بچی کو گود میں اُٹھا لیا۔ عمر کے اعتبار سے غلام حیدر رحمت بی بی سے کہیں چھوٹا تھا، پھر بھی اُس کا رحمت بی بی کے سر پر ہاتھ رکھنا کسی کو عجیب نہ لگا بلکہ پورے لوگوں کی آنکھیں نم ہو گئیں اور دلوں کے اندر جو ہراس اور خوف بیٹھ چکا تھا، وہ حوصلے میں بدل گیا۔ ہر ایک کے دل میں غلام حیدر کے لیے ایک خاموش جذبہ محبت اُبھر آیا۔ گویا احساس ہو گیا ہو کہ اُن کے غم کا مداوا ہو چکا ہے۔ اِس اپنائیت سے حوصلہ لیتے ہوئے کئی بوڑھی عورتوں نے غلام حیدر کے سر پر ہاتھ پھیر کر اُسے دعا بھی دی۔ مگر اُس نے اُنھیں نظر انداز کرتے ہوئے پانچ سو

روپیہ کی تھیلی جیب سے نکال کر رحمت بی بی کی مٹھی میں دے دی۔ حالانکہ اِس سے پہلے پانچ سو روپے وہ رفیق پاؤلی کے ہاتھ پہلے ہی بھیج چکا تھا۔ پیسے دے غلام حیدر نے کہا، چاچی صبر کر، چاچے چراغ دین کو تو میں لا نہیں سکتا لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ اُس کا قاتل نہیں بچے گا۔ اس سے آگے غلام حیدر بول نہ سکا مگر لہجے میں اِس قدر اعتماد تھا کہ اس سے پہلے نظر نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد وہ چراغ دین کے گھر سے نکل کر چوک میں آ گیا۔ جہاں پورا گاؤں اکٹھا ہوا بیٹھا تھا۔

غلام حیدر کو دیکھتے ہی سب کھڑے ہو گئے۔ جب وہ چار پائی پر بیٹھ چکا تو دوسرے لوگ بھی بیٹھ گئے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا شیر حیدر نئے روپ میں ان کے درمیان بیٹھا ہے۔ بلکہ اُس سے بڑھ کر ایک نئی طاقت ہے کہ شیر حیدر کے پاس رائفل نہیں تھی جبکہ غلام حیدر کی رائفل اُس کی پائنتی کے ساتھ پڑی لشکارے مار رہی تھی۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر اچانک غلام حیدر بولنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

شیر حیدر کا کبھی یہ وطیرہ نہیں رہا تھا کہ وہ لوگوں سے کھڑے ہو کر بات کرے مگر اس کے برخلاف غلام حیدر نے تخاطب کا طریقہ اس طرح اپنایا کہ ہر شخص آواز سننے کے ساتھ اُسے دیکھ بھی لے۔ حالانکہ یہ مجمع اتنا بڑا نہیں تھا۔ بھائیو" شیر حیدر کی آواز گونجی چراغ دین مارا گیا حالانکہ اس کا کوئی جرم نہیں تھا۔ سکھڑوں نے اُس کی بیوی کو بیوہ اور بچی کو یتیم کر دیا۔ یہ حملہ اس گاؤں پر نہیں، شیر حیدر کی قبر پر ہوا ہے۔ سودھا سنگھ نے ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ قل اور ساتویں کا انتظار بھی نہیں کیا۔ دشمن نے کسی اصول اور دین دھرم کا لحاظ نہیں کیا۔ (پھر کچھ دیر رُک کر) ٹھیک ہے اُس نے اپنا وار کر دیا (رفیق پاولی جو حقہ پی رہا تھا، نے حقے کی نے ایک طرف کر کے رکھ دی) مگر وہ یہ نہ سمجھے کہ ہمارے گاؤں کوئی چری کی فصلیں ہیں، جنہیں جب چاہے گدھے آ کر اُجاڑ دیں۔ سودھا سنگھ نے مونگی نہیں اُجاڑی، بارود میں آگ لگائی ہے، چراغ دین کو قتل نہیں کیا، شیر حیدر کی لاش کا مُثلہ کیّا ہے اور سودھا سنگھ نے جودھا پور پر حملہ نہیں کیا، اپنی چتا کو آگ لگائی ہے۔

غلام حیدر کی آواز میں درد کے ساتھ اس قدر رعب در آیا کہ پورا مجمع مبہوت سنتا رہا۔ اس کی آواز اتنی بلند ہو گئی کہ لڑکے بالے اپنی اچھل کود چھوڑ کر وہیں کھنچے چلے آئے۔ پندرہ منٹ تک غلام حیدر پوری طاقت سے بولتا رہا۔ سردی کے دن تھے مگر اُسے پسینہ آ گیا۔ گفتگو ختم کر کے جیسے ہی بیٹھا تو لوگوں کے دلوں سے بوجھ اتر چکا تھا۔

غلام حیدر کے بیٹھنے کے بعد جمال دین آگے بڑھ کر کانپتی ہوئی آواز میں بولا، غلام حیدر اِن سکھڑوں نے سمجھا تھا شیر

حیدر کے مرنے کے ساتھ اُس کے تینوں گاؤں بھی مر گئے۔ خدا کی قسم یہ ان کی بھول تھی۔ ان کو وہ حساب دینا پڑے گا کہ اگلی نسلیں کانپ جائیں گی۔ (پھر غلام حیدر کی طرف دیکھ کر) پتر غلام حیدر ہمیں حکم کر ہم سودھا سنگھ کے گاؤں کو آگ لگا دیں گے۔ تُو بس اشارہ کر، سکھوں کے بچے کو لہو میں پیس دیں گے۔

رفیق پاولی نے جمال کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا بابا تسلی رکھ۔ حکم تو اب آپ نے کرنا ہے اور عمل ہم کریں گے۔ تم بس ایک کام کرو، اپنے جوانوں کی دس ٹولیاں بناؤ۔ ہر ٹولی میں دس جوان ہوں، جو گاؤں کے گرد گھیرے میں رات پہرا دیا کریں تا کہ سودھا سنگھ نئی چال نہ چل سکے۔ اگلے کام ہم جانیں اور ہمارا خدا۔ اب یہی میدان ہے اور یہیں گھوڑے۔

اس کے بعد مختلف تجویزیں پیش ہوئیں جن میں حالات کا پورا جائزہ لیا گیا۔ ظہر کے وقت بگھیاں گروہرسا کی طرف چل پڑیں۔ پچاس جوانوں کا قافلہ جن میں سے کچھ بگھیوں پر سوار تھے اور کچھ گھوڑوں پر۔

غلام حیدر نے بوسکی کا کریم رنگ کا کُرتہ پہنا تھا اور سرمئی رنگ کی موٹی اُون کی چادر کاندھوں پر رکھے ہوئے تھا جس کا بر تین گز تو ضرور ہو گا۔ دائیں کاندھے پر رائفل، جس کی نال سر سے اوپر تک نکلی ہوئی عجب شان پیدا کر رہی تھی۔ اِس کے علاوہ جتنے جوان تھے، سب کے پاس برچھیاں اور چُوڑی چڑھیں ڈانگیں تھیں۔ اکثر نے مونچھوں کو اتنا تیل پلا رکھا تھا کہ اُنھیں دیکھ کر خوف آتا۔ بگھیاں جونہی راجباہ کے پُل کو پار کر کے تھانے کے قریب پہنچیں، پہرے پر سنتریوں میں ہلچل پڑ گئی۔ ایک سنتری بھاگ کر تھانے میں داخل ہوا کہ تھانیدار کو اطلاع کرے۔ بگھیاں تھانے کے باہر کھڑے برگد کے پیڑ کے نیچے کھڑی ہو گئیں۔ اتنے میں تھانے دار دیدار سنگھ کچھ اور سنتریوں کے ساتھ تھانے کے دیوہیکل بیرونی دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کا گیٹ لوہے کی موٹی چادر کا تھا، جس پر لال اور پیلا رنگ کر دیا گیا تھا۔ اِس ڈیوڑھی نما دروازے سے آگے صحن کو چھوڑ چاروں طرف کمرے اور حوالاتیں تھیں۔ ان سب کا رنگ بھی سُرخ اور بوجھل کر دینے والے ماحول سے مشابہ تھا۔ دروازے کی چوٹی پر دو جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ایک سلطنت برطانیہ کا اور دوسرا پولیس کا۔

غلام حیدر بگھی سے اترا تو جوانوں کا پورا دستہ اس کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔ آگے بڑھا تو ایک پر اسرار رعب اس کے ساتھ تھا۔ بوسکی کا کرتہ، اون کی چادر اور کاندھے پر ولایتی رائفل، اس سے بڑھ کر ریشمی لاچا جس کے کنارے دُور

تک زمین پر گھسٹتے آتے تھے۔ اَن کے علاوہ قدم اُٹھاتے ہی طلائی کھسہ چرر چرر کی آواز اٹھاتا۔ ان سب چیزوں نے مل جل کر اس کی شخصیت میں ہیبت پیدا کر دی تھی۔

غلام حیدر نپے تلے قدم اُٹھاتا تھانیدار کے قریب پہنچا تو دیدار سنگھ کے کندھے رعب سے جُھک گئے۔ اُس نے غلام حیدر سے مصافحہ کیا اور آگے بڑھنے کے لیے رستہ دیا۔

صحن میں دو چار پائیاں بچھا دی گئیں، جن میں سے ایک پر غلام حیدر بیٹھ گیا اور دوسری پر تھانیدار دیدار سنگھ۔ دیدار سنگھ کی توند نکلی ہوئی تھی۔ داڑھی مروڑ کر پگڑی کے نیچے کس دی گئی تھی۔ لیکن وزن اتنا تھا کہ چار پائی چرمرا کر رہ گئی۔ غلام حیدر کے سامنے تھانیدار کی شخصیت بالکل غیر متاثر کن تھی۔ نوجوان خون اور اُس کے پیچھے بڑی زمینداری۔ سب سے بڑھ کر تعلیم کا اپنا رعب، کہ سینکڑوں میل تک بی اے پاس کا نام و نشان نہ تھا۔ پھر بھی گورنمنٹ کی نوکری میں اتنی ہیبت ضرور تھی کہ غلام حیدر کے ساتھ آیا ہوا جوانوں کا دستہ تھانیدار کے آگے باادب ہو ہی گیا۔ یہ رعب ان پر دیسی ملازمت کا نہیں بلکہ انگریز سرکار کا تھا۔ جس کا ایک پیادہ گاؤں میں چلا جاتا تو پورا گاؤں خوف کے مارے چوہوں کی طرح اپنے بلوں میں گھس جاتا۔ لوگ کئی کئی دن تک تذکرہ کرتے کہ گاؤں میں سپاہی آیا تھا اور فلاں کو وارنٹ جاری کر گیا۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا کہ ایک ہی سپاہی آکر کئی آدمیوں کو گھیر لے جاتا۔ کسی کی مجال نہ تھی، اوں آں کرے۔

چراغ دین کا مدعی مَیں ہوں، پرچہ ! غلام حیدر نے گفتگو کا آغاز کیا اور ہلکے طنز کے ساتھ کہا: ، تھانیدار صاحب کٹوانے آیا ہوں (آگے کی طرف جھکتے ہوئے) سودھا سنگھ کے خلاف۔

چوہدری صاحب ’تھانے دار بولا، اس طرح تو قتل کا کیس خراب ہو جائے گا۔ میرا مطلب ہے کہ یہ سودھا سنگھ پر سیدھا الزام ہے جو عدالت میں ثابت نہیں ہو گا۔ خوامخواہ قتل ضائع ہو جائے گا۔ ویسے بھی قتل والی رات سودھا سنگھ شیخوپورہ گیا ہوا تھا۔ (داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) مَیں قتل کے اگلے دن سے ہی سارے معاملے کی تحقیق کر رہا ہوں۔ واہگرو کی سونہہ ایک لمحہ بھی سکون سے نہیں بیٹھا۔

دیکھیں سردار جی ”غلام حیدر نے زور دیتے ہوئے کہا“ عصر کا وقت ہو گیا ہے اور میں دشمن داری والا بندہ ہوں۔ وقت بالکل نہیں ہے۔ کیس خراب ہو گا تو میرا ہو گا۔ عدالت میں ثابت نہیں ہو گا تو نقصان ہمارا ہو گا لیکن میرا ملزم سردار سودھا سنگھ ہے آپ پرچہ کاٹیں۔

چوہدری صاحب آپ چنتا نہ رکھیں اور حوصلے سے کام لیں۔ ایک آدھ دن اور سوچ لیں۔ سب کام ٹھیک ہو جان گے۔ (ایک بار پھر داڑھی کُھجاتے ہوئے) آپ جذباتی نہ ہوں۔

دیدار سنگھ نے غلام حیدر کو دلاسے کی شکل میں بات سمجھانے کی کوشش کی مگر یہ جملے سن کر غلام حیدر کے تیور بگڑنے لگے اور وہ تلخی سے بولا، سردار جی آپ کی داڑھی کی مٹی مَیں نکال دوں گا، میرے پاس بہت بندے ہیں، وہ ساری جھاڑ پونچھ کر دیں گے۔ جو کام تمہارے کرنے کے ہیں وہ تم کرو۔ اگر تم پرچہ نہیں کاٹو گے تو آج کے بعد میں تھانے نہیں آؤں گا۔ رشوت کی بھینسیں سودھا سنگھ نے آپ کو بھیجی ہیں مجھے نہیں۔ یاد رکھو پرچہ کٹے گا تو سودھا سنگھ پرورنہ میں لاہور تک جاؤں گا اور یہ دونوں پھول تارے وردی پر نہیں رہیں گے۔ چراغ دین کا قتل اندھا نہیں ہے کہ کوئی تھانیدار بھی پی جائے۔

دیدار سنگھ غلام حیدر کا لہجہ دیکھ کر دہل گیا۔ آج تک اس حوصلے اور جگرے سے کسی نے بھی گورنمنٹ کے دو پھولوں والے تھانے دار سے بات کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ دیدار سنگھ یہ بھی جانتا تھا کہ غلام حیدر کے رابطے دُور تک نہ ہوتے تو وہ اس طرح بولنے کی جرأت نہ کرتا۔ اُس نے محسوس کیا یہ لڑکا جذباتی ہے کچھ بھی کر گزرے گا۔

اسسٹنٹ کمشنر تک تو وہ پہلے ہی جا چکا تھا۔ چنانچہ مصیبت میں پڑنے کی کیا ضرورت۔ وہ جانتا تھا یہ کیس اتنا پتلا بھی نہیں۔ اس لیے بیٹھے بٹھائے وردی سے ہاتھ نہ دھونے پڑ جائیں۔ سب کچھ سوچ کر تھانے دار غصے کو پی گیا۔ اُس نے جلدی سے منشی کو طلب کر کے سودھا سنگھ کے خلاف چراغ دین کے قتل اور بیس ایکڑ مونگی کی فصل کے اُجاڑے کا پرچہ کاٹ دیا جس کا مدعی غلام حیدر خود تھا۔

غلام حیدر نے پرچے کی مثل پکڑی، دیدار سنگھ کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بگھی پر آ بیٹھا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ غلام حیدر کی کوشش تھی جلد سے جلد جلال آباد پہنچے کیونکہ حالات اس کی حمایت میں نظر نہیں آ رہے تھے۔ پہلے دن جب غلام حیدر فیروز پور کے اسٹیشن پر اترا تھا اُس وقت سے لے کر اب تک اس کے اندر ایک عجیب طرح کی کایا کلپ ہو چکی تھی۔ لباس سے لے کر اندازِ گفتگو تک، ہر شے اتنی جلدی بدل رہی تھی کہ رفیق پاولی جس نے اُسے گودی میں کھلایا تھا، حیران رہ گیا۔ جیسے ہی بگھی جلال آباد کی طرف روانہ ہوئی، وہ اُس سے بات کیے بغیر نہ رہ سکا۔

غلام حیدر مجھے تم پر بڑا فخر ہے۔ آخر شیروں کے بچے شیر ہی ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا غلام حیدر رعایا بے وارثی نہیں رہے گی۔

چاچا فیقے، نظام دین بولا، چوہدری غلام حیدر کو دیکھ کر اپنے دیدار سنگھ کا تو پاجامہ ہی ڈھیلا ہو گیا۔ چوہدری غلام حیدر نے اس کی دھون پر اپنا کھسہ جو رکھ دیا۔ سکھڑا پرچہ کیسے نہ کاٹتا۔

اِدھر بگھیاں جلال آباد کی طرف دڑ دڑ بھاگی جاتی تھیں اُدھر یہ گپیں چل رہی تھیں۔ جس سے سب کے مزاج خوش گوار ہو گئے۔

رفیق پاولی نے کہا، او نظامے تین سو دو کا پرچہ سہہ جانے کے لیے بھینسوں کے جگرے چاہئیں۔

چاچا فیقے مجھے پتا ہے یہ تین سو دو تو ایسی بُری بلا ہے، درخت پر لکھ دو تو درخت سوکھ جائے، بندہ کیا چیز ہے۔ اب سودھا سنگھ تو گیا کام سے، یہ شامت اس کے گھر سے نہیں نکلے گی۔

چاچا رفیق! غلام حیدر بولا' اب یہ اس کے گھر سے نکلے نہ نکلے۔ سودھا سنگھ کے گلے میں پھندا ڈلے نہ ڈلے، میں نے تو ایک ہی بات سوچی ہے اور وہ یہ کہ مَیں سودھا سنگھ کی رَت کا رنگ دیکھنا چاہتا ہوں۔

غلام حیدر کی اتنی بڑی پُر اعتماد بات سُن کر ایک دفعہ تو سب خاموش ہو گئے۔

جاری ہے

قسط نمبر 4

(8)

مولوی کرامت مسجد میں داخل ہوا تو سورج دکن کی طرف سے عین پہاڑ کو منہ کرتا تھا گویا ابھی بارہ ہی بجے تھے اوراذان دینے میں کافی وقت تھا۔ مولوی کرامت نے کھجی کی ایک صف اندر سے نکال کر باہر صحن میں موجود دھوپ میں بچھادی، جو رات کو اوس پڑنے سے گیلا ہونے کے ڈر سے اندر رکھ دی گئی تھی۔ مسجد کا صحن کچا تھا لیکن صاف ستھرا اس لیے تھا کہ مولوی کرامت روزانہ اُس پر صفیں بچھانے سے پہلے جھاڑو ضرور دیتا کہ صفیں صحن کی گرد سے گندی نہ ہوں۔ سردیوں کی دھوپ میں صفیں بچھا کر اُس پر نماز پڑھنے کا بھی اپنا ہی ایک لطف ہے۔ بوڑھوں اور کام کرنے والے افراد کے لیے اس طرح کی دھوپ میں نماز پڑھنا عبادت کے ساتھ ایک طرح کی تفریح بھی ہے۔ مسجد یوں تو پکی اینٹوں سے بنی تھی مگر تمام صحن ابھی کچا تھا، جو سردی کے دنوں میں زیادہ ہی سیم زدہ ہو جاتا۔ پنجاب کے چھوٹے دیہاتوں میں جو مسجدوں کی حالت ہوتی ہے، یہ مسجد بھی اُن سے مختلف نہ تھی۔ گاؤں کے درمیان چوک کے عین بیچ اِس کا وجود خشک روٹی پر رکھے اُس پیاز کی طرح تھا جو بہت عرصہ پڑا رہنے سے سُکڑ گیا ہو۔ اِس چھوٹی سی مسجد کے صحن کو تین طرف سے دیوار نے گھیر رکھا تھا۔ چوتھی سمت یعنی مغرب کی جانب خود مسجد کی مسقف عمارت تھی۔ آپ اِسے تیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چھوٹا کمرہ کہہ لیں، جس کے اُوپر سامنے کے بنیرے پر چھوٹے چھوٹے کئی منارچے رکھ دیے گئے تھے۔ اُن کا رنگ مدتوں ہوا، اڑ گیا تھا۔ اس کمرے کے سامنے تیس پینتیس فٹ چوڑا اور اتنا ہی لمبا کچا صحن اور صحن کے بالکل سامنے مشرق کی طرف آٹھ فٹ چوڑا اور تیس فٹ لمبا برآمدہ، جس کی چھت بارہ فٹ تک اونچی تھی۔ البتہ مسجد کی چھت بیس فٹ ضرور اونچی تھی۔ مسجد کی چھت اور برآمدے کی چھت کے آنکڑے اور شہتیر یکساں ہیئت کے تھے۔ فرق تھا تو یہ کہ برآمدے کی چھت کے آنکڑے اور ٹائیلیں مٹی اور گرد سے خاکستری ہو گئیے تھے۔ جبکہ مسجد کی چھت کے شہتیر، آنکڑے اور ٹائیلیں گھی اور تیل کے چراغوں سے اُٹھنے والے دھویں سے سیاہ ہوئے تھے۔ برآمدے کے عین درمیان مسجد کے صحن میں داخل ہونے کے لیے لکڑی کے تختوں کا دروازہ تھا، جس پر لوہے کا زنجیر لٹکا رہتا۔ اس دروازے کا واحد اور مفید مصرف یہ تھا کہ کوئی جانور، کُتا یا گدھا داخل نہ ہو سکے۔ دروازے کے دائیں پہلو پانی کا کنواں تھا۔ وضو کرنے کی جگہ برآمدے کے نیچے ایک لمبی نالی کی صورت میں بنا

دی گئی تھی جس کے ایک کونے پر پانی کی ایک ٹینکی پکی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی تاکہ کنویں سے پانی کھینچ کر ٹینکی میں آسانی سے ڈالا جاسکے۔

برآمدوں کی اینٹوں پر پلستر نہیں ہوا تھا، اس لیے ان کی درزوں سے مٹی سیم اور شور بن بن کر گر رہی تھی۔ مسجد کے صحن کی شمالی دیوار بھی کچی اینٹوں کے ہونے کی وجہ سے دائیں طرف کو جھکی ہوئی تھی لیکن وہ صرف پانچ فٹ اونچی تھی جس کی وجہ سے کچھ زیادہ خطرے میں نہیں تھی۔ یوں بھی مسجد گاؤں کے عین چوک میں تھی۔ جس کے آس پاس چاروں طرف تیس فٹ کی دوری سے گھر تھے اس لیے کسی جانی نقصان کا اندیشہ نہیں تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ مسجد کی حالت روز بروز خستہ ہو رہی تھی۔ مولوی کرامت نے بار بار گاؤں والوں کی اس طرف توجہ دلائی مگر وہ سنتے ہی نہ تھے۔ ویسے بھی گاؤں کے لیے مولوی اور مسجد غیر ضروری سے تھے۔ ان دو چیزوں کا اصل کام گاؤں میں کسی فرد کے مرنے کے بعد ہی شروع ہوتا۔ جو میت کے دفنانے کے بعد ختم ہو جاتا۔ البتہ پانچ دس بوڑھے ضرور پانچ وقت آتے اور یہ تعداد پچھلے کئی عشروں سے ایسے ہی چلی آتی تھی۔ نہ بڑھتی اور نہ گھٹتی۔ ایک بوڑھا مرتا تو کوئی دوسرا شخص بوڑھا ہو جاتا۔ اس طرح دس بارہ بوڑھے ہر وقت مسجد کی زینت بنے رہتے اور مولوی کی ضرورت کا احساس رہتا۔

فضل دین کی پہلی ڈیوٹی صبح کے وقت ٹینکی میں پانی بھرنے سے شروع ہوتی۔ روزانہ بیس مشکیں کنویں سے نکال کر اسے ٹینکی میں ڈالنا ہوتیں۔ یہ پانی عصر تک کے لیے کافی ہوتا تھا۔ عصر کے وقت فضل دین اُس میں مزید سات آٹھ مشکیں ڈال دیتا۔ یوں ایک دن نکل جاتا۔ بعض اوقات کام چوری کر جاتا۔ وہ صبح کے وقت دس بارہ مشکیں ڈال کر ہی جلدی جلدی نماز پڑھ کر روٹیاں لینے نکل جاتا۔ جس کا نقصان یہ ہوتا کہ پانی جلد ختم ہو جاتا۔ پھر وہ مشکیں مولوی کرامت کو خود کنویں سے کھینچ کر ٹینکی میں ڈالنا پڑتیں۔ اس عمل میں مولوی کرامت کا پارہ ایک سو بیس ڈگری پر چڑھ جاتا۔ اول تو اُسے اِن بڈھوں پر غصہ آتا جو مٹی کے لوٹے ٹینکی سے بھر بھر کے وہیں بیٹھے کُلیاں کر کر کے کھنگارتے رہتے اور پانی ضائع کرتے۔ لیکن غصہ اُترتا بالآخر فضل دین پر ہی تھا جو ادھورا کام کر کے مولوی کرامت کو مشقت میں ڈال دیتا۔ آج پھر جب وہ صحن میں ہلکا سا جھاڑو دے کر وضو کرنے کے لیے بیٹھا تو پانی موجود نہ تھا۔ مولوی کرامت نے ایڑیوں کے بل کھڑے ہو کر ٹینکی میں نظر ماری تو وہ بالکل صاف تھی، پانی کا ایک قطرہ تک نہ تھا۔ یہ دیکھ کر مولوی کی حالت مُردوں کی سی ہو گئی۔ اُسے فضل دین پر اس قدر غصہ آیا کہ دانت کچکچا کر رہ گیا۔ وہ پاس ہوتا تو کاٹ

ہی کھاتا۔ آخر کیا کرتا، پانی تو بہر طور ٹینکی میں بھرنا تھا۔ کیونکہ فضل دین ابھی تک گھروں سے روٹیاں اکٹھی کر کے نہیں لوٹا تھا۔ مولوی کرامت نے مشکیزہ اٹھا کر کنویں میں ڈال دیا، جو چالیس فٹ گہرا تھا۔ کنواں زیادہ گہرا ہونے کی وجہ سے مشکیزے کی رسی بھی چالیس فٹ لمبی تھی۔ جسے کھینچتے کھینچتے ہاتھ شل ہو جاتے۔ مولوی کرامت نے ابھی پہلی ہی مشک بھر کر نکالی تھی کہ اس کے کانوں میں چیخوں کی آواز سنائی دی۔ اُس نے مشک رکھ کر چیخوں کی طرف دھیان دیا تو اُسے ایسے لگا کہ آواز مسجد کے پچھواڑے سے آ رہی ہے۔

خدا خیر کرے، کیا مصیبت آ گئی، مولوی کا کلیجہ حلق میں آ گیا۔ خدانخواستہ فضل دین کو کچھ ہو گیا مگر وہ تو ابھی نہیں لوٹا تھا۔ اُسے گھر سے آئے ابھی چند لمحے تو ہوئے تھے۔ تب تو سب کچھ خیر تھی۔ مولوی کرامت نے بھاری قدموں اور لرزتی ٹانگوں سے گھر کی طرف دوڑ لگا دی مگر ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اُسے ڈر ہوا کہیں گر نہ پڑے۔ وہ دوڑنے کی بجائے چلنے لگا۔ جیسے ہی دروازے پر پہنچا تو عجب تماشا جاری تھا۔ شریفاں نے اپنے بال کھولے ہوئے تھے اور باہیں پھیلا کر اُونچے اُونچے بین کر رہی تھی۔ ارد گرد کچھ عورتیں بھی جمع تھیں۔ شریفاں نے مولوی کو آتے دیکھ کر بین کی آواز مزید بلند کر دی۔

ہائے کرامت ہم لُٹ گئے، خانہ خراب ہو گیا۔ میرا ایک ہی ست جمنوں کا بھائی مارا گیا۔ میں برباد ہو گئی۔

مولوی نے ہانپتے ہوئے کہا "نیک بختے خیر ہووے کیا ہوا؟ کوئی پتہ تو چلے۔"

وے کرامتا چراغ مارا گیا۔ میرا اکیلا بھائی مار دیا دشمنوں نے۔

شریفاں نے دونوں ہاتھوں کو زانوں پر زور زور سے مار کر پیٹنا شروع کر دیا۔ عورتیں اُسے ادھر اُدھر سے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھیں اور وہ سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔

اِنَّ لِلّٰہِ وَاِنَّ اِلیہ راجعون کہہ کر مولوی کرامت آگے بڑھا تو راج محمد سامنے کھڑا نظر آیا۔ اُسے دیکھ کر مولوی کرامت سارا معاملہ سمجھ گیا۔ تو گویا راج محمد چک جودھا پور سے چراغ دین کی موت کی خبر لایا تھا۔ مگر مولوی کرامت کے لیے یہ بات اچنبھے کی تھی کیونکہ چراغ دین نہ تو بیمار تھا اور نہ ہی اس کی کسی سے دشمنی تھی۔ پھر یہ کیا ہوا؟

سلام دعا کے بعد مولوی کرامت نے راج محمد کو بان کی چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ اتنے میں فضل دین بھی روٹیوں کا توبڑا لے کر آ گیا۔ مولوی کرامت نے اُسے حقہ تازہ کرنے کا کہہ کر خود راج کے لیے پانی لسی تیار کرنے لگا۔ شریفاں بین کر کر کے اپنا ہلکان کر رہی تھی۔ مولوی کرامت کو پتا تھا، فی الحال اسے روکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ عورتیں خود اس کے

گرد حلقہ کیے ہوئے تھیں۔ کوئی ہاتھ مل رہی تھی اور کوئی پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ زمین پر لیٹی ہاتھ پھیلا پھیلا کر روتی گئی۔ حقہ تازہ کرنے کے دوران فضل دین بھی ماں کی تقلید میں رو رہا تھا۔ اگرچہ اُسے اس معاملے سے ایسی ہی لاتعلّقی تھی جیسے ڈیڑھ سو میل دور کسی بھی اجنبی سے ہو سکتی ہے۔ وہ ایسے کسی رشتے دار کو نہیں جانتا تھا جو کبھی اُس کے لیے مٹھائی کی ڈلی ہی لایا ہو۔

خاطر مدارت کرنے کے بعد مولوی کرامت جب آرام سے راج محمد کے سامنے بیٹھ گیا تو اُس نے چراغ دین کے قتل کا پورا قصہ مولوی کرامت کو سنا دیا۔ پھر آہستہ سے آگے بڑھ کر ایک اور خبر مولوی کرامت کو دی "لیکن بھائی کرامت تو چراغ دین اور بی بی رحمتے کی فکر نہ کرنا، غلام حیدر نے چراغ دین کے قتل کا سنتے ہی دس ایکڑ زمین دینے کا اعلان کر دیا ہے اور اُس کے ساتھ پورے ایک ہزار روپے تو پہلے ہی دے دیے ہیں۔ اتنے پیسے تو چراغ دین پوری زندگی نہیں کما سکتا تھا اور پرسوں جلال آباد کچہری میں زمین باقاعدہ رحمت بی بی کے نام ہو جائے گی۔ غلام حیدر تو فرشتہ ہے فرشتہ۔ اُس نے مالکوں والا حق ادا کر دیا۔

یہ سن کر مولوی کرامت کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی لیکن مولوی نے اس تاثر کو چھپانے کی بھرپور کوشش کی گویا چراغ دین کی زندگی کے آگے اس دس ایکڑ کی کیا حیثیت ہے۔ پھر حیرانی سے پوچھا، بھائی راج مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ تم شیر حیدر کی بجائے غلام حیدر کا ذکر بار بار کر رہے ہو۔ خدانہ خواستہ شیر حیدر کا کیا ہوا؟

راج محمد نے کہا" مولوی جی تو کیا تمھیں شیر حیدر کے مرنے کی خبر بھی نہیں ملی؟ بھائی کرامت اسی کے سوم والی" رات تو چراغ دین کا قتل ہوا ہے۔

مولوی کرامت نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوبارہ اِنَّا للہ پڑھی پھر پورے حالات پر راج محمد سے گفتگو کرنے لگا۔ جب آدھ گھنٹے کی گفتگو کے بعد ہر چیز مولوی کرامت پر کھل گئی تو اس نے ایک ٹھنڈی آہ کھینچی پھر چراغ کے حوالے سے بات دوبارہ چھیڑ دی۔

بھائی راج محمد مجھے تو ایک ہی فکر اب کھا رہی ہے کہ رحمتے اور اس کی بیٹی تاجاں کا کیا بنے گا۔ بچاری یتیم بیٹی کو کیسے پالے گی۔ ادھر مَیں جلال آباد سے ڈیڑھ سو میل دور قصور میں بیٹھا اُن کی دیکھ بھال کیسے کروں گا۔ بچی نادان ہے اور یہ مسجد کا کام میرے بغیر چل نہیں سکتا۔

ادھر مولوی کرامت یہ باتیں کر رہا تھا اُدھر شریفاں رو رو کے تھک چکی تھی۔ اب اس کی آواز بھی حلق سے بمشکل نکل رہی تھی۔

دیکھ بھائی کرامت، فی الحال تو جا کر چراغ دین کے ساتویں کا بندوبست تجھے کرنا ہے۔ تیرے سوا اب اس کا وہاں رشتے دار کوئی اور تو ہے نہیں۔ ابھی سے چلنے کی تیاری کر، شام چھ بجے قصور سے ریل پکڑنی ہے۔ قُل کا ختم تو آج ہو گیا ہو گا۔ تین دن بعد ساتا ہے۔ اُس کے بعد دوسرا بندوبست دیکھ لینا۔ جو مناسب ہو وہی کرنا۔

مولوی کرامت تاسف سے بولا "لیکن بھائی راج، مجھے تو دکھ ہے کہ شریفاں بھاگاں والی اپنے بھائی کا منہ بھی نہ دیکھ سکی۔ یہ تو بچاری مر جائے گی۔

مولوی صاحب آپ تو جانتے ہیں اللہ کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ پہلے دن تو کسی کو ہوش ہی نہ رہا۔ ادھر غلام حیدر کی پگ بندی کی رسم تھی۔ ہر کوئی وہاں مگن تھا۔ میں بھی وہیں چلا گیا تھا۔ صبح سورج چڑھا تو اس واقعے کا پتہ چلا لیکن رسم کو اُدھورا چھوڑ کر آنا اچھا نہ لگا۔ جیسے ہی رسم ختم ہوئی، مَیں سیدھا یہاں دوڑا آیا مگر ریل نکل چکی تھی۔ دوسری گاڑی رات کے دو بجے جلال آباد سے چلی اور صبح آٹھ بجے قصور پہنچی وہاں ایک گھنٹہ رُکی رہی۔ پھر کہیں خدا خدا کر کے گیارہ بجے اڈا جبو میل آیا۔ مَیں اُترتے ہی بھاگ کھڑا ہوا اور ڈیڑھ گھنٹے میں یہاں آن پہنچا۔ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے غلام حیدر چراغ دین کا بدلہ لیے بغیر نہیں ٹلے گا۔ اُس کے تیور تو ایسے ہی لگتے تھے۔ خیر یہ سب باتیں تو ہوتی رہیں گی تُو چلنے کی تیاری کر۔

مولوی کرامت نے فضل دین کو آواز دی جو اپنی والدہ کو اتنی شدت سے روتے ہوئے دیکھ کر سہما کھڑا تھا، بیٹے ذرا بھاگ کر چودھری حکم داد کے پاس جا اور اُس سے کہنا کہ آج دو گھنٹے کے لیے بیل گاڑی چاہیے' جیسے فضل دین پاس آیا مولوی کرامت نے اسے ہدایت کی "اور ہمیں ریلوے سٹیشن تک چھوڑ آ پھر شریفاں کو پکار کر بولا، اب صبر کر بس اللہ کے کام ہیں جن پر نہ تیرا بس چلے گا نہ میرا۔ خدا اُسے شہیدوں کی صف میں لائے گا۔ چراغ دین ہماری بخشش کا وسیلہ بھی بنے گا۔ شام چھ بجے کی گاڑی سے فیروز پور نکلنا ہے۔ اُس لیے کپڑا لتّا اُٹھا لے۔ فضل دین ہمیں سٹیشن پر چھوڑ آئے گا۔

تو کیا فضل دین نہیں جائے گا ساتھ؟ شریفاں نے مُردنی سی آواز میں احتجاج کرنے کی کوشش کی۔ اُسے اپنے مامے کے ختم میں شریک نہیں ہونے دے گا؟

اُف بھاگ بھریے سمجھا کر،" مولوی کرامت نے آہستہ سے شریفاں کو کندھے سے سہارا دیتے ہوئے کہا' فضل دین بھی اگر ساتھ چلا جائے گا تو یہ بھرا پُرا گھر کس کے سپرد کروں؟ پھر گدھی اور یہ بکریاں یہیں بندھی بھوکی مر جائیں گی۔ ہمیں کچھ دن لگ جانے ہیں۔ اتنے دنوں تک کون ہمارے اس سارے بکھیڑے کو سنبھالے گا؟ فضل دین کو یہیں رہنے دیتے ہیں۔ مسجد کی صفائی اور اذان کون دے گا؟ اتنا کہہ کر مولوی کرامت نے حقّے کے دو تین کش لیے پھر اس کی نَے راج محمد کے سامنے کر دی۔

مولوی کرامت کو پتا تھا کم از کم وہ چھ سات دن تک واپس نہیں آ سکتا۔ اس عرصے میں تہرے نقصان ایک دم برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جودھا پور آنے جانے کا خرچہ، اس کے علاوہ ساتویں کے ختم میں رحمت بی بی اور اس کی بیٹی کو بھی پانچ دس دینا پڑتے۔ کم از کم پچاس کا نسخہ اس کے پیٹے پڑ چکا تھا اور اگر وہ فضل دین کو بھی ساتھ لے جائے تو اور تو سب گزارا ہو سکتا تھا لیکن روٹیاں نہ ملنے کا نقصان ایک اضافی تھا۔ جس سے بچنے کے لیے فضل دین کا یہاں رکنا ضروری تھا۔

اس پوری سوچ کے دوران مولوی کرامت راج سے باتیں بھی کرتا گیا اور سر پر پگڑی سے لے کر جوتے پہننے کا کام بھی نمٹاتا گیا۔ لٹھے کی چادر جسے ٹین کے صندوق میں پچھلے کئی مہینوں سے دھو کر رکھا ہوا تھا، وہ بھی شریفاں نے اُسے وہیں بیٹھے لا کر تھما دی اور کرامت نے وہیں کھڑے ہو کر کمر کے گرد لپیٹ کر نیچے سے پہلی دھوتی کھینچ لی۔ پھر جانگیے کے اوپر لٹھے کا سفید کرتا بھی پہن لیا۔ مولوی کرامت نے چند لمحوں میں کھڑے کھڑے یہ سارا کام مکمل کر لیا۔ اس عرصے میں راج محمد حقہ پیتا رہا۔ شریفاں کبھی جانے کی تیاری میں ادھر اُدھر تیزی سے چلتی اور کبھی چلنے کے ساتھ زور زور سے رونا شروع کر دیتی۔ جس کی مولوی کرامت کو بہت کوفت ہونے لگی مگر وہ جانتا تھا کہ اب یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہے گا۔ اس لیے اسے بہر حال برداشت کرنا تھا۔

اِسی اثنا میں عورتوں کے علاوہ گاؤں کے مرد بھی آنا شروع ہو گئے۔ گاؤں میں پردے کا کوئی رواج نہیں تھا اس لیے مولوی کا گھر بھی گاؤں والوں کی طرح ہر لحاظ سے کھلا تھا۔ نہ کسی کو تانک جھانک کی عادت تھی اور نہ ہی اس طرح کا ابھی خیال پیدا ہوا تھا۔ جو جب چاہتا ہر گھر میں اپنے ہی گھر کی طرح داخل ہو سکتا تھا۔ ہر کوئی دوسرے کی ماں بہن کو اپنی ماں بہن سمجھنے کے سوا اُس وقت دوسرا تصور بھی نہیں لاتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں دس بارہ مرد بھی پرسہ داری کو جمع ہو گئے، جنھیں فی الحال مولوی کرامت جلدی سے فارغ کر کے چلنے کی فکر میں تھا۔ نور تیلی کو مولوی کرامت نے

ہدایت کر دی جو اُس کا شاگرد بھی تھا کہ جب تک وہ واپس نہیں آ جاتے، رات اس کے گھر فضل دین کے پاس رہ لیا کرے۔ اتنے عرصے میں فضل دین بیل گاڑی لے کر آگیا۔

مولوی کے پاس اپنی گدھی بھی تھی، جو فالتو روٹیاں کھا کھا کر بہت موٹی تازی اور تیز طرار ہو چکی تھی۔ مولوی کرامت اُسی پر روٹیاں لاد کر شہر لے جایا کرتا اور واپسی میں اُسی گدھی پر سوار ہو کر گاؤں آجاتا۔ اس لیے اس کا سٹیشن تک پہنچنے میں تھکاوٹ کو دخل نہیں تھا۔ ویسے بھی ہر ہفتے ایک دو من روٹیاں قصور لے جانے میں گدھی کی کافی مشق ہو چکی تھی لیکن آج بندے زیادہ تھے گدھی کام نہیں دے سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی جو مولوی کو بیل گاڑی کا احسان لینا پڑا۔

شریفاں نے فضل دین کو ضروری ہدایات دے کر اور گھر کی صفائی ستھرائی کا سمجھا کر ہر کام ازبر کرا دیا اور کہا کہ وہ شام سے پہلے ہر حالت میں گھر آ جایا کرے۔

عصر کے وقت مولوی کرامت، شریفاں اور راج محمد بیل گاڑی پر بیٹھ چکے تو فضل دین نے بیلوں کو ہشکارا دے کر پہلا ڈنڈا رسید کر دیا۔ بیل گاڑی گرد بھری کچی سڑک پر دوڑ پڑی۔ نورا تیلی بھی پاس ہی بیٹھا فضل دین کو بیل گاڑی چلانے کے متعلق ہدایات دینے لگا۔ اسٹیشن پندرہ کلو میٹر دور تھا۔ مولوی کرامت نے فضل دین کو ہدایت کر دی کہ وہ بیلوں کو دوڑائے چلا جائے، کہیں گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ گرد سے مولوی کرامت اور شریفاں کے کپڑے مٹیالے ہوئے جاتے تھے لیکن اب اس کی کس کو پرواہ تھی۔

(9)

رات کا گھنٹا بجنے میں ابھی کچھ وقت تھا لیکن دھند نے اندھیرا بڑھا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے تاریکی کے اندر ہیبت کا تاثر بڑھ گیا۔ سودھا سنگھ کی حویلی میں دس پندرہ سرداروں کی محفل جم چکی تھی۔ دیسی شراب کے مٹکے اور تانبے کے بھاری گلاس جن پر قلعی پُرانی ہو چلی تھی، چار پائیوں کے ساتھ پڑے لکڑی کے تختوں پر سجا دیے گئے۔ سوڈا باقاعدہ فیروزپور سے منگوایا تھا۔ شراب کے بہت سے برتن ایک ہی دفعہ استعمال ہو رہے تھے۔ اس لیے انھیں یکے بعد دیگرے تبدیل کرنا اکیلے چھدو کے بس میں نہیں تھا چنانچہ مزید ایک آدمی اس کام پر متعین ہو گیا۔ حویلی کا دروازہ بڑی بڑی اُوپر نیچے چار بلّیوں سے بند کر دیا گیا۔ ان سرداروں میں دو مسلمان زمین دار بھی موجود تھے۔ جن میں عبدل گجر اپنے وقار اور سرداری میں سودھا سنگھ کے علاوہ سکھوں سمیت سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اُس کا

مُوڑھا مرکزی حیثیت کا حامل تھا۔اُس کے ساتھ شریف بودلہ بھی بیٹھا تھا۔سردار سودھا سنگھ کو پتا تھا،غلام حیدر اگرچہ نا تجربہ کار ہے مگراس کے باپ کے تعلقات ضرور غلام حیدر کی پشت پر موجود ہیں۔عبدل گجر کا تنازعہ چونکہ شیر حیدر کے ساتھ پچھلے بیس سال سے تھا۔اس لیے وہ کبھی بھی اپنے پرانے دشمن سے بدلہ چکانے میں کوتاہی نہیں کرے گااور بیلوں کی لڑائی میں جو سُبکی اُسے اٹھانی پڑی تھی، جس میں پورے پچاس ایکڑ زمین شیر حیدر سے ہار گیا تھا، اُس پر قبضہ کرنے کااس سے بہتر موقع نہیں تھا۔یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنے کام کو انجام تک پہنچانے کے لیے اپنے صحیح حلیف کاانتخاب کیا۔اس کے علاوہ عبدل گجر کو ساتھ ملانے سے ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اس لڑائی میں سکھوں کی ہمدردیاں تو سودھا سنگھ کے ساتھ رہتیں، لیکن مسلمان دو حصوں میں بٹ جاتے۔وہ پورے طور پر غلام حیدر کے ساتھ نہ مل سکتے تھے۔لہٰذا یہ لڑائی سکھ مسلم سے زیادہ ذاتی تصور کی جاتی،جس کا فائدہ ہر صورت میں سودھا سنگھ کو پہنچتا۔ویسے بھی شیر حیدر کے مرنے کے بعد عبدل گجر کی طاقت اور رعب کاعلاقے میں خود بخود اضافہ ہو گیا تھا۔ آٹھ دس جوان کرپانیں اور برچھیاں لیے ڈیرے کی چار دیواری کے گرد پہرے پر موجود تھے۔کچھ جاسوسی کے لیے ادھر اُدھر گاؤں کے رستوں پر بٹھادیے گئے تاکہ حالات اچانک پلٹا نہ کھا جائیں۔محفل میں جب ہر طرف سے سکون ہو گیا تو سودھا سنگھ نے عبدل گجر کو مخاطب کیا،

چوہدری صاحب اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب اپنی کمانوں کی تندیاں کَس کر اُن پر تیر چڑھادیں اور (اپنی کرپان کی دھار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) لوہے کو پان دے لیں۔اپنے لوہاروں کو کہہ دو وہ درانتیاں بنانی چھوڑیں اور کرپانوں کی چوڑیاں کَس دیں۔

سردار جی! "عبدل نے پہلو بدل کر کہا"لوہا کُھنڈا ہو یا پان چڑھا، ضرب لگاؤ تو اپنی لاج رکھتا ہے۔ویسے میں نے لوہاروں کو کہہ دیا ہے کہ دیگی لوہے کو سان پر رکھ دیں۔تیرے کہنے سے پہلے ہی چھویوں کی دھاروں پر پان چڑھ گئی ہے۔میرا سو بندہ برچھیوں کی بولی بولتا ہے۔سودھا سنگھ ،ڈر تو بس سرکار کا مارتا ہے۔کتا بھی مار دو تو کچہری کی سیڑھیاں قدموں سے لگ جاتی ہیں۔ڈرتا ہوں وار اوچھا نہ پڑ جائے اور میں مقدمے بازی میں نہ پھنس جاؤں۔

سُودھا سنگھ آگے جھک کر بولا، چوہدری صاحب سمجھا کر، سیدھا حملہ نقصان دے گا۔میری طرف دیکھ، میں نے غلام حیدر کی ساری مونگی اُجاڑ دی اور ایک نوکر بھی مار دیا۔اب کُتے کی طرح زخم پر دُم مارتا پھرتا ہے۔دیکھنا تھوڑے دنوں میں کیڑے پڑ جائیں گے پھر اس قابل بھی نہیں رَہے گا۔زیادہ سے زیادہ تین سو دو کا کیس ہو گا، جس میں

میری ضمانت پہلی پیشی پر لازمی ہے۔ کیونکہ نہ ثبوت نہ گواہ۔ سیدھی لڑائی انگریزی دور میں سراسر نقصان ہے۔ واہگرو دی سونہہ، غلام حیدر چوطرفہ نہیں لڑ سکتا۔ بس ایک طرف ہو کر وَکھی میں وار کرو۔

شریف بودلہ، جو ابھی تک خاموش بیٹھا صرف حقہ پیے جارہا تھا، بولا: سُودھا سنگھ بات سیدھی کر، بجھارتوں کا وقت نہیں۔

شریف بودلے کے اس سوال پر سودھا سنگھ کی بجائے دھیر سنگھ بولا: "چوہدری جی، سردار سودھا سنگھ کے کہنے کا مطلب ہے، غلام حیدر سے سیدھا پھڈا لینے کی بجائے اُس کی رعایا کے مال پر ہاتھ صاف کرو۔ سٹ پہ سٹ مارتے جاؤ۔ اس کی رعایا کو جتنا زیادہ نقصان دو گے، غلام حیدر کے اوسان اتنے ہی بے وَسے ہوں گے۔ آخر بوندلا جائے گا۔ رعایا کے پاس تو مقدمے بازی کے لیے پیسہ ہوتا نہیں۔ وہ غلام حیدر سے ہی جا جا کر فریادیں کریں گے۔ اب آپ ہی بتاؤ، بچارا کہاں تک ان کے مقدمے بھگتے گا۔ آخر تھک کر لاہور بھاگ جائے گا۔ رہا رفیق پاولی، تو وہ بے چارا، پاولی کا پاولی، منشی کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ چوہدری صاحب اس کارادھاری میں غلام حیدر کی رعایا اُس سے بددل ہو جائے گی۔ آخر بے چارے لاوارث آپ کی جھولی میں آ گریں گے۔ بس رعایا آپ سے مل گئی تو آرام سے زمینوں پر بغیر رجسٹری کے قبضہ ہو جائے گا۔ پھر زمین تو ہو گی غلام حیدر کی اور اُس میں واہی بیجی کریں گے آپ اور ہم۔ آئی بات سمجھ میں چوہدری صاحب؟

ہوں" عبدل گجر نے سوچتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ عبدل کو جال کی طرف آتے دیکھ کر سودھا سنگھ نے دھیر سنگھ کی "
: بات مزید آگے بڑھائی اور بولا

تمہارے گاؤں کے نزدیک شاہ پور جو غلام حیدر کا گاؤں ہے، وہاں بندے بھیج کر رات کو ساری بھینسیں گھیر لاؤ اور ہدایت کر دو کہ اس کام میں ہو سکے تو ایک آدھ بندہ بھی پھڑکا دیں۔ جب چاروں طرف سے یلغار ہو گی تو غلام حیدر کس کس کا مقابلہ کرے گا۔ ساری برادری اُس کی پاکپتن بیٹھی ہے۔ وہ تو فیروز پور اور جلال آباد آ کر ہم سے مقابلہ کرنے سے رہی۔

ہوں" ٹھیک ہے۔ عبدل گجر اور شریف بودلے نے یہ سن کر مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ "

عبدل دل میں سوچنے لگا کہ آج کسی سکھ نے بھی کوئی کام کی بات کی ہے۔ ورنہ تو ہر وقت دماغ کے بارہ ہی بجے ہوتے ہیں۔

چوہدری عبدل سوچنے کا وقت نہیں "انھیں متاثر ہوتا دیکھ کر سودھا سنگھ نے گرم لوہے پر ایک اور ضرب لگائی" پربھا کا نام لے کر آج ہی کام شروع کر دو۔ میں اپنے بھی کچھ بندے بھیج دوں گا، اگر تمہیں اکیلے میں کچھ شبہ ہے کہ کام ادھورا نہ رہ جائے تو مَیں متھا سنگھ اور رنگا کو بھی حملہ کی رات تیری پارٹی میں بھیج دوں گا۔ مَیں تو متروں کا متر ہوں عبدل بیبا۔

ٹھیک ہے سودھا سنگھ، "عبدل گُجر سودھا سنگھ کی اس آخری امداد سے متفق ہوتے ہوئے بولا" میں سارا منصوبہ کر کے تمہیں اپنی دلیل بتا دوں گا۔ پچاس ایکڑ تو اب میں لے کے رہوں گا۔

القصہ رات پچھلے پہر تک اس مسئلے پر بحث اور گفتگو رہی جس میں بہت سے پہلوؤں پر غور کیا گیا اور ہر معاملے کو بڑی سنجیدگی سے دیکھ کر ایک طے شدہ پروگرام مرتب کیا۔ جس کے تحت ہر حالت میں عمل درآمد کرنا تھا۔ عبدل گجر اور شریف بودلے نے رات وہیں سودھا سنگھ کے ڈیرے پر بسر کی۔ اپنی اپنی پگڑیاں بدلیں۔ قرآن اور گرنتھ پر قسمیں کھائیں۔ جس کے تحت ایک دوسرے کی مدد کے وعدے کیے اور بالآخر سب لوگ اطمینان سے سو گئے جبکہ باقی لوگ جن کے گھر وہیں تھے، وہ اپنے گھروں کو چلے گئے۔

دوسرے دن صبح مرغ کی اذان کے ساتھ ہی عبدل گجر اور شریف بودلہ جاگ اُٹھے۔ سودھا سنگھ جو غالباً باقی رات بھی نہیں سویا تھا بلکہ گروجی کی جے میں پوجا پاٹ کو بیٹھا رہا، ان کے جاگتے ہی آ گیا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں نوردین ماچھی ناشتے کا ٹوکرا سر پہ رکھے آ گیا۔ سردار جی نے خاص اہتمام ناشتے کا کیا تھا۔ جس کا سارا انتظام نوردین ماچھی کے گھر میں کیا گیا۔ ناشتے میں دیسی مرغ کا گوشت، مکھن، شکر، لسی اور دیسی گھی میں تر پراٹھے تھے۔

نوردین نے چوہدریوں کے سامنے ناشتہ بڑے سلیقے سے رکھ دیا۔ سچ پوچھیں تو سودھا سنگھ نے رات سے لے کر اب تک اُن کی اتنی آؤ بھگت کی کہ اب وہ دل و جان سے سردار جی کے ساتھ مل کر غلام حیدر کا تیا پانچا کرنے کو تیار ہو گئے۔ ناشتے کے بعد حقے کے کش لیتے لیتے سورج کافی چڑھ آیا تو انھوں نے سودھا سنگھ سے کہا، بگھی تیار کروا دے تاکہ جلد اپنے گاؤں پہنچ کر منصوبے پر عمل شروع کریں۔

جاری ہے

قسط نمبر 5

(10)

جنوری کا جاڑا پنجاب میں خوشگوار قسم کی خوشبو لیے ہوتا ہے۔ ہر طرف دھند ہی دھند تھی مگر ولیم کو یہ کُہر لندن کے جاڑے سے کہیں زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ آج اتوار تھا۔ اس موسم میں اتوار انگریز افسروں کے لیے نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ دیر تک گرم بستر میں لیٹے رہنا، اُس کے بعد مچھلی کے ساتھ ہلکی شراب کا اہتمام اپنے اندر بڑی کشش رکھتا ہے۔ مگر ولیم نے باورچی کو حکم دیا کہ اس کی کرسی بنگلے کے کھلے صحن میں لگا دے۔ باورچی کرسی اور میز دہلیز کے سامنے لگا چکا تو ولیم نے اُسے کہا کافی بنا لاؤ۔

ولیم کا بنگلہ کم از کم چار کنال کے رقبے میں تھا۔ انگریز نے برطانیہ کے تنگ رقبے اور لندن کے چھوٹے چھوٹے فلیٹس کا غصہ ہندوستان کی دور تک پھیلی ہوئی ہموار زمینوں پر نکالا تھا۔ تنگ گلیوں اور کوارٹروں سے نکلنے کے بعد جب اُس نے اتنی کھلی زمینیں اور رقبے بے مصرف پڑے دیکھے جس کا تصور بھی یورپ نہیں کر سکتا تھا، تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اُنھوں نے وہ سارا احساس محرومی یہاں نکالا۔ کئی کئی ایکڑ پر بنگلے اور دسٹرکٹ کمپلیکس بنا دیے۔ جن کے تیار کرنے میں اُنھیں باہر سے کچھ بھی نہ خرچ کرنا پڑا تھا۔ اسی طرح ولیم کو ملنے والا بنگلہ بھی اپنی نوعیت کا شاہکار تھا۔ پورے چار کنال رقبے کو گھیرے ہوئے سرخ اینٹوں کی آٹھ فٹ اونچی دیوار اور اس کے سروں پر لوہے کی نوکدار سلاخیں مستزاد تھیں۔ دیوار کے ساتھ تین اطراف سے پچاس فٹ چھوڑ کر درمیان میں بنگلے کی سرخ عمارت تھی۔ تمام عمارت میں سرخ اینٹیں اس صفائی اور مہارت سے استعمال کی گئیں کہ پلستر کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ عمارت کے سامنے بڑا وسیع صحن تھا۔ دیوار کے چاروں طرف اور صحن کے سامنے والی دیوار کے ساتھ پیپل کے دس پندرہ درخت تھے، جن کے زرد پتے بکھر رہے تھے۔ عمارت میں چھ سات کمرے لکڑی کے دروازوں کی جلالت کے ساتھ بنگلے اور بنگلے میں رہنے والے کے وقار کے ذمہ دار بھی تھے۔ اسی کی مناسبت سے لکڑی کا بڑا گیٹ تھا۔ جس میں سے برابر دو جیپیں اندرونی عمارت کی دہلیز تک چلی جاتیں۔ عمارت سے کچھ دور کمپلیکس کے دوسرے آفیسرز کے گھروں کی عمارتیں تھیں۔ جو اتنی شاندار تو نہ تھیں جتنی ولیم کی کوٹھی تھی۔ پھر بھی ان میں مقامی عمارتوں کی نسبت ایک قسم کا دبدبہ ضرور تھا۔ ان سب عمارتوں کی دیواریں اٹھارہ انچ موٹائی میں بیس فٹ تک اونچی چلی گئیں تھیں۔ جن کے سامنے اور ارد گرد بھاری درختوں کے سلسلے عمارتوں کی وجاہت کے مزید گواہ تھے۔

ولیم نے ایک دفعہ چاہا کہ نجیب شاہ کو بلا بھیجے مگر افسرانہ تمکنت زیب نہ دیتی تھی کہ اُسے دفتر کے علاوہ گھر پر بھی ملے۔ یہ بات انگریزی آدابِ افسری کے سراسر خلاف تھی۔ نجیب شاہ نے کل ہی بتا دیا تھا کہ رپورٹ تیار ہو چکی ہے جس میں غلام حیدر کی فائل اور سردار سودھا سنگھ کے متعلق تمام ضروری معلومات موجود تھیں۔ لیکن وہ اُسے دفتر میں دیکھ نہیں سکا تھا کیونکہ فوراً میٹنگ کے لیے فیروز پور نکلنا تھا۔ البتہ اُس نے یہ فائل ساتھ لے لی تھی کہ اس کا مطالعہ کر لے۔ جیسے جیسے وہ فائل کا مطالعہ کرتا گیا غلام حیدر کے لیے فکر مند ہوتا گیا۔ دفتر میں غلام حیدر کے ساتھ پہلی ملاقات میں ولیم سے جو غلطی سرزد ہوئی تھی، اُس کے پیشِ نظر اُس نے سوچا کہ غلام حیدر کوئی بھی غلط فیصلہ کر سکتا ہے۔ جبکہ ولیم فائل کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ دوسری صورت میں غلام حیدر کے جوابی حملہ کرنے پر حالات اُسے مجرم بنا سکتے تھے۔ لیکن کل اُسے وقت ہی نہ مل سکا کہ نجیب شاہ کے ساتھ بات کر کے اس مسئلے پر سنجیدہ قدم اٹھا سکے۔ ہاں ڈپٹی کمشنر کو ولیم نے اس بارے تھوڑا سا بریف کر دیا تھا۔ میٹنگ میں یہ مسئلہ زیرِ بحث طے نہ تھا، پھر بھی ولیم نے ضروری سمجھا تھا کہ معاملہ ڈپٹی صاحب کے کانوں تک پہنچ جائے۔ رات وہ دیر سے جلال آباد لوٹا تھا اور آج اتوار کی وجہ سے چھٹی تھی مگر ولیم کو کسی وجہ سے چین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بار بار رپورٹ کا مطالعہ کیا جو نجیب شاہ نے تین دن کے اندر سرکاری کارندوں کی معلومات سے تیار کی تھی۔ اس فائل میں زیادہ تر شیر حیدر اور غلام حیدر کی زندگی کے کوائف جمع کیے گئے تھے۔ واردات کے متعلق رپورٹ تیار کرنا فی الحال نجیب شاہ کے بس کا کام نہیں تھا۔ اس طرح کی رپورٹ پولیس کا کام تھا۔ پھر بھی اپنی حد تک واقعہ کے نشیب و فراز کا تھوڑا بہت جائزہ ضرور لیا گیا تھا اور اہم معلومات دے دی گئیں تھیں، جو انھوں نے موقع واردات پر پہنچ کر حتیٰ کہ سودھا سنگھ اور غلام حیدر کی حویلیوں میں جا کر فراہم کی تھیں۔

ولیم ایک گھنٹہ تک وہیں بنگلے کے صحن میں بیٹھا کافی پینے کے ساتھ فائل کا مطالعہ کرتا رہا۔ آخر بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ملازم کو آواز دی۔

گل دین بھاگتا ہوا کچھ فاصلے پر آ کر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

ڈرائیور کو بلاؤ ہم کہیں جانا چاہتے ہیں" ولیم نے کھردے لہجے میں گل دین کو بغیر نظریں اٹھائے حکم دیا" اور سنو ہمارا اوور کوٹ لے آؤ

گل دین حکم ملتے ہی اُلٹے قدموں بھاگا۔اُس کے جانے کے چند ثانیوں بعد ہی دلبیر سنگھ ڈرائیور پگڑی باندھے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ولیم نے اُسے دیکھ کر کہا، دلبیر سنگھ ،انسپکٹر متھرا سے کہو کہ ہم نے کہیں جانا ہے۔ وہ جلدی سے آ جائے اور تم بھی چلنے کی تیاری کرو، یہ کہہ کر ولیم اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تا کہ چلنے کے لیے ضروری سامان لے لیا جائے۔

ٹھیک بیس منٹ بعد ولیم اوور کوٹ پہنے باہر نکلا تو پورا عملہ انتظار میں کھڑا تھا۔ سی آئی ڈی مِتھرا صاحب، دس عدد سنتری اور ان کے علاوہ بھی دس بارہ لوگ جو قریب ہی رہائش پذیر تھے۔ دلبیر سنگھ باہر جیپ اسٹارٹ کیے کھڑا تھا۔ ولیم نے متھرا کے ساتھ ہاتھ ملایا اور باقی کو دور ہی سے سلام کا اشارہ کر دیا۔جیپ کے پاس آ کر ولیم نے متھرا سے مخاطب ہو کر کہا، متھرا صاحب چھ سنتری لے کر جیپ میں بیٹھ جاؤ اور دوسرے سب اپنے گھروں میں چلے جاؤ۔ جیپ نے جلال آباد کو پیچھے چھوڑا تو ولیم نے ڈرائیور کو حکم دیا، دلبیر سنگھ ہمیں کچھ دیر جودھا پور رُک کر جھنڈو والا کی طرف چلنا ہے۔

دلبیر سنگھ نے سر جھکاتے ہوئے جیپ کو اگلے گیئر میں ڈال دیا۔جیب کی رفتار کے ہموار ہوتے ہی ولیم نے انسپیکٹر متھرا کے ساتھ گفتگو شروع کر دی

متھرا صاحب "کیا میں سمجھوں کہ سودھا سنگھ کا غلام حیدر کے گاؤں پر حملہ کرنا سکھ مسلمان لڑائی ہے یا چودھراہٹ کا معاملہ ہے' ولیم نے بغیر متھرا کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا۔

سر پہلے تو لڑائی ذاتی عناد اور فرد کے مفاد سے شروع ہوتی ہے۔ مگر سکھ اور مسلمان دونوں عقل سے زیادہ جذبات میں پلتے ہیں۔اس لیے یہ لڑائی فوراً کسی ایک نعرے کی بنیاد پر مذہبی روپ لے لیتی ہے۔

متھرا صاحب کو اپنا فلسفہ پیش کرنے کا موقع مل چکا تھا،اس لیے اُس نے بات مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا' سر یہ علاقہ جسے آپ فیروز پور کہتے ہیں، یہاں گیہوں سے زیادہ برچھیاں اُگتی ہیں اور معزز پیشہ چوری ہے۔ بلاشبہ جالندھر کے بدمعاش پر فیروز پور کے مولوی کو فضیلت ہے۔

متھرا صاحب کیا بات ہے تم سکھوں کے بارے میں بہت کم معلومات رکھتے ہو، کیا اُن کے سَنت واقعی جالندھر کے بدمعاش کے مقابلے میں سنت ہی ہیں؟

ولیم کے اس بھرپور طنز پر انسپیکٹر متھرا ایک دم جھنیپ گیا۔ اُسے اپنی لاگدار گفتگو کا احساس فوراً ہو گیا چنانچہ الفاظ کو احتیاط کی شکل دینے لگا اور بولا، سر ایسی بات نہیں ہے۔ سنت اور مولوی سے میری مراد ایک ہی ہے۔ دونوں ہی خون کی تیز گردش میں خدا اور گروجی کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔

میں نے سنا ہے، شیر حیدر کا یہاں کافی اثر ورسوخ تھا" ولیم نے بات فوراً اور اچانک اپنے مطلب کی طرف موڑی جس میں متھرا صاحب کو داخل ہونے میں کچھ وقت لگا، پھر بھی اُسے اس امر کی تصدیق کرنا پڑی۔

انسپکٹر متھرا نے جواب دیا "جی سر" شیر حیدر تو پورے علاقے کا جمعدار بنا ہوا تھا۔ جب تک زندہ رہا، پتا نہیں کھڑکنے دیتا تھا۔

متھرا میں جتنی بات پوچھتا ہوں مجھے اتنا ہی جواب چاہیے۔ ولیم نے دانت پیستے ہوئے کہا، عہدے بانٹنا گورنمنٹ کا کام ہے۔ مقامیوں کو اس میں دخل نہیں۔

متھرا کو ولیم کے خاص کر اس جملے نے سنجیدہ رہنے اور فاصلے کا مطلب سمجھا دیا تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر دونوں طرف سے خموشی رہی اور جیپ دوڑتی رہی لیکن انسپکٹر متھرا نے گھبرا کر سہمے ہوئے انداز میں کہا، جی سر ولیم کی اس تنبیہ پر اب یہ بات اُسے معلوم ہو چکی تھی کہ ولیم کے آگے جھوٹ بولنا اور جانب داری سے کام لینا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ متھرا نے طرح طرح کے بڑے افسروں کو دیکھا تھا۔ اس لیے تجربے کی بنا پر اُسے فوراً محسوس ہو گیا کہ ولیم کا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ لہٰذا جھوٹ بولنے کا فائدہ نہیں۔

شیر حیدر رسہ گیری اور قتل وغیرہ میں کبھی ملوث رہا ہے؟ ولیم نے دوٹوک پوچھنا شروع کر دیا۔

بالکل نہیں سر، متھرا نے اب کے مختصر جواب میں ہی عافیت سمجھی۔

رعایا کے ساتھ کیسا رویہ تھا؟ ولیم نے پوچھا

انسپکٹر متھرداس بولا،، سر اس معاملے میں مَیں بے خبر ہوں۔ میرا واسطہ نہیں پڑا لیکن سر ایک بات ایسی ہے کہ ارد گرد کے مسلمان چودھری بھی اُسکے خلاف تھے۔ شاید وہ ان کی عزت نہیں کرتا تھا۔

اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ اپنی رعایا کی عزت بھی نہیں کرتا تھا۔" ولیم نے متھرا کو دوبارہ پٹڑی پر لانے کی کوشش کی"

جی سر، متھرداس نے گھبرا کر مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

ولیم نے فوراً اگلا سوال کر دیا" گورنمنٹ کے ساتھ تعلقات کیسے تھے؟"

کوئی شکایت سننے میں نہیں آئی، انسپکٹر متھرا نے بغیر وضاحت کے کہا، لیکن ولیم متھرا کے جواب میں چھپے نشتر کو مسلسل محسوس کر رہا تھا۔ متھرا بڑی چالاکی سے کام لے کر ولیم کو باور کرانا چاہتا تھا کہ شیر حیدر گورنمنٹ کے دربار میں گویا حاضر باشوں میں نہ تھا۔

سی آئی ڈی انسپکٹر متھرا کے ساتھ اس گفتگو میں ایک بات ولیم پر واضح ہو چکی تھی کہ غلام حیدر کسی بھی وقت مشکل میں گرفتار ہو سکتا تھا۔ اُس کے باپ کے خلاف بغض دیسی چودھریوں سے لے کر سرکاری افسروں تک بھرا ہوا تھا۔ اس کی واحد وجہ شاید یہ تھی کہ شیر حیدر نے اپنے معاملات اپنے ہی ہاتھ میں رکھے تھے اور وہ فیصلے بھی صحیح وقت میں کرتا رہا تھا۔ انسپکٹر متھرا داس کے ساتھ ولیم کی گفتگو بیس منٹ جاری رہی۔ اس عرصے میں جیپ جلال آباد سے شمال مشرق کی طرف کچی سڑک پر دوڑتی رہی، جس کے دائیں طرف نہر تھی اور بائیں ہاتھ کھیتوں کا سلسلہ۔ دُھند باقی تھی، اِس لیے دور کا منظر صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔ البتہ پاس کی نظر میں غیر واضح سے مناظر تھے۔ کھیت کچھ زیادہ نہیں تھے۔ کہیں چارے کی فصلیں، چری اور مکئی وغیرہ اور کہیں خالی زمین تھی۔ جس میں بھکھڑا، اِٹ سٹ، عک اور دوسری کانٹے دار جڑی بوٹیاں اُگی ہوئی تھیں۔ کیکر، جنڈ اور کریر کے درخت بھی کہیں کہیں نظر آ رہے تھے لیکن اِن کی تعداد ویرانی کے اعتبار سے بہت کم تھی۔ پوری سڑک سرکنڈوں کے بے پناہ جمگھٹوں کے درمیان میدے کی طرح پسی ہوئی گرد سے اٹی پڑی تھی جو بارش ہونے کی وجہ سے اب کیچڑ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اگر رات بارش نہ ہوئی ہوتی تو لازماً جیپ گزرنے کے بعد غبار اِس طرح اُٹھتا جیسے دھویں کے مرغولے چڑھتے ہیں۔ اِن زمینوں کی ویرانی سے صاف پتا چلتا تھا کہ لوگوں کو اپنی معاش کی پروا نہیں۔ وہ کھیتی باڑی سے زیادہ چوری چکاری کو اولیت دیتے ہیں۔ دوسری طرف نہر کے کنارے پر مسلسل کیکروں اور سرکنڈوں کے بے شمار جھنڈ تھے، جو ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔ سرکنڈوں کے بیچ کہیں ٹاہلی یا اسی طرح کا مقامی پیڑ نظر آ جاتا مگر اُن کی حیثیت آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ اِکادُکّا لوگ بھی نظر آئے جو کچھ دیر تک کھڑے ہو کر حیرانی سے جیپ کو دیکھتے پھر اپنے رستے چل دیتے۔ ولیم کو یہ سب دیکھ کر شدید کوفت کا احساس ہو رہا تھا۔ اُسے دل ہی دل میں اُن سابقہ اسسٹنٹ کمشنروں پر غصہ آ رہا تھا، جنھوں نے علاقے میں ذرا بھی ترقی کا کام کرنے یا لوگوں کو کام پر اکسانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ آفیسر محض یہاں افسری کرنے کے لیے آتے رہے تھے۔ جیسے پورے جلال آباد کو شکار گاہ بنانا چاہتے

ہوں۔ جہاں اُن کے کُتے خرگوش اور سوّروں کے پیچھے لمبی دوڑیں بھاگ سکیں۔ اُس نے سوچا اگرچہ اس کوتاہی میں مقامی لوگوں کا بھی نقصان ہے مگر حقیقتاً گورنمنٹ کا نقصان بڑے پیمانے پر تھا۔ کیونکہ علاقہ جس قدر غیرآباد ہوتا، حکومت کو خراج اور مالیے کا نقصان اُتنا ہی زیادہ تھا۔ ولیم کا یہ علاقے کا پہلا بے قاعدہ دورہ تھا۔ وہ سب کچھ ڈائری میں نوٹ کرتا جارہا تھا۔ انہی خیالوں میں تھا کہ جیپ آہستہ سے ایک جگہ پر رُک گئی۔ ولیم نے چونک کر پوچھا، کیا بات ہے رُک کیوں گئے؟۔

سر ہم جودھاپور پہنچ گئے ہیں، دلبیر سنگھ نے جیپ کو گیئر سے نکالتے ہوئے خبردار کیا۔

دلبیر کی آواز سن کر ولیم خیالوں سے باہر آیا۔ اس نے ایک طائرانہ سی نظر پورے گاؤں پر ڈالی جو بمشکل پچاس گھروں پر مشتمل تھا اور آبادی زیادہ سے زیادہ دوڈھائی سو افراد ہو گی۔ جیپ سے تھوڑے فاصلے پر چھوٹی مسجد تھی۔ جس کے دائیں پہلو بڑا پیپل کا درخت لہریں لے رہا تھا۔ مکان سب کچے تھے اور اُن میں سے اکثر کی مٹی سیم اور تھور کی وجہ سے مسلسل گر رہی تھی۔ بعض مکانوں کی دیواریں پاتھیوں کے بیل بوٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ جن میں سے کچھ سوکھ کر نیچے گری پڑی تھیں۔ رات کو غالباً بارش ہوئی تھی اس لیے گلیاں جو پہلے ہی تنگ اور ناہموار تھیں، کیچڑ اور بارش کے پانی سے بھر گئیں۔ اِکادُکا بچے مسجد کے پاس کی قدرے بلند اور خشک زمین پر بانٹے کھیل رہے تھے۔ اُن کے پاس ہی دو بڈھے چارپائی بچھائے کھیل دیکھنے کے ساتھ اپنی باتیں کر رہے تھے، جو بچوں کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ دونوں نے ہاتھ سے بُنے ہوئے کھدر کے کھیس اوڑھ رکھے تھے، جن کے کناروں پر سُرخ اور سوت ہی کے دھاگے کی نیلی ڈوریاں بندھی تھیں۔ اُن ڈوریوں کی وجہ سے کھیسوں کی شوکت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جب کھیلتے کھیلتے بچوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا تو یہ بڈھے بہت آسانی سے اُن کے درمیان منصفی کا فریضہ بھی ادا کرتے جاتے۔ ولیم کی جیپ جیسے ہی وہاں رُکی، سب نے اپنے کام چھوڑ کر اُسی طرف دھیان کر لیا۔ مگر کچھ سہمے سہمے انداز میں۔ دونوں بڈھے بھی چادریں سمیٹتے ہوئے چارپائی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک بوڑھے کی اسی جلدی میں سر سے پگڑی گر گئی، جسے افراتفری کی حالت میں تیزی سے اُٹھا کر وہ سر پر باندھنے لگا۔

ولیم نیچے اُتر کر آہستہ روی سے چلتا ہوا بڈھوں کے قریب آکر رک گیا جبکہ سنتری بندوقیں تھامیں وہیں الرٹ کھڑے رہے۔ اسی طرح انسپکٹر متھرا ولیم کے پیچھے تمیز سے کھڑا ہو گیا۔ اس گاؤں میں غالباً پہلی دفعہ کسی گورے کی آمد ہوئی تھی اس لیے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ حتیٰ کہ اُنھیں یہ تک پتہ نہیں تھا کہ فرنگی سے ڈرنے کا

طریقہ کیا ہے۔ بس بِڑبِڑ اُسے دیکھنے لگے۔ کچھ بچے ڈر کر گھروں کو بھاگ گئے اور کچھ دور جا کھڑے ہو گئے۔ جیسے محفوظ جگہ پر بیٹھ کر تماشا دیکھنا چاہتے ہوں۔ ولیم نے چند لمحوں ہی میں پورے گاؤں کا جائزہ لے لیا تھا۔ سامنے کے گھر میں ایک کیکر کا درخت بھی تھا۔ جس پر زرد پھولوں کی اتنی بہتات تھی کہ وہ پیڑ ہی سونے کا لگتا تھا۔ اسی کیکر پر ایک کبوتر اڑانے والی چھتری پر کبوتر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ یہ سب ولیم کو اتنا دلکش لگا کہ وہ چند لمحے ہر ایک چیز سے بے نیاز اُسی خوبصورت منظر میں کھو گیا۔

ولیم نے آگے بڑھ کر اسلام علیکم کہا اور کھڑے ہو کر گاؤں پر ایک بھرپور نظر ڈالنے لگا۔ اُس کے اس عمل کے دوران وہاں لوگ جمع ہونے لگے مگر اکثر دور ہی اپنے دروازوں سے جھانکا تانی میں لگ گئے کہ نہ جانے ابھی کونسی قیامت آ جائے۔ ولیم کچھ دیر کھڑا رہا پھر آگے بڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اپنی اسٹک اُس نے چارپائی کے سرہانے سے لگا دی۔ اس دوران جو دس بارہ لوگ وہاں آن کھڑے تھے، اُن میں سے ایک بڈھے سے مخاطب ہو کر بولا، بابا ہم نے سنا ہے اِس گاؤں کا آدمی قتل ہوا ہے؟

بڈھا نہایت تمیز سے آگے ہو کر کھڑا ہوا اور بولنے لگا، حضور چراغ دین بالکل بے گناہ مارا گیا۔ (ہاتھ باندھ کر جو ہلکے رعشہ سے کانپ رہے تھے) سرکار سکھوں نے مار دیا۔ بے چارے کی ایک یتیم بیٹی ہے اور بیوی رحمت بی بی بیوہ ہو گئی۔

ہم اس کی بیوی سے ملنا چاہتے ہیں، ولیم نے سپاٹ انداز میں کہا۔

سرکار وہ چالیس دن تک گھر سے باہر نہیں نکل سکتی' بڈھے نے وضاحت کی" اب وہ چالیس دن تک پردے میں رہے گی۔ بچاری کا خاوند جو نہ رہا۔

تو کیا اُن کا کوئی اور رشتہ دار نہیں؟ اگر کوئی رشتہ دار ہے تو اُسے بلا لو، ہم اُسی سے بات کر لیں گی، ولیم نے تحمل سے پوچھا۔

حضور کل ہی قصور سے اس کا بہنوئی مولوی کرامت اور چراغ دین کی بہن شریفاں آئی ہے۔ بچاری پیٹتے پیٹتے بیہوش ہوئی جاتی تھی۔ کرماں والی کا ایک ہی بھائی تھا۔ سکھوں نے مار دیا۔ سرکار ظلم ہو گیا آپ کی سرکار میں۔ سودھا سنگھ نے اندھیر نگری مچا رکھی ہے۔ صاحب بہادر اُس نے سارے انگریزی قانون فیل کر دیے۔

ولیم نے دیکھا کہ بڈھا زیادہ ہی بولنے لگا ہے، دراصل اُس کے نرم رویے نے اِسے کچھ زیادہ ہی حوصلہ دے دیا تھا۔اس لیے وہ عرض و معروض سے بڑھ کر سرکار کی طنز پر اُتر آیا تھا۔ یہ بات حکومت کے وقار کے خلاف تھی۔اُسے اس طرح بولتے دیکھ کر دوسرے لوگ بھی آہستہ آہستہ مجمعے کی شکل میں اُن کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ولیم کو یہ بات ناگوار گزری۔ وہ انصاف کا قائل تو تھا لیکن مقامی لوگوں کے ساتھ فاصلے کی کمی منظور نہ تھی۔ چنانچہ سٹپٹا کر بولا، بڈھے زیادہ باتیں مت بناؤ جاؤ مولوی کرامت کو بلاؤ۔ سرکار اس قتل کا پورا انصاف کرے گی۔

ولیم کے اس سپاٹ اور دوٹوک رویے نے بڈھے کو دوبارہ اپنی اوقات میں کر دیا۔ وہ اس اچانک سرد مہری پر بوکھلا گیا اور کھسیانا سا ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس صورت حال میں اس کا رعشہ مزید بڑھ گیا۔ بڈھے کو پیچھے ہٹتے دیکھ کر دوسرے لوگ بھی جلدی سے پیچھے سرک گئے، جو چند لمحے پہلے ولیم پر سایہ کیے کھڑے تھے۔اِسی اثنا میں ایک لڑکا بھاگتا ہوا مولوی کرامت کو بُلا لایا۔ مولوی کرامت سہمے ہوئے انداز میں لوگوں کو نظر انداز کر کے ولیم کی طرف جانے لگا۔ مجمع اب چھٹ چُکا تھا بلکہ اکثر لوگ اپنے گھروں کے دروازوں پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ اس عرصے میں ولیم ایک تمکنت سے اپنی بیت کو چارپائی کے پائے سے آہستہ آہستہ مارتا رہا۔ مولوی کرامت نے دو قدم دُور ہی سے سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ غالباً اُسے لڑکے نے بڈھے کو صاحب کی طرف سے پلائی جانے والی ڈانٹ کی اطلاع بھی کر دی تھی۔ اِس لیے وہ کچھ زیادہ ہی محتاط نظر آ رہا تھا اور صاحب کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ ویسے بھی مولوی کرامت اس گاؤں کے لوگوں سے زیادہ معاملے کی اونچ نیچ سمجھنے والا تھا کیونکہ تھوڑے بہت کتابی علم نے اُسے معاملہ فہمی کا ادراک دے دیا تھا۔ اسی لیے وہ پچھلی تین پشتوں سے قصور میں اپنی امامت بچائے ہوئے تھا۔ جیسے ہی مولوی کرامت نزدیک پہنچا، ولیم نے اُسے مخاطب کیا۔

خوب آپ مولوی کرامت ہیں؟ ولیم نے اس کے انکسار سے متاثر ہو کر گفتگو کا آغاز کیا۔

آپ کا غلام اور انگریز سرکار کا نام لیوا کرامت ہی ہوں۔ مولوی کرامت نے سارے جسم کی عاجزی چہرے پر سمیٹتے ہوئے جواب دیا

تم چراغ دین کے کیا لگتے ہو؟ ولیم نے اسی بے نیازی سے پوچھا۔

غلام اُس کا بہنوئی ہے۔ مولوی کرامت کے جواب دینے میں ایسی انکساری تھی جو اگرچہ ولیم کی نظر میں چاپلوسی تھی مگر اُسے پسند آئی لہٰذا اُس نے مولوی میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا، تم کہاں رہتے ہو؟ ولیم کی تمکنت برقرار تھی البتہ لہجے میں ہلکی ملائمت در آئی۔

صاحب جی، بندہ تحصیل قصور کی باجگزاری میں ہے اور پیش امامت پیشہ ہے۔ کل شام ہی پہنچا ہوں، مولوی نے اُسی انکسار سے جواب دیا۔

آپ کو اطلاع کب ہوئی چراغ دین کے قتل کی، ولیم نے پوچھا۔

سرکار صبح فضل دین کو معلقہ کا سبق دے کے اور کریماں کا آخری دور ختم کرا کے روٹیاں لینے بھیج دیا اور مَیں تھوڑی دیر چارپائی پر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ سردیوں کے دن ہیں۔ سر پر آفتاب چمکا تو آنکھ کھلی۔ مسجد میں پہنچا تھا کہ ظہر کی اذان کی تیاری کروں، اُسی وقت راج محمد چراغ دین کی خبر لے کر پہنچ گیا۔ یہ بدھ کا دن تھا، کہنے لگا چراغ دین کو سودھا سنگھ کے بندوں نے برچھیوں سے مار دیا اور مونگی کی فصل جو لے جا سکے، لے گئے باقی کو آگ لگا دی۔ وہ بارہ بجے دن کے وقت پہنچا میرے پاس۔ ہم شام کی ریل سے بیٹھے۔ جلال آباد تو سرگی ہی پہنچ گئے تھے لیکن جودھا پور جمعرات دوپہر آئے اور آج جمعہ ہے۔ مولوی کرامت نے مختصر جواب میں پوری تفصیل بتا دی۔

ولیم نے دیکھا کہ مولوی کرامت نے کتنی ہشیاری سے پورا ملبہ سودھا سنگھ پر ڈال دیا ہے حالانکہ اُس نے ملزم کے متعلق کچھ نہیں پوچھا تھا۔

تمہیں اتنی دیر کیوں لگی جودھا پور آنے میں؟ ولیم نے سوال کا سلسلہ جاری رکھا۔

حضور راڑے سے قصور کا دس کوس اور پھر جلال پور سے جودھا پور کا بیس کوس پیدا کیا۔ اس میں دیر ہو گئی لیکن کل ساتے کے ختم پر پہنچ گیا تھا۔

چراغ دین کتنے عرصے سے شیر حیدر کا ملازم تھا؟ ولیم نے پوچھا

سرکار پینتیس سال سے وہ انہی کا نمک خوار تھا، مولوی نے اب مختصر جواب دینے شروع کر دیے۔

غلام حیدر جودھا پور کب پہنچا؟ اب ولیم نے دوبارہ گاؤں کے لوگوں کو مخاطب کیا لیکن لہجے کی سختی برقرار تھی۔

اب ایک اور بوڑھے کو حوصلہ ہوا کہ وہ آگے بڑھ کر جواب دے۔ یہ بوڑھا سر تا پا سفید لٹھے میں تھا۔ مگر ہاتھ میں

عصا نہیں تھا اور کمر بھی جھکی نہ تھی لیکن عمر کے اس حصے میں ضرور تھا جب جسم کی کمزوری طاقت میں کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔

صاحب بہادر جی غلام حیدر منگل کے دن آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ اس خون کو ضائع نہیں جانے دے گا۔ حضور غلام حیدر کو آپ پر بہت بھروسا ہے اور وہ آپ کے انصاف کی بہت تعریف کر رہا تھا۔ کہتا تھا، وہ انگریزی سرکار کے پاس جا کر سودھا سنگھ سے چراغ دین کے قتل کا پورا حساب لے گا۔

ولیم کو بڈھے کی اِس بات پر کوفت ہوئی کیونکہ بڈھا یقیناً جھوٹ بول رہا تھا کہ غلام حیدر کو سرکار پر بھروسا ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا یہ محض اس کی چاپلوسی کی جا رہی ہے مگر اس کی یہ بات ضرور سچ تھی کہ غلام حیدر منگل سے پہلے جودھا پور نہیں آیا تھا بلکہ وہ پچھلے چار سال سے جودھا پور ہی داخل نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ولیم نے گاؤں والوں سے اور بھی کئی سوال کیے جس سے اُسے صاف پتا چل گیا کہ چراغ دین کا قتل اور مونگی کی فصل کا اُجاڑا سودھا سنگھ کے خلاف کوئی سازش نہیں تھی جیسا کہ پہلے اُس کے ذہن کے ایک گوشے میں ہلکا سا اندیشہ تھا۔ اِن سوال وجواب سے فارغ ہو کر ولیم اُٹھ کھڑا ہوا اور جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لوگ فوراً پچھلے قدموں ہٹ گئے جو دوبارہ مجمعے کی شکل میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ ولیم جب تک گاؤں والوں سے بات چیت میں مصروف رہا، انسپکٹر متھرا اور دیگر عملہ ماتحتی بھول کر گفتگو میں دوسرے سامعین کی طرح دلچسپی لے رہے تھے مگر ولیم کے اُٹھتے ہی انھیں اپنی اوقات کا احساس ہو گیا۔ وہ فوراً الرٹ ہو گئے اور ولیم کے احترام میں ایک طرف تعظیم سے کھڑے ہو گئے تا آنکہ ولیم آہستگی سے چلتا ہوا جیپ کی طرف بڑھا اور سوار ہو گیا۔ بعد ازاں سنتری اور متھرا بھی پھرتی سے جیپ میں سوار ہو گئے۔ دلبیر سنگھ نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔ قبل اِس کے کہ وہ اُسے گیئر میں ڈالتا، ولیم نے مولوی کرامت کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ مولوی کرامت بھاگ کر قریب آیا تو ولیم نے نرمی سے کہا، مولوی! کل تمھیں جلال آباد آنا ہے۔ تحصیل میں آ کر مجھ سے ملو۔

مولوی کرامت نے ہاتھ باندھ کر سر ہلایا پھر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کر دیا۔

اس کے بعد جیپ چل دی جس کا رخ جھنڈو والا کی طرف تھا۔ صبح کے دس بج چکے تھے اور جھنڈو والا محض پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ سودھا سنگھ کا گاؤں۔

جیسے ہی جیپ گاؤں سے نکلی، لوگ تین گنا بڑھ گئے۔ عورتیں بھی گھروں سے نکل آئیں اور ولیم کی آمد پر تبصرے ہونے لگے۔ ان کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ وہ کسی انگریز کو دیکھ سکے۔ اس لیے سب بہت پُرجوش اور بھرے بھرے

لگ رہے تھے۔ ان کے خیال میں جودھا پور میں ایک انگریز بڑے افسر کا آنا غلام حیدر کے اثر و رسوخ کا نتیجہ تھا۔ جس نے لاہور میں رہ کر اپنے تعلقات وائسرائے تک بڑے بڑے افسروں سے پیدا کر لیے تھے۔ ورنہ کہاں جودھا پور اور کہاں انگریز سرکار کا کلکٹر۔

ایک شخص نے کہا، بھائی میراں بخش دیکھا تم نے اپنے غلام حیدر کا زور؟ کلکٹر صاحب جودھا پور میں ایسے ہی نہیں آیا۔ غلام حیدر کی مار تو لاہور میں بڑے گھر تک ہے۔

رشید ماچھی جو گنّے کے چھلکے سے زمین پر لکیریں کھینچ رہا تھا، فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا، ”میاں رنگو' میں تو پہلے دن سے ہی سوچے بیٹھا تھا کہ اب سکھڑوں کی خیر نہیں۔ اپنا غلام حیدر شیر ہے شیر۔ انگریز سرکار کا عدل تو اب جودھا پور پہنچے ہی پہنچے۔ سنا ہے تھانیدار کو حکم مل گیا ہے کہ سودھا سنگھ کو ہتھ کڑی لگا کے گھسیٹتا ہوا تھانے لے کے آئے۔

میراں بخش جو چار پائی پر بیٹھ کر حقّے کے کئی کش لگا چکا تھا، بڑی سوچ بچار کے بعد مخاطب ہوا' بیلیو تم خود ہی سوچو، غلام حیدر کس باپ کا سپوت ہے۔ کیا تم بھول گئے ہو جب اُس نے کہا تھا کہ سودھا سنگھ کو اس ناحق خون کا حساب دینا پڑے گا۔

اس کے بعد ایک دو چار پائیاں اور بھی نکل آئیں۔ سردی کی دھوپ سینکنے کے لیے اُن کے پاس یہ ایک ایسا موضوع ہاتھ آ گیا جس کا ایک سرا وائسرائے اور دوسرا جودھا پور سے ملتا تھا۔ اُن کے لیے چوری چکاری اور دیسی قصے کہانیاں اچانک دقیانوسی ہو گئیں۔ چراغ دین کا قتل اور مونگی کی فصل ایسا عظیم واقعہ تھا جس نے انگریز سرکار اور غلام حیدر کی طاقت کے درمیان حدِ فاصل کو ختم کر دیا تھا۔ یہ تو سب کو پہلے سے ہی پتا تھا کہ غلام حیدر بڑے شہروں میں بڑے بڑے لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے جہاں اور بھی بڑے راج والے اور پُلس والے کپتان جمع ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا تھا، غلام حیدر جب تمھیں کوئی مصیبت پڑے تو ہمیں خبر کر دینا۔ تیرے دشمنوں کو باندھ کر تیرے آگے پھینک دیں گے۔ ایک فوج کے سب سے بڑے افسر کو تو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جب وہ غلام حیدر کے ساتھ شکار کھیلتے جودھا پور کچھ دیر رُکے تھے۔

ایک بوڑھی خاتون جس کا گھگھرا ایک مرلے کے گھیر میں پھیلا ہوا تھا، آگے بڑھ کر بولی، وے میراں، ہُن تے جودھا پور نُوں ستے خیراں نے۔ ہُن تے غلام حیدر دا سکھ دی سری تے پیر آ گیا اِے۔

جودھاپور والوں کی نظر میں اب غلام حیدر کے ساتھ سودھا سنگھ کا نام لینا بھی غلام حیدر کی توہین تھی۔اُن کی نظر میں اب سودھا سنگھ محض ایک دیسی بدمعاش اور دو ٹکے کا غنڈہ تھا۔ جبکہ غلام حیدر کے تعلقات نئی دلی سے لے کر ملکہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ مولوی کرامت بڑی خاموشی سے اُن کی باتیں سنتا رہا۔اُس نے نہ تو پہلے کبھی غلام حیدر کو دیکھا تھااور نہ ہی جودھاپور والوں سے کچھ زیادہ واقف تھا۔البتہ اس بات پر دل ہی دل میں خوش تھا کہ اُسے کمشنر صاحب نے تحصیل حاضر ہونے کو کہاہے۔اُس نے سوچا، گاؤں والوں کی نسبت وہ اُس سے زیادہ متاثر ہوا تھا۔لوگ اُسے رشک کی نظر سے دیکھ رہے تھے لیکن کسی قسم کا تاثر نہیں دے رہے تھے کہ مولوی کرامت جو دوسرے ضلع کا ہے، کہیں اپنی برتری نہ سمجھ لے اور جودھاپور والوں کی توہین نہ ہو۔ بہر طور ہر ایک نے آج اپنے کام کو التوا میں ڈال دیا اور وہاں آکر جم گیا۔ جو صبح سویرے چارہ وغیرہ لینے گئے تھے،وہ بھی لوٹ آئے۔ سردیوں کی اس دھوپ میں بیٹھ کر ولیم کی آمد پر طرح طرح سے خیالات کا اظہار کرنے لگے اور جب انھیں یہ پتا چلا کہ ولیم جودھاپور سے سیدھا جھنڈو والا کی طرف گیاہے تو ان میں مزید گرم جوشی پیدا ہوئی۔ میراں بخش نے فوراًایک آدمی کا انتخاب کیاکہ وہ پتہ چلائے، ولیم جھنڈو والا میں سودھا سنگھ سے کیا پوچھ گچھ کرتا ہے۔اس کام کے لیے رحمت علی چھینبے کا قرعہ نکلا، جسے گھوڑی کے ذریعے جھنڈو والا کی حدود میں چھوڑ کر آنے کا کام الٰہ بخش کو سونپا گیا تاکہ وہ جلدی جھنڈو والا پہنچ جائے۔ اگر حدود میں پہنچ گیا توآگے گاؤں تک پیدل ایک ہی کلو میٹر طے کرنا پڑتا ہے۔گاؤں تک گھوڑی پر جانے کا مطلب مشکوک ہونے کے سوا کچھ نہیں تھا۔یوں بھی اب یہ کام خطرے سے خالی نہیں تھا کہ دونوں گاؤں کی اب باقاعدہ دشمنی ہو چکی تھی۔

رحمت علی رخصت ہوا تو میراں بخش نے داڑھی کو انگلیوں سے خلال کیا پھر حقے کے دو چار گہرے کش لیے اور سب لوگوں پر بھرپور نظر ڈالی گویا یہ ثابت کر رہا ہو کہ اس کی یہ کارروائی اس قتل میں اہم کام ہو گی اور یہ کام اسی کو سُوجھا ہے۔اس کے اِس عمل سے ایک گُونہ مولوی کرامت کی اہمیت میں کمی بھی واقع ہو گئی جو چند لمحے پہلے گاؤں کو احساس کمتری میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔

جاری ہے

قسط نمبر 6

(11)

ولیم جھنڈو والا پہنچا تو ایک بج چکا تھا۔ دُھند چھٹ چکی تھی۔ اس لیے گاؤں اور ارد گرد کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ویسے بھی سردی کی دھوپ جب چمک کر نکلتی ہے تو کچھ زیادہ ہی سفید ہو جاتی ہے۔ ولیم کا یہ چھوٹا سا قافلہ اُس کی ایما پر پانچ چھ منٹ تک جھنڈو والا سے ڈیڑھ سو گز پیچھے ہی رکا رہا۔ جیپ پر بیٹھے بیٹھے ولیم جائزہ لینے لگا۔ گاؤں کے ارد گرد زیادہ تر کماد، ہری ہری برسن کے کھیتوں کے بیچ دُور تک پھیلے ہوئے توریے کے زرد زرد پھول اور چری کی فصلیں تھیں۔ ایک دو جگہ گُڑ بنانے کے بیلنے لگے ہوئے تھے اور آگ پر چڑھی ہوئی گنے کی پت سے اٹھنے والی حرارت کی خوشبو ہوا میں گھل مل کر سانسوں کو مہکا رہی تھی۔ کچھ سکھ گڈوں پر چارہ لاد کر گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ جگہ جگہ رہٹ اور کاریزیں تھیں۔ جن کا شفاف پانی کھالیوں میں تیرتا ہوا توریے اور برسن کی فصلوں میں پھیلتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ کھالیوں کے کناروں پر ٹاہلیوں اور پیپلیوں کے سایہ دار درختوں کی قطاریں آگے پیچھے جمی ہوئی تھیں۔ فصلوں کی سرسبزی اور پانی کی طراوت آنکھوں سے ہو کر ولیم کے دل میں اُترنے لگی۔ اُسے جھنڈو والا کے مضافات دیکھ کر وسطی پنجاب کی ہریالیاں شدت سے یاد آئیں۔ گاؤں کے درمیان کھڑے گُردوارے کا منارہ دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ مختصر یہ کہ پورے گاؤں کا ظاہری ماحول پر امن اور اطمینان بخش تھا۔ جس سے ولیم چند لمحے کے لیے متاثر ضرور ہوا۔ جودھا پور کی نسبت یہ گاؤں زیادہ خوش حال دکھائی دیتا تھا لیکن اس سب سرسبزی کو دیکھ کر ولیم نے کسی خیال کے پیشِ نظر انسپکٹر متھرا سے اچانک ایک چُبھتا ہوا سوال کر دیا۔ متھرا کہیں ایسا تو نہیں، جھنڈو والا کی ہریالی اور فصلوں کی شادابی کی جڑوں میں ارد گرد کے گاؤں کا خون سینچا جاتا ہے۔

متھر داس ولیم کی طرف دیکھ کر فقط مسکرا دیا۔ غالباً متھرا جانتا تھا کہ ولیم اس کی کسی بھی بات سے اب کچھ بھی اخذ کر سکتا ہے چنانچہ خاموش رہنا ہی زیادہ بہتر تھا۔

کچھ ہی دیر میں ولیم نے محسوس کیا کہ کام کرنے والے کچھ لوگوں کی نظر اُن پر پڑ چکی ہے اور وہ اُسے اپنا کام چھوڑ کر بغور دیکھنا شروع ہو گئے ہیں۔ ولیم کو ان کی یہ عادت بری لگی۔ خاص کر ہندوستانیوں کی، چاہے وہ مسلمان ہوں یا سکھ، اُن کی اس مشترکہ عادت سے اُسے سخت نفرت تھی۔ وہ کسی بھی چیز کو عجوبے کی طرح دیکھنے کے عادی ہیں۔ پھر اس کے بارے میں انتہائی بیہودہ اور غلط مگر حتمی تاویلیں کرنے کے ماہر بھی۔ ولیم نے دلبیر کو حکم دیا کہ وہ گاڑی

آگے بڑھائے۔ لہٰذا جیپ گاؤں کی طرف بڑھنے لگی۔ متھرا نے ایک دو بار پیچھے نظر ڈالی۔ لوگ جوں کے توں کھڑے دیکھتے رہے حتیٰ کہ جیپ جھنڈو والا میں داخل ہو گئی۔ ولیم کو یقین تھا کہ یہ لوگ اپنا کام چھوڑ کر یا جلد نپٹا کر تماشا ضرور دیکھنے آئیں گے۔

دلبیر سنگھ نے جیپ گاؤں کے عین وسط میں کھڑی کر دی۔ سو فٹ قطر کا چوک تھا۔ جس کے ایک طرف وہی گوردوارہ تھا جس کا منارہ اور گھنٹا ولیم گاؤں سے باہر ہی دیکھ چکا تھا۔ بعض مکان چھوٹی اور پکی اینٹوں کے تھے مگر اکثر کچے ہی تھے۔ کچے مکانوں پر چکنی مٹی کے ساتھ نہایت صفائی سے لیپ ہوا تھا۔ چوک کے عین درمیان میں ایک شریہنہ، تین چار شیشم کے پیڑ اور ایک پیپل کا درخت تھا۔ سب کے پتے جاڑے کے سبب یا تو جھڑ چکے تھے یا ٹہنیوں پر پیلے اور خاکستری رنگوں میں تبدیل ہوئے کسی ہوا کے جھونکے کے منتظر تھے۔ عورتیں جو ادھر اُدھر آ جا رہیں تھیں، زیادہ تر لہنگے پہنے ہوئے تھیں۔ مرد چھوٹوں سے لے کر بڑوں تک قریباً ایک ہی ہیئت میں جوڑا اور پگڑ میں نظر آئے۔ ولیم نے یہ بات بار بار سنی تھی کہ سکھ مسلمانوں کی نسبت کم متعصب ہیں لیکن ظاہری ہیئت میں اُسے سکھ زیادہ بنیاد پرست لگے۔

مسلمانوں کی اکثریت نہ تو داڑھی رکھتی تھی اور نہ ہی نماز کی طرف توجہ دیتی تھی۔ اِن کے مقابلے میں سکھ داڑھی اور بالوں سے بھرے رہتے۔ گاؤں کی گلیاں تنگ ضرور تھیں مگر مکانوں کے احاطے کُھلے کُھلے تھے۔ چاہے وہ پکے تھے یا کچے۔ احاطوں میں شیشم اور کیکر کی لکڑی کے بڑے بڑے پھاٹک تھے۔ دیواریں قدآور نہ تھیں اس لیے احاطوں کے اندر تک نظر جاتی۔ اکثر احاطوں میں مال مویشی بندھا تھا جنھیں دیکھ کر لکڑی کے بڑے پھاٹکوں کی سمجھ آ جاتی تا کہ گڈ اور مویشی آسانی سے گزر جائیں۔

ہر گھر میں نیم، بیری، شیشم، شریہنہ یا اسی طرح کوئی نہ کوئی سایہ دار درخت ضرور تھا۔ گلیاں جو تھوڑی دیر پہلے قریب قریب خالی تھیں، ولیم کے گاؤں میں داخل ہونے سے کچھ ہی دیر بعد سکھوں کو اپنے گھروں سے باہر کھینچنے لگیں۔ اُن کے لیے گاؤں میں کسی گورے کی آمد طوفان سے کم نہیں تھی۔ لوگ گھروں سے باہر نکل تو آئے تھے مگر جودھا پور کی نسبت اِن کے ہاں خوف کی کیفیت زیادہ تھی۔ ہر ایک جانتا تھا کہ مونگی کی تباہی اور قتل تو بہر حال جھنڈو والا نے ہی کیا ہے۔ ولیم دیکھ رہا تھا، لوگ آپس میں کچھ کُھسر پُھسر کر رہے ہیں۔ خوف کے باوجود ولیم کے ارد گرد کچھ لوگ جمع ہو گئے۔ اُن میں سے ایک شخص سے متھرا داس نے پوچھا، او بُڈھے، سردار سودھا سنگھ کا کچھ پتا ہے؟

اس شخص نے جس کی داڑھی ناف تک آتی تھی اور ہاتھ میں سیر بھر کا لوہے کا کڑا تھا، ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور کہا، صاحب جی وہ سامنے سودھا سنگھ کی حویلی ہی تو ہے۔ پھر ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے، لو جی وہ سردار صاحب خود ہی آ رہے ہیں۔ ولیم نے سامنے دیکھا، سو فٹ کے فاصلے پر سردار سودھا سنگھ آ رہا تھا۔ اُس کے آگے پیچھے آٹھ دس جوان کرپانیں اور برچھیاں لیے ہوئے تھے۔ سردار کا جسمانی ڈیل ڈول، مونچھوں کا تاؤ، داڑھی کا لمباؤ اور ہاتھ میں پندرہ تولے سونے کا کڑا دیکھ کر ولیم کو ایک دفعہ کپکپاہٹ سی آ گئی۔ مگر ہر حکمران کے اندر چونکہ ایک غیر مرئی طاقت کا حوصلہ موجود ہوتا ہے۔ اس لیے ولیم نے اپنی کیفیت پر جلد ہی قابو پا لیا اور چہرے پر کسی بھی احساس سے عاری نقش واضح کر لیے۔ اتنے میں سردار سودھا سنگھ نے نزدیک ہو کر ہاتھ جوڑے اور پرنام کیا۔ ولیم نے اس کا جواب انتہائی سرد مہری سے ویلکم کہہ کر دیا۔ اس کے بعد متھرا سے مخاطب ہو کر کہا، متھرا ہم کچھ دیر سودھا سنگھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اِن سے کہو، بیٹھنے کا انتظام کرے۔ ولیم نے سودھا سنگھ کو براہ راست مخاطب نہیں کیا تھا اور گفتگو کا انداز بھی دو ٹوک تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ صاحب کمشنر بہادر کے موڈ ٹھیک نہیں تھے۔

سودھا سنگھ سے بالواسطہ مخاطب ہونا اور بے پروائی سے پرنام کا جواب دینا ایسی گستاخی تھی جس نے اُس کی طبیعت کو نہایت منغض کیا۔ اُس نے سوچا سب قسمت کے کھیل ہیں، ورنہ اس گوری چمڑے کے چھ فٹ بالکے کی کیا حیثیت تھی۔ ابھی زمین میں کلّے کی طرح گاڑ کر ساتھ ڈاچی باندھ دیتا۔ یا پھر چھدّو سے کہتا کہ اِسے ذرا جھانبڑ پھیر اور بیلنے پر بیلوں کی جگہ اِس فرنگی کو جوت دیتا۔ مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا آخر سرکار انگریز تھی۔ چنانچہ غصے کے باوجود سودھا سنگھ نے چہرے پر خوشگوار سی کیفیت پیدا کرتے ہوئے کہا، سرکار کا جھنڈو والا میں قدم رکھنا ہمارے بھاگ ہیں۔ صاحب بہادر کو برا نہ لگے تو میری حویلی حاضر ہے، وہیں بیٹھ کے بات کر لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سردار جی کے چہرے پر ہلکے پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ ولیم نے قدم بڑھائے تو متھرا فوراً باہر کی طرف ہو کر تعظیم سے چلنے لگا۔ دونوں سنتری بندوقیں لیے ولیم کے پیچھے ہو گئے۔ ولیم تھوڑا سا آگے بڑھا تو دلبیر سنگھ نے جیپ اسٹارٹ کر کے آہستہ آہستہ حویلی کی طرف بڑھا دی۔

ولیم جیسے ہی حویلی میں داخل ہوا، اُس کی ہیبت نے ایک دفعہ پھر اُسے اپنی جکڑ میں لے لیا۔ اتنے بڑے اور وسیع احاطے میں چاروں طرف سینکڑوں برآمدے اور برآمدوں میں چھوٹی اینٹوں سے بنائے گئے سینکڑوں ستون ایک کے بعد ایک، اس طرح پھیلے تھے جیسے ستونوں کے جنگل آباد ہوں۔ یہ تمام ستون نوے کے زاویے کی خمدار ڈاٹوں کا بار

اُٹھائے ہوئے تھے۔ان ڈاٹوں کے سروں پر گول اور چوڑی دار محرابوں والے بام پَر پھیلائے ہوئے آگے کی طرف جھکے تھے۔برآمدوں کے اندر بیس بیس قدم ہٹ کر کمرے تھے۔جن کے دروازے اور کھڑکیاں شیشم کی سیاہ لکڑی کی اِس خوبصورتی سے تیار کی گئیں تھیں کہ کاری گروں کو داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا تھا۔یہ کمرے بھی اتنی ہی تعداد میں تھے جتنی تعداد میں دروازے تھے۔انہی برآمدوں کے ایک طرف سے کافی کھلا رستہ چھوڑ کر ایک بڑا دروازہ مزید نکال دیا گیا تھا۔جو حویلی کے زنانہ حصے کا راستہ تھا اور سردار سودھا سنگھ کے گھر کا حصہ تھا۔ولیم اس ساری ہیبت کو دیکھنے کے بعد اپنی حکومت کی ہیبت کا اندازہ لگانے لگا جس نے اس پورے ملک کی تمام حویلیوں کی گردن اپنے پاؤں کے نیچے رکھ لی تھیں۔ولیم نے فوراََ ہی اِن خیالات کو سر سے جھٹک دیا اور موجودہ صورت حال کی طرف دماغ کو لے آیا۔

جب بیٹھ چکے تو سردار سودھا سنگھ نے انسپیکٹر متھرداس اکو مخاطب کر کے پوچھا، تھانیدار جی، کلکٹر بہادر کیا لسی وسّی پئیں گے یا کوڑے پانی کا بندوبست ہو جائے؟متھرا کافی حد تک ولیم کا مزاج سمجھ چکا تھا اس لیے فوراََ منع کر دیا۔ حویلی میں بہت سے آدمی جمع ہو گئے تھے، جنھیں سردار سودھا سنگھ نے باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔تمام لوگ چند ایک کے سوا جو سودھا سنگھ کے صلاح مشورے کے لیے ہر وقت کے لیے حاضر باش تھے، حویلی سے باہر جا چُکے تو سودھا سنگھ نے حویلی کا بڑا دروازہ بند کروا دیا۔

سودھا سنگھ نے ولیم کو بیٹھنے کے لیے ایک بڑے موڑھے کی طرف اشارہ کر دیا۔یہ تین فٹ چوڑا پر شکوہ موڑھا بید کی شاخوں کو ریشم سے بُنی ہوئی رسیوں سے باندھ کر بنایا گیا تھا۔اِسے ہمیشہ سودھا سنگھ کی چارپائی کے سامنے رکھا جاتا اور وہی بندہ اس پر بیٹھ سکتا تھا، جو سودھا سنگھ کا خاص آدمی ہوتا ورنہ یہ خالی پڑا رہتا۔اِس کے دائیں طرف سامنے ہی سودھا سنگھ کی چارپائی تھی۔یہ بھی پانچ فٹ چوڑی، سات فٹ لمبی اور اڑھائی فٹ اونچی صندل کی لکڑی کے پایوں اور بازووں سے تیار کی گئی تھی۔جسے ریشمی بان سے بُنا گیا تھا اور پائنتی پر کھدّر کی موٹی دوہریں تھیں۔سرھانے دیسی کپاہ سے بھرا ہوا ریشمی تکیہ پڑا تھا۔اُس کے ساتھ سودھا سنگھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔باقی مُوڑھے اور چارپائیاں دو رُویہ بچھے تھے، جو ایسے قیمتی تو نہ تھے جیسے چارپائی یا موڑھا مگر بُرے بھی نہ تھے۔یعنی عام گھروں کی چارپائیوں اور مُوڑھوں کی نسبت تو اچھے خاصے مہنگے تھے۔ولیم سامنے اُسی بڑے موڑھے پر بیٹھ گیا۔اِس کے بعد سودھا سنگھ نے بڑی چارپائی پر ٹانگیں پسار لیں اور کرپان کمر سے کھول کر سرہانے کے ساتھ رکھ دی۔اسی طرح سودھا سنگھ کے

آدمی بھی چارپائیوں پر بیٹھ گئے مگر سنتری بندوقیں لیے ویسے ہی ولیم کے دائیں بائیں کھڑے رہے۔ چند لمحے خاموشی سے گزر گئے جیسے ہوا کا دم حبس کی وجہ سے گھُٹ جاتا ہے پھر فوراً ہی ولیم نے گفتگو کا آغاز کر دیا۔ اُسی لمحے متھرا نے محسوس کیا کہ ولیم کے چہرے پر ایسا رعب تھا کہ ابھی تک اُس نے اِسے ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ اب وہ محض ایک نوآموز اسسٹنٹ کمشنر نہیں لگ رہا تھا بلکہ ایک منجھا ہوا انگریز سرکار کا نمائندہ معلوم ہوتا تھا۔

سودھا سنگھ ہم آپ کے جھنڈووالا میں آئے ہیں، براستہ جودھا پور۔ کیا آپ کو ہمارا اس راستے سے بغیر اطلاع دیے آنا پسند آیا؟

سودھا سنگھ جو پہلے ہی بے قراری کی کیفیت میں تھا، کو ولیم کے پہلے ہی سوال کی تیز کاٹ نے ہلا کے رکھ دیا۔ اُسے اول تو ولیم کا اس کے نام سے سردار کا لفظ ہٹا دینا ہی بُرا لگا کہ اپنے بندوں کے درمیان اس کی یہ صاف توہین تھی۔ اس پر ستم یہ کہ سوال جس چابکدستی سے کیا گیا تھا، اِس طرح کی بجھارتوں اور چالبازیوں کے سننے کی اُسے عادت نہیں تھی۔ یہ سب عمل سودھا سنگھ پر بہت گراں گزرا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، فوجا سیوئ جو سودھا سنگھ کی ہر مشکل معاملے میں مدد کر گزرتا تھا، نے سوچا، کہیں سودھا سنگھ کوئی بونگی نہ مار دے، فوراً بولا، سرکار یہ ملک آپ کا ہے۔ ہم آپ کی رعایا ہیں، آپ جب اور جس وقت چاہیں اپنی رعایا کی سیوا کو آ سکتے ہیں۔ اس میں ہمارے پسند اور نا پسند کی کون سی بات ہے۔

ولیم کو فوجا سیوئ کی اس طرح دخل اندازی پر شدید غصہ آیا۔ وہ جانتا تھا، اِس طرح کے لوگ بات سنبھالنے کے بہت ماہر ہوتے ہیں۔ کسی بھی معاملے کو چھپانے اور مجرم کو بچانے میں ان سے زیادہ کارآمد کوئی نہیں ہوتا۔

فوجا سیوئ کا جواب سن کر ولیم نے اپنی بیت سامنے پڑی میز پر رکھ دی اور دوبارہ بولا، لیکن اُس نے فوجا سیوئ کی طرف دیکھا بھی نہیں مخاطب سودھا سنگھ کو ہی رکھا۔

سودھا سنگھ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں جھنڈووالا کے ہر شخص سے الگ الگ پر نام لوں۔ میں یہاں بیس منٹ ٹھہروں گا۔ اِس دوران صرف آپ ہی سے بات کرنا میرے لیے عزت کا باعث ہو گی۔ جب اِن کی ضرورت پڑے گی تو انھیں تحصیل بلوالوں گا۔ (پھر فوجا سیوئ کی طرف منہ کر کے) اور میرا خیال ہے، یہ بُڈھا بخوشی آ جائے گا۔ ولیم کی بڑبڑاہٹ سن کر فوجا سیوئ تو بالکل ہی بیٹھ سا گیا اور اُس کی ساری پُھرتیاں ہوا ہو گئیں۔

اُدھر سودھا سنگھ کو کلکٹر کی اس بات سے آگ لگ گئی، گویا کسی کے کلیجے پر سُرخ کوئلے رکھ دیے ہوں مگر جو مجرم کے اندر ایک ڈر بیٹھ جاتا ہے اور اُس کی وجہ سے دل مسلسل خوف کی حالت میں چلا جاتا ہے اور قانون ایک ایسے کالے ناگ کی طرح دکھائی دیتا ہے، جس کے آگے پیچھے ڈنک ہی ڈنک ہوں۔ یہی حالت اِس وقت سودھا سنگھ کی تھی۔ اُسے نہیں معلوم تھا اس چھوٹے سے واقعے پر انگریز کمشنر خود آ جائے گا۔ دیسی تھانیداروں کی تو یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ اس طرح بات کریں لیکن وہ اس سے پہلے کسی انگریز افسر سے کبھی دوبدو نہیں ہوا تھا اور طاقت ور حکومت کا ڈر بھی سر پر کھڑا تھا۔ اس لیے کچھ ایسا ویسا عمل کرنے سے عاجز تھا۔ اگر کوئی اور ہوتا اور یہی کچھ بولتا جو یہ ولایتی مُنڈا بول رہا تھا تو وہ جھنڈو والا کی یادیں عمر بھر نہ بھولتا۔

آخر سودھا سنگھ نے ہمت کر کے اپنے اوسان مجتمع کیے، مونچھوں پر ہاتھ کی انگلیاں سرکائیں اور بولا، صاحب بہادر، سردار سودھا سنگھ کو کیا پتا کہ سرکار اتنا لمبا چکر کاٹ کر جلال آباد سے جھنڈو والا کیوں تشریف لائی اور ہماری عزت افزائی کی۔ واہگرو کی جے سے سرکار کی مہمانی ہمارا فرض ہے، جو ہو سکا کریں گے۔

ویل سودھا سنگھ " ولیم دوبارہ بولا" آپ کا گاؤں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ کنویں چلتے ہیں، گنے اور گندم ہے، ہر طرف سبزے ہی سبزے ہیں۔ سودھا سنگھ، یہاں مکئی اور برسن بھی بہت ہے، دو چار ایکڑ مونگی بھی ہوتی تو کچھ بُرا نہیں تھا۔ اِدھر اُدھر سے لوٹنے کھسوٹنے کی حاجت نہ رہتی، خواہ مخواہ کی پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔

اس جملے کے ادا کرنے کے ساتھ ہی ولیم نے سودھا سنگھ سمیت دوسرے سرداروں کے چہروں پر بھی بھرپور نظر دوڑائی اور محسوس کیا کہ سب کے رنگ واضح تبدیل ہو گئے تھے۔

سودھا سنگھ اپنے آپ کو فوراً سنبھال کر بولا، صاحب بہادر آپ کی باتیں کچھ میرے اُوپر اُوپر سے گزر رہی ہیں۔ واہگرو کی جے ہو، کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔

سودھا سنگھ، ولیم نے اُسی رَو میں کہنا شروع کیا، آپ کے ہمسائے میں عجیب طرح کے کام ہوتے ہیں۔ قتل وتل تو شاید سرداروں کا معمول ہے لیکن مونگی تو ہندو کھاتے ہیں۔ خاص کر بنیے، کیا میں نے غلط کہا سودھا سنگھ؟ آپ تو شاید جھٹکے کا گوشت کھاتے ہیں۔

میں سمجھا نہیں صاحب بہادر" سودھا سنگھ نے دونوں پاؤں چارپائی سے نیچے لٹکاتے ہوئے کہا،، آپ مجھ سے اس طرح کی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔ کون سی مونگی اور کون سے قتل؟

ولیم اب اُٹھ کھڑا ہوا اور سودھا سنگھ کی چارپائی پر پائنتی کی طرف بیٹھ گیا۔ ولیم کے اس عمل سے سودھا سنگھ ایک دفعہ تو لرز کر رہ گیا۔ اتنی جرأت تو جھنڈو والا میں خدا ہی کر سکتا تھا۔ سودھا سنگھ سمجھ چکا تھا کہ ولیم اُس پر ثابت کر رہا ہے کہ اب بات سیدھی سیدھی ہو گی۔

سردار صاحب، یہ بتایئے، اس وقت پنجاب میں کس کا راج ہے؟ ولیم نے نہایت بے تکلفی دکھاتے ہوئے سوال کیا۔

سودھا سنگھ نے حیرت سے ولیم کی طرف دیکھا اور کہا، انگریز سرکار کا، کلکٹر صاحب، بھلا مجھے اتنا بھی نہیں پتہ؟" ہلکا سا مسکرا کر" آج صاحب بہادر آپ عجیب طرح کی باتیں کر رہے ہیں (موڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کمشنر صاحب یہ موڑھا میں نے آپ ہی کے لیے رکھوایا ہے۔

ولیم سودھا سنگھ کے آخری فقرے کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے مسکرا کر بولا، چلو یہ بات تو طے ہوئی کہ رنجیت سنگھ کا راج ختم ہو چکا اور اب پنجاب پر ہمارا راج ہے۔

سودھا سنگھ آخر کار گھبرا کر ذرا تلخی سے بولا، سرکار آپ بجھارتیں بجھواتے ہیں۔

ولیم نے سودھا سنگھ کی تلخی کو مزے سے محسوس کیا اور اُس کی حالت سے لُطف اُٹھاتے ہوئے دوبارہ بولا، سودھا سنگھ مَیں نے سمجھا تھا، جودھا پور جو یہاں سے صرف پانچ کلو میٹر پر ہے، وہاں ایک بندہ قتل ہو جائے، بیس ایکڑ مونگی کی فصل ویران ہو جائے اور سردار سودھا سنگھ کو پتہ نہ چلے، تو ہو سکتا ہے اُسے ڈیڑھ سو میل دُور لاہور میں ابھی تک انگریزی راج قائم ہونے کی بھی خبر نہ ملی ہو۔ وہ یہی سمجھے بیٹھا ہو کہ لاہور تخت ابھی تک مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وارثوں کے پاس ہے۔ اس میں سردار صاحب بجھارتوں والی کیا بات ہے؟

سودھا سنگھ کے ماتھے پر دوبارہ پسینہ آ گیا مگر جلد ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور بولا" صاحب بہادر، مَیں لائل پور گیا ہوا تھا، کل آیا ہوں۔ رات پتہ چلا کہ جودھا پور میں ایک بندہ قتل ہو گیا ہے اور مونگی کو آگ لگ گئی ہے لیکن میں نے پورا سیاپا نہیں سنا۔

ولیم نے سودھا سنگھ کی طرف بھرپور طنز سے دیکھا اور کہا، سیاپا سردار جی گورنمنٹ آپ کو بتا دے گی۔ اسی لیے تو ہم آئے ہیں کہ آپ لائل پور میں تھے۔ آپ کی غیر حاضری میں یہ سانحہ ہوا اور آپ کو کچھ پتہ نہیں۔ اب ہمارا کام ہے، اِس پورے قصے کی تفصیل بتائیں کہ آپ کی غیر موجودگی میں بدمعاشوں کا ٹولہ جودھا پور میں داخل ہوا۔ ایک بندہ

قتل کر دیا، مونگی کاٹ کر گڈوں اور چھکڑوں پر لاد لی اور باقی کو آگ لگا دی۔ حالانکہ یہ سب کام آپ کی موجودگی میں ہونے چاہییں تھے۔

سردار سودھا سنگھ گفتگو کے اس اُلٹ پھیر کے انداز سے بالکل واقف نہ تھا اور نہ ہی اسے یہ پتا چل رہا تھا کہ ولیم اِس طرح باتیں کیوں کر رہا ہے۔ کس لیے سیدھی سیدھی واردات اس پر نہیں ڈال دیتا جبکہ ولیم سودھا سنگھ کو ذہنی طور پر اذیت پہنچانا چاہتا تھا۔ جس میں وہ کامیاب ہو رہا تھا۔ اُدھر فوجا سیوُ ڈانٹ کھا کر خاموش دُور بیٹھا یہ سمجھ چکا تھا کہ سودھا سنگھ کے ہاتھ پُڑوں کے نیچے آنے ہی والے ہیں۔ اُسے پتا چل گیا تھا کہ یہ فرنگی چھوہرا واقعی ٹیڑھی کھیر ہے۔ جس کو گھمانا ممکن نہیں۔ چنانچہ اُس نے خموشی ہی میں غنیمت سمجھی اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔ البتہ سودھا سنگھ نے یہ سمجھ لیا کہ اب بات کھل کر کی جائے، جو ہونا ہے وہ تو ہو ہی جائے گا۔ کیونکہ سرکار کو اُس کے کرتوت کا پتہ چل گیا ہے۔ ایسے ہی تو یہ فرنگی چھوکرا اوکھی اوکھی باتیں نہیں کر رہا۔ لہٰذا وہ اب صاف صاف جواب دینے لگا اور کچھ دلیری سے بولا، کمشنر صاحب، غلام حیدر ابھی مُنڈا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ شیر حیدر کی مجھ سے پرخاش تھی۔ پر اس کی موت کا واہگرو کی سونہہ مجھے بہت افسوس ہوا۔ لیکن یہ بات اس چھوکرے کو کون سمجھائے کہ بزرگوں پر اتنے بڑے کُوڑے الزام سوچ سمجھ کے لگانے چاہئیں۔ پھر بھی جو ہو سکا جودھا پور کے معاملے میں آپ کی سیوا کروں گا۔ کمشنر صاحب کسی نے یہ کام کر کے شیر حیدر اور مجھ سے پرانی دشمنی کا حساب چُکایا ہے۔

سودھا سنگھ، ولیم نے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا" وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں جنھوں نے شیر حیدر اور آپ سے پُرانی دشمنی کا حساب چُکایا ہے؟ کیا آپ سرکار کو اس بارے میں کچھ بتائیں گے؟

صاحب بہادر" اپنی داڑھی میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سودھا سنگھ بولا" سرکار کو سمجھنے میں مشکل نہیں ہو گی۔ کمشنر صاحب، اکثر یہ کام خود ہی کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے غلام حیدر نے اپنے بندے کو خود قتل کر دیا ہو۔ آپ اس معاملے پر بھی غور کر لیں۔

بہت اچھا سودھا سنگھ" ولیم دوبارہ بولا، آپ بہت جلد اس الزام پر اُتر آئے ہیں جو آپ کے خیال میں بغیر ثبوت کے" آپ پر لگ چُکا ہے لیکن آپ یہ بھول رہے ہیں کہ اس کے ایک دن پہلے شیر حیدر فوت ہوا ہے اور اُس کا بیٹا غلام حیدر جسے میرے خیال میں اس علاقے اور آپ سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا، لاہور سے اسی روز پہنچا ہے۔ ہو سکتا ہے اتنی

بڑی اور فوری منصوبہ بندی کی اس کو ضرورت پیش آ گئی ہو لیکن آپ کا اتنی جلدی اس پر ایسا الزام لگانا آپ کے منہ پر نہیں پڑتا کیونکہ ابھی ابھی آپ اسے ایک 'ندان منڈا' کہہ چکے ہیں۔

اس کے بعد ولیم موڑھے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا" ویسے سردار صاحب، آج یہاں آنے کا مقصد آپ سے اعترافِ جرم کروانا نہیں تھا۔ یہ کام پولیس کا ہے۔ میں تو بس آپ کے درشن کرنے آیا تھا اور یہ بتانے کہ گورنمنٹ کی ابھی اجازت نہیں ہے کہ کوئی اپنی مرضی سے حملے کر کے قتل اور لوٹ مار کرتا پھرے۔ دوسری بات سودھا سنگھ یہ ہے کہ چارپائی بھی گورنمنٹ کی ہے اور موڑھا بھی گورنمنٹ کا۔ جس پر اُس کا جی چاہے بیٹھے اور جہاں جی چاہے عدالت لگا دے۔آپ رعایا ہیں، رعایا کی طرح رہیے۔ اب حکم یہ ہے کہ آپ سرکار کی اجازت کے بغیر جھنڈو والا سے باہر نہیں جائیں گے۔

یہ کہہ کر ولیم چل پڑا اور اس کے ساتھ متھراداس بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

سردار سودھا سنگھ اِس کھلی دھمکی کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ اٹھ کر بولا، سرکار آپ زیادتی کر رہے ہیں۔

سودھا سنگھ کی بات سن کر ولیم ایک دفعہ رُکا اور پیچھے مُڑ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا" سودھا سنگھ یہی بات میں کہنا چاہتا ہوں کہ سرکار نہ زیادتی کرتی ہے نہ کرنے دیتی ہے۔ چاہے قاتل سردار سودھا سنگھ کے بندے ہی کیوں نہ ہوں اور قتل ہونے والا چراغ دین ماچھی ہی کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد ولیم جلد ہی حویلی سے باہر نکل آیا۔ متھراداس ولیم کی اس تیزی اور پھرتی پر حیران ہی نہ تھا، پریشان بھی تھا۔ وہ اچھی طرح جان گیا تھا کہ ولیم کے ساتھ کام کرنا کتنا مشکل ہو گا۔ چنانچہ اُسے ہر طرف سے چوکنا رہنا تھا اور اس کیس میں نہ چاہتے ہوئے بھی غیر جانبدار فیصلے کرنا تھے۔ اُس نے اپنے آپ سے کچھ عہد کیے اور کیس کی تفتیش صحیح پیمانے پر کرنے کا تہیہ کر لیا۔ کیونکہ ملازمت ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ بھی انگریز سرکار کی ملازمت، جس کا سکہ آدھی دنیا پر چلتا تھا۔

جاری ہے

قسط نمبر 7

(12)

شاہ پور جلال آباد کے شمال میں دس کلو میٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس گاؤں کی آبادی تین سو کے لگ بھگ تھی۔ ساری آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ پورا گاؤں شیر حیدر کی ملکیت تھا اس لیے جوں کا توں غلام حیدر کی طرف منتقل ہو گیا۔ دراصل یہی وہ گاؤں تھا جو اُن کی آبائی جاگیر تھی۔ جودھا پور شیر حیدر کو بیوی کی طرف سے ملا تھا اور جلال آباد کے مضافات میں جو دو ہزار ایکڑ زمین تھی، وہ یا تو آلاٹی تھی یا پھر خریدی ہوئی تھی۔ غلام حیدر کا آبائی گھر بھی شاہ پور میں تھا۔ گھر کیا تھا، چھوٹی اینٹوں سے بنی قلعے جیسی حویلی تھی جس کا بیرونی دروازہ گویا ہاتھیوں کے لیے بنایا گیا تھا۔ دروازے کے سامنے دائیں بائیں ڈیوڑھیاں تھیں۔ اُن کی چھتوں پر ٹاہلی کی سیاہ لکڑی کے موٹے شہتیر اور ٹاہلی ہی کے آنکڑے تھے۔ صحن میں تین چار نیم کے درخت اتنے بڑے تھے کہ پورے صحن اور حویلی کی چھتوں کے اُوپر تک اُن کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ گرمیوں میں ان کا سایہ جس قدر راحت بخش تھا، سردیوں میں اتنا ہی تکلیف دہ ہو جاتا، جو ارد گرد کے گھروں میں بھی جا نکلتا۔ غلام حیدر نے اُن کی شاخیں کبھی کٹوائی نہیں تھیں۔ کچھ حویلی کے کمروں اور دیواروں کا رعب اور کچھ اِن نیم کے پیڑوں کی جلالت اور بزرگی نے اِسے شاندار ہیئت سے نوازا تھا جو دیکھنے والے کو مرعوب کر دیتی۔ حقیقت میں یہ گاؤں ارد گرد کے تمام گاؤں سے زیادہ خوشحال تھا۔ اسی گاؤں میں ایک پرائمری کے درجے تک اسکول بھی تھا۔ اسکول کی عمارت تین ہی کمروں پر مشتمل تھی لیکن اس عمارت اور سکول کی بیرونی دیوار سے بھی انگریزی وقار جھلکتا تھا۔ تمام عمارت اور دیوار پختہ سُرخ اینٹوں سے بنی تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ پاپلر اور سنبل کے بے شمار درخت بھی تھے، جن کی شاخوں اور چھاؤں کے گھیراؤ میں ساری عمارت چھپ گئی تھی۔ مگر مولویوں کی کرم فرمائی سے بچوں کی تعداد بیس سے نہ بڑھ سکی۔ وہ بھی زیادہ تر ادھر اُدھر سے کچھ چوہڑوں اور کراڑوں کے بچے تھے۔ گاؤں کے ایک دو بچے ہی پڑھنے آتے۔ گاؤں میں پپلیوں اور ٹاہلیوں کی بھرمار تھی۔ کئی مکان پکے تھے لیکن اکثر آبادی کچے گھروں میں مقیم تھی۔ مگر تھے وہ بھی صاف ستھرے۔ الغرض جودھا پور کی نسبت شاہ پور ایک خوشحال گاؤں تھا۔ لوگوں کے پاس مال مویشی بے انت تھا۔ شیر حیدر جب تک زندہ رہا، اس کی ساری توجہ اپنے آبائی گاؤں شاہ پور پر رہی۔ اُس نے خصوصی ہدایت کی تھی کہ گاؤں صاف ستھرا اور کوڑا کرکٹ سے پاک رہنا چاہیے جس پر پورا عمل کیا گیا۔ وہ اُسے ایک ماڈل گاؤں بنانا چاہتا تھا کہ آس پاس کے

چوہدریوں پر اُس کی مزید دھاک بیٹھ جائے۔ اسی سلسلے میں اُس نے ایک دفعہ کسی سے کہہ کہلا کر اسسٹنٹ کلکٹر جلال آباد کو بھی وہاں مدعو کیا تھا، جو گاؤں کی صفائی دیکھ کر بہت خوش ہوا، شیر حیدر کے انتظام کی بہت تعریف کی اور ایک سکول کا اعلان کر گیا لیکن اسے ماڈل گاؤں کا درجہ حاصل نہ ہو سکا تھا۔ خیر انہی وجوہات سے گاؤں میں مال مویشی رکھنے کی ممانعت ہو گئی۔ ان کے لیے شیر حیدر نے یہ انتظام کیا کہ گاؤں کے ساتھ ہی ایک پانچ ایکڑ کا احاطہ تعمیر کروا کے اُس کے گرد کچی دیوار کرا دی۔ تمام لوگ، جن کے پاس مال تھا، اُنھیں حکم دیا کہ وہ ڈھور ڈنگر وہیں باندھا کریں۔ اُس وقت سے پورے گاؤں کے مویشی وہیں بندھتے اور اُن کی حفاظت کے لیے ہر گھر کا ایک فرد رات کو وہاں ٹھہرتا۔ چوری چکاری کا ڈر اس لیے نہیں تھا کہ شیر حیدر کا دبدبہ بہت تھا۔ غلام حیدر اپنے باپ کی وفات کے بعد ابھی تک شاہ پور نہیں جا سکا تھا۔ اُسے چراغ دین کے قتل اور دوسرے معاملات سے فرصت ہی نہ مل سکی۔ البتہ شاہ پور کے اکثر مزارع جلال آباد آ کر تعزیت ضرور کر چکے تھے۔ غلام حیدر شاہ پور جانا تو چاہتا تھا لیکن وہ مونگی اور چراغ کے قتل میں ہی اُلجھ کر رہ گیا اور اتنا وقت نہ مل سکا کہ شاہ پور کا ایک چکر لگا لے۔ سردار سودھا سنگھ پر تین سو دو کا پرچہ تو کٹ چکا تھا مگر اُس کی گرفتاری آسان بات نہ تھی۔ اُس کے خیال میں اسسٹنٹ کمشنر اور تحصیل کے متعلقہ عملے نے اس مسئلے کو کچھ خاص اہمیت نہ دی تھی اور ولیم کے ساتھ پہلی ناخوشگوار ملاقات دوسری ملاقات میں رکاوٹ تھی۔ لہٰذا اُسے ملاقات کا وسیلہ نکال کر اِس معاملے کو اُس ڈپٹی کمشنر فیروز پور کے علم میں لانا تھا۔ جس کے لیے اُس نے رات سونے سے پہلے چاچے رفیق کو سمجھا دیا تھا کہ وہ تیس جوانوں کو تیار رکھے تاکہ صبح کی نماز کے فوراً بعد فیروز پور روانہ ہو جائیں۔ غلام حیدر کو فکر یہ تھی کہ رعایا اپنے آپ کو بے بس اور لاوارث سمجھنا نہ شروع کر دے۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کا باپ شیر حیدر جس طرح زمینوں اور رعایا کے معاملات کو سلجھاتا آیا اور پیدا ہونے والی دشمنیوں سے نبٹتا آیا تھا، اگر وہ اُس وقار کو برقرار نہ رکھ سکا تو یقیناً اُس کا اپنا مستقبل اور ذاتی ملکیت بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

صبح سات بجے کے قریب غلام حیدر باہر نکلا۔ دس گھوڑے اور دو بگھیاں تیار کھڑی تھیں۔ شیرا کمبو، حمیدا ماچھی، جانی چھینبا، گاموں کبوتر والا، شادھا کھوکھر، رنگو چھینبا اور دوسرے کئی جوان برچھیوں اور چھویوں سے لیس بیٹھے حُقوں کے سوٹے لگا رہے تھے۔ ہر ایک جوش اور جذبے سے بھرا ہوا تھا کہ وہ آج فیروز پور میں بڑے صاحب سے ملاقات کریں گے اور یہ بات پہلی بار واقع ہونے والی تھی۔ شیر حیدر کے دور میں تو کبھی تحصیلدار سے نہیں مل سکے تھے۔

تحصیل جلال آباد سے فیروز پور کی راہ ساٹھ کلو میٹر تھی جس کے لیے کم از کم آٹھ یا نو گھنٹے لگ سکتے تھے۔ ریل کے اپنے اوقات تھے۔ پھر غلام حیدر نے فیروز پور میں کئی اور لوگوں سے بھی ملنا تھا۔ اس لیے سفر گھوڑے اور بگھیوں پر ہی مناسب معلوم ہوا۔ اس کے علاوہ کھلی فضا میں دشمن کے حملے کا خوف بھی کم تھا، بہ نسبت ریل کے تنگ ڈبوں کے۔

غلام حیدر کا خیال تھا، وہ شام سے پہلے ہی فیروز پور میں پہنچ جائے گا۔ رات شیخ نجم علی کے پاس گزارے گا کہ وہ اس کے سکول فیلو ہونے کے علاوہ گہرا دوست بھی تھا۔ فیروز پور کی عدالت میں اُس کے والد شیخ مبارک علی کا اچھا خاصا رسوخ تھا، جو ڈپٹی کمشنر کے ساتھ اُس کی ملاقات کا بندوبست بھی کر سکتا تھا۔ غلام حیدر نے ریشمی لاچا اور بوسکی کی قمیض پہن رکھی تھی۔ لاچے کا لمباؤ ایک فٹ تک زمین پر گھسٹتا تھا۔ سر پر لٹھے کی کھڑکی دار پگڑی تھی۔ جسے پف لگا کر یوں اکڑا دیا جیسے سانپ کا پھن لہراتا ہوا ڈسنے کو آتا ہو۔ پاؤں میں سنہری تلے کا کُھسا چرر چرر کی آواز کے ساتھ قدموں کو ہلکی ٹھاپ دے رہا تھا، گویا شیر حیدر کا دوسرا جنم ہو۔ بائیں کاندھے پر لش لش کرتی پکی رائفل اس پر مستزاد تھی۔ حویلی کے باہر اور بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ کچھ بوڑھی عورتیں آکر غلام حیدر کا سر چومنے اور دعائیں دینے لگیں۔ عورتوں کے اس طرح غلام حیدر کے گرد گھیرے نے فضا کو رقت آمیز کر دیا۔ غلام حیدر جانتا تھا کہ وہ اُس سے بہت بڑی توقعات رکھے ہوئے ہیں۔ جنھیں اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ پورا کرے لیکن دل میں اُس خوف کی کیفیت غالب تھی جو ولیم کے ساتھ ملاقات میں پیش آچکی تھی۔ غلام حیدر سوچ رہا تھا، اگر ڈپٹی کمشنر نے بھی اُسی بے اعتنائی کا ثبوت دیا تو اُس کا بھرم جاتا رہے گا۔ پھر بھی وہ کسی صورت بیٹھے گا نہیں۔ یہ فیصلہ اس نے دل میں کر رکھا تھا مگر اس کے بعد کیا کرے گا؟ اِس امر کی بابت اُس نے بھی نہیں سوچا تھا۔ فی الحال اُسے جلد فیروز پور پہنچ کر ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کا وسیلہ نکالنا تھا اور حکومت سے اس ناحق قتل کے سخت مواخذے کا عمل درآمد کرانا تھا۔ جس نے مونگی کی فصل کو ثانوی حیثیت دے دی تھی۔

صبح سات بجے غلام حیدر نے بگھی پر قدم رکھ دیا۔ ایک بگھی آگے اور تھی باقی جوان گھوڑوں پر سوار غلام حیدر کی بگھی کے پیچھے جلال آباد سے نکل کھڑے ہوئے۔ اِدھر بگھیاں فیروز پور کی طرف روانہ ہوئیں، اُدھر جلال آباد میں بوڑھے گپوں کے ہانکے لگانے لگے۔

حویلی کے دالان میں حقوں کی چلمیں انگاروں سے دہک اُٹھیں اور نمکین لسی کے دور چلنے لگے۔ آدھ آدھ سیر کے پیتل کے گلاس مجمعے کے درمیان کھنک رہے تھے۔ پوہ کی سردی میں لسی پی کر صبح کے عالم میں دھوپ سیکنا اوّل تو خود ایک طرح کی ایسی عیاشی ہے جس کا جواب نہیں لیکن اگر گپ ہانکنے کو نیا موضوع مل جائے تو سونے پہ سہاگہ ہے۔ ایسے عالم میں خاص کر پنجاب کا طبقہ اپنے نقصان پر بھی مزے لے کر تبصرے کرتا ہے اور یہی حالت اِن کی تھی۔ جودھا پور میں چراغ دین کا قتل اور مونگی کا نقصان ثانوی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اب تجزیے اور تبصرے کا سارا مرکز غلام حیدر کی ذات تھی۔ وہ بھی اس پر کہ اُس کی پہنچ کہاں تک ہے۔ کوئی غلام حیدر کے تعلقات گورنر سے پیدا کر رہا تھا۔ کسی کا خیال تھا کہ وائسرائے خود اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے کیونکہ ایک دفعہ لاہور میں اُن کے خیال میں غلام حیدر سے وائسرائے کی خفیہ ملاقات ہو چکی تھی۔

امیر سبحانی نے تو اس سلسلے میں ایک نہایت ہی عجیب خبر نکالی۔ اُس نے ملک نظام کے کان کے نزدیک منہ کر کے کہا، ملک جی یہ بات باہر نہیں نکلنی چاہیے۔ اپنے غلام حیدر کا وائسرائے کی بیٹی سے یارانہ ہے۔ وہ اپنے شیر غلام حیدر کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے لیکن غلام حیدر اُسے ابھی تک ٹال رہا ہے۔ اس معاملے میں غلام حیدر کا دل جیتنے کے لیے اُس نے خود ڈپٹی کمشنر فیروز پور کو تار بھیجی ہے کہ میں اس کیس میں پورا انصاف چاہتی ہوں۔ اصل میں ڈپٹی کمشنر نے غلام حیدر کو فیروز پور بلایا ہے لیکن غلام حیدر بڑا چالاک ہے۔ اُس نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی حتیٰ کہ اپنے فیقے کو بھی۔ دیکھنا یہ بات سچ نہ نکلے تو میری داڑھی مونڈ دینا بیچ اس مجمعے کے۔ یہ کہہ کر امیر سبحانی تسلی سے دوبارہ حقہ گڑگڑانے لگا لیکن ملک نظام اس انکشاف پر ایک دفعہ اُچھل گیا۔ وہ سوچنے لگا، واقعی غلام حیدر اس چھوٹی عمر میں کتنا چالاک ہے۔ یہ سوچ کر جی میں خوش ہونے لگا کہ اب سکھوں کی موت آئی کہ آئی۔ مگر یہ ایسی خبر تھی جس کا شیدے کو پتا چلنا بہت ضروری تھا۔ وہ اس کی تہہ تک پہنچ کر آنے والے وقت کا صحیح نتیجہ نکال سکتا تھا۔ شیدا کونے والی چار پائی پر بیٹھا حالات کی گتھیاں سلجھا رہا تھا۔ جس کی بات ارد گرد بیٹھے لوگ بڑے غور سے سن رہے تھے۔ ملک نظام نے آواز دے کر اُسے اپنے پاس بلایا اور ساری کہانی سامنے رکھ دی۔ شیدے نے بات نہایت توجہ سے سنی اور کہا، دیکھ نظام بھائی، یہ بات اپنے درمیان ہی رکھنا۔ اس لیے کہ اِس میں گورنمنٹ کی بے عزتی ہے اور سرکار طیش میں بھی آسکتی ہے۔ کیونکہ دھی بہن کی عزت ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اب سودھا سنگھ کی موت یقینی ہے۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ سکھوں نے شیر کی دُم پہ پاؤں رکھ دیا ہے۔ اب دیکھنا انھیں کیسا بھگتان

دینا پڑے گا۔ اس کے بعد شیدا دوبارہ اُٹھ کر اپنی چارپائی پر جا بیٹھا۔ سب کو پتہ تھا نظام دین نے کوئی بات رشید سے کی ہے۔ اس لیے وہ سب اس کی ٹوہ لینے لگے۔ کافی دیر تک وہ بات کو دبائے بیٹھا رہا لیکن اس شرط پر اُس نے یہ راز کھول دیا کہ خبردار بات حویلی سے باہر نہ جائے۔

یہاں تو یہ کچھ چل رہا تھا، اتنے میں نظام دین کو چوکیدار نے آکر بتایا کہ جودھا پور سے رحمت علی بلوچ آیا ہے کچھ خاص خبریں لے کر۔ یہ سُن کر تمام لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سلام دعا کے بعد اُسے درمیان کی چارپائی پر بیٹھ کر لسی کے دو گلاس دیے۔ مجیدے نے حقہ سامنے رکھ دیا، جسے دو چار دفعہ رحمت علی نے گڑگڑایا اور مجمعے کی بے صبری کا امتحان لیے بغیر بولا،، بیلیو مَیں غلام حیدر کو ایک بڑی ضروری خبر دینا چاہتا ہوں، اُسے خبر دو کہ رحمت علی جودھا پور سے آیا ہے۔

نظام دین نے رحمت علی کی بات سُن کر کہا، پر غلام حیدر تو بھائی رحمت آج صبح ہی فیروز پور بڑے صاحب سے ملنے کے لیے نکل گیا ہے۔ اب شاید اسے دو دن لگ جائیں واپس آنے میں۔ جو بھی خبر ہے، ہمیں بتا دو۔ ہم غلام حیدر کو بتا دیں گے۔ اگر خفیہ بات ہے تو غلام حیدر کا انتظار کر لو۔

رحمت علی نظام کی بات سن کر بجھ سا گیا۔ اس کا سارا جوش جذبہ اسی میں تھا کہ جودھا پور انگریز بہادر کے آنے کی خبر غلام حیدر کو بتائی جائے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اُسے اتنے دن یہاں رکنا گوارا بھی نہیں تھا، ناچار یہ خبر نظام ہی کو سنانا پڑی اور اپنی چادر کا پلو درست کر کے کاندھے پر ڈالتے ہوئے بولا،، بھائی نظام خبر یہ ہے کہ کل انگریز بہادر جودھا پور میں آیا تھا۔ اُس نے کہا کہ اُسے اُوپر سے حکم آیا ہے کہ وہ خود جا کر موقع پر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرے۔

”نظام، رشید ماچھی اور دوسرے تمام لوگ حیران ہوئے“ کیا انگریز بہادر خود جودھا پور میں آیا تھا

رحمت علی نے بلائی ہونٹ سے نیچے لٹکی ہوئی مونچھ کے سفید اور کالے بالوں سے لسی کی ٹھنڈائی کو ہاتھ سے صاف کیا پھر سب لوگوں کو گھورتے ہوئے بولا، تو کیا میں دس کوس چل کر یہاں ٹھٹھہ مذاق کرنے آیا ہوں؟ مَیں آیا ہوں کہ ساری خبر چوہدری غلام حیدر کو دوں۔ اِدھر سامنے تم بیٹھے مجھے جھوٹا بنا رہے ہو۔

ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ غلام حیدر کو وہاں نہ پا کر رحمت علی کا سارا مزا کِرکرا ہو گیا تھا کہ اُس خبر کی داد وہ براہِ راست غلام حیدر سے نہ لے سکا۔ اور اب اس کا غصہ ان پر نکال رہا تھا۔

صاحب بہادر سکھوں پہ بہت غصے میں تھا، رحمت علی دوبارہ اپنی کہانی کی طرف لوٹا، کہہ رہا تھا، میں سودھا سنگھ کو چوراہے کے بیچ پھانسی نہ دوں تو ولیم نام نہیں۔ ہماری سرکار میں یہ ظلم نہیں ہو سکتا۔
ادھر رحمت علی یہ باتیں کر رہا تھا، اُدھر امیر سبحانی آہستہ آہستہ مسکرانے لگا گویا اپنی بات کی تصدیق ہو رہی ہو۔ آخر سب لوگ امیر سبحانی کو رشک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ جس نے بیچ کی خبر پہلے ہی دے دی تھی اور یہ سب کچھ وائسرائے کی بیٹی کی وجہ سے ہو رہا تھا کہ انگریز بہادر دوڑے دوڑے خود ہی انصاف کے لیے تفتیشیں کر رہے تھے۔ ورنہ کہاں جودھاپور اور کہاں انگریز سرکار۔ اب امیر سبحانی نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور اُٹھ کر اکڑتا ہوا ایک طرف جا بیٹھا۔ اُسے پتا تھا اُس کی بات کی تصدیق ہو چکی ہے۔ چنانچہ مزید کریدنے کے لیے لوگ اُس کے مرہون ہیں۔ بالآخر وہی ہوا۔ لوگ اُٹھ اُٹھ کر امیر سبحانی کے پاس بیٹھنے لگے اور وہیں ایک ٹولی بندھ کر کُھد بُد ہونے لگی۔
ادھر رحمت علی کو اپنی خبر کی یوں بے وقعتی پر تاؤ آ گیا۔ کچھ دیر تو وہ صبر سے بیٹھا رہا لیکن اُس سے نہ رہا گیا اور بولا، وہاں کیا تماشا ہے، بھائی اب اس مسئلے پر غور کرو کہ آگے کیا کرنا ہے؟ تھوڑی دیر کے بعد رحمت علی کو بات اپنے تک رکھنے کی شرط پر سب کہانی سنا دی گئی کہ ولیم کو آخر اُوپر سے حکم کس وجہ سے ملا تھا اور اسی بنا پر آج غلام حیدر ڈپٹی کمشنر سے ملنے فیروزپور گیا تھا۔ اب آگے جو کچھ ہو گا اُس کا اندازہ خود لگا لو۔ رحمت علی اس خبر کو سن کر واقعی حیران رہ گیا۔ چنانچہ اس کی کوفت کچھ دور ہو گئی کہ وہ ایک نئی خبر جودھاپور لے کر جا رہا تھا۔
جاری ہے

قسط نمبر 8

سردار سودھا سنگھ مجبوراً ولیم کو رخصت کرنے کے لیے جیپ تک آیا اور اُس کو سوار ہوتے دیکھتا رہا۔ جیپ جب تک رخصت نہیں ہوئی، وہیں کھڑا رہا۔ کسی نے کوئی بات بھی نہ کی۔ دلبیر سنگھ نے گاڑی کو اسٹارٹ کر کے اُسے گیئر میں ڈال دیا اور وہ رفتہ رفتہ گاؤں والوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جیپ کے گاؤں سے نکل جانے کے بعد سودھا سنگھ نہایت بے چینی سے حویلی کی طرف مڑا۔ مجمع جو چند لمحوں میں قریب دو سو نفوس پر مشتمل ہو گیا تھا، وہ بھی سودھا سنگھ کی حویلی کی طرف چل دیا تاکہ پتہ چلے فرنگی گورنمنٹ کیسے آئی تھی اور سردار سودھا سنگھ کے ساتھ کیا بات چیت ہوئی مگر فوجا سیوئ نے سب لوگوں کو جھڑک کر پیچھے کر دیا۔
حویلی میں داخل ہو کر فوجا سیوئ نے پھاٹک بند کروا دیا۔ پھر دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ آخر سودھا سنگھ نے سکوت توڑا اور فوجا سیوئ کی طرف مخاطب ہو کر بولا، فوجے لگتا ہے معاملہ کچھ گھمبیر ہو گیا ہے۔ اس کلکٹر کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے۔
فوجا سیوئ خاموشی سے کان کھجاتا رہا اور سودھے سنگھ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر کے لیے پھر خاموشی چھا گئی۔ حویلی کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ کسی دوسرے کے بولنے کی ہمت اس لیے نہیں تھی کہ سودھا سنگھ غصے سے بھرا بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیا ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔ آخر جگبیر نے ہمت کی اور بولا، سردار جی واہگرو جی شرماں رکھو، ہمت سے کام لے۔ غلام حیدر یا انگریز کے پاس کوئی ثبوت تو ہے نہیں۔ کلکٹر آ گیا ہے تو کوئی قہر نہیں ٹوٹ پڑا، دیکھی جائے گی۔
فوجا سیوئ جو پہلے ہی کلکٹر کی طرف سے کی گئی توہین سے سخت برہم تھا اور جودھا پور پر حملہ بھی اس کے مشورے کے برخلاف ہوا تھا۔ جس میں جگبیر نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، جگبیر کے ان جملوں پر ایک دم بھڑک اٹھا اور بولا۔
جگبیرے تیرے جیسے بارہ تالیے شراب کے چوہے ہوتے ہیں، جو دو گھونٹ چڑھا کر اپنی دُم پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور شیر کو للکار دینا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ یہ تم ہی تھے جنھوں نے سودھا سنگھ کو الٹی مت دی ہے اور جودھا پور پر دھاوا بول دیا۔ اسی وجہ سے فرنگی کو ہمت ہوئی کہ وہ میری اور سردار سودھا سنگھ کی بے عزتی میں ہاتھ ڈبو کر چلا گیا ہے۔ اُس وقت سے ڈر جب چراغ دین مُسلے کا پھندا سودھا سنگھ کے گلے میں فٹ ہو جائے۔ مگر تجھے کیا، تو کوئی اور کڑاہا ڈھونڈ لے گا جہاں پرانے گُڑ کی بت چڑھی ہو گی۔ مسئلہ تو ہمارا ہے کہ جینا مرنا سودھا سنگھ کے ساتھ ہے۔

جبگیر نے فوجا سیوئ کے آگ لگا دینے والے جملے سنے تو کرپان کھینچ کر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ غصے سے نتھنے پھڑ کنے لگے اور چہرہ انگارے کی طرح دہک گیا۔

تیری تو میں دو گز لمبی زبان کھینچ لوں گا۔ واہگرو کی سونہہ تیرا قتل نہ کروں تو سمجھ لینا میری ماں پھیروں پر رہی ہے۔

بڈھا پاگل ہو گیا ہے۔ اِسے کسی نے سمجھایا نہیں کہ جگبیر سے بات کن محاوروں میں کی جاتی ہے۔

جگبیر کو مشتعل ہوتے دیکھ کر سب اٹھ کھڑے ہوئے اور پیت سنگھ نے آگے بڑھ کر جگبیر کو جپھا ڈال لیا۔ بیدا سنگھ نے اس کے ہاتھ سے کرپان پکڑ لی۔

مگر اسی اثنا میں جما سنگھ بھڑک اٹھا۔ پیتے چھوڑ دے اس سورمے کو، میں اس کی وراچھیں چیر دوں گا۔ خنزیر چاچے فوجے کو للکارتا ہے۔ حرامی کیا یہ نہیں جانتا سردار فوجا سئیو کون ہے؟

اس کے ساتھ ہی تلوار کھینچ لی اور بیدا سنگھ کی طرف بھاگا۔ ساتھ گالیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ اِدھر نکل رانی خاں کے سالے تیری ایسی تیسی پھیر دوں گا۔ تو نے سمجھا تھا یہاں جھانجھروں والے بیٹھے ہیں۔ لیکن دو تین جوانوں نے اُٹھ کر فوراً جما سنگھ کو پکڑ لیا۔

مگر اُدھر سے للکار سُن کر جگبیر دوبارہ پلٹا، چھوڑ دے بیدے مجھے۔ یہاں آج لہو کی چکیاں چل ہی لینے دے۔ لاف سرداروں کو مہنا ہے۔ لیکن لوگوں نے جگبیر کو مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ اس دنگے میں شور اور واویلا اتنا بلند ہوا کہ باہر کھڑا مجمع حواس باختہ ہو کر حویلی کا پھاٹک پیٹنے لگا۔ سودھا سنگھ یہ تماشا دیکھ کر انتہائی کرب اور بے بسی سے چیخا۔ مترو واہگرو کا خوف کرو۔ یہ کیا اودھم مچا دیا تم نے۔ کیا جھنڈو والا میں آگ لگ گئی؟ سودھا سنگھ کی آواز میں اس قدر غیظ تھا کہ تمام لوگ حویلی کے اندر اور باہر والے سب ایک ہی دفعہ خاموش ہو گئے۔ اس خموشی سے سودھا سنگھ کو ذرا سکون ملا۔ وہ دوبارہ قدرے دھیمے لہجے میں بولا، فوجے اب لڑنے اور طعنے مہنے دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جو ہوا سو ہوا۔ کیے پر پچھتانا مورکھوں کا شیوہ ہے۔ بس آگے کی سوچو۔

فوجا سیوئ نے جب دیکھا کہ سودھا سنگھ بالکل ہی ہتھیار پھینک چکا ہے تو وہ قدرے سکون سے بولا۔ دیکھ بھئی سردار سودھا سنگھ اب میں تب بولوں گا جب میرا مشورہ جڑ سے پرامبلوں تک مانو گے۔ ورنہ (طنز سے جگبیر کو دیکھتے ہوئے) تیری اور اِن سورموں کی اپنی راہ اور میری اپنی راہ۔

سودھا سنگھ نے بڑے سکون سے پگڑی کو درست کیا اور سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ پھر فوجا سیوءٔ نے آگے جھک کر اپنی بات شروع کی۔

سردار سودھا سنگھ میری دو باتیں غور سے سن اور اس کو پلے باندھ لے۔ ایک یہ کہ اب جھنڈو والا سے باہر قدم نہ نکالنا، چاہے قیامت آ جائے۔ کچھ سمے تک یہ حویلی ہی تیرا مرن جیون رہنا چاہیے۔ اس کے علاوہ جتنی جلدی ہو سکتا ہے، مہاراجہ پٹیالہ کے دربار سے کسی سفارش کا بندوبست کر بلکہ میں تو کہتا ہوں دو چار مہینوں کے لیے وہیں پٹیالہ چلا جا اور اُدھر ہی بیٹھ کے سارا مقدمہ لڑ۔ دوسری صلاح میری یہ ہے کہ ڈُلھے بیروں کا کچھ نہیں گیا، عبدل گجر کی طرف فوراً بندہ بھیج کے انھیں شاہ پور پر حملے سے روک دے۔

فوجا سیوءٔ کی بات سن کر جگبیر اور پیت سنگھ نے منہ بسورا لیکن کچھ بولے نہیں مگر سودھا سنگھ نے تحمل سے سوال کیا، اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم اتنی بزدلی کا ثبوت دیں؟

فوجا سیوءٔ دوبارہ بولا، وجہ یہ ہے سردار سودھا سنگھ اس دفعہ دو کام ایسے ہوئے ہیں جو آج تک نہیں ہوئے تھے۔ اُن کا شگون اچھا نہیں۔ ایک یہ کہ تیری کمر پر غلام حیدر نے قتل کا پرچہ رکھ دیا ہے۔ دوسرا اکلکٹر ایسا آ گیا ہے جس کے تیور شینہہ کی طرح خونخوار ہیں۔ وہ سمجھ چکا ہے کہ یہ سب کیا دھرا تیرا ہی ہے۔ ورنہ وہ جھنڈو والا کبھی نہ آتا۔ اب شاہ پور پر حملہ ہوا تو اس میں چاہے تو جتنا بھی پلہ چھڑائے باٹوں کی جگہ تجھے ہی رکھا جائے گا۔ ادھر انگریز راج میں قتل معاف نہیں ہو سکتا۔ رہی غلام حیدر کی بات، وہ بھوکے شیر کی طرح باولا ہوا ہے۔ تھانیدار نے جو حالت اس کی بتائی ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسے پرچے ورچے سے کچھ غرض نہیں۔ وہ تو بس تیرا سامنا چاہتا ہے اور یہ اچھی بات نہیں۔

تو کیا بزدلوں کی طرح چوڑیاں پہن لوں؟ سودھا سنگھ ذرا تپ کر بولا۔

میں نے کب کہا ہے چوڑیاں پہن لے۔ بس ذرا کوئلوں کو سیاہ ہونے دے اور حالات کا رخ دیکھ۔

واہ حالات کا رخ دیکھ "اب کے پیت سنگھ بولا" تا کہ پُلس آرام سے آ کر سودھا سنگھ کو بیل کی طرح نتھ ڈال کر لے جائے اور پھر جیل میں چکی پر جوت دے۔

اس کا ایک حل ہے، فوجا سیوءٔ اسی تحمل سے بولا۔

وہ کیا؟ سودھا سنگھ نے پوچھا۔

دیکھ سردار سودھا سنگھ معاملہ ابھی زیادہ بگڑا نہیں ہے۔ایک قتل کی بات سنبھالی جا سکتی ہے اور مونگی کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔اِس سے تھوڑا سا بھی آگے بڑھے تو سمجھ لو دودھ کا چھنا گوبر میں جا گرے گا۔ (پھر تھوڑی دیر رُک کر) میری مان غلام حیدر سے صلح کر لیں اور چراغ دین کا قصاص دے دیں۔ فوجا سیوٴ نے لجائے ہوئے لہجے میں کہا۔

فوجے سیوٴ کی بات سن کر تمام لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کسی کو بھی توقع نہیں تھی کہ فوجا سیوٴ اتنی بزدلی کی بات کرے گا۔ خاص کر جگبیر کے تو گویا سر پر فوجے نے راب کی اُبلی اُبلی دیگ ڈال دی۔ ادھر سودھا سنگھ اور پیت سنگھ بھی غصے سے سرخ اور لال پیلے ہو گئے لیکن ان کے جواب دینے سے پہلے ہی فوجا سیوٴ اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ اُسے پتہ تھا کہ وہ جو جواب دیں گے، وہ اس سے سنا نہیں جائے گا۔اس لیے بہتر ہے حویلی سے نکل جائے اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دے۔

فوجا سیوٴ کے ساتھ ہی جما بھی حویلی سے نکل گیا۔ اگرچہ فوجا سیوٴ کا سردار سودھا سنگھ کو یوں بات سُنے بغیر چھوڑ کے جانا اچھا فیصلہ نہیں تھا۔ مگر سودھے سنگھ کو بھی فوجا سیوٴ کی یہ بات بہت گھٹیا اور شوہدی لگی۔ یہ بزدلی کی حد تھی جو فوجا سیوٴ نے کی تھی۔ اس لیے سودھا سنگھ نے اسے روکنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ اُس نے سوچا جگبیر سنگھ اور پیتا ٹھیک کہتے ہیں۔ ابھی کون سی قیامت آ گئی ہے کہ مُسلوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیں۔ خاص کر کل کے چھوکرے کے آگے، جو ابھی سکول کا مُنڈا ہے۔ پوری سکھ برادری میں ناک کٹ جائے گی اور شریکے میں کیا منہ دکھائیں گے۔ بَیر اور لڑائی تو جوانوں کا سنگھار ہے ورنہ مر تو وہ بھی جاتے ہیں جو ساری عمر اکھاڑے میں ناچتے ہیں اور کیکر کا کانٹا چھبنے سے بیہوش ہو جاتے ہیں۔ پھر سودھا سنگھ جگبیر کی طرف منہ کر کے بولا،، جگبیرے اب تیرا مشورہ ہی چلے گا۔ بول واہگرو کے نام سے کیا کہتا ہے۔ فوجا سیوٴ نے تو زنخوں والی بات کی ہے،، میرے لیے تو دما، رنگا اور آپ ہی اب سب کچھ ہو۔

جگبیر نے جو ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں سودھا سنگھ کو فوجا سیئو کے بھرے مجمعے سے اٹھ کر جانے کا افسوس نہ ہوا ہو،، سودھا سنگھ کی طرف سے حوصلہ پا کر کہا، سردار سودھا سنگھ پندرہ جوان میرے ساتھ کر دے اور عبدل گجر کو پیغام بھیج کر پوچھ، اگر وہ کل تک شاہ پور پر حملہ کرتا ہے تو ٹھیک ورنہ یہ کام بھی میں ہی کرتا ہوں۔ وہ راضی ہو جائے تو میں اس کی فوج میں شامل ہو جاتا ہوں۔ کل رات ہی ہم اور گجر مل کر یہ کام کر دیں تو یہ انگریزی بابو اور غلام حیدر دونوں پاگل ہو جائیں گے اور بول کی جھاگ کی طرح نہ بیٹھ جائیں تو مجھے کہنا۔

سودھانے پیت سنگھ کی طرف دیکھا تو وہ بولا، سردار صاحب، دیکھ شاہ پور پر حملہ اس وقت بڑا مفید ہے۔ جگبیرے نے بڑی ٹھیک صلاح دی ہے۔ شاہ پور میں میرا یار فضلو میو موجود ہے۔ بندہ بھیج کر اُسے بلا لے۔ سو روپیہ دے کر سب مخبری لے لیتے ہیں۔

سودھا سنگھ کو پیت سنگھ کی بات پسند آئی۔ ہرے سنگھ کو آواز دے کر سودھے نے پاس بلایا اور اسے فوراً شاہ پور جانے کے لیے کہا کہ جا کر عشا تک فضلو کو لے آئے۔ دوسری طرف نتھا سنگھ کو ہدایات بھیج کر عبدل کی طرف روانہ کر دیا کہ ان کو سودھے کے فیصلے سے آگاہ کر دے اور جو کچھ بھی وہ کہیں وہ آکر خبر دے لیکن انھیں کہہ دے کہ حملہ ہر صورت کل ہونا چاہیے۔

(14)

مولوی کرامت کو جودھا پور میں تیسرا دن تھا۔ چراغ دین کے ساتے کو دو دن گزر چکے تھے۔ اُسے فضل دین کی فکر کھائے جا رہی تھی، جسے اکیلا پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ مگر اب وہ کمشنر صاحب سے ملے بغیر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ دوسری طرف رحمتے اور اس کی بیٹی جودھا پور میں بالکل اکیلی تھیں۔ تیسری طرف غلام حیدر نے دس ایکڑ زمین چراغ دین کی بیوی کے نام کرنے کا اعلان کر کے ایک عجیب کشمکش پیدا کر دی تھی۔ شریفاں رحمت بی بی اور اُس کی بچی کے ساتھ چولہے کی انگنائی میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ مولوی کرامت دو قدم دور بان کی چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں سہ طرفہ تفکرات کی آندھی چل رہی تھی۔ خدا جانے صاحب کمشنر اُسے تحصیل بلا کر کیا کہنا چاہتا تھا۔ اُس نے کوئی ایسی ویسی بات تو کی نہیں تھی جس سے صاحب کو کچھ شک پیدا ہوا ہو۔ شاید انگریز بہادر اُس سے چراغ کی کسی خفیہ دشمن داری کی بابت سوال کرنا چاہتا تھا؟ کچھ چیز سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے تنگ آ کر سر جھٹک دیا اور دس ایکڑ زمین پر غور کرنے لگا، جو رحمتے کے نام ہونے والی تھی۔ لیکن رحمتے اس زمین کو کیا کرے گی۔ چراغ دین تو مر چکا تھا جبکہ وہ اتنی دور قصور میں رہ کر اُسے کیسے کاشت کر سکتا تھا۔ بہر حال یہ بعد کی باتیں تھیں۔ اول تو اُسے کل ہر حالت تحصیل جانا تھا۔ خیر دین ٹانگے والے سے اُس نے بات کر لی تھی۔ جو روزانہ جودھا پور سے جلال آباد سواریاں لے کر جاتا تھا۔ اُس نے کرایہ زیادہ مانگا تھا۔ پورے ایک روپیہ وصول کر رہا تھا۔ مگر پندرہ کوس پیدل طے کرنا بھی تو مشکل تھا۔ سارا دن سفر میں کٹ جاتا۔ اس طرح ایک روپے کا نقصان تو ہو جاتا مگر خیر دین کا ٹانگا

اُسے دن نکلتے ہی جلال آباد پہنچا سکتا تھا۔ اگر صبح کاذب سے پہلے چل نکلتا۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ رحمت بی بی نے مولوی کرامت کو مخاطب کر کے کہا۔

بھائی کرامت کچھ پتا ہے کہ سرکار بہادر نے تمھیں کیوں تحصیل بلایا ہے؟ مجھے تو لگتا ہے سرکار صلح کرانا چاہتی ہے، تمھیں بیچ میں ڈال کے۔

مولوی کرامت نے داڑھی کھجاتے ہوئے کہا، دیکھ رحمتے، سرکار کا اُس وقت تک کوئی پتا نہیں چلتا جب تک بات کھل کر نہ کرے۔ میرا خیال ہے سرکار کو اتنی خبر تو ہو گئی ہو گی کہ یہ قتل سودھا سنگھ نے ہی کرایا ہے۔ اب رہی صلح کی بات، وہ تیری مرضی کے بغیر کیسے ہو سکتی ہے؟ پھر میں نے سنا ہے کہ پرچے کا مدعی غلام حیدر خود بنا ہے اور آج کی خبر یہ ہے کہ وہ فیروز پور بڑے صاحب کو ملنے گیا ہے۔

رحمت بی بی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا، بھائی کرامت سنا ہے، وائسرائے کی بیٹی کا غلام حیدر سے یارانہ ہے۔ آج مجھے فاتاں اور شیداں نے بتایا ہے۔ انھوں نے کہا ہے سودھا سنگھ کو فکر پڑ گئی ہے کہ غلام حیدر بدلہ لے کے رہے گا۔ اس لیے وہ صلح کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا تو خیال ہے چھوٹے صاحب نے سکھوں سے رشوت کھالی ہے۔ وہ تم کو بلا کر دھونس دھاندلی سے سودھا سنگھ کے ساتھ صلح کروا دے گا۔

مولوی کرامت نے فکر مند ہوتے ہوئے سر ہلایا۔"

شریفاں رحمت بی بی کی بات سن کر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولی" ہائے ہائے کیا زمانہ ہے بہن رحمتے۔ یہ تو تم نے بڑی ناہونی سنائی۔ پر وائسرائے کی دھی غلام حیدر سے ملی کہاں؟ نا پر وائسرائے کو پتا ہے اس کہانی کا؟

رحمت بی بی چولہے میں جلتی لکڑیوں کو پھونک مارتے ہوئے بولی" اے ہے شریفاں اب بھلا مجھے اس کا کیا پتا؟" بڑے لوگوں کے ملن ملاپ کوئی ہم غریبوں سے پوچھ کر ہوتے ہیں۔ سنا ہے، اُدھر لاہور میں اونچے اونچے بنگلوں میں دونوں کی ملاقاتیں ہوئیں۔ فاتاں کہتی تھی، وائسرائے کی بیٹی بے حد چٹی گوری اور سوہنی سنکھنی ہے۔ یونہی آنکھ سے دیکھے میلی ہو جائے۔ ایسی کُڑی تو پورے ولایت میں نہیں۔

شریفاں نے فوراً رحمتے کی بات کاٹ کر لقمہ دیا، پر دیکھ رحمتے، اپنا غلام حیدر بھی تو چاند کا ٹکڑا ہے۔ اس جیسا گبھرو اُسے بھلا پورے ولایت میں ملے گا؟ آنکھوں سے خدا سلامت رکھے خون چھوٹتا ہے اور رنگ مکھنوں پلے کا گلابوں میں ڈھلتا ہے۔

رحمت علی چپکے بیٹھا دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے حقّے کی نَے ایک طرف کی اور اُٹھ کر دروازے کی کُنڈی کھول دی۔ سامنے خیر دین کھڑا تھا ہاتھ میں چابک لیے۔ مولوی کرامت نے پیچھے مڑ کر رحمتے اور شریفاں سے رخصت لی۔ اپنی پگڑی درست کر کے باندھی اور باہر نکل آیا۔ دونوں عورتیں دروازے پر آ کر مولوی کرامت کو تانگے پر بیٹھتے ہوئے دیکھ کر دعائیں دینے لگیں کہ خیر سلامت سے واپس لوٹے۔ مولوی کرامت کے بیٹھتے ہی تانگا چل پڑا۔

(15)

ولیم نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی ہیٹ اتار کر کھونٹی پر رکھا اور فوراً گھنٹی دی۔ گھنٹی سنتے ہی کرم دین اندر داخل ہو کر باادب کھڑا ہو گیا۔

نجیب شاہ کو بلاؤ، ولیم نے کرم دین کی طرف دیکھے بغیر نہایت سپاٹ لہجے میں حکم دیا۔

کرم دین کے باہر نکلتے ہی چند ثانیوں بعد نجیب شاہ کمرے میں داخل ہوا اور ابھی اُس نے سانس بھی نہ لی تھی کہ ولیم نے ہدایات دینا شروع کر دیں، جنھیں نجیب شاہ کھڑے کھڑے نوٹ بک پر اُتارنے لگا۔

نجیب شاہ، تحصیل جلال آباد میں جس قدر سکول ہیں، اُن کا تمام ریکارڈ مجھے جلد از جلد چاہیے۔ وہاں پر اساتذہ کی تعداد سے لے کر طلبا اور اُن کی تعلیم کے معیار سے متعلق ہر چیز تحصیل ایجوکیشن افسر سے کہو، دو گھنٹے کے اندر لے کر میرے پاس میٹنگ کے لیے پہنچے۔ اِس کے علاوہ انسپکٹر متھرا داس اور منڈی گرو ہرسا کے تھانیدار کو بلواؤ اور غلام حیدر کے معاملے کی فائل میز پر پہنچا دو۔

نجیب شاہ نے ہدایات نوٹ کیں اور پچھلے قدموں پھرتی سے مُڑا۔

اور سنو! ولیم دوبارہ بولا، آج ایک شخص مولوی کرامت کسی وقت آئے گا، اُسے مجھ سے ملے بغیر نہیں لوٹنا چاہیے۔

جی سر جیسے ہی آیا، اُسے سرکار میں حاضر کر دوں گا۔ اِس کے بعد نجیب شاہ نے نہایت ادب سے سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

نجیب شاہ کے باہر نکلنے کے بعد کمرے میں پھر سناٹا چھا گیا۔ اس خموشی میں ولیم کا دماغ ایک دفعہ پھر سودھا سنگھ اور غلام حیدر کے بارے میں الجھ گیا۔ ولیم کو اس کیس پر کام کرتے چوتھا دن تھا۔ وہ تمام حاصل شدہ حقائق اور معلومات سامنے رکھتے ہوئے ایک نتیجے پر یقین سے پہنچ چکا تھا۔ چراغ دین کا قتل اور مونگی کے کھیت کی تباہی کا ذمہ دار سودھا

سنگھ ہی تھا۔ چنانچہ اُس کی گرفتاری بہت ضروری تھی۔ ولیم کمرے میں ٹہلنے لگا اور معاملات کے نشیب و فراز پر مزید غور کرنے لگا۔ اسی اثنا میں کمرے کی دیواروں پر اُس کی نظر پڑی، جہاں سابقہ تحصیلداروں اور ایک اسسٹنٹ کمشنر کی تصاویر آویزاں تھیں، جو یکے بعد دیگرے جلال آباد میں پوسٹ کیے گئے تھے۔ ولیم نے پہلے دن جب اس کمرے میں قدم رکھا تو ان تصویروں پر اُس کی نظر پڑی تھی لیکن وہ نہ جانے کیوں انھیں کمرے کی فالتو چیز سمجھ کر نظر انداز کر گیا تھا۔ اب اُس نے خیال کیا آخر ایسا کیوں ہوا۔ اُس نے ان تصاویر پر کیوں توجہ نہیں دی؟ شاید پہلی پوسٹنگ کی وجہ سے اُسے یہ گمان نہ گزرا ہو کہ اب وہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ اُس نے سوچا شاید نئے افسروں کے ساتھ ایسا ہو جاتا ہے، انھیں کافی عرصہ تک باور نہیں آتا کہ وہ افسر بن چکے ہیں۔ اسی لمحے اُسے خیال آیا اُس کی اپنی تصویر پر بھی اب یہاں آویزاں ہو جانی چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی وہ ہلکا سا مسکرادیا پھر آگے بڑھ کر گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔ گھنٹی سن کر کرم دین دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو ولیم نے اس کی طرف دیکھے بغیر کافی کا آرڈر دیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

کرم دین نے کمرے سے نکلنے سے پہلے ایک چٹ سامنے رکھ دی، جس پر مولوی کرامت لکھا تھا۔

ہاں اس کو اندر بھیجو۔ ولیم نے چٹ کو ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔

کرم دین کے جانے کے ایک منٹ بعد ہی مولوی کرامت کمرے میں داخل ہوا اور سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ جیسے نماز میں قیام کی صورت ہو۔ ولیم نے مولوی کرامت کو سامنے بیٹھنے کا حکم دیا پھر کچھ دیر خموشی چھائی رہی۔ اس دوران ولیم نے محسوس کیا کہ مولوی کرامت اندر سے سہا اور ڈرا ڈرا تھا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے۔ اُنھیں حدِ ادب کی وجہ سے صاف کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں ولیم سے آنکھیں بھی نہیں ملا رہا تھا اور نہ ہی پورے کمرے کو دیکھنے کی جرات کر سکا۔ مولوی کرامت نے اپنی آنکھوں کو صرف اتنی اجازت دی تھی کہ وہ کسی شے سے ٹھوکر نہ کھا سکے۔ اُس نے اُن کا دائرہ اپنے قدموں سے لے کر ولیم کی میز تک رکھا۔ کمرے میں میز اور ولیم کے سوا کیا کچھ تھا؟ یہ سب کچھ مولوی کرامت نہیں دیکھ سکا۔ اِدھر سفید لٹھے کا سوٹ اور سفید پگڑی کی شفافیت نے ولیم کو ایک دفعہ پھر متاثر کیا۔ اسی اثنا میں کرم دین کافی کا کپ رکھ کر چلا گیا، جس کی ولیم چسکیاں لینے لگا۔ ولیم کی احساس تھا کہ اُس کی خموشی مولوی کرامت کے اضطراب کو بڑھا رہی ہے مگر وہ جان بوجھ کر اس عمل سے لطف لے رہا تھا، جو کچھ دیر تک مزید جاری رہا۔ جب ولیم نے کافی کے گھونٹ کے ساتھ چھ سات چسکیاں مزید لے لیں اور مولوی صاحب

کی بے چینی بھی کافی بڑھ گئی، تو اُس نے بات کا آغاز کر ہی دیا۔
مولوی صاحب کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کچھ لکھ پڑھ سکتے ہیں؟
حضور، غلام کچھ کچھ عربی اور فارسی کی سُدھ بُدھ رکھتا ہے۔ عرفی کے قصیدے اور حافظ کی کئی غزلیں بھی یاد ہیں۔ اس کے علاوہ سعدی کی گلستان، بوستاں اور اُردو کے میر تقی اور غالب کے کچھ شعر اور انیس کے دو مرثیے بھی یاد ہیں۔ ہیر وارث شاہ اور بابا بلھے شاہ کی ساری شاعری تو الف سے یے تک سب زبانی یاد ہے۔ بس انگریزی سے بے بہرا ہوں۔ سرکار یہ مجھے نہیں آتی حضور۔
عربی، فارسی اور اردو کیا لکھ بھی لیتے ہو یا صرف پڑھنا ہی جانتے ہو؟ ولیم نے دوبارہ کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔
مولوی کی جھجھک اب کچھ دور ہو چکی تھی اس لیے کھل کر تیزی سے بولا، سرکار فَر فَر پانی کی طرح لکھتا ہوں۔ آپ کا غلام مولوی کرامت یہ کام تو بڑے ڈھنگ سے کر سکتا ہے اور سرکار میری خوش خطی کی دھوم تو قصور شہر تک ہے۔ دو قُرآن میں نے اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں۔ بہشتی والد نے نستعلیق، نسخ، خطِ کوفی، ہر طرح کی اِملا سکھا دی تھی۔
اگر ہم چاہیں کہ آپ انگریزی سیکھو تو کتنے مہینے لگیں گے؟ ولیم نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
مولوی کرامت ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا، صاحب بہادر آپ مہینوں کی بات کرتے ہیں، میں کوئی بوندلایا ہوا تھوڑی ہوں۔ تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کا تو دنوں میں کر لوں گا۔ لیکن سرکار آخر انگریزی بادشاہوں کی زبان ہے اور سب زبانوں کی بادشاہ ہے۔ اس کو سیکھنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ میں اگر اِس عمر میں لکھنے پڑھنے لگ گیا تو بچوں کو کیا کھِلاؤں گا؟
اُس کی پرواہ نہ کرو۔ اُسی کا بندوبست ہم آپ کے لیے کرنے والے ہیں، ولیم نے کہا
پھر تو حضور بندہ دنوں میں ہی یہ سب کچھ سیکھ جائے گا،، مولوی کرامت انتہائی بے تابی سے بولا،، اور جو کچھ سرکار کی طرف سے کام ملے گا، وہ پورا پورا منشا کے مطابق ہو گا۔
او کے مولوی ”ولیم نے کہا“ ہم تم کو یہاں جلال آباد میں ایک ہیڈ منشی رکھتے ہیں۔ تم بچوں کو اردو، فارسی اور عربی پڑھایا کرو۔ اس جلال آباد کے بڑے سکول میں تمھاری پوسٹینگ کے آرڈر کروا دیتا ہوں۔ ہم نے تمھیں اسی لیے یہاں بلایا کہ تم سرکار کی نوکری میں آ جاؤ۔ ہم تمہارا چالیس روپے مہینہ مقرر کروا دیتے ہیں۔
مولوی کرامت ولیم کی بات سن کر حیرانی اور خوشی کی ملی جلی کیفیت سے کانپنے لگا اور اُٹھ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر ولیم کا

شکریہ ادا کرتے ہوئے اُس کی درازیٔ عمر کی دعا میں مصروف ہو گیا، سرکار بہادر آپ کا احسان میری نسلوں کے ساتھ چلے گا۔ یہ آپ نے مجھ ناچیز پر ایسی عنایت کی ہے، جس کا صلہ خداوند مسیح آپ کو دے گا اور میرا خدا آپ پر برکتیں نازل کرے۔ حضور برطانیہ کا سایہ ہندوستان پر تا قیامت رہے۔

ولیم نے ہاتھ کے اشارے سے مولوی کرامت کو خاموش ہو جانے کے لیے کہا پھر نجیب شاہ کو کمرے میں بلا کر حکم دیا، نجیب شاہ جب تک ٹی ای او نہیں آتا، مولوی کو باہر بٹھاؤ۔

مولوی کرامت کے جانے کے بعد ولیم نے نجیب شاہ کو کچھ اور بھی ہدایات دیں اور اُس کی طرف سے پیش کی گئی بقیہ فائلوں کا ایک ایک کر کے مطالعہ کرنے لگا۔ ان فائلوں میں محکمہ مال، فوجداری، نہری اور تحصیل کے انتظامی معاملات کے متعلق بہت معلومات افزا چیزیں تھیں، جن کا مطالعہ کرنے میں ولیم کو کم از کم ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا۔ اس عرصے میں، ٹی ای او، تلسی داس خاکی رنگ کی بڑی بڑی جیبوں اور نصف بازوؤں والی شرٹ اور سفید رنگ کا بغیر بیلٹ کے پاجامہ پہنے تحصیل کے ایجوکیشن ریکارڈ کی فائل بغل میں دابے آچکا تھا۔ لیکن اُسے ولیم کے کمرے میں اُس وقت تک جانے کی ہمت نہیں تھی، جب تک صاحب خود دوبارہ یاد نہ فرماتے۔ وہ سر پر دو پلی ٹوپی رکھے، نجیب شاہ کے کمرے ہی میں بیٹھ کر صاحب کے مکرر بُلاوے کا انتظار کرنے لگا۔ نجیب شاہ کے کمرے کے باہر مولوی کرامت بھی چپڑاسیوں کی بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ جس کو ولیم کے حکم کے مطابق باہر بٹھا تو رکھا تھا لیکن اُس کے بارے میں نجیب شاہ کو ابھی کوئی ہدایت نہیں ملی تھی۔ کافی دیر بیٹھنے کے بعد اندر سے بیل کی گھنٹی بجی تو تُلسی داس کی سانس میں سانس آئی کہ صاحب کو یاد تو آیا۔ گھنٹی بجنے کے فوراً بعد نجیب شاہ کمرے میں داخل ہو گیا جبکہ تُلسی داس نے پہلے تو اپنی عینک اُتار کر اُس کے شیشوں کو اچھی طرح اپنی شرٹ کی جیب میں اڑسے ہوئے رومال سے صاف کیا۔ پھر اُسے آنکھوں پر چڑھا لیا۔ اُس کے بعد قمیض کے کالر درست کر کے اُٹھ کھڑا ہوا اور فائل کو کھول کر اُس پر ایک سرسری نظر مارنے لگا۔ اتنے میں نجیب شاہ باہر آ گیا۔ اُس سے پہلے کہ تُلسی داس آگے بڑھ کر اندر جانے کی کوشش کرتا، نجیب شاہ نے اُسے بڑی سنجیدگی سے صاحب کا اگلا حکم سنا دیا،، صاحب کہتے ہیں میٹنگ لنچ کے بعد ہو گی۔ پھر انتہائی بے نیازی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

صاحب کا حکم سن کر تُلسی داس دوبارہ اپنے آفس کی طرف چلا گیا اور سب عملے نے بوسیدہ میزوں کی درازوں سے اپنے اپنے کھانے کے برتن اور گھی سے لپڑے ہوئے رومالوں میں بندھی روٹیاں نکال لیں اور کھانے میں مصروف ہو

گئے۔ جبکہ مولوی کرامت وہیں بنچ پر بیٹھا اُن کو دیکھتا رہا، جس سے تمام لوگ اس طرح بے نیاز ہو چکے تھے جیسے وہ مولوی کرامت نہیں بلکہ صاحب کے آفس میں آج ہی کسی نے لکڑی کا پتلا لا کر رکھ دیا ہو۔ کرم دین چپڑاسی نے ایک رومال میں بندھا ہوا اپنا کھانا کھول لیا، جو محض دو سوکھی روٹیوں پر مشتمل تھا۔ اُن کے اُوپر پسی ہوئی لال مرچیں رکھی تھیں۔ کرم دین اپنا کھانا لے کر مولوی کرامت کے پاس آ بیٹھا اور اُسے اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے دی۔ مولوی کرامت بھوکا تو تھا ہی، اشارہ پاتے ہی شریک ہو گیا۔ دونوں نے ایک ایک روٹی کھا کر خدا کا شُکر ادا کیا اور مٹی کے گھڑے سے پانی پی کر دوبارہ ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ دو بجے نجیب شاہ کو دوبارہ بُلاوا آ گیا۔ نجیب شاہ نے باہر آ کر تُلسی داس کو اندر جانے کا اشارہ کر دیا جو لنچ کے بعد آ کر بیس منٹ سے نجیب شاہ کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ تُلسی داس نے آگے بڑھ کر آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا اور بڑے احترام کے ساتھ ولیم کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ فائل اُس نے اپنے سینے کے ساتھ لگا رکھی تھی۔ ولیم نے اُسے کچھ دیر تک خموشی سے دیکھا، پھر آنکھ کے اشارے سے بیٹھنے کا حکم دیا۔

ولیم نے تُلسی داس کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد آخر گفتگو کا آغاز کر ہی دیا،، مسٹر تُلسی مجھے کچھ سوالوں کے جواب جلد اور بہت مختصر چاہییں۔

،جی سر، تُلسی داس نے ولیم کی طبیعت کو بھانپتے ہوئے کہا۔

جلال آباد میں پرائمری، مڈل اور اپر درجے کے کتنے اسکول ہیں؟ وہاں کے طلبا اور مُنشیوں کی تعداد اور حالات کے بارے میں مجھے بتاؤ،، ولیم نے دوٹوک لہجہ اپناتے ہوئے سوال کیا۔

سر تحصیل جلال آباد میں اس وقت ایک سو ستر پرائمری کے درجے کے، آٹھ مڈل اور دو اپر درجے کے اسکول ہیں۔ جن میں مُنشیوں اور طلبا کی تعداد (فائل کھول کر اُس کا مطلوبہ صفحہ آگے بڑھاتے ہوئے) اِس میں تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ اِس کے علاوہ بورڈنگ ہاؤس، لائبریریز اور دوسری بہت سی معلومات سر اس فائل میں صحیح اندراج کے ساتھ جمع کی گئی ہیں۔

ولیم فائل سامنے رکھ کر اُس کا غور سے مطالعہ کرنے لگا۔ اس عرصے میں تُلسی داس غالباً ولیم کے اگلے سوالوں کا دل ہی دل میں اندازہ لگانے میں مصروف ہو گیا۔ اسی کیفیت میں پندرہ منٹ گزر گئے۔ حتیٰ کہ ولیم نے سر اوپر اُٹھایا اور بولا

تُلسی داس اِن اسکولوں میں مسلمان طُلبا اور مُنشیوں کی تعداد تشویشناک حد تک کم ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا سرکار کی طرف سے اُن کے لیے کوئی رُکاوٹ ہے؟

حضور، سرکار کی طرف سے اُن کے لیے کوئی رُکاوٹ نہیں۔ خود اُنہی کی طرف سے رُکاوٹ ہے۔

مثلاً؟ ولیم نے مختصر پوچھا۔

اب تُلسی داس نے وضاحت کرتے ہوئے جواب دیا،، مسلمانوں کے مُلاوں نے انہیں روک رکھا ہے کہ گورنمنٹ کے اسکولوں میں نصاریٰ کی تعلیم دی جاتی ہے اور بچوں کو زبردستی عیسائی بنا دیا جاتا ہے۔ وہ اسی لیے مسلمان اپنے بچوں کو گورنمنٹ کے اسکولوں میں بھیجنے سے کتراتے ہیں۔

لیکن وہ یہ پراپیگنڈہ اتنے وسیع پیمانے پر کس طرح کر سکتے ہیں؟، ولیم نے فائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، آپ کی اس رپورٹ کے مطابق پوری تحصیل میں مسلمان طلبا کی تعداد محض ایک سو پینتیس ہے، جن میں اپر درجے کے صرف اٹھارہ بچے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

تُلسی داس نے سیاہ ڈوری سے بندھی ہوئی اپنی عینک آنکھوں سے اُتار کر گلے میں لٹکائی لی اور دانشوارانہ انداز میں جواب دیا،، سر، گورنمنٹ کے اسکولوں میں مسلمان طلبا کی یہ حالت اسی تحصیل میں نہیں بلکہ ہر جگہ یہی کیفیت ہے۔ اُن کے مُلا کے وسیع پرپیگنڈاہ کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہر گاؤں میں ایک مسجد ہوتی ہے، جس میں ایک دن میں پانچ بار یہ لوگ جمع ہو کر نماز پڑھتے ہیں اور جمعہ کے روز تو ہر شخص نماز کے لیے وہاں حاضر ہوتا ہے۔ جہاں یہ اپنے مولویوں کے خطبے سنتے ہیں۔ اُن خطبوں میں اِسی طرح کے درس دیے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اَن پڑھ ہوتے ہیں لہٰذا وہ اپنے مولویوں کی بات کو سچ مان کر اُس پر پورا پورا عمل کرتے ہیں اور حکومت کی بار بار تاکید کے باوجود اپنے بچوں کو اسکول نہیں بھیجتے۔

اوں وووہوں، ولیم فکر مندی سے ہنکارہ بھرتے ہوئے بولا، اوکے مسٹر داس، ہمیں اس پر غور کر کے اس کا کوئی حل نکالنا ہے۔

اس کے بعد کچھ دیر خموشی چھاگئی اور ولیم اپنی کرسی سے اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا، جسے دیکھ کر تُلسی داس بھی احتراماً اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر چند ثانیوں کے بعد ولیم دوبارہ بولا، تُلسی داس ابھی آپ جا سکتے ہو اور یہ فائل یہیں چھوڑ دو۔

تُلسی داس سلام کر کے کمرے سے نکلنے لگا تو ولیم اُسے دوبارہ مخاطب کر کے بولا،اور سنو

تُلسی داس آواز سُنتے ہی واپس مڑا، حکم سر

باہر ایک مُلا بیٹھا ہو گا نجیب شاہ کے پاس۔اُسے جلال آباد ہائی سکول میں مُنشی کی حیثیت سے نوکر کر لو، چالیس روپے ماہوار پر،، ولیم نے اپنا حکم دوٹوک سناتے ہوئے کہا، اور آج ہی اُس کا لیٹر جاری کر کے میرے پاس لاؤ۔ کسی فارسی دان سے کہنا، اُس کا انٹرویو بھی کر لے۔

جی بہتر سر، تُلسی داس سلام کر کے کمرے سے نکل گیا

جاری ہے

قسط نمبر 9

(16)

متھرا صاحب مجھے پانچ دن کے اندر سردار سودھا سنگھ کی گرفتاری چاہیے، ولیم اپنی ٹانگیں میز پر بچھا کر اور کمر کو کیا (کرسی پر لٹا کر متھرا داس سے مخاطب ہوا، کیا خیال ہے آپ کا یہ کام ممکن ہے؟ (پھر تھانیدار کی طرف منہ کر کے یہ بات مناسب تھی بیر سنگھ، جس شخص پر تم چھ دن پہلے تین سو دو کا پرچہ دے چکے ہو۔ اُس کی گرفتاری کے لیے تم چیونٹی بھر نہیں رینگے۔ اس کے لیے کیا میں لاہور سے تھانیدار بلواؤں؟

تھانیدار بیر سنگھ کانپتے ہوئے فائل آگے بڑھا کر بولا، سر یہ دیکھیں میں کارروائی کر رہا ہوں لیکن سودھا سنگھ کی گرفتاری تھوڑا سا مشکل کام ہے۔ مقابلے کا خطرہ ہے مگر میں اُسے نہیں چھوڑوں گا۔

کیا اس کے بارے میں تم نے ہمیں رپورٹ دی؟ ولیم کا لہجہ انتہائی سخت ہو چکا تھا، یا تم سمجھتے ہو سودھا سنگھ کو گرفتار کرنا آپ کے معدے کے لیے بُرا شگون ہے کیونکہ غلام حیدر نے تمھارے لیے کبھی دیسی شراب کے مٹکے نہیں بھجوائے حالانکہ تم اُس کے بہت زیادہ حق دار تھے اور سودھا سنگھ کا ایک آدمی اسی کام پر اُس کا تنخواہ دار ہے۔ (پھر متھرا کی طرف مخاطب ہو کر) متھرا صاحب ایک بات طے ہے، مَیں یہاں صرف سکھ مسلمان کے جھگڑے چکانے نہیں آیا۔ مجھے اور بہت سے کام ہیں، اُنھی میں سے ایک یہ بھی ہو سکتا ہے۔ سودھا سنگھ میرے لیے اور بہت سے مجرموں کی طرح ایک مجرم ہے اور بس۔ اگر آپ دونوں یہ کام نہیں کر سکتے تو گورنمنٹ کی طرف سے آپ کو اجازت ہے کچھ اور کام کیجیے۔ گورنمنٹ کوئی دوسرا آدمی حاصل کر لے گی۔

بیر سنگھ نے اپنی خاطر اس انداز سے ہوتے دیکھی تو لرز گیا اور کچھ دیر تک سر جھکا کر سوچنے کے بعد ہمت کر کے بولا "سر ہم گورنمنٹ کی بے عزتی نہیں ہونے دیں گے۔ سودھا سنگھ کو اس کی حویلی میں گرفتار کر کے لاؤں گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں نے سب تحقیق اچھی طرح کر لی ہے۔ وہ اس معاملے میں صاف مجرم ہے۔ جما سنگھ نے مجھے مخبری کر کے سب کچھ بتا دیا ہے۔

یہ جما سنگھ کون ہے؟ ولیم نے اب کہ کرسی سے اُٹھتے ہوئے پوچھا اور اپنی بیت ٹھوڑی کے نیچے ٹکا کر اُسے میز کا سہارا دے کر کھڑا ہو گیا۔ اب ولیم کے لہجے میں فوراً نرمی آ گئی۔ وہ جانتا تھا گھی کو تھوڑا سا گرم کیا ہے تو اُس نے برتن کی سطح

چھوڑ دی تھی۔اس لیے ولیم نے تھانیدار کے ساتھ شفقت کا سا انداز اپنا لیا تھا، ہمیں یقین ہے بیر سنگھ آپ نے کوئی بہتر تدبیر سوچی ہو گی لیکن جلدی۔

ولیم کو نرم پڑتے دیکھ کر تھانیدار کو مزید بولنے کی ہمت ہوئی۔ سر یہ جما سنگھ سردار فوجا سیوئ کا بھتیجا ہے۔ دونوں جھنڈو والا میں ہی رہتے ہیں۔ فوجا سیوئ سردار سودھا سنگھ کے دن رات کا یار ہے۔ حملہ کرنے سے پہلے اُس سے بھی مشورہ لیا گیا تھا اور فوجا سیوئ نے اُسے اس کام سے روکا تھا۔ مگر پیت سنگھ اور جگبیر نے اُسے حملہ کرنے پر اُکسایا اور سر، جب آپ جھنڈو والا گئے تھے۔آپ کے بعد وہاں فوجا سیوئ اور جگبیر کی منہ ماری ہوئی تھی۔ اُنھوں نے فوجا سیوئ کو بے عزت کر کے حویلی سے نکال دیا۔اسی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اُس کے بھتیجے نے مخبری کر دی۔

تو کیا جما سنگھ کو فوجا سیوئ نے آپ کے پاس بھیجا؟ ولیم نے مزید ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

ناں سر، وہ تو یہ کہہ رہا تھا اِس بات کی خبر چاچے فوجے کو بالکل نہ ہو کہ مَیں نے آپ کو بتایا ہے، تھانیدار نے اب سر آگے کر کے سر گوشی کے انداز میں کہنے کی کوشش کی جیسے کوئی سُن رہا ہو، اُس نے بتایا ہے اِن کے اور بھی بہت خطرناک ارادے ہیں۔ اگر سودھا سنگھ کو جلد نہ پکڑا گیا تو وہ غلام حیدر کو برباد کر دے گا۔ اُسے شیر حیدر پر بڑا اوَٹ ہے سرکار۔ وہ غلام حیدر سے اُس سب کا حساب چُکانا چاہتا ہے جو شیر حیدر سے اُسے ماتیں ہوئی ہیں۔

ہوں! ولیم دوبارہ کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔

ولیم تھانیدار کی معلومات سے متاثر ہوا۔ تھانیدار یہ سب کچھ کبھی نہ اُگلتا اگر ولیم اُس کے ساتھ سخت رویہ اختیار نہ کرتا۔ اُسے تو سردار سودھا سنگھ کی خوشی منظور تھی اور اُس نے جما سنگھ کے بارے میں سودھا سنگھ کو مطلع بھی کرنا تھا۔ مگر جما سنگھ کی خوش بختی کہ ولیم نے تھانیدار کو دفتر میں جلد طلب کر کے اُس کی ساری خواہش پر پانی پھیر دیا۔

ولیم نے کچھ دیر خموشی کے بعد متھرا اور تھانیدار دونوں کو مخاطب کر کے کہا، آپ دونوں کیس کو فوراً ہینڈل کرو۔ مَیں آپ کو سودھا سنگھ کی گرفتاری کے لیے پانچ دن دیتا ہوں۔ اس سے زیادہ میرے پاس وقت نہیں۔ اب آپ جائیں اور دیکھو اگر جما سنگھ کی خبر باہر نکلی تو اُس کے ذمہ دار آپ دونوں ہوں گے۔ گورنمنٹ کا مخبر اُس کی آنکھ ہوتا ہے اور اپنی آنکھ کی حفاظت کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

متھرا اور تھانیدار سلام کر کے باہر نکلے تو ولیم کچھ دیر تک کرسی پر سر ٹکائے بیٹھا رہا۔ دس پندرہ منٹ بیٹھنے کے بعد کرسی سے اٹھا، سر پر ہیٹ رکھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ ولیم کو کمرے سے نکلتے ہوئے افسروں اور کلرکوں نے

دیکھا تو سب مؤدب ہو گئے۔ نجیب شاہ بھاگ کر ولیم کے پہلو میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ ولیم اُسی خاموشی اور بغیر تاثر کے دفتر کی عمارت سے نکل کر سامنے والے گراؤنڈ میں کھڑا ہو گیا اور پوری عمارت کا بغور جائزہ لینے لگا۔ عمارت سُرخ اینٹوں سے تیار کی گئی تھی، جس کے چاروں طرف پچیس فٹ کھلے دالان در دالان برآمدے تھے۔ برآمدوں کے ستون آٹھ پہلو میں انتہائی صفائی اور کاریگری سے تیار کیے گئے تھے اور اُن کی چھتیں پچیس فٹ اونچی تھیں۔ برآمدوں سے آگے اور کمروں کے سامنے زمین سے تین فٹ اونچی چوکی چلنے کے لیے بنائی گئی۔ اسی طرح وہ چوکی برآمدوں سے باہر کی سمت بھی موجود تھی، جو چھوٹی سُرخ اینٹوں ہی کی بنی ہوئی تھی مگر پتھر کی چوکی سے کہیں خوبصورت تھی۔ برآمدوں سے آگے چوکی کے ساتھ ہی دفتر کے کمرے شروع ہو جاتے تھے، جن میں تحصیدار، نائب تحصیلدار، محکمہ مال اور کچہری انتظامیہ کے کمرے تفصیل وار کوئی سو کے قریب ہوں گے۔ آفیسرز کے کمرے قدرے بڑے اور کھلے تھے جبکہ کلرکوں کے کمرے انتہائی تنگ لیکن چھتوں کی اونچائی سب کی ایک جیسی تھی۔ گرمی کے دن اونچی چھتوں کے کمروں میں آسان گزر جاتے ہیں۔ اس عمارت کو اگر غور سے دیکھیں تو باہر سے انتہائی خوبصورت لیکن اندر سے بدنما تھی۔ آفیسرز کے کمروں کے سوا ہر کمرہ کاغذوں کے بوسیدہ پلندوں، میل جمی ہوئی فائلوں اور گرد و غبار سے اٹی ہوئی میز کرسیوں کا عجائب خانہ تھا۔ ولیم نے آتے ہی ایک آدھ دفعہ کلرکوں کے کمروں کا جائزہ لے لیا تھا۔ جس میں اُسے شدید ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر کلرک کی میز جگہ جگہ سے چھدی ہوئی تھی۔ غالباً جو نیا کلرک آتا وہ سب سے پہلے اپنا نام اُس پر کندہ کرنے کی کوشش کرتا۔ ہر میز کی دراز گھی اور تیل سے لتھڑی ہوئی تھی کہ گھروں سے لائے ہوئے کھانے رکھنے کی یہ درازیں بہترین مصرف تھیں۔ گویا میز کی ہر دراز میں میل کچیل اور بدبو کی ایک دنیا آباد تھی۔ اِسی طرح ہر میز یا کرسی پر جا بجا کیلوں اور لوہے کی پتریوں کی ٹھونکا ٹھانکی ہوئی تھی۔ دراصل کسی بھی کلرک نے اس طرف کبھی توجہ نہ دی کہ پرانی کرسی یا میز کو بدل لیا جائے بلکہ وہ خود ہی اُن کی مرمت کرتے رہتے تھے۔

اِس سلسلے میں ہتھوڑیاں اور کیلیں جا بجا کمروں سے برآمد ہو سکتی تھیں۔ نئی چیز منگوانے کے لیے چونکہ درخواست دینا پڑتی، یا پھر لمبے چوڑے نوٹ لکھنا ہوتے، جو اگرچہ کرسیوں کی خود ساختہ مرمت سے کہیں آسان تھے مگر وہ کام مشکل ہی تصور کیے جاتے کہ جب تک درخواست اُوپر سے ہو کر واپس محکمہ خزانہ تک آتی، کلرک کا تبادلہ ہو چکا ہوتا۔ اس لیے کوئی بھی یہ ذمہ داری قبول نہ کرتا اور اُسی فرنیچر پر وقت کاٹ لیتا۔ ولیم نے چلتے چلتے پوری عمارت کا چکر

کاٹ لیا۔ چہل قدمی کے دوران قریب قریب تمام آفیسر ولیم کے جلو میں شامل ہو چکے تھے۔ عمارت کو چاروں طرف سے دیکھنے کے بعد ولیم ایک بڑے صحن میں کھڑا ہو گیا۔ جس میں سڑی گھاس اور گھاس کے ارد گرد کیاریوں میں گیندے کے سوکھے ہوئے پودے کھڑے تھے۔ کچھ دیر یہاں رکنے کے بعد اُس نے ادھر اُدھر عمارت سے ذرا ہٹ کر چہل قدمی شروع کر دی، جہاں چھوٹے چھوٹے قطعات میں کہیں ٹماٹر اور کہیں پیاز یا لہسن کاشت کیا گیا تھا۔ اکثر جگہیں خالی تھیں، جن میں بے کار جڑی بوٹیاں اور جھاڑ جھنکاڑ تھا۔ جن جگہوں پر سبزیاں تھیں، اُنھیں بھی زیادہ توجہ نہیں دی گئی تھی۔ دراصل یہ سبزیاں افسروں کی بیگمات نے دفتر میں کام کرنے والے اُن چپڑاسیوں کی کام چوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، لگوائی تھیں، جنھیں دفتر کا کام بار محسوس ہوتا لیکن افسروں کے بچے کھیلانا اور اُن کی بیگمات کا کام کرنا ان لوگوں کے دائیں بائیں ہاتھ کے کام تھے۔

درخت نہ ہونے کے برابر تھے۔ البتہ جڑی بوٹیوں اور عک کے پودوں کی بہتات سے دفتر کی ویرانی کا ازالہ بہت حد ہو چکا تھا، جو ولیم کی طبیعت پر اچھا اثر نہیں ڈال رہا تھا۔

یہ چہل قدمی ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ جس میں ولیم کے ماتحت افسروں نے اپنی خوشی اور نوکری کے جبر کے باعث حصہ لیا۔ ایک جگہ جہاں رہٹ چل رہا تھا، ولیم رُک گیا اور تمام افسروں کی طرف مخاطب ہو کر بولا، مسٹرز میرا خیال ہے، جو کچھ میں دیکھ اور سوچ رہا ہوں آپ اُس سے بے خبر ہیں۔ میں یہاں کام کرنے آیا ہوں۔ گورنمنٹ کے لیے، لوگوں کے لیے اور آپ کے لیے۔ آپ سب گورنمنٹ کے اِس لیے ملازم ہیں کہ احکام پر عمل کرانے میں میرے معاون ہوں۔ (پھر کچھ دیر رُک کر اور بیت کو بائیں ہتھیلی پر مار کر) کیا آپ اس علاقے کو دیکھ رہے ہیں؟ دُور تک ویرانی اور بیزاری نظر آ رہی ہے۔ ایسی صورت میں اگر ہم کام نہ کریں تو ہمارا یہاں کیا جواز بنتا ہے؟ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگوں کو کاشت کاری سے کوئی دلچسپی نہیں۔ (نائب تحصیلدار مدن لعل کی طرف منہ کر کے) مدن لعل کل صبح نو بجے نہر کے عملے کی میٹنگ بلواؤ اور کچھ سر کردہ زمینداروں کو بھی جمع کرو۔ میں جلال آباد میں لہلہاتے کھیت اور باغات دیکھنا چاہتا ہوں (نجیب شاہ کی طرف دیکھ کر) تحصیل کمپلیکس میں ایک دو رہٹ لگوانے کا بندوبست کرو۔ ہم یہاں چوہوں سے مورچے کھدوانے نہیں آئے۔ مجھے ایسی جگہوں سے وحشت ہوتی ہے، جہاں رات کتوں اور گیدڑوں کے لشکر چوکیاں بھریں۔

ولیم کا حکم ملتے ہی ہر ایک نے اپنی نوٹ بکوں پر پُھرتی سے اندراجات شروع کر دیے۔

دو بگھیاں اور دس گھوڑے شیخ نجم علی کی کوٹھی کے سامنے رکے تو ادھر اُدھر کے راہگیر حیرت سے دیکھنے لگے۔ اُن کی نظر میں کوئی بہت بڑا رئیس آیا تھا۔ بعض لوگ اپنی دکانوں سے نکل کر بازار میں کھڑے ہو گئے مگر غلام حیدر نے کسی کی طرف توجہ نہ دی، بگھی سے اُتر کر سیدھا دروازے کی زنجیر ہلا دی۔ رفیق پاولی اور دوسرے سب آدمی بھی اپنی سواریوں سے نیچے اُتر آئے۔ رفیق پاولی "علی منزل" کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کوٹھی کی لمبائی سو میٹر تک پھیلی ہوئی تھی۔ جس کے نیچے کپڑے، پرچون اور لوہے والوں کی بیسیوں دکانیں قطار میں دور تک نظر آ رہی تھیں۔ کوٹھی انڈے سے زیادہ سفید تھی اور تین منزلوں پر مشتمل اتنی اونچی کہ اُوپر تک دیکھنے کے لیے اُسے اپنی پگڑی سنبھالنا پڑی۔ مرکزی دروازہ مغلیہ قلعے کا ہاتھی گیٹ معلوم ہوتا تھا۔ بیضہ گیر اُوپر نیچے لمبی اور چوڑی ڈاٹوں سے کم از کم تیس فٹ تک چڑھایا ہوا۔ جس کے اُوپر دونوں سروں پر دو ببر شیر منہ کھولے دھاڑ رہے تھے۔ شیر سیمنٹ اور چونے کے ہونے کے باوجود اِن کے بنانے میں ایسی کاریگری دکھائی گئی تھی کہ یہ بالکل اصلی لگتے۔ اِس کے علاوہ نیچے سے لے کر اُوپر کی دو منزلوں تک دیواروں میں بے شمار محرابیاں اور ڈاٹیں مزید تھیں۔ اِن ڈاٹوں پر اُوپر تلے کئی طاق تھے، جن پر اس قدر نفاست سے کام کیا گیا تھا کہ ایک ایک طاق مہینوں کی محنت کا نتیجہ نظر آ رہا تھا۔ ان تین تین ڈاٹوں کے اندر کہیں محض سجاوٹ کے لیے جالیاں تھیں اور کہیں بیچ بیچ دیودار کی لکڑی کی لاتعداد کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ انھی کھڑکیوں، جالیوں اور الماریوں سے ہوا اور روشنی کوٹھی کے اندر جاتی۔ اس کے علاوہ پوری کوٹھی اُوپر سے لے کر پاؤں کی اینٹوں تک سفید چونے اور ابرق میں نہلا دی گئی کہ دیکھنے والے کی آنکھیں سفید روشنی میں بہہ جاتیں۔ یوں تو غلام حیدر کی حویلی بھی کم نہ تھی مگر رفیق پاولی نے سوچا کہ جتنی عمدہ اور شاندار یہ کوٹھی ہے اور جتنا کرایہ شیخ صاحب کو اس ایک ایکڑ سے ماہانہ آ جاتا ہو گا اِتنی تو شیر حیدر کے دو گاؤں کی آمدنی بھی مشکل سے تھی۔

انہی خیالوں میں گم اُسے پتہ ہی نہ چلا کب وہ سب ایک بڑے ہال نما کمرے میں نرم نرم چوڑی اور لمبی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ بڑی بڑی لالٹینیں اور کانچ کے بھاری فانوس اونچی سفید چھت سے لٹکے ہوئے تھے۔ قدموں کے نیچے فرش پر بھی بڑی صاف اور لال رنگ کے پھول بوٹوں والی نرم دریاں بچھی تھیں۔ جن کے اندر آدھا پاؤں گھُس جاتا۔ رفیق پاولی کوٹھی اور کمرے کی ہیبت میں ہی گم تھا۔ سوچ رہا تھا کہ غلام حیدر کا دوست بھی کتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ سچ ہے بڑے پانیوں میں بڑی مچھلیاں۔ اس سے پہلے اُس کی اتنے بڑے لوگوں سے نہ تو ملاقات ہوئی تھی اور نہ

ہی ایسے اچھے گھر دیکھے تھے۔ شیر حیدر کے تو جتنے دوست یار تھے، وہ صرف گاؤں اور دیہاتوں میں رہنے والے زمیندار تھے۔ اُن کے گھروں سے تو شیر حیدر کی حویلی کئی درجے بہتر تھی۔ اُس نے سوچا واپس جا کر وہ غلام حیدر سے بھی ایک اِسی طرح کا بڑا سا کمرہ حویلی کے بیرونی احاطے میں بنوائے گا۔ غلام حیدر کے بڑے بڑے دوستوں کو بٹھانے کے لیے ڈھنگ کی جگہ تو ہونی چاہیے۔ اب چاہے اس پر ایک گاؤں کی سال بھر کی آمدنی ہی کیوں نہ لگ جائے، وہ ایسا کمرہ تو غلام حیدر سے بنوا کر رہے گا۔ انہی سوچوں میں اُسے بالکل نہیں اندازہ تھا کون آ رہا ہے اور کون جا رہا ہے۔ اچانک غلام حیدر نے رفیق پاولی سے مخاطب ہو کر کہا، چاچا رفیق یہ میرا دوست نجم علی ہے۔ غلام حیدر کی آواز سن کر رفیق پاولی خیالات سے چونکا۔ اُس نے نظریں اُوپر اُٹھا کر دیکھا تو نجم علی اُس کی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔ بالکل غلام حیدر کی دوستی کے ہی قابل تھا۔ نجم علی کو دیکھ کر رفیق پاولی تو خیالات کی دنیا سے باہر نکل آیا مگر دوسرے لوگوں کی توجہ ڈرائنگ روم یا بڑے کمرے ہی پر مرکوز رہی۔

نجم نے سب کے ساتھ سلام دعا کے بعد ملازم سے کہا، صاحب کے بندوں کے لیے کھانا پانی کا بندوبست کرواور (ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ نہانے دھونے کا کمرہ ہے، سب منہ ہاتھ دھو لو۔ ان سے فارغ ہو کر نجم علی غلام حیدر کو دوسرے کمرے میں لے گیا اور بیٹھتے ہوئے بولا، خیر ہے غلام حیدر، لاہور سے کب آئے؟ آج فوجاں کس طرف چڑھی ہیں۔ یہ چھوَیاں، ریفلاں؟ کوئی مسئلہ ہو گیا کیا؟

غلام حیدر نے مدھم آواز میں سر اُوپر اٹھاتے ہوئے کہا "نجمے یار اب تو شائد لاہور مکمل طور پر چھوڑنا پڑ جائے، ابا فوت ہو گیا۔

اِنَّ للہ، کب؟ نجم علی نے حیرت سے پوچھا۔

آج چھٹا دن ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ستم یہ ہوا کہ علاقے میں دشمنی مزید پیدا ہو گئی۔ دشمنوں نے میرا ایک بندہ مار دیا، بیس ایکڑ مونگی کی فصل تباہ کر دی، کچھ لے گئے، باقی جلا گئے۔

لاحول ولا، یہ کس وقت ہوا؟ نجم علی ہونق سا ہو گیا۔

ابا کے قتل والی رات، غلام حیدر سیدھا بولتا چلا گیا، سردار سودھا سنگھ ابا کا بڑا واہیات دشمن ہے۔ منڈی گروہر سا کے پاس ہمارے گاؤں جودھا پور کے قریب ہی اُس کا گاؤں ہے، جھنڈو والا نام سے۔ ابا سے کئی دفعہ منہ کی کھا چکا تھا۔ اب وہ فوت ہوئے تو اُس نے عین پھوڑے پر ضرب ماری ہے۔ میں تو تعزیت کرنے آئے مہمانوں اور ختم درود میں

اُلجھا ہوا تھا اور خیال تک نہیں تھا کہ کوئی اس طرح کی حرکت بھی کرے گا مگر اُس نے اپنا کام دکھا دیا۔ فصل برباد کرنے کے ساتھ ساتھ میرا ایک بندہ بھی مار دیا۔

پھر اب کیا ارادہ ہے؟ نجم علی نے پوچھا، پرچہ درج کرایا؟

پرچہ تو درج کروا دیا ہے۔ غلام حیدر نے بتانا شروع کیا، پر مجھے لگتا ہے، سودھا سنگھ کے ہاتھ لمبے ہیں۔ تھانیدار سے لے کر اُوپر تک سب اُسی کے کنویں سے پانی پیتے ہیں۔ ابا کیا فوت ہوا، سب نے نظریں پھیر لیں۔ اب تو خبریں ہیں کہ چوہے بھی شراب کے مٹکوں سے نکل نکل کر سامنے آ رہے ہیں۔

تھانیدار سے بات کی، نجم نے پوچھا۔

تھانیدار چھوڑ، اسسٹنٹ کمشنر تک سے بات کی مگر وہ اپنی اکڑ میں ہے۔ نیا نیا پہلی دفعہ ہماری تحصیل میں ہی آ لگا ہے، یہیں تجربہ سیکھنے کے لیے۔ مجھے لگتا ہے وہ کچھ نہیں سیکھے گا۔ اُس کے سیکرٹری نجیب شاہ نے بتایا ہے کہ اُسے باغوں اور فصلوں کی بیماری ہے۔ امن و امان کی طرف ذرا دھیان نہیں۔ اگر اسی طرح چلا تو تھوڑے دن نکالے گا۔ کیونکہ جلال آباد میں چور بھی کھمبیوں کی طرح اُگتے ہیں۔

آج فیروز پور کیسے؟ اگر مجھ سے کوئی مدد کی ضرورت ہو تو حاضر ہوں مگر میرا تھانے کچہری میں تو کوئی واسطہ نہیں اور نہ کوئی واقف ہے، نجم نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔

اس تنگ وقت میں آپ کی طرف آنے کا مقصد آپ کی مدد حاصل کرنا ہی ہے، غلام حیدر بولا، تم اپنے والد شیخ مبارک سے کہو، وہ ڈپٹی کمشنر سے میری ملاقات کا بندوبست کروا دے تاکہ ہم سودھا سنگھ پر پکا ہاتھ ڈالیں۔ یہ مسئلہ میری عزت اور انا کا بن چکا ہے۔ اگر سودھا سنگھ گرفتار نہ ہوا تو سمجھ لو شیر حیدر کا نام ابھی اُس کے جسم کے ساتھ دفن ہو جائے گا اور میں جیتے جی ایسا ہونے نہیں دوں گا۔ دوسری طرف میری رعایا ہے۔ ابھی تک تو انھیں امید ہے کہ میں بہت کچھ کر گزروں گا لیکن تمھیں یہ نہیں پتا کہ رعایا خود کچھ نہیں ہوتی۔ اس کا معاملہ پل میں تولہ اور پل میں ماشہ والا ہوتا ہے۔ جس طرح یہ لوگ پہاڑ جیسے مضبوط ہوتے ہیں، تھوڑی سی ہمت ماند پڑے تو اُسی لمحے رائی بن جاتے ہیں۔ ابھی تک وہ سمجھے بیٹھے ہیں، مَیں سودھا سنگھ کا گاؤں کھود ڈالنے پر قادر ہوں۔ اگر انھیں پتا چل جائے کہ میری تحصیل میں سُبکی ہوئی ہے اور گورنمنٹ میں مجھے کوئی نہیں جانتا تو یہ جتنے بندے میرے ساتھ شیروں کے جگرے

والے نظر آتے ہیں، ابھی گیدڑوں سے بدتر ہو جائیں گے۔ اس لیے میں ان پر اپنا بھرم کھونا نہیں چاہتا۔ تم مجھے اپنے والد شیخ مبارک سے ملاؤ، میں اُن سے خود بات کرتا ہوں۔

نجم علی نے سنجیدگی سے تمام بات سن کر غلام حیدر کی طرف دیکھا اور بولا، حیدر اصل میں ابا تو لدھیانے میں ہیں۔ وہاں سے وہ پرسوں آئیں گے۔ تم کو دو دن یہاں رُکنا پڑے گا۔ یا پھر کل ہم خود ملاقات کی راہ نکال لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کمشنر صاحب بات سُن لے گا۔ اگر چاہو تو اپنے بندوں کو واپس بھیج دو، چاہو تو یہیں رہنے دو۔

نہیں ہمارا خود ڈپٹی کمشنر سے ملنا کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ بلکہ اُلٹا کام بگڑے گا، غلام حیدر نے جواب دیا، یہ کام اتنا مشکل نہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ نواب افتخار لندن میں ہے اور اُس سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ بالفرض رابطہ ہو بھی جائے تو وہ اتنی دور سے مناسب طریقے سے معاملہ سمجھ نہیں سکے گا۔ اس لیے اُس کو اس پنگے میں ڈالنا بہتر نہیں۔ رہا اُس کا باپ سر شاہنواز تو اس وقت وہ کشمیر میں گیا ہوا ہے۔ اُس سے بھی رابطہ نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی اُن سے اس کام کے لیے کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔ ان نوابوں شوابوں سے کوئی بڑا کام لیں گے۔ میں چچا مبارک کا یہاں انتظار کر لیتا ہوں لیکن ہاتھ سخت ڈالنا چاہتا ہوں۔

ہاں بہتر یہی ہے تم یہاں رُک کر ابّا کا انتظار کر لو۔ اُن کی ڈپٹی کمشنر صاحب سے مل کر بات کرنے کی صورت ذرا الگ ہے، اس لیے انھیں آنے دیں اور اپنے ان بندوں کو واپس جلال آباد بھیج دو، یہ وہاں کے حالات پر نظر رکھیں۔

نجم علی "غلام حیدر دوبارہ بولا" میں کچا ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتا لیکن مجھے جلدی بھی بہت ہے۔ اس طرح کی ملاقات جس میں صرف انھیں بات سنانی مقصود ہو، مجھے منظور نہیں۔ سرسری ملاقات کرنے میں قباحت یہ ہے کہ ڈپٹی کمشنر زیادہ سے زیادہ اسسٹنٹ کمشنر کو لکھ دے گا کہ اس مسئلے کو دیکھو جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس طرح میں جلال آباد میں مزید بے عزت ہو جاؤں گا اور اسسٹنٹ کمشنر مزید میرے خلاف ہو جائے گا۔

ٹھیک ہے پھر ابا کو واپس آنے دو۔ ڈپٹی کمشنر سے اُن کے اچھے تعلقات ہیں، نجم علی نے کہا، لیکن ایک بات اگر برا نہ مانو تو کہوں "تم اِن زمین کے دھندوں سے جان چھڑا کیوں نہیں لیتے؟ خواہ مخواہ کی دشمنی میں اُلجھے رہو گے، ساری عمر لڑائی اور تھانہ کچہری میں برباد ہو جائے گی۔ اپنی زمین کسی کو ٹھیکے پر دے کر آرام سے لاہور چلے جاؤ۔ یہاں بلا وجہ گنواروں میں پھنسے رہنا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔

نجم علی مجھے اس طرح کے مشورے کی فی الحال ضرورت نہیں۔ تم میرے بندوں کے سونے کا بندوبست کر دو۔ یہ بھی تھکے ہوئے ہیں۔ کل صبح میں انھیں واپس بھیج دوں گا، غلام حیدر نے غصے سے جواب دیا۔

ٹھیک ہے بھائی ناراض نہ ہو، یہ کہہ کر نجم علی وہاں سے اُٹھ کر باہر نکل گیا۔

نجم علی نے مہمانوں کے تمام انتظامات بوڑھے ملازم میراں داد کو سونپ کر خاص ہدایت کر دی کہ کوئی شکایت پیدا نہ ہو۔ اس کے بعد خود غلام حیدر کے پاس آ بیٹھا۔ دونوں سکول کے زمانے کی باتیں کرنے لگے، جو مڈل تک گورنمنٹ ہائی سکول فیروز پور میں گزارے تھے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات اور بچپن کی شرارتیں یاد کر کے ہنستے رہے۔ اِن خوش گپیوں اور یادوں میں غلام حیدر کی طبیعت سے کچھ تکدّر دور ہو گیا اور رات کا ایک بج گیا۔ بالآخر باتیں کرتے دونوں وہیں سو گئے۔

اگلے دن صبح سات بجے اُن کی آنکھ کھلی۔ نہانے دھونے اور ناشتہ کرنے میں دس بج گئے۔ ناشتے کے بعد غلام حیدر اپنے لوگوں کے پاس ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہ سب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کے چہروں سے محسوس ہو رہا تھا کہ نجم علی کے ملازم نے اُن کی کافی آؤ بھگت کی تھی۔ سب کی طرف سے خوشگوار تاثر مل رہا تھا۔

غلام حیدر نے رفیق پاولی کی طرف دیکھ کر بلا کسی تمہید کے کہا، جو رات کی نسبت کافی ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا، چاچا رفیق آپ ایسا کرو، بندوں کو لے کر آج واپس جلال آباد چلے جاؤ اور دونوں گاؤں کے معاملات پر پوری نظر رکھو۔ دشمن کسی بھی طرف سے دوبارہ شرارت کر سکتا ہے۔ کل شیخ صاحب واپس آ جائیں گے تو میں پرسوں ڈپٹی کمشنر صاحب سے ملاقات کر کے شام پانچ بجے یہاں سے جلال آباد کے لیے ریل پکڑ کر سات یا آٹھ بجے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جاؤں گا اور دیکھو کسی کو بھنک بھی نہ پڑے کہ میں کہاں ہوں اور کس وقت یہاں سے نکلوں گا۔ بس اب جاؤ اور میرا پرسوں وہاں انتظار کرنا۔ باقی کسی قسم کی جلدی کسی بھی کام میں ضروری نہیں۔

جاری ہے

قسط نمبر 10

(18)

سر دار سودھا سنگھ سورج چڑھنے سے کافی دیر پہلے بیدار ہو گیا۔ پلنگ سے آہستہ سے اُٹھا اور رضائی آرام سے یینت کور کے اُوپر ڈال دی۔ اِس کے بعد اپنی پگڑی سر پر درست کی، کرپان باندھی اور منہ اندھیرے ہی حویلی سے باہر نکل آیا۔ باہر ڈیوڑھی میں رات کے جتنے پہرے دار تھے سب سو چکے تھے، البتہ چھدّو جاگ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ رات کو سر دار سودھا سنگھ کے اٹھتے ہی اپنی چار پائی پر جا پڑتا تھا۔ اس لیے صبح اُس کی آنکھ جلدی کھُل جاتی۔ اُس نے اشنان تو مہینوں بعد کرنا ہوتا تھا اس لیے سردی میں صبح کے وقت آگ جلانے کے سوا اُسے کوئی کام نہ تھا۔ آج بھی اُس نے صبح گوردوارے کا گھنٹہ بجنے سے پہلے ہی آگ جلا لی تھی۔ سر دار کو ڈیوڑھی کی طرف آتے دیکھ کر چھدّو فوراً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پر نام کیا۔ سر دار نے چھدّو کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا، چھدّو ڈیوڑھی کا دروازہ کھولو۔ چھدّو کو سر دار سودھا سنگھ کے معمول کا پتہ تھا، اس لیے سودھا سنگھ کے بولنے سے پہلے ہی دروازے کی بلیاں اُٹھانے لگا اور آہستہ آہستہ پانچوں بلیاں اُٹھا دیں۔ دروازے کو دھکیلنے کے لیے تختوں کے نیچے لکڑی کے چھوٹے پہیے لگے ہوئے تھے۔ پھر بھی اِس پہاڑ جیسے دروازے کو دھکیل کر ایک طرف کرتے ہوئے چھدّو کو بہت زور لگانا پڑا۔ دروازہ اتنا بڑا اور بھاری تھا کہ اُس سے دو دو ہاتھی ایک وقت میں گزرنے کی راہ تھی۔ کالی سیاہ ٹاہلی کی موٹی موٹی چگاٹھوں پر تین انچ کے موٹے اور چھ ضرب دس فٹ کے چوڑے اور لمبے تختے تھے، جن پر کلو کلو بھر کے بے شمار لوہے اور تانبے کے کیل کٹرے جڑے ہوئے تھے۔ تختوں کے علاوہ لوہے کا وزن ہی کوئی تین چار من کے قریب ہو گا۔ سر دار سودھا سنگھ نے آگے بڑھ کر چھدّو کا اس معاملے میں ہاتھ بٹایا اور دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی سر دار سودھا سنگھ باہر نکل گیا اور چھدو لنگڑاتا، ہانپتا دوبارہ آگ کے پاس آ بیٹھا۔

سر دار سودھا سنگھ نے گوردوارہ پہنچ کر سنت سے کہا کہ اُسے اشنان کرائے۔ حوض کے کنارے کھڑے ہو کر کپڑے اتارنے لگا۔ حوض کا پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ رات بھر پڑنے والے پوہ کے پالے اور ٹھنڈی ہوا سے پانی کے اُوپر برف کی کاغذی تہہ جم چکی تھی۔ لیکن سر دار سودھا سنگھ نے بچپن ہی سے کبھی گرم پانی اشنان کے لیے استعمال نہیں کیا تھا۔ اُس کے خیال میں پانی گرم کر کے نہانا زنانیوں کا کام تھا۔ اس طرح کے لچھن کرنے سے سر داروں کی مردانگی میں فرق آتا تھا۔ سودھا سنگھ کی کمر اور پورے جسم پر ریچھ کی طرح بالوں کے اتنے گچھے اُگے تھے کہ ماس کی ذرا بھی کرن

نظر نہیں آتی تھی۔ ان کھردرے بالوں میں چھپے جسم کو نہلانے کے لیے سنت نے لسی کی بھری ہوئی گاگر رات کو ہی منگوالی تھی۔ یہ اُس کا معمول تھا۔ سودھا سنگھ کے جسم کے اوپر کھٹی لسی گرا کر، جو کم از کم چوبیس گھنٹے پُرانی ہوتی، وہ دونوں ہاتھوں سے جسم کو رگڑتا۔ پھر ٹھنڈے پانی کے کٹورے بھر بھر کر اُس کے اوپر ڈالتا تو جسم کے بال کالے شیشوں کی طرح چمک اُٹھتے اور ایسے لگتا پورے جسم پر چھوٹے چھوٹے باریک سانپ اُگ آئے ہوں۔

سردار سودھا سنگھ نے اشنان کرنے کے بعد آرام سے کپڑے پہنے اور پوجا پاٹ میں مصروف ہو گیا حتیٰ کہ سورج چڑھنے کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اُس کے بعد وہ گوردوارہ سے نکل کر کھیتوں کی طرف چل دیا۔ کھیتوں کی لمبی سیر نے سردار سودھا سنگھ کی طبیعت میں جوانوں کی سی تازگی بھر دی۔ رات بھر اوس پڑتے رہنے سے ہر طرف پھیلی ہوئی فصلوں پر سبزے پر اور پگڈنڈیوں پر ٹھنڈک ہی ٹھنڈک اور تریل جمع ہو چکی تھی۔ بہت سارے لوگ ادھر اُدھر اپنے ہل جوتے ہوئے بیلوں کو ہانک رہے تھے۔ اِن صبح سویرے ہلوں میں جُتے ہوئے بیلوں کی بجتی ہوئی گھنٹیاں سردار سودھا سنگھ کو گوردوارے کے گھنٹے کی آواز سے کہیں زیادہ مسحور کن لگنے لگیں۔ دُور تک دیسی سرسوں کے پیلے پھول، برسن کا چارہ اور گندم کے کھیت جن پر ابھی خوشے یا سٹے نہیں نکلے تھے، یہ سب اور ان کے درمیان جا بجا بہتا ہوا، کھالوں اور رہٹ کا پانی شیشے پر لڑھکتے ہوئے شفاف پارے کی طرح تیر رہا تھا۔ سردار سودھا سنگھ کبھی کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں اور کبھی کھال کے کناروں پر چلتا اور چھوٹے موٹے کھڈوں کو پھلانگتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ کبھی کبھی دور سے کوئی واہگرو یا ست سری اکال کا نعرہ بلند کرتا تو سردار صاحب ہاتھ ہلا کر یا اُسی طرح نعرے کے ساتھ اُس کا جواب دے کر بغیر ٹھہرے آگے چلتا گیا۔ اسی طرح سردار سودھا سنگھ، ٹاہلیوں، کیکروں اور شریہنہ کے درختوں کا طواف کرتا، کھیتوں کی اوس اور لمس لیتا سورج کے منہ دکھانے کے ساتھ ہی دوبارہ حویلی کی ڈیوڑھی کے بڑے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو سب نے اٹھ کر سردار صاحب کو پرنام کیا۔ سردار سودھا سنگھ تھوڑی دیر وہاں رُکا، دو ایک لوگوں کے ساتھ ہلکی پھلکی چہل کی پھر زنانے میں چلا گیا۔ اس سیر سے سردار صاحب کی بھوک کافی چمک گئی تھی کیونکہ وہ کم از کم دو میل چلا تھا۔

زنانے میں داخل ہوتے ہی سردار سودھا سنگھ نے بینت کور کو آواز دی جو گرنتھ پڑھنے میں مصروف تھی، او بنتے جلدی نال بھوجن دے دے۔ ہُن بُھکھ بڑی لگ گئی آ۔ جدو یکھو گرنتھ پڑھ دی رہندی آ، پتا نئیں گروجی نال کوئی ٹُک مکا کر لیا وا۔

یننت کور نے بیٹھے بیٹھے ہی اجیت کور سے کہا" پت اجیتے چھیتی نال اپنے پِتا جی نوں ناشتہ کروا، میں تھوڑا جہیا رہ گیا، پڑھ لاں۔ اونی دیر وچ کتے تیرے پِتا جی دی جان نہ نکل جاوے۔

اجیت کور، جلدی سے اُٹھ کر ناشتہ تیار کرنے لگی۔ اتنی دیر میں چھماں نے دُور تک پھیلے صحن کے ایک کونے میں جہاں دھوپ خوب نکل کر سفید ہو گئی تھی، چارپائی لگا دی، جس پر سردار سودھا سنگھ چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ کرپان اتار کر اُس نے چارپائی کی ادوائین کی طرف رکھ دی۔ اس عرصے میں یننت کور بھی گرنتھ کو غلاف میں لپیٹ کر اونچے اور محرابی نما طاق میں رکھ کر پاس آ بیٹھی۔ چند منٹوں میں اجیت کور نے ناشتہ تیار کر کے چھماں کو پکڑا دیا اور خود لسی جگ میں ڈالنے لگی۔ چھماں نے ناشتہ سردار سودھا سنگھ کر سامنے رکھ کر بڑا سا کپڑا اُس کے زانوؤں پر پھیلا دیا تاکہ کپڑے خراب نہ ہوں۔ اسی اثنا میں اجیت کور لسیؔ لے کر آ گئی اور سامنے تپائی پر ناشتہ رکھ دیا گیا۔ دیسی سرسوں کا مکھن میں گھلا ہوا ساگ اور مکھن میں تیرتے ہوئے پراٹھوں نے، جن سے گرم گرم بھاپ کے لمس اُٹھ رہے تھے، سودھا سنگھ کی مزید بھوک بڑھا دی۔

پہلے سردار سودھا سنگھ نے سیر بھر کا پیتل کا گلاس جسے نئی قلعی کرائی گئی تھی، بھر کر گٹا گٹ کر کے پیا۔ ہلکے نمک والی لسی نے سردار جی کے کئی مسام کھول دیے۔ اگر کسی نے سردیوں کی دھوپ میں بیٹھ کر صبح سویرے نمک والی لسی نہیں پی تو وہ نہیں جان سکتا کہ سردار سودھا سنگھ اِس وقت کتنی شرابوں سے مخمور تھا۔ لسی پینے کے بعد سردار صاحب نے ساگ کے ساتھ پراٹھے کا لقمہ لیا اور اُسے کھانے لگا۔ یننت کور سردار سودھا سنگھ کے تین سالہ بیٹے موہن سنگھ کو گود میں لے کر سامنے خموش بیٹھی تھی جبکہ چھماں جو گھر کی ملازمہ تھی، گھر کے بقیہ کام نمٹانے لگی اور اجیت کور نے چولہے پر رکھے دودھ کے نیچے پاتھیوں کی ہلکی آنچ رکھ دی۔ پاتھیوں کی ہلکی آنچ سے ایک تو دودھ برتن سے اُبل کر باہر نہیں گرتا دوسرا یہ کہ تھوڑی تھوڑی آگ کے دُھکنے سے دودھ خوب کڑھ بھی جاتا ہے اور اُس پر موٹی بالائی آ جاتی ہے۔

سردار سودھا سنگھ نے ناشتہ کرتے ہوئے یننت کور کو دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان نظر آ رہی تھی۔

خیر ہے بنتو کچھ کملائی لگتی ہو؟ سودھا سنگھ نے بھاری مونچھوں اور گھنی داڑھی کے درمیان میں کہیں چھُپے ہوئے منہ کے دھانے کی طرف لُقمہ لیجاتے ہوئے پوچھا۔

یننت کور نے دھیمے سے، ہاں، میں سر ہلا دیا۔

"پر ہوا کیا؟ کچھ تو پتا چلے" سردار سودھا سنگھ کھانے سے بغیر ہاتھ روکے بولا

سردار جی مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ آج کل بُرے بُرے سپنے دیکھتی ہوں، بینت کور نے سر اُٹھا کے آخر سردار جی کو اپنی پریشانی بتانے کی کوشش کی۔

پھر بینت کور مزید آگے ہو کر بولی "کنتا، جودھاں، بلّو اور دوسری کُڑیاں سو سو طریقے کی باتیں کرتی ہیں۔"

سودھا سنگھ لاپرواِئی کے ساتھ ایک اور لسی کا گلاس چڑھاتے ہوئے بولا، اسی لیے دن رات گرنتھ اور پاٹھ پوجا کے دوالے رہتی ہو۔ وہ کیا باتیں کرتی ہیں کچھ تو پتا چلے بنتے؟

بینت کور سرگوشی کے سے انداز میں بولنے لگی، وہ کہتی تھیں غلام حیدر کی وائسرائے کے ساتھ رشتے داری ہو گئی ہے۔ اُس کی کُڑی کے ساتھ اِس منڈے کا یارانہ ہے۔ اندر خانے شادی بیاہ کے قصے بھی چل رہے ہیں۔ سودھے مجھے فکر ہے اگر یہ باتیں ٹھیک ہیں تو پھر بڑے سیاپے پڑ جان گے۔ واہگرو نہ کرے، اگر سردار جی وائسرائے نے غلام حیدر کو اپنی کُڑی دے دی تو پھر،،،؟ بس مجھے یہی پریشانی ہے کہ ہمارا سیدھا سیدھا فرنگیوں سے وَیر پڑ جائے گا۔ مَیں تو کہتی ہوں ان فرنگی عیسائی اور مُسلوں کا اندر سے دھرم بھی ایک ہی ہے۔ دونوں ہی اپنے مُردوں کو گڑھوں میں دباتے ہیں اور کوئی پیغمبروں شغمبروں کو مانتے ہیں۔ ان کو وَیر صرف سرداروں سے ہی ہے۔

سردار سودھا سنگھ نے ناشتہ کر کے ایک بڑا سا ڈکار لیا اور بینت کور کی بات سن کر ہلکا سا قہقہہ مارا، پھر مونچھوں سے لسی کی سفیدی صاف کرتے ہوئے بولا۔ بنتو! تُو نے اتنی باتیں کہاں سے سیکھ لی ہیں؟ حوصلہ رکھ، یہ فرنگی کسی کے متر نہیں، جتنے سرداروں کے دشمن ہیں اتنے ہی مُسلوں کے بھی ہیں۔ پھر دشمنی تو مردوں کا گہنا ہوتی ہے۔ بنتو۔ وَیر کے بغیر مرد ایسے ہی ہے جیسے اکھاڑوں میں ناچنے والا کھسرا، جس کے سارے یار ہی یار ہوتے ہیں۔ غلام حیدر کل کا مُنڈا میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ چاہے ملکہ کے ساتھ بیاہیا جائے۔ اس مُسلے کی دُم تو اب چکی کے پُڑ نیچے آئی ہے۔ کل تک اُس کو سُر لگ جائے گی۔ ایہہ نہیں جانتا سرداروں کی چھویوں میں لوہا دیگی ہوتا ہے۔ پتھر کے سینے میں لگے تو خون نکال دے۔ یہ تو پھر ایک پڑھا کو چھوہرا ہے۔

پھر بھی سودھا سنگھ "بینت کور دوبارہ بولی" سُنا ہے اُس کے پاس ایک پکی ریفل بھی ہے۔ سردار جی تُوں احتیاط ہی کر۔ باہر نکلے تو چار بندے بھی ساتھ لے لیا کر۔ اکیلا ہی نہ سیر اں کو نکل جایا کر، تجھ پر گرو جی کی رکھ ہو، مجھے تو رات ہَول پڑتے رہے۔ جب آنکھ بند کرتی تھی، میرے منہ میں سواہ، تجھے ہتھ کڑیوں میں دیکھتی تھی۔ ات نیند نہیں

آئی۔ میری مان سودھا سنگھ، غلام حیدر سے صلح کر لے، یہ فرنگی بڑے بُرے ہیں۔ ظالموں میں ذرا ترس نئیں۔ بڑے سے بڑے سردار سے نہیں ڈرتے۔ سنا نہیں؟ رنجیت سنگھ کی نسلوں تک کو ہتھ کڑیاں اور بیڑیاں لگا کر لے گئے۔ سودھے مجھے تو بڑا ڈرا لگتا ہے۔

دیکھ بنتو "سردار سودھا سنگھ غصے سے بولا" تم مردوں کے بکھیڑے میں نہ پڑا کرو۔ ساری رات سوتی ہو۔ سُفنے کدھر سے دیکھتی ہو۔ خراٹے مار مار کے میری نیند حرام کر دیتی ہو۔ (کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دوبارہ بولا) تمہاری مت رونے دھونے سے آگے نہیں بڑھتی۔ اب یا تو غلام حیدر رہے گا یا سردار سودھا سنگھ۔ تُو دیکھتی جا، مَیں نے ڈپٹی کمشنر سے سفارش کا بندوبست کر لیا ہے۔ بس تُوں اپنے کام کر اور کسی زنانی کی باتوں پر غور نہ کر۔ یہ ہمارے کرنے کے کام ہیں، ہم بہتر کر لیں گے۔ اتنا کہ کر سودھا سنگھ نے کرپان کمر سے باندھی اور پگڑی سر پر رکھ کر بیرونی حویلی میں آگیا، جہاں بہت سارے سردار جمع ہوئے بیٹھے تھے۔ سردار سودھا سنگھ کو آتے دیکھ کر سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سودھا سنگھ نے چار پائی پر بیٹھتے ہی جگبیر سنگھ کو بلایا۔ جب وہ پاس آ کر سامنے والی چار پائی پر بیٹھ گیا تو سردار نے کہا، جگبیرا اس سے پہلے کہ تھانیدار یہاں سنتری لے کر پہنچے، ہم اپنی اگلی گوٹی چل دیں۔ کیا پورا بندوبست ہو گیا ہے؟

جگبیر نے کھنگھار کا گلہ صاف کیا اور بولا، سردار صاحب بس آپ کی اشیر واد چاہیے۔ باقی تو ہر شے کی تیاری ہے۔ بیت سنگھ کو میں نے ساری بات سمجھا دی ہے۔ چھ گھوڑیاں تیار کھڑی ہیں شاہ پور کا مُلک لوٹنے کے لیے۔ آج شام گھنٹہ بجنے کے ساتھ ہی بیت سنگھ، پھجا سیوئ، ہرا سنگھ، دتّا سنگھ، چھندا سیوئ اور میں نکل جائیں گے۔ عبدل گجر کے چالیس بندے ہوں گے۔ واہگرو کی منشا ہوئی تو صبح چاننن ہو جان گے۔

اس کے بعد سودھا سنگھ نے جگبیر کے کان کے پاس ہو کر ہَولے سے کہا، جگبیرے ایک آدھ بندہ ضرور پھڑک جانا چاہیے۔ کم سے کم عبدل گجر کی کَنڈ پر تین سو دو ضرور رکھ آنا۔ اس طرح معاملہ زیادہ گھمبیر ہو جائے گا اور غلام حیدر چو طرفہ نہیں لڑ سکے گا۔

سردار جی آپ چنتا رکھیں، بندہ ایک نہیں دو دو لمکیں گے، جگبیر نے شرارت آمیز ہنسی بکھیرتے ہوئے جواب دیا۔ آخری بات کسی کو بھی سنائی نہ دی۔ البتہ ہر ایک یہ ضرور جان گیا کہ سردار سودھا سنگھ نے پتے کی بات جگبیر سے آخر ہی میں کی ہے، جس پر جگبیر نے ہنستے ہوئے آنکھ بھی ماری تھی۔ اس کے بعد کافی دیر تک دوسری باتیں ہوتی رہیں،

جن کا غلام حیدر کے معاملے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہاں تک کہ سورج چمک کر سامنے آگیا اور سب لوگ اپنے کام کاج کو نکل گئے۔ لوگوں کے جانے کے بعد حویلی دوبارہ چار چھ نوکروں کے علاوہ قریباً خالی ہو گئی اور سردار سودھا سنگھ بھی زنانے میں چلا گیا۔

(20)

عشا کی نماز پڑھنے کے بعد دس بارہ نمازی، جن میں اکثر بڈھے تھے، سب اپنے گھروں کو چلے گئے مگر مولوی کرامت وہیں بیٹھا رہا۔ اُس نے نہ تو کسی سے بات کی اور نہ ہی دعا مانگنے اور نماز پڑھانے میں طوالت اختیار کی تھی۔ وہ مسجد کی محراب میں بیٹھا اس طرح سوچ میں ڈوبا تھا جیسے صبح سب کچھ لٹنے والا ہو۔ اُس نے اسی مسجد کے احاطے میں ہوش سنبھالے تھے اور آج وہ پچپن کا ہو چکا تھا۔ اُس نے وہیں اپنا پہلا سبق پڑھا تھا۔ اسی فرشِ خاک پر پیشانی رکھی تھی، تو یہی خاک اُس کے لیے خاکِ شفا بن چکی تھی۔

مسجد نہایت چھوٹی، بوسیدہ اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی مگر مولوی کرامت کے لیے کعبۃ اللہ سے کم نہیں تھی۔ اُسے مسجد کی ایک ایک شے سے محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ رات اِسی مسجد میں رہ گیا اور باہر جانے کو جی نہ چاہا۔ اُس کے لیے پُرانے طاقوں میں پڑے مٹی کے وہ چراغ جن میں اپنے ہاتھوں سے برس ہا برس تک تیل ڈال کر جلاتا رہا تھا۔ اُن کے اندر پڑے ہوئے روئی کے پھمبے، جو بیسیوں سال تیل اور آگ کے دھویں میں گھل مل کر نہایت میلے کچیلے ہو گئے تھے۔ مسجد کی چھت کے برسوں پُرانے اور دھویں سے سیاہ ہوئے شہتیر اور آنکڑے، جن پر مکڑی کے سیاہ جالے لگے ہوئے تھے، دیواروں میں ٹیڑھے میڑھے طاق اور اُن میں بوسیدہ غلافوں میں لپٹے قرآن اور قاعدے سپارے، جن کی اپنی حالت بھی غلافوں سے کم نہیں تھی۔۔ کچے فرش پر بچھی کھجور کے پتوں کی چٹائیاں جو گھِس گھِس کر اتنی پرانی ہو چکی تھیں کہ اُن میں ملائمت اور چمک پیدا ہو گئی تھی۔ اُن چٹائیوں کے دھاگے تو کب کے ریزہ ریزہ ہو چکے تھے مگر پتے اپنی ترتیب میں فقط پیروں کے دباؤ کی وجہ سے ہی ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے رہ گئے تھے۔ ان کے علاوہ دیواروں میں جگہ جگہ تنگ روزن۔ اُن روزنوں اور روشندانوں میں بے شمار چڑیوں، فاختاؤں اور لقے کبوتروں کے گھونسلے اس طرح بنے تھے کہ اُن کی وجہ سے وہ بالکل بند ہو چکے تھے۔ انھی روزنوں میں پھنسے پرندوں کے پر، تنکے، خس اور بیٹوں نے سورج کی کرنوں اور ہوا کا راستہ ایک عرصے سے روک رکھا تھا۔ مسجد کی محراب جو ایک قسم سے مولوی کرامت کے جسم کا حصہ تھی۔ اس چھوٹی سی چار فٹ چوڑی، پانچ فٹ لمبی اور آٹھ فٹ اونچی محراب میں

کئی چیزیں مثلاً لکڑی کا پرانا چار سیڑھیوں والا منبر، جس پر بیٹھ کر اُس کا دادا، باپ اور پھر وہ خود جمعہ کا خطبہ دیتے رہے یا کبھی کبھار وعظ کہتے رہے۔ جن میں چند بندھی ٹکی نصیحتوں کا اصرار تھا، جو گاؤں والوں کو کبھی کی ازبر ہو چکی تھیں، جیسے اُن کے دونوں ہاتھوں کی دس انگلیاں۔ اُس منبر کا رنگ اب کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ جب وہ نیا تھا تو کیا ہو گا۔ محراب کے اندر کاندھوں کے برابر تین چھوٹی چھوٹی محرابیوں والے طاق اور اُن میں رکھے چراغ۔ جن کے جلانے کی ڈیوٹی بچپن سے اُس کی اپنی ہی رہی۔ اُس کے علاوہ مسجد کے صحن کے مشرقی کونے میں وہ چبوترہ جس پر کھڑے ہو کر پانچ وقت اذان دیتا تھا۔ الماریوں میں پڑی لکڑی کی رحلیں، میلاد النبیؐ کے دن مسجد کی چھت اور صحن میں باندھی جانے والی رنگ برنگی کپڑے کی جھنڈیاں، رمضان کے مہینے میں روزہ افطاری کا اعلان کرنے والا نقارہ، حتیٰ کہ صحن کے ایک کونے میں پڑی ہوئی مُردوں کو لاد کر لے جانے والی چارپائی، وہ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا گیا اور اُسے بوسے دیتا گیا۔ غرض صحن سمیت اس تیس فٹ لمبی اور بیس فٹ چوڑی مسجد کی ایک ایک شے مولوی کرامت کے وجود کا حصہ بن چکی تھی، جسے اگر اُس کے بس میں ہوتا تو اٹھا کر جلال آباد لے جاتا۔ کئی دفعہ ذہن میں آیا کہ نہ جائے مگر پھر اُسے فضل دین کا خیال آ جاتا جو محض روٹیاں اکٹھی کرنے اور جھڑکیاں کھانے کے لیے پیدا ہوا تھا۔ اسی عالم میں اُسے صبح نے آ لیا۔

مسجد میں صبح کی نماز چھوڑ کر باقی چار وقتوں میں نمازیوں کی تعداد پندرہ بیس سے کبھی نہیں بڑھی تھی۔ صبح کے وقت چالیس پچاس فرد ہر صورت جمع ہو جاتے۔ یہ اصول اسی گاؤں کی مسجد کا نہیں تھا۔ پنجاب کے جتنے دیہات یا شہر ہیں، وہاں کے نمازیوں کی یہی حالت ہے۔ یہ لوگ صبح کی نماز کو عموماً ترجیح دیتے ہیں اور باقی کو اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ بالکل اُس نوکر کی طرح جس کا مالک اُسے کوئی کام بتا کر فوت ہو جائے اور وہ نوکر اُس کام کا ایک فی صد کر کے باقی اپنے مالک کے زندہ ہونے تک ملتوی کر دے۔ صبح کی نماز پڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اِن دیہاتی لوگوں کو ہمیشہ سے ہی رات کو جلد سونے کی اور صبح جلد اُٹھنے کی عادت ہوتی ہے۔ چونکہ صبح کے وقت اٹھ کر کرنے کو کوئی اور کام نہیں ہوتا اور نماز پڑھنے کے لیے ہاتھ منہ دھونا ضروری ہوتے ہیں۔ اس لیے صبح کی نماز گویا منہ ہاتھ دھونے کا بہانہ سمجھ لیں۔ اس کے علاوہ صبح کے وقت لوگ تازہ دم بھی ہوتے ہیں۔ بہر حال آج فجر کی نماز میں معمول کے مطابق گاؤں کے قریباً سبھی سر کردہ لوگ جمع تھے جن کی تعداد ساٹھ تک تھی۔

نماز ختم ہوئی تو مولوی کرامت نے نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ گڑگڑا کر دُعا کی اور اس کو اتنا لمبا کھینچا کہ نمازی فکر مند ہو گئے۔ ہر ایک شخص کا نام لے کر، اُن کی ضروریات کی تمام چیزیں صحت، دولت اور ایمان تک مولوی صاحب نے اللہ سے مانگیں۔ اس کے بعد نمازیوں کی طرف منہ کر کے رُندھی ہوئی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔

گاؤں والو، خدا تم کو سلامت رکھے اور اس گاؤں پر کبھی کوئی مصیبت نہ آئے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بہت دُکھ ہو رہا ہے کہ میں آج یہاں سے ہجرت کر جاؤں گا۔ تم نے میری اور میرے باپ دادا کی بہت خدمت کی۔ اس مٹی میں جتنا ہمارا رزق تھا، وہ ہم نے کھالیا۔ اب آگے کا دانہ پانی اللہ نے کہیں اور لکھ دیا ہے۔ اب دعاؤں کے ساتھ رخصت چاہتا ہوں۔

اتنا کہتے ہوئے مولوی کی آواز ایک دم بھرّا گئی۔ اُس سے آگے نہ بولا گیا اور ہچکی بندھ گئی مولوی کو روتے دیکھ کر سب لوگوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

سچ بات تو یہ تھی کہ آج تک مولوی کرامت کی کسی بھی شخص سے چپقلش نہ ہوئی تھی۔ سب کے گھروں میں آنا جانا کُھلا تھا ہر ایک کی ماں بہن کو مولوی کرامت نے اپنی ماں بہن سمجھا۔ کبھی نہ کسی شخص سے منہ بھر کے مانگا اور نہ کم زیادہ ملنے پر بُڑبُڑ کی۔ جو کسی نے دیا، رکھ لیا، نہ دیا تو خموش ہو گیا۔ گاؤں میں مولوی کی ایک انچ زمین نہ تھی۔ گھر کا جو احاطہ رہنے کے لیے تھا وہ بھی چوہدری گلزار محمد نے دے رکھا تھا مگر مولوی کرامت گاؤں کی تمام زمین کو اپنی ملکیت ہی سمجھتا تھا۔ جس کھیت سے جی چاہا، ساگ اتار لائے۔ جہاں سے چاہا سبزی، مکئی کے بھٹے، گنا، لہسن، پیاز غرض ہر شے کسی کے بھی کھیت سے مولوی کرامت بغیر پوچھے کاٹ لاتے تھے۔ کسی نے آج تک منہ نہ پھٹکارا۔ کافی عرصہ پہلے ایک دو دفعہ مولوی کرامت کو شہر کی مسجدوں سے پیش امامت کی پیش کش بھی ہوئی۔ مولوی صاحب نے انہی سہولیات کے باعث وہاں جانے سے انکار کر دیا تھا مگر اب کے معاملہ الٹ تھا۔ ایک تو انگریزی سرکار کی نوکری، اُس پر رحمت بی بی کی دس ایکڑ زمین کی سنبھال۔ مولوی کرامت نے سوچا اُسے چاہے تنگی ہو جائے، مگر فضل دین کا مستقبل ضرور سنور جائے گا۔ اب چونکہ مولوی کرامت کی پیدائش اسی گاؤں کی مٹی کے خون سے ہوئی تھی اس لیے آج گاؤں چھوڑنے پر دل بھر آنا فطری عمل تھا۔

جب دن کافی چڑھ آیا اور کُہر نے آنکھوں کا راستہ چھوڑ دیا تو چوہدری گلزار، اللہ بخش، دین محمد اور دوسرے کئی لوگ مولوی کرامت کو رخصت کرنے کے لیے اُس کے گھر کے سامنے جمع ہو گئے۔ آج شام چار بجے کی ریل سے مولوی

کرامت نے جلال آباد کا ٹکٹ لینا تھا۔ اس لیے چار سے پہلے اُسے سامان لے کر ریلوے اسٹیشن پر پہنچنا تھا۔ سامان کیا تھا، دو لکڑی اور ایک لوہے کا صندوق، جن میں پرانے کپڑے، پانچ دس کتابیں اور گھر کے چھوٹے موٹے برتن۔ اس کے علاوہ تین عدد بستر جن میں پرانی رضائیاں اور چٹائیاں تھیں اور باقی اللہ اللہ۔

یہ سارا سامان ایک گڈ پر باندھ دیا گیا جو حسین محمد کا تھا۔ اُس نے اپنے نوکر سے کہا، وہ مولوی صاحب کا سامان ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ آئے۔ اُس کے علاوہ دو تین لڑکے مزید جو کبھی مولوی کرامت کے شاگرد رہ چکے تھے، وہ بھی ریلوے سٹیشن تک جانے کے لیے ساتھ ہو گئے۔ ہر ایک نے اپنی استطاعت کے مطابق اُس کی کچھ نہ کچھ خدمت کی۔ کوئی مولوی کرامت، اُس کی بیوی اور فضل دین کے لیے کپڑے لے آیا۔ کسی نے پیسے دیے۔ کسی نے کچھ اور تحفہ۔ یوں مولوی کرامت کے پاس ڈیڑھ سو روپیہ اور کپڑوں کے کئی جوڑے جمع ہو گئے۔

مولوی کرامت تمام لوگوں کے ساتھ گلے مل مل کر رویا۔ شریفاں بی بی کے گرد عورتوں کا مجمع الگ تھا، جو اُسے بڑی گلوگیری سے دعائیں دے رہی تھیں۔ فضل دین نے آج نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ اس سب کچھ سے بے نیاز نئی دنیا دیکھنے کے لیے بے تاب اور خوش خوش سفر کو آمادہ۔ جی ہی جی میں سوچ رہا تھا کہ وہ ایسی جگہ جا رہا ہے جہاں دن کا رنگ ہرا ہرا ہوتا ہے اور راتوں کو جگمگ کرتے تارے کوٹھوں کی چھتوں پر آجاتے ہیں۔ اُسے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ اُس جگہ پر رنگ برنگ کی میٹھی میٹھی برفی، ٹانگر، جلیبی اور کرارے پکوڑے بھی بہت سستے مل جائیں گے۔ اس لیے اب وہ جی بھر کر جلیبی اور پکوڑے کھایا کرے گا، جو ڈیڑھ سال پہلے پیر نتھو شاہ کے میلے میں اُس کے والد مولوی کرامت نے اُسے لے کر دیے تھے۔ وہ جلیبی کیسی مزیدار تھی۔ مگر روٹیاں مانگنے کے لیے کہاں جائے گا؟ اس اہم معاملے میں ابھی تک اُس کا دماغ کچھ کام نہیں کر سکا تھا۔ پتا نہیں وہاں کی روٹیاں گھی والی ہوں گی یا سوکھی، خیر جیسی بھی ہوں گی لیکن اب وہ کسی کا کام نہیں کرے گا۔ جلد ہی روٹیاں اکٹھی کر کے گھر بھاگ آیا کرے گا۔ آج اُس نے جوتے نئے پہنے تھے، اس لیے پاؤں خود بخود ادھر اُدھر اٹھ رہے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا کہ ابھی ہوا میں اڑ جائے گا۔ ان نئے جوتوں کی وجہ سے اُسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ سب سے زیادہ تیز دوڑ سکتا ہے۔

مولوی کرامت، رحمت بی بی اور فضل دین گڈ پر بیٹھ گئے۔ جس پر اُن کا سامان لد چکا تھا۔ اپنی بکری اور چارپائیاں مولوی نے وہیں پر بیچ دیں کہ اُنھیں کون اُٹھائے اُٹھائے پھرتا۔ آخر رمدو نے بیلوں کو ہانک لگادی اور دو بجے سہ پہر یہ قافلہ چک راڑے سے فیروز پور کی تحصیل جلال آباد کی طرف رخصت ہو گیا، جو کم از کم سو میل قصور سے دُور

تھااور اب

"جانی دےچیے راوی۔۔۔۔۔نہ کوئی آوی نہ کوئی جاوی"

والا معاملہ تھا۔

جاری ہے

قسط نمبر 11

(20)

شیخ صاحب مَیں اس معاملے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ ڈپٹی کمشنر نے فائل کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد تحمل سے بولنا شروع کیا۔ قتل اور لوٹ مار کی ایف آئی آر کٹ چکی ہے۔ کیا نام ہے آپ کا مسٹر........... حیدر (غلام حیدر کی طرف منہ کرتے ہوئے) آپ خود پرچہ کے مدعی بن چکے ہیں۔ سودھا سنگھ نامزد ملزم قرار دیا جا چکا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ خود ولیم دلچسپی لے رہا ہے۔ غالباً کچھ دن پہلے اُس نے مجھ سے اس بارے میں سرسری گفتگو بھی کی تھی۔ میرا خیال ہے، وہ اس قصے کو جلد ہینڈل کر لے گا۔ آپ اس بارے میں پریشان نہ ہوں۔

شیخ مبارک علی نے مزید گزارش کے سے انداز میں کہا، حضور ہمیں گورنمنٹ کے انصاف سے کچھ اندیشہ نہیں مگر صاحب نئے نئے آئے ہیں۔ سُنا ہے ابھی مزاج کے کھُردرے ہیں۔ آپ اس بارے میں ذاتی طور پر کمشنر صاحب کو ہدایات پھر بھی دے دیں تو نوازش ہو گی۔ ڈر ہے اگر دیر ہو گئی تو خدانخواستہ کچھ مزید خرابی نہ ہو جائے۔ آپ تو جانتے ہیں سکھ آخر سکھ ہوتا ہے سمجھنے میں دیر کرتا ہے۔

ڈپٹی کمشنر ہیلے صاحب نے اپنی کُرسی کو ایک دم مکمل گھما کر سیدھا کیا اور شیخ صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا، شیخ صاحب مجھے تو اپنے تجربے سے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ مسلمان اور سکھ الگ الگ دماغ کے مالک ہیں۔ بس داڑھیوں کی لمبائی میں فرق ہے۔ آپ فکر نہ کریں، دونوں عقل کے ایک ہی قبیلے سے منسلک ہیں۔

شیخ مبارک ڈپٹی کمشنر کی بھرپور طنز کو محسوس تو کر گیا پھر بھی چہرے پر خوشگواری کا تاثر لاتے ہوئے دوبارہ بولا، سر آپ میری بات کہیں اور ہی لے گئے۔ بہر حال آپ ہمارے حاکم ہیں۔ اگر ہم آپ کے پاس نہیں آئیں گے تو کہاں جائیں گے؟ ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ کے پاس کچھ اپنی بات عرض گزار کر دیں۔ اگر حکم ہو تو یہ غلام حیدر، شیر حیدر کا بیٹا اپنی درخواست آپ کے حضور سنانے آیا ہے (پھر غلام حیدر سے مخاطب ہو کر) بیٹا آپ صاحب بہادر کو بتاؤ۔ جو آپ کی صاحب سے ملاقات ہوئی (پھر ڈپٹی کمشنر سے) سر ذرا سن لیں ایک بار۔

غلام حیدر نے اشارہ پاتے ہی اپنی ولیم کے ساتھ ہونے والی تمام گفتگو مِن و عن ڈپٹی کمشنر کے گوش گزار کر دی، جسے اُس نے نہایت غور اور تحمل سے سُنا پھر سکون سے بولا، لیکن مجھے تو یہ رپورٹ ہے کہ ولیم سراسر مسٹر حیدر کی طرف داری کر رہا ہے۔ کل ہی ولیم نے انتہائی قریب سے واقعات کا جائیزہ لینے کے لیے موقعہ واردات پر جا کر خود

حالات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور تھانیدار کو بُلا کر سرزنش کی۔ اس سب کے باوجود میں کیسے اُسے مزید ہدایات دے سکتا ہوں۔

پھر تمام رپورٹس کا خلاصہ شیخ صاحب اور غلام حیدر کو سنا دیا۔ جسے سُن کر شیخ مبارک حسین تو شرمندہ اور کھسیانا سا ہوا مگر غلام حیدر کو حیرانی اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت نے گھیر لیا۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ ڈپٹی کمشنر کی بات پر یقین کرے یا ولیم صاحب اور تھانیدار کے رویے کو سامنے رکھے۔ ایک بات اُسے مطمئن بھی کر رہی تھی۔ اور وہ تھی ڈپٹی کمشنر کی معلومات، جو اس کیس کے بارے میں اتنی جلدی اُس تک پہنچ گئیں تھیں۔ اُس نے سوچا، اگر یہ سچ ہے کہ ڈپٹی کمشنر سے لے کر ولیم تک میرے ساتھ منصفانہ رویہ رکھتے ہیں تو کیوں سردار سودھا سنگھ کی گرفتاری کے لیے تھانیدار پر دباؤ نہیں ڈال رہے ؟ جبکہ آج اس واردات اور قتل کو آٹھ دن گزر چکے ہیں۔ غلام حیدر یہ سوچتے ہوئے ڈپٹی کمشنر سے مخاطب ہوا، مگر سر سردار سودھا سنگھ کی گرفتاری کے لیے کون سی مشکل ہے کہ ابھی تک وہ حوالات میں نظر نہیں آتا۔ آپ کی سرکار میں پہلے تو کبھی ایسی تاخیر نہیں ہوئی تھی۔ میری خبر کے مطابق وہ ابھی آرام سے نہیں بیٹھا، نہ بیٹھے گا، مزید کوئی نہ کوئی فساد پیدا کرے گا۔

ڈپٹی کمشنر نے بسکٹ کا ٹکرا منہ میں ڈالتے ہوئے کاندھے اُچکائے، پھر شیخ مبارک حسین کو مخاطب کرتے ہوئے بولا، شیخ صاحب، برخوردار کو سمجھائیں اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھے۔ گورنمنٹ کے کام کرنے کے اپنے طریقے ہیں۔ ویسے بھی یہ چھوٹے موٹے کام پولیس انتظامیہ کے حوالے کیے جا چکے ہیں۔ کمشنروں کے کرنے کو اور بہت کچھ ہے ہیں۔ کچھ اصول اور قاعدہ ہوتا ہے۔

ہمیں معلوم ہے اس معاملے میں تاخیر ہوئی ہے یا نہیں۔ سودھا سنگھ جلد گرفتار ہو جائے گا۔ اگر آپ پھر بھی مطمئن نہیں تو میں ولیم سے تاکید کر دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے شیخ مبارک حسین کی طرف الوداعی سلام کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میٹنگ کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ مبارک حسین نے اشارے کو سمجھتے ہوئے فوراً اُٹھ جانے میں بہتری خیال کی اور ایک مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ ملا لیا کیونکہ مزید بولنا صاحب کا موڈ خراب کرنے کے مترادف تھا۔ جس کا اشارہ اُ سُس کے آخری رویے سے مل چکا تھا۔ شیخ مبارک کو دیکھ کر غلام حیدر بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

اُس نے بھی صاحب کے ساتھ بے دلی سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے باہر نکلنے کے لیے مڑا۔اسی اثنا میں ڈپٹی کمشنر کی آواز دوبارہ سنائی دی، جس کا تخاطب تو شیخ مبارک حسین تھا مگر غلام حیدر نے بھی مڑ کر ڈپٹی کمشنر کی طرف دیکھا، شیخ صاحب ایک بات آپ کے فائدے کے لیے بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ حیدر کو سمجھائیں قانون کو ہاتھ میں لینے سے گریز کرے۔ مجھے افسوس ہوا ہے کہ سودھا سنگھ نے قانون کا مذاق اڑایا ہے۔ جس کا اُسے خمیازہ بھگتنا ہے مگر ایسا نہ ہو کہ اُس کی دیکھا دیکھی ہمارا دوست بھی جھنڈو والا کو میدان جنگ بنا دے (پھر غلام حیدر کی طرف دیکھ کر) مسٹر آپ پڑھے لکھے ہیں۔ ذرا آہستہ اور سمجھ داری سے چلیں اور قانون کا ساتھ دیتے ہوئے آگے بڑھیں۔ ولیم آپ کے حق میں بُرا نہیں ہے۔ کل یا پرسوں آپ کو بہت اچھی خبر ملے گی۔ گڈ بائے

ڈپٹی کمشنر ہیلے کے یہ آخری جملے ایسے تھے جنھوں نے چلتے چلتے شیخ مبارک حسین اور غلام حیدر کی ڈھارس بندھا دی۔ خاص کر یہ جملے شیخ صاحب کو بہت ہی پسند آئے جو بڑی دیر سے اپنی خجالت محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اُس نے ناحق غلام حیدر کے ساتھ ڈپٹی کمشنر کے پاس آکر اپنا بھرم گنوا لیا۔اب کمشنر صاحب کی اِن باتوں نے شیخ صاحب کی کچھ نہ کچھ عزت رکھ لی تھی۔ غالباً کمشنر صاحب نے آخری وقت میں محسوس کر لیا تھا کہ اُس کے ہاتھوں سے شیخ صاحب کی ذلت ہو گئی ہے۔ شاید اسی لیے اس نے یہ چند کلمات ادا کر کے تکدر دُور کرنے کی کوشش کی تھی۔

(21)

ایس ڈی او جنتا مان نقشے پر درج شدہ تمام معلومات جب ولیم کے گوش گزار کر چکا تو ولیم اُٹھ کر خود دیوار پر آویزاں اُس دس فٹ لمبے اور آٹھ فٹ چوڑے کپڑے پر بنے نقشے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر خاموشی سے اُس کا جائزہ لینے کے بعد بولا، جنتا مان، جلال آباد کے اِس سارے حدود اربعے میں جو بات مجھے سمجھ آئی ہے، وہ یہاں کا ناقص نہری نظام ہے۔ یقیناً یہاں کام چوری اور بد دیانتی کے سوا کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ (چھڑی سے مختلف مقامات کی نشاندھی کرتے ہوئے) کیا آپ دیکھ رہے ہیں کہ روہی کا تمام علاقہ زیریں اور لبّر اور بنگلہ سے اُوپر کا علاقہ، یہ تمام کا تمام آب پاشی سے یکسر خالی ہے۔ حالانکہ اس پورے علاقے کی زمین نشیبی ہے اور پانی کا بہاؤ نہایت آسانی سے اپنی تہیں بچھا سکتا ہے۔ کیا ہمیں اِس بہت بڑے علاقے کی ضرورت کا احساس نہیں ہونا چاہیے؟ جبکہ آپ کے پاس وسطی پنجاب کی حد پر بہتے ہوئے ستلج کا چوڑا پاٹ اپنی کشادہ پیشانی سے دعوت دے رہا ہے۔ کیا ہمارا اس سے فائدہ اٹھانا فرنچ کو ناگوار گزرتا ہے جن کا وجود کم از کم میری معلومات کے مطابق یہاں نہیں ہے؟ ہم اِس بنگلہ سے جلال آباد تک آنے

والے برساتی نالے کو اِس کام کے لیے استعمال کر کے اُسے میٹھے پانی کی بہتی ہوئی نہر میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ جبکہ ایک ہیڈ برج پہلے سے سُلیمانکی پر موجود ہے۔ اگر ہم تھوڑی سی سر دردی اور زحمت گوارا کریں، جو اس قدر ضروری ہے جس قدر ہمارا اپنا وجود، تو یہ خاکستری زمینیں سبز رنگوں میں بدل جائیں۔ ولیم نے معنی خیز انداز میں جتنا مان کی طرف دیکھ کر پوچھا، کیا خیال ہے آپ کا جتنا مان؟

سر آپ کی یہ حکمت تو واقعی ایک اہم قدم ہے جلال آباد تحصیل کے لیے، جتنا مان بولا "مگر میں سرکار کی خدمت میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس ہیڈ سے نہر پہلے نکل چکی ہے۔ یہ آپ کی چھڑی کے اُوپر اُسی کی لائن جا رہی ہے لیکن اس کا پانی گورنمنٹ نے ریاست بہاونگر کو سیراب کرنے کے لیے وقف کر دیا ہے۔ ہم دوسری نہر یہاں سے کیسے نکال سکتے ہیں؟

اسی سے، ولیم نے نقشے پر نہر والی جگہ کو چھڑی سے ٹھوہکا دیتے ہوئے کہا، اِسی نہر سے جتنا مان، ہم ایک دوسری نہر نکال سکتے ہیں، جو جلال آباد کے زیریں اور روہی کے پورے علاقے کو سیراب کرے گی۔

نہر کا تمام عملہ جو میٹنگ میں موجود تھا ولیم کی اس بات پر متعجب ہوا۔ وہ جانتے تھے ولیم جو کہ رہا ہے وہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اِس کام کے لیے لاکھوں روپے کا فنڈ اور منصوبہ بندی درکار تھی۔ جس کے لیے کم از کم گورنمنٹ اُن کی سروس کے دوران تو اجازت دینے پر رضامند نہ ہو گی اور اگر ہو بھی گئی تو منصوبہ بناتے ہوئے کئی برس بیت جائیں گے، لیکن خاموش رہے اور ولیم بولتا چلا گیا۔

دیکھیں ہم اس ہیڈ کی گیج کو بڑھا کر دُگنا کر دیں گے اور تین در مزید کھول دیں گے۔ اِسی طرح اِس نہر کا پاٹ بھی دُگنا کر دیں گے۔ جو ہیڈ سے لے کر چار کلومیٹر تک چلے گا اور یہاں گونا پور کے مقام پر ہم اپنی نہر کا رُخ روہی کے زیریں علاقے کی طرف موڑ دیں گے۔ یعنی جتنا پانی ہم نے ہیڈ سے ریاست کی نہر کو دیا ہو گا، وہ پانی ہم جلال آباد کی تحصیل کے لیے اس طرف موڑ لیں گے۔ جس کے لیے ہمیں اُس نہر کی ضرورت ہے، جو ابھی تک ہم نے نہیں کھودی۔ یہ نہر روہی کے ساتھ ساتھ فاضلکا بنگلہ کے بالائی حصوں اور اُن علاقوں کو پانی دیتی ہوئی، تارے والی، سے اس برساتی نالے میں گر کر جلال آباد اور سری مکھسر کے درمیان تک پہنچ جائے گی۔ پھر جلال آباد شہر کو چھُو لے گی۔ اس نہر کا پاٹ پچاس فٹ ہو گا اور گہرائی آٹھ فٹ۔ جہاں سے ہم ریاست کی نہر کو الگ کریں گے، وہاں ایک گیج لگا دیں گے تاکہ اپنا پانی بغیر خیانت کے حاصل کر لیں۔

بولا" سر اس کے لیے بہت بڑے بجٹ کی اور " بیر داس، جو تمام گفتگو بہت تحمل سے سن رہا تھا اور نہری سپر وائزر تھا وقت کی ضرورت ہے۔ میں جانتا ہوں، اس کام میں کتنا خرچہ اُٹھے گا اور کتنا وقت لگے گا اور کتنے لوگوں کی ضرورت ہو گی۔

ولیم مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر اُس کے سامنے آیا اور اُسے مخاطب کرتے ہوئے بولا" بیر داس مسائل اور مصیبتوں کے آگے صبر اور حرکت کی ڈھال باندھی جاتی ہے۔ گھبرایے نہیں۔ رہی بات تمھارے سب کچھ جاننے کی تو یہ بہت عمدہ بات ہے۔ ہمیں آپ ہی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے، جو اس طرح کی معلومات رکھتے ہوں۔ سر دست میں آپ کی ایک کمیٹی بنا رہا ہوں، جس کے سر براہ جنتا مان ہوں گے۔ آپ کے پاس ایک ماہ ہو گا۔ اس عرصے میں سب لوگ سر جوڑ کر بیٹھو، تمام علاقے کی پیمائش کرو اور اخراجات سے لے کر ممکنہ مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی فائل کو تیار کرو۔ آپ کی مدد کے لیے میں ڈیوڈ صاحب کو آپ کے ساتھ کر دیتا ہوں۔ یہ نہر کے تیار کرنے میں اتھارٹی کا درجہ رکھتے ہیں۔ تمام لوگ اِن سے ہر طرح کی مدد لے سکتے ہیں۔ ہم ایک مہینے کے اندر یہ تیار شدہ رپورٹ حکومت کو پیش کر دیں اور اُنھیں میرا خیال ہے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ لیکن پہلا کام جو نہایت محنت طلب اور جانفشانی کا ہے، وہ آپ کریں گے، جس کے لیے میں ابھی سے آپ کا شکر گزار ہوں۔ اِس کے بعد ولیم بیر داس سے مخاطب ہو کر بولا، بیر داس آپ نہر کے فوائد اور اِس میں گورنمنٹ کو جو کچھ خرچ کے بعد حاصل ہو گا، اُس کا بھی پورا حساب کیجیے گا۔ یہ رپورٹ کسی بھی طرف سے ناقص نہیں رہنی چاہیے۔ کیا میری بات آپ کی سمجھ میں آچکی ہے؟

جی سر، جنتا مان نے نہایت گرم جوشی سے جواب دیا۔

گُڈ، اب ہم اپنا کام شروع کر سکتے ہیں، ولیم نے میٹنگ ختم کرتے ہوئے کہا لیکن جنتا مان، آپ، بیر داس، ڈیوڈ اور میں کل اس سلسلے میں دورہ کر رہے ہیں۔ ہم یہاں سے بنگلہ، وہاں سے ہیڈ سلیمانکی اور واپسی پر نہر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گونا پور، جہاں سے ہماری اصلی نہر کی بنیاد شروع ہو گی، سے روہی کی طرف مڑ جائیں گے۔ پھر روہی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جلال آباد واپس آئیں گے۔ میرا خیال ہے صبح آٹھ بجے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ رات ہیڈ سلیمانکی پر بسر کریں گے۔ وہاں مسٹر میتھیو ہماری مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوں گے۔

یہ کہتے ہوئے ولیم دروازے سے نکل کر راہداری سے ہوتا ہوا چائے کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ جبکہ نجیب شاہ

رہنمائی کرتے ہوئے ساتھ چل رہا تھا۔ اُن دونوں کے پیچھے نہر اور مال کا پورا عملہ بھی اُس کمرے سے باہر نکل آیا، جو پچیس افراد پر مشتمل تھا۔

چائے کا کمرہ تیس فٹ لمبا اور پندرہ فٹ چوڑا تھا۔ ایک قسم کا کانفرنس ہال کہہ سکتے ہیں لیکن اس کام کے لیے شاید کبھی استعمال نہیں ہو سکا تھا۔ یہاں نہ تو اس قسم کی کرسیاں تھیں اور نہ ہی کانفرنس کے باقی لوازمات، لاؤڈ سپیکر یا اسٹیج وغیرہ۔ ایک لمبی میز ضرور تھی، جس پر چائے کا سامان پڑا ہوا تھا۔ میز پر سفید رنگ کا نہایت نفیس کپڑا اور خوبصورت چائے کے برتن نجیب شاہ کی انتظامی نفاست کی غمازی کر رہے تھے۔ کمرے کی دیوار پر سفید قلعی تھی۔ لیکن دیواروں پر داغ دھبا نظر نہ آنے کے باوجود محسوس ہو رہا تھا کہ کمرے کو بناتے وقت جو رنگ کیا گیا تھا، اُس پر دوبارہ قلعی کرنے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ کمرہ اکثر بند ہی رہتا ہے اور جب زیادہ چائے پینے والے ہوں تو اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اب تو نجیب شاہ کو محسوس ہو گیا تھا کہ یہ اکثر کھولنا پڑے گا کیوں کہ پچھلے کئی دنوں میں ثابت ہو گیا تھا کہ ولیم روایتی اسسٹنٹ کمشنروں کی طرح کا نہیں ہے جو محض افسری کرنے آتے ہیں۔ ویسے بھی ولیم سے پہلے زیادہ تر تحصیلدار ہی جلال آباد میں پوسٹ ہوتے رہے تھے، جو اکثر دیسی لوگ ہی ہوا کرتے تھے۔ گورنمنٹ یا عوام کے لیے کام کرنے کو وہ غالباً ثانوی حیثیت پر ہی رکھتے تھے۔ اُن کا اصل کام تو ہندوستانیوں کو یہ جتلانا تھا کہ وہ اُن کے حاکم بنا دیے گئے ہیں اور وہ اُن کی رعایا ہیں۔ اسی وجہ سے اس کمرے کے کھولنے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

نجیب شاہ نے سوچا، ولیم کا آئے دن علاقے کا دورے کرنے کا سلسلہ بڑھا تو کام کی شدت خود بخود بڑھ جائے گی۔ کیونکہ یہ دورے نہ تو سؤروں کے شکار کے سلسلے میں تھے اور نہ ہی مقامی لوگوں کی عادات وخصائل سے محظوظ ہونے کے لیے۔ جس کا پہلے والے افسروں میں بہت زیادہ رواج تھا۔ چائے کے دوران پندرہ منٹ تک ادھر اُدھر کی گپ بازی کے بعد ولیم اپنے کمرے میں چار پانچ انگریز افسروں کو لے کر آ گیا۔ باقی لوگوں کو اپنی میزوں پر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ان افسروں میں، ڈیوڈ، انجینئر جوزف، ایکسئین سٹیورٹ، مالیکم تحصیل دار اور براہم میتھیو محکمہ مال کا انسپکشن افسر شامل تھے۔

جب چاروں سامنے بیٹھ چکے تو ولیم نے سب کو مخاطب کر کے ایک بھرپور تقریر کی۔ اس تقریر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ دلی جذبات کے ساتھ کچھ کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اُس نے اپنے باپ اور دادا کو ماتحت افسروں سے

مخاطب ہوتے دیکھا تھا۔ اس لیے کچھ وہ تجربہ اور کچھ ذاتی جوش و خروش نے ایسے الفاظ کا رُخ ڈھال لیا کہ آفیسرز ولیم کا کام کے سلسلے میں ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ اُس نے نے اپنا ہیٹ میز پر رکھا اور بولا،

ڈیئر آفیسرز، میں جانتا ہوں کہ میں جلال پور میں ایک اجنبی، نا تجربہ کار اور نو آموز داخل ہوا ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے آپ کا تجربہ، آپ کا علم اور علاقے کے متعلق آپ کی شناسائی میرا ذاتی سرمایہ ثابت ہو گی۔ اس سلسلے میں آپ میرے پیش رو، مجھے طاقت دینے والے اور کام پر اُکسانے والوں میں سے ہوں گے۔ میرے دوستو، میں آپ ہی کی طرح حکومت سے تنخواہ لینے والا اُس کا ملازم ہوں تا کہ علاقے میں اُس کے قوانین کی عملداری کا فریضہ انجام دوں۔ حکومت کے لیے خراج اور مالیہ جمع کروں، نظم و ضبط اور خیر خواہی کا فرض ادا کروں، یہاں کے اَن پڑھ اور گنواروں کو تعلیم، تہذیب اور سماجی معاشرتی اور معاشی اقدار سے آگاہ کروں، جس سے یہ لوگ ایسے ہی دور ہیں جیسے یورپ اِن سے دور ہے۔ لیکن اس کے ساتھ میں آپ سے یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ یہ سب کام تب ہی اچھے طریقے سے انجام پا سکتے ہیں جب عوام کی خوشحالی اور اُن کے جان و مال کی حفاظت اور اُن کے روزگار کے مسائل درست ہوں گے۔ آپ مجھے جتنا بھی اِن لوگوں کی آزادی سلب کرنے کے بارے میں لیکچر دیں، مجھے سمجھ نہیں آئے گا۔ یہ لوگ تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود صرف اس لیے اپنے سابقہ آقاؤں کے کام نہ آسکے کہ اِنہیں ہر معاملے میں مکمل طور پر بانجھ رکھا گیا تھا۔ چنانچہ ہمیں پہلے یہاں کے عوام کی فلاح کے لیے اقدام کرنے ہوں گے، بطور حاکم یہ ہمارا پہلا کام ہے۔ یاد رکھو، یہاں جگہ جگہ پر اُگی ہوئی خود رو جڑی بوٹیاں اور سرکنڈے اگر عوام کے لیے مُضر ہیں تو ہمارے لیے بھی مُضر ہیں۔ یہاں کی پبلک بھوکی مرے گی تو ہم بھی زیادہ دیر گائے کے تازہ دودھ نہیں پی سکتے۔ گورنمنٹ اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ جس مٹی سے تم سو روپیہ نکالو اُس میں سے بیس روپے اُسی مٹی پر ضرور خرچ کرو تا کہ مزید سو روپیہ حاصل کر سکو۔ یہ طریقہ اُسی مرغی کی مثال ہے جسے آپ ایک دمڑی کا دانہ دے کر درجن انڈے لیتے ہیں۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ ہندوستان ایسی مرغی نہیں جو کُڑک ہو اور ہمیں انڈا دینے سے انکار کر دے۔ ہمارا سابقہ تجربہ بتاتا ہے، جس نے اس کی مٹی کے حلق میں پانی کے چند قطرے انڈیلے، اِس کے پستانوں نے اُس کے کٹورے میٹھے دودھ سے بھر دیے۔۔ عوام کی خوشحالی، حکومت کی عزت اور وقار کا پروانہ ہوتی ہے اور اس کی مفلسی بادشاہ کو بے وقار کر دیتی ہے۔ کوئی بھی حاکم زیادہ دیر تک اپنی رعایا کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ یاد رکھو بیمار رعایا کا گوشت بھی بیمار ہوتا ہے، جس سے کینسر پھوٹتے ہیں اور جو اندر ہی اندر ہی بادشاہ کو دیمک کی

طرح کھا جاتا ہے۔

ہمیں اپنی رعایا کو صحت منداور باوقار دیکھنا ہے تاکہ ہم خود باوقار نظر آئیں۔ مسٹر جوزف مَیں یہ نہیں کہتا کہ میں افسری کرنا پسند نہیں کرتا اور کام کا مجھے بہت شوق ہے۔ یقیناً مجھے اسسٹنٹ کمشنر ہونا پسند ہے۔ اگر میں بطور افسر یہاں نہ آتا تو شاید مجھے بھی عوام سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ مگر میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ اب اپنی مصروفیت کا مرکز سیر وشکار کو بنالوں اور کام بالکل نہ کروں۔ میں یہاں ہر صورت کام کروں گا جس کے لیے مجھے مددگار اور دوست چاہییں۔ میں نہیں جانتا کہ میں یہاں کتنے دن رہوں گا، مگر جتنے دن رہوں گا، زمینوں کو آباد کرنا اور لوگوں کو تعلیم دینا میری اولین ترجیح ہو گی اور آپ کو اس سلسلے میں میرا ساتھ دینا ہو گا۔ میں دیسی لوگوں پر انحصار نہیں کرتا۔ ان کے اندر کام کی بجائے چاپلوسی اور کام چوری کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے۔

مسٹر ڈیوڈ، یہاں کی زمینوں اور لندن کی مٹی میں یہ فرق ہے، اگر یہاں بیج بو کر پانی دو گے تو ہرا ابھرا پودا سر نکالے گا مگر وہاں بیزار کر دینے والی سردی اُسے برف میں بدل دے گی۔ اور وہ مسلسل کی بارش اُسے گلا دے گی جو تمہاری رگوں تک اُتری ہوئی ہے۔ ہمارے پاس عقل ہے اور ہندوستان کے پاس وسائل۔ یہی ہماری اور ہندوستان کی خوش قسمتی ہے۔ اس لیے جو ذمہ داری مجھ پر ہے، مَیں اپنے حصے کی پوری کروں گا، آپ اس کے لیے مجھے طاقت اور بازو دیں گے۔ کل میرے ساتھ دورے پر چلو۔ ہم اِن تمام معاملات کا جائزہ لیتے ہوئے دو دن میں واپس آجائیں گے۔

ولیم ہیٹ دوبارہ سر پر رکھتے ہوئے کرسی سے اُٹھا اور بولا، مسٹر مالیکم آپ کی ذمہ داری سب سے اہم ہے۔ آپ اس معاملے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟

مالیکم جو اڑتالیس سال کی عمر کا پختہ تحصیل دار تھا اور پچھلے تین سال سے یہیں پر تھا، نہایت تحمل سے بولا، سر کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی افسر کی خواہش پر اُس کے ماتحت نے کام کرنے سے انکار کیا ہو؟ ماتحت کا کام عمل درآمد کرنا ہے۔ افسر جس قدر اپنے حکم میں مخلص ہو گا، ماتحت اُسی اخلاص سے عمل کرے گا۔ ہمیں آپ کی خواہش معلوم ہو گئی، آپ کی محکم رائے کا اندازہ ہو گیا اور حکم کے اخلاص پر یقین آگیا ہے۔ اب آپ جو چاہیں گے ہم اُسے ہر حالت میں ممکن بنائیں گے۔

ولیم خوشی اور مسرت سے اٹھتے ہوئے بولا، بہت خوب مالیکم صاحب، بہت خوب، ہم کل بنگلہ فاضلکا میں جا کر باقی معاملات پر بات کریں گے کیونکہ نقشہ زمین سے بہت زیادہ مختلف ہوتا ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں گڈ بائے۔

افسروں کے کمرے سے جانے کے بعد ولیم اپنی کرسی پر دراز ہو کر دیر تک خالی الذہن آنکھیں بند کیے سکون سے پڑا رہا۔ آج اُس نے بہت سے کام نپٹائے تھے۔ تین انتہائی اہم میٹنگز میں دماغ کی حالت بچہ پیدا کرنے والی عورت کی سی ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ دفتر کے کسی بھی معاملے پر آج کے دن مزید غور کرنے سے کترا رہا تھا۔ ولیم نے آنکھیں بند کر لیں اور ان فرصت کے لمحوں میں اُسے کیتھی یاد آنے لگی۔

وہ اُس کے ساتھ لندن کے مضافات میں گزارے گئے مسحور کن لمحات میں کھو گیا۔ کیتھی کی نیلی آنکھوں میں بلوریں چمک، ماتھے پر گہرے سنہری بال اور یاقوت کے ریزوں میں گُندھے اور پنکھڑیوں میں ترشے ہوئے باریک ہونٹ ولیم کی آنکھوں میں چاقو کی سی تیز دھار کے چرکے لگا رہے تھے۔ بالائی ہونٹ کے اوپر سُرمئی تِل ولیم کے سامنے تصویریں بن کر گھومنے لگا۔

یونیورسٹی کے صحن میں چھوٹے سے پہاڑی ٹیلے پر جمی ہوئی برف کے اُوپر جب گرتے گرتے وہ اُس کی باہوں میں جھول گئی اور پھر دونوں لڑھکتے ہوئے نیچے تک آ گئے تھے، جس دوران اُس کے بازو کی ہڈی بھی تڑخ گئی۔ اُس وقت کیتھی کا کرب اور تکلیف سے سونے میں گھُلا ہوا چہرہ اور بھی اچھا لگا تھا۔ ولیم کو یاد آیا کہ کرسمس کی رات تو قیامت برپا کر دینے والی تھی، جب لہروں میں گھومتی ہوئی سرد شام کی دُھند میں وہ دونوں لندن کے جنوبی مضافات میں موجود تاریخی گرجا گھر (ایس ٹی سوویئر) میں گئے تھے۔ جسے بُردت خاندان نے ۱۶۲۲ میں اپنے ذاتی فارم ہاؤس میں بنایا تھا اور اُس خاندان کی بہت سی یادگار بھی اس کے اندر موجود تھیں۔ اُس شام چناروں کے زرد پتوّں کے گرتے ہوئے شور اور کھڑ کھڑاہٹ میں ہر چیز کس قدر رومان انگیز ہو گئی تھی۔ اُس رومان پرور ماحول میں بھورے آسمان سے اُترتی ہوئی دُھند اور کُہر نے اُن دونوں کے چہرے اس طرح بھگو دیے تھے جیسے دو فرشتوں کو دُھلا ہوا سفید نور اپنی ٹھنڈک کے حصار میں لے لے اور پھر اُنہیں اُڑائے اُڑائے سفید خوشبو کی وادیوں کی سیر کراتا پھرے۔ گرجا سے واپسی پر وہ اور کیتھی ایک دوسرے کی باہنوں میں جھولتے ہوئے بہت دیر چناروں کے باجتے پتوں کی سرسراہٹ میں دور تک چلتے رہے تھے۔ پھر بگھی پر بیٹھ کر اپنے کمرے میں آئے تھے۔ اُس وقت کیتھی کا چہرہ کتنا سُرخ اور سبزی گھُلی ہوئی سفیدیوں میں دہک رہا تھا۔ گرم کمرے میں سُرخ کوئلوں سے اُٹھتی ہوئی حرارت کے پاس چند منٹ تک بیٹھے رہنے کے بعد اُس نے کیتھی کا بوسہ لیا اور پھر وہ بیڈ پر لیٹ گئے۔ اُس وقت پہلی دفعہ اُس نے کیتھی کے سنہرے بالوں سے انگلیوں میں خلال کرتے ہوئے سینے پر کسی ہوئی شرٹ سے اُبھاروں پر ہاتھ رکھ کر اُنہیں ہلکا ہلکا دبایا اور

ساتھ ہی اُس کی شرٹ کے عنابی بٹن بالترتیب کھولتا گیا۔ جس کے نیچے دودھیا لمس اور دو بلوریں آئینے اور اُن آئینوں کے درمیان حشر خیز سفید اور نرم وملائم نشیب تڑپ رہا تھا۔ آئینوں پر ہاتھ رکھ کر اُس نے جب اپنے ہونٹ اُس نشیب پر رکھے تو کیتھی کس طرح دوہری ہو ہو کر گرتی تھی۔ ایسے میں اُس کا سینہ اُبھر اُبھر کر ولیم سے لپٹ لپٹ جاتا تھا۔ اسی حالت میں کیتھی کی سانسیں تیز تیز حرکت کرنے لگیں تو اُس نے کیتھی کی بلاؤز کے تمام بٹن کھول کر دودھ میں نہائے ہوئے پستانوں کی نرمی اور ناف کے ہیرے میں چمکتی ہوئی بالی کی حدت کو محسوس کیا تھا۔ تب کیتھی کیسے پیار اور شہوت کے ملے جلے جذبے کے ہاتھوں بے قابو ہو کر دوہری ہونے لگی تھی اور اُس کے گرد اپنی بانہوں کو اس سختی سے جکڑ جکڑ لیتی تھی جیسے ابھی مر جائے گی۔ وہ وقت تو عین فتنہ تھا، جب اُس نے کیتھی کی سکرٹ اُتار کر یکدم اپنے ہونٹ اُس کی سرین کے اندر پیوست کر دیے تھے۔ تب تو وہ یوں بے حال ہو کر اُس کے ساتھ گھوم گئی تھی جیسے توری کی بیل شیشم کی ٹہنیوں سے لپٹ جائے۔ پھر ولیم اُس منظر کو یاد کر کے تھوڑا سا مسکرا دیا جس میں اُس نے بالآخر کیتھی کی ناف کے اُوپر بیٹھ کر اپنی پینٹ کی بیلٹ بھی بٹن سمیت جلد ہی کھول دی تھی۔ جبکہ کیتھی انتہائی بے چینی سے اُس کی شرٹ قریب قریب پھاڑ رہی تھی۔ یہ وہ آخری لمحے تھے جب اُس نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ کی ہلکی روشنی بھی آف کر کے دو دودھیا جسموں کو نورانی اندھیروں کے حوالے کر دیا تھا۔ جس کے بعد وہ دونوں خوابوں کی دنیا میں چلے گئے تھے۔ پھر ولیم تمام اُن بعد میں مسلسل آنے والے لمحات کو یاد کرنے لگا۔ جس میں اُس نے کیتھی کی نیلی رگوں میں سُرخی بھر دی تھی، مگر وہ پہلی رات کا منظر تو کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

کرسی پر آرام سے پڑے پڑے وہ کتنی ہی دیر اُن یادوں میں کھویا رہا پھر اچانک سیدھا ہو کر بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ کرم دین اندر آیا تو ولیم نے اُسے کہا، کافی کا ایک کپ لاؤ اور نجیب شاہ کو اندر بھیجو۔

کرم دین پھُرتی سے باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد نجیب شاہ کمرے میں داخل ہوا تو ولیم نے اُسے ہدایات دینا شروع کر دیں، نجیب شاہ اِسی وقت لندن میں ایک تار بھیج دو، میں ابھی پانچ منٹ میں آپ کو ایک لیٹر دے رہا ہوں، دوسری بات یہ کہ ہمارے کل کے دورے کے لیے کیا بندوبست کیا ہے؟

سر تین جیپیں تیار ہیں، نجیب شاہ بتانے لگا، جن آفیسرز کے نام آپ نے بتائے ہیں وہ اور ڈی ایس پی لوئیس صاحب بھی چھٹی سے واپس آچکے ہیں، اگر آپ حکم دیں تو انہیں بھی پیغام بھیج دیتا ہوں۔ ان کے علاوہ انسپکٹر رام داس اور چھ سنتری مزید ہیں۔ میں نے ضرورت کی تمام چیزیں بھی بالکل تیار کروا دی ہیں جو سفر میں کام آسکتی ہیں۔

گُڈ، ولیم نے مسکراتے ہوئے اظہارِ مسرت کیا پھر ایک کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے اُسے باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔ اتنے میں کرم دین کافی لے کر آ گیا۔ کافی کی گرم گرم اٹھتی ہوئی بھاپ نے ولیم کی اشتہا بڑھا دی،۔ وہ کافی کی چسکیاں لینے کے ساتھ ساتھ کیتھی کو خط لکھنے لگا۔

پیاری کیتھی تمھیں خط لکھے بہت دن ہو گئے۔ آج سے چار دن پہلے تمھارا خط ملا تو میں پڑھنے کے بعد دیر تک اُسے چومتا رہا پھر سینے پر رکھ کر سو گیا۔ خواب میں تم ملیں اور مَیں نے دیکھا تم میرے سینے پر لیٹی ہوئی ہو۔ پیاری کیتھی اب تمھیں یہ کہنا بالکل واہیات لگتا ہے کہ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ اب تو ہم محبت کی خندقیں پاٹ کر کے اشتہاؤں کے قلعے کی فصیلوں کے اندر داخل ہو چکے ہیں۔ جس میں ہم تیسری قوت کا مقابلہ ایک جسم بن کر کریں گے۔ ہم محلوں میں رہیں گے، تکیوں کے درمیان لیٹیں گے اور ریشمی گدّوں پر بیٹھ کر فانوسوں کی رونق میں چھلیں کریں گے جس میں کوئی تیسرا مخل نہ ہو۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں، تمھارے خواب کی تکمیل میں جُتا ہوا ہوں اور سخت محنت کر رہا ہوں تاکہ تمھاری خوابگاہ تیار کرنے کا خواب پورا کر سکوں۔ یہاں دفتر میں کام بہت بڑھ گیا ہے۔ تم جانتی ہو، تمہارا ولیم اب ایک عام اور کھنڈر الڑ کا نہیں رہا۔ میں جانتا ہوں تمھیں یقین نہیں آ رہا ہو گا مگر یہ سچ ہے میں اب بڑے بڑے کام کرنے لگا ہوں۔ جیسا کہ کمشنروں کی بہت سی سنجیدہ ذمہ داریاں ہوتی ہیں، میری بھی ویسی ہی سنجیدہ ذمہ داریاں ہیں۔ یقین مانو میں یہاں بڑی بڑی میٹنگیں کر رہا ہوں جن میں اہم فیصلے کیے جاتے ہیں۔ دیسی لوگ تو ایک طرف، یہاں کے انگریز افسر بھی مجھے سلام کرتے ہیں۔ میں نے تمھیں کہا تھا، ایک دن تم ایک بڑے کمشنر کی بیوی ہو گی جو ہندوستان کی کھلی سڑکوں اور شاداب وادیوں کی سیر کو نکلا کرے گی۔ بس وہ دن قریب آ گئے ہیں۔ میں یہاں کچھ اہم کام نپٹا لوں اُس کے بعد چند ماہ میں ہی تمھیں بیاہ کر ہندوستان لے آؤں گا۔ بس چند ماہ اور انتظار میری جان۔ سر دست میں یہاں اپنا وجود ثابت کرنا چاہ رہا ہوں اور مجھے یقین ہے وہ جلد ہی ہو جائے گا، اُس کے بعد ہم تم ہوں گے اور ہندوستان پر ہمارا اقتدار اور تمہاری نوکرانیوں اور ملازماؤں کے گروہ کے گروہ ہوں گے، ہمارے دو پیارے پیارے تمہارے جیسے بچے ہوں گے۔ اب ایک بوسہ دو

تمہارا اور تمہارا ولیم

ولیم نے کافی کی آخری چُسکی کے ساتھ ہی خط کی تحریر کو انجام دیا پھر نجیب شاہ کو طلب کر کے خط اُس کے حوالے کیا اور کہا، اِسے ابھی بذریعہ تار کیتھی کو روانہ کر دے۔ نجیب شاہ کے کمرہ سے نکلنے کے بعد ولیم نے کلارک کی طرف

دیکھا، وہاں چار بج رہے تھے۔ اُس نے سوچا کہ آج تو وقت نکلنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور اگر دفتر کی مصروفیات اسی طرح رہیں تو زندگی کے نکلنے کا بھی پتا نہیں چلے گا۔ ایک دو منٹ آج کے گزرے واقعات پر دوبارہ نظر دوڑانے کے بعد وہ کرسی سے اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر سامنے ہی کلرکوں کے کمروں کے درمیان والی ساٹھ فٹ لمبی اور دس فٹ چوڑی راہداری عبور کر کے باہر کی چوکی پر پہنچا تو اُسے اپنی پُشت پر کئی آفیسرز اور کلرک کھڑے ہوئے نظر آئے۔ غالباً وہ اسی انتظار میں تھے کہ کب صاحب کمرے سے باہر نکلے اور اُن کی آج کے دن سے جان چُھٹے۔ ولیم نے سب پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ طائرانہ سی نظر ماری اور آگے بڑھ گیا۔ کسی کی جُرات نہیں ہوئی آگے بڑھ کر ولیم سے سلام لے یا اُسی کی طرح مسکرا کر جواب دے۔ وہ سب فقط ہاتھ باندھ کر کھڑے رہے اور جب ولیم آگے بڑھ گیا تو دو آفیسر بھی اُس کی تائید میں پیچھے پیچھے بنگلے کی طرف پیدل ہی چل پڑے جو دفتر کی عمارت سے زیادہ سے زیادہ دو سو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ افسروں کے ساتھ چار سنتری بنگلے تک آئے۔ اس پیدل واک کے دوران ولیم نے کسی سے کوئی بات نہیں کی البتہ بنگلے کے گیٹ کے اس طرف ہونے کے بعد انھیں تھینکس ضرور کہا۔

(22)

دلبیر سنگھ صبح سات بجے ہی جیپ اسٹارٹ کر کے ولیم کے بنگلے پر آ گیا تھا باقی کا بھی تمام عملہ پونے آٹھ بجے تک پہنچ گیا اور پورے آٹھ بجے ولیم اپنے بنگلے سے باہر نکل آیا۔ مالکم کے ساتھ ہاتھ ملا کر باقی سب کو گڈ مارننگ پر ہی اکتفا کیا اور آگے بڑھ کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ ولیم کے بعد دوسرے بھی جیپوں کی طرف بڑھے اور سوا آٹھ بجے ولیم جلال آباد سے نکل پڑا۔

یہ دن فروری کے آغاز کے تھے۔ بنگلے کے دائیں طرف کھڑے پیپل کے پتے مسلسل گرتے رہنے سے سڑک پر زردی بکھر چکی تھی۔ سڑک کچی تھی لیکن اُس پر اینٹوں کے بھٹے سے بچ جانے والی پکی اینٹوں کی ملی جُلی کیری اور ریت پوری سڑک پر دور تک بچھائی گئی تھی تا کہ گرد نہ اٹھ سکے۔ یہ سُرخ رنگ کی کیری کمپلیکس سمیت جلال آباد شہر کی قریباً تمام سڑکوں پر بھی ڈال دی گئی تھی جو وافر مقدار سے بھٹوں سے مل جاتی تھی۔ روز کی روز اُن پر ماشکی چھڑکاؤ بھی کر دیتے۔ جس کی وجہ سے مٹی بیٹھ جاتی۔ اس سڑک پر بھی صبح ہی ماشکی چھڑکاؤ کر کے جا چکا تھا۔ بلکہ تحصیل کا بڑا صاحب ہونے کی وجہ سے ولیم کے گھر کو جانے والی سڑک پر چھڑکاؤ کا خاص خیال رکھا جاتا۔ آج ہوا قدرے تیز اور ٹھنڈی چل رہی تھی۔ اس لیے ولیم نے نکلتے وقت گلے میں مفلر بھی لپیٹ لیا۔ جیپ نے جلال آباد کو

پیچھے چھوڑا تو مضافات میں کچھ کچھ سبزیوں اور سرسوں کے کھیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وسطی پنجاب کے برعکس یہاں درختوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس لیے نظر دُور تک چلی جاتی تھی اور جیسے ہی جیپیں جلال آباد سے دور ہونا شروع ہوئیں۔ سبزیوں اور سرسوں کے کھیت بھی کم ہونا شروع ہو گئے۔ جب جلال آباد چار میل پیچھے رہ گیا تو ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آنے لگی۔ سڑک کے دونوں طرف درختوں کے بجائے دو رویہ سرکنڈوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ تھے۔ جن سے کبھی خرگوش اور کبھی گیدڑ یا سوّر جیپوں کے شور سے اچانک نکل کر بھاگ اُٹھتا اور کبھی کانٹوں والی سیہہ سڑک پر جیپ کے آگے آگے تھوڑی دُور تک دوڑ کر دوسری طرف غائب ہو جاتا۔ سورج جیسے جیسے بلند ہوتا جا رہا تھا، سڑک کی گرد جو رات میں پڑنے والی اوس سے جم چکی تھی، وہ غبار بن کر اُٹھنے لگی۔ حتیٰ کہ جیپوں کے پیچھے دھویں اور گرد و غبار کے بادل سے چڑھ جاتے اور پیچھے کی طرف دیکھنے سے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ قافلہ ٹوٹیانوالہ، بدھوکے اور جمالکے سے ہوتا ہوا آگے فاضلکا بنگلہ کی طرف بڑھتا گیا۔

ولیم بڑی گہری نظروں سے اِس پورے علاقے کا جائزہ لیتا ہوا جا رہا تھا۔ سڑک پر ریت اور مٹی کی ملی جُلی گرد تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ اس پورے علاقے پر دریا کا کافی اثر تھا۔ اِس وجہ سے کہیں کہیں کیکر اور بہت زیادہ عک، کریر اور ون کے درخت تھے۔ ان کیکروں اور جھاڑیوں کے علاقے میں جگہ جگہ چرواہے اپنی بھیڑوں اور بکریوں کے ساتھ بکثرت نظر آ رہے تھے۔ جن کے ہاتھوں میں کاپے اور کاندھوں پر کلہاڑیاں تھیں۔ ان کے ذریعے وہ بلند کیکروں کی شاخیں کاٹ کر اُتارتے۔ جن سے ان کی بکریاں تمام پتے اور نرم کونپلیں اس طرح صاف کر جاتیں جیسے کسی مرغی کی کھال کھینچ لی گئی ہو۔ ان چرواہوں کی سادگی اور اپنے حال میں مست رہنے کی کیفیت دیکھ کر ولیم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ پاؤں میں عموماً چمڑے کے پھٹے پُرانے جوتے اور سر پر ایک چھوٹا سا پٹکا نظر آتا تھا۔ یہ چرواہے اور ان کی بھیڑ بکریاں تھوڑی دیر تک ولیم کی جیپ کو حیرانی سے کھڑے دیکھتے رہتے، اُس وقت تک جب تک وہ اُن کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔ بکریوں کی حیرانی دوچند ہوتی تھی کہ اُن کے منہ میں گھاس یا شاخ کی پتی بھی وہیں رک جاتی اور منہ اور آنکھیں دیر تک کھلی رہتیں۔ ظاہری ہیئت سے پتا چلتا تھا کہ یہ چرواہے زیادہ تر مسلمان تھے۔

چھوٹی چھوٹی آبادیاں ایک ایک یا دو دو میل کے بعد نظر آ رہی تھیں۔ ان آبادیوں کے لوگ بھی کہیں کہیں ننگ دھڑنگ بچے، کہیں عورتیں یا مرد جیپوں کو پاس سے گزرتا دیکھ کر حیرت سے تکنے لگ جاتے۔ کوئی بھی آبادی چالیس یا پچاس گھروں سے زیادہ نہیں تھی بلکہ اکثر اس سے بھی کم پانچ دس جھونپڑوں پر ہی مشتمل تھیں۔ ولیم اس پورے

ویران اور غیر سبز علاقے کو دیکھتا اور سوچتا جا رہا تھا کہ یہ لوگ کیا کماتے اور کیا کھاتے ہوں گے۔ اُسے ان غریب آبادیوں پر ترس آنے کے ساتھ ساتھ وحشت ہو رہی تھی، جنھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کس حکومت کی رعایا ہیں اور اُن کے کیا حقوق ہیں اور کتنے فرائض ہیں۔ کبھی کبھی اس ویرانی میں دو چار سبز کھیت بھی نظر آ جاتے تھے، جو رہٹ یا بارش کے لطف کا نتیجہ تھے اور حکومت کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ سکول اور مدرسے کا تو دُور دُور تک نام ونشان نہیں تھا۔ ولیم نے سوچا، کاش حکومت برطانیہ دولت سمیٹنے کے علاوہ بھی کچھ کام کر سکتی۔ اُسے اِس علاقے کا بنجر پن دیکھ کر وحشت ہونے لگی۔ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا اور یہاں کے سابقہ ڈپٹی کمشنروں اور اسسٹنٹ کمشنروں کو کوسنے لگا، جنھوں نے کبھی یا تو اپنے دفتر سے نکل کر دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی یا اگر دیکھا بھی تھا تو وہ کسی بھی احساس سے عاری تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کی حالت پر کبھی غور نہیں کیا تھا بلکہ ان کے لیے کچھ کرنا تو دُور کی بات تھی، سوچا بھی نہیں ہو گا۔

ولیم خیالات کی اسی رو میں گم تھا کہ اُسے ایک ٹیلے پر قصبہ نما گاؤں دکھائی دیا جس کی طرف دو تین گڈے بھوسے اور چارے سے لدے جا رہے تھے۔ جن کے آگے بیل جُتے ہوئے تھے۔ ان گڈوں کی خصوصیات یہ تھیں کہ پہیوں سے لے کر ہر چیز لکڑی کی تھی۔ لکڑی کے بڑے بڑے پہیے چلتے ہوئے ایسی آواز پیدا کر رہے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو کھینچنے کے لیے کسی دیو کا کلیجہ چاہیے۔ جنہیں بچارے بیل محض اپنے جانور پن کی وجہ سے کھینچے لیے جا رہے تھے۔ یہ سراسر جانوروں کے ساتھ ظلم تھا لیکن یہ گڈے ہی وہاں کی مقبول ترین اور مقامی ترکھانوں کے ہاتھوں سے بنی ہوئی بار برداری کی سستی شے تھی۔ اسے چلانے کے لیے صرف دو بیل اور ایک کسان چاہیے ہوتا۔ جس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ باقاعدہ تربیت یافتہ ہو۔ بلکہ اُسے ایک چار سال کا بچہ بھی بغیر تجربے کے ہانک کر لے جا سکتا تھا۔ بس وہ گڈے پر بیٹھ سکتا ہو۔ ولیم نے دلبیر سے کہا، دلبیر سنگھ اس قصبے میں جیپ روک دو۔ دلبیر سنگھ نے گاؤں میں داخل ہونے سے چند قدم دُور ہی جیپ روک دی۔ ولیم کی جیپ کے پیچھے دوسری دونوں جیپیں بھی آ کر رُک گئیں۔ گاؤں کے ارد گرد ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے تھے، جن میں زیادہ تر مکئی، باجرا، گوارہ اور چنے کی فصلیں تھیں۔ ان فصلوں کو دیکھ کر ولیم کو ایک گونہ مسرت اور حوصلہ ہوا۔

مالکیم نے آگے بڑھتے ہوئے کہا، سر اس گاؤں کا نام تارے والا ہے۔ قدرے بڑی آبادی ہے اور زراعت میں دلچسپی رکھتی ہے۔ تیس فیصد مسلمان ہیں، چالیس فیصد کے قریب سکھ ہیں، بیس فی صد ہندو اور باقی چوہڑے ہیں۔ یہاں پر

ایک پرائمری سکول بھی موجود ہے۔

گڈ، ولیم بولا، ہم کچھ دیر اس گاؤں کو دیکھنا چاہیں گے۔

یہ کہہ کر ولیم گاؤں کی طرف چل دیا۔ کچھ لوگ جیپوں کے رُکتے ہی جمع ہو گئے تھے۔ مگر اب تماشا دیکھنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ خاص کر بچوں کا جوش اور حیرانی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ گاؤں کے مکان زیادہ کچے ہی تھے۔ دو چار پکے مکان بھی تھے مگر وہ بھی ایسے خاص پکے نہ تھے۔ ولیم اور دس دوسرے ملازمین جیسے ہی گاؤں کی طرف بڑھے، مرد، خواتین اور بچے گاؤں کی چوڑی اور کھلی گلیوں میں دورویہ کھڑے ہو گئے۔ بعض کھسر پھُسر کر کے ایک دوسرے کو سوال بھی کرنے لگے۔ کچھ ڈرے اور سہمے ہوئے بھی تھے۔ غالباً پولیس افسر اور سنتریوں کی وجہ سے یہ کیفیت تھی۔ ولیم کو گاؤں والوں کی حیرانی اور ہیجانی کیفیت سے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ اِس سے پہلے انگریز افسروں نے کبھی گاؤں میں قدم رکھا بھی ہو گا تو صرف اُن کی گوشمالی کے پیشِ نظر، اسی لیے اکثر ڈرے ہوئے تھے۔ گلیاں اس قدر کھلی تھیں کہ پچاس فٹ کی ضرور تھیں۔ انھی گلیوں میں جگہ جگہ پر گدھے اور بھینسیں بندھی تھیں جن کے آگے چارہ بغیر کُترے، لمبے لمبے مکئی، چری اور باجرے کے ٹانڈوں کی شکل میں اکثر چبایا ہوا پڑا تھا۔ بعض جانور اُنھی چبائے ہوئے ٹانڈوں کو بار بار چبا رہے تھے۔ اُس کے پتے وہ کھا چکے تھے۔ گدھوں کے سامنے چاولوں کے باریک چھلکے ڈھیر ہوئے پڑے تھے، جنھیں وہ شوق سے کھا رہے تھے۔ ولیم گزرتے ہوئے ایک گدھے کے پاس پہنچا تو وہ اچانک ہِنکنے لگا، جس سے ولیم ایک دم ڈر کے پیچھے ہٹا۔ اُسے ڈرتے ہوئے دیکھ کر بچے ہنس دیے اور وہ کھسیانا سا ہو کر آگے بڑھ گیا۔ پورا گاؤں کھیتوں کی نسبت بلندی اور ریتلی زمین پر تھا۔ اس وجہ سے نہ تو وہاں بارش کے پانی کے آثار تھے اور نہ ہی گندگی نظر آئی۔ البتہ درختوں کی یہاں بھی کمی تھی۔ کہیں کہیں کسی گھر کے صحن میں ٹاہلی یا نیم کا پیڑ ضرور نظر آ رہا تھا۔ مالیکم ولیم کو اس گاؤں کے متعلق اپنی معلومات دے رہا تھا جس کا مطلب تھا وہ یہاں پہلے بھی آ چکا ہے۔

سر، یہاں ایک مسجد، ایک گوردوارہ اور ایک مندر بھی ہے، یہ گاؤں اصل میں نواب سر شاہنواز ممدوٹ کی ملکیت ہے اور انھی چوراسی گاؤں میں سے ایک ہے جو اُن کی ملکیت ہیں۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر محنتی اور جفاکش ہیں۔ ان کو تحصیل جلال آباد ہی لگتی ہے مگر ان کی آمد و رفت اور خرید و فروخت تحصیل مکھسر میں رہتی ہے۔ نواب صاحب یہاں کبھی کبھار آتے ہیں۔ یہ جو کچھ اُسے حصہ دیتے ہیں، وہ لے کر چلتا بنتا ہے۔ ادھر اُدھر کھیتوں میں جو رہٹ لگے

ہوئے ہیں، یہ سب اُسی نے لگوا کر دیے ہیں۔ گورنمنٹ ان علاقوں پر توجہ اس لیے نہیں دیتی کہ ان کے ذمہ دار نواب صاحب ہیں اور وہ خود دلچسپی کم لیتے ہیں۔ یہاں کے سکول میں بچوں کی تعداد تیس ہے۔

مالیکم اس طرح معلومات دیے جا رہا تھا جیسے یہ کوئی نیا ملک تھا جس پر انگریز سرکار حملے کا منصوبہ ترتیب دے رہی ہو۔ لوگوں کی تعداد میں تماشائیوں کی صورت کافی اضافہ ہو چکا تھا جن میں اب مردوں کے علاوہ عورتیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ مردوں کی طرح اکثر عورتوں نے بھی دھوتیاں باندھی ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ بہت سی بڑی بوڑھیوں کے لگھرے بھی بندھے تھے، جن کے گھیر کا پھیلاؤ کم از کم تین گز تک تھا۔ اُنہیں دیکھ کر ولیم کے ذہن میں ایسے ہی ایک خیال آیا کہ اتنے کپڑے سے تو دو میموں کا لباس بن جائے۔ یہ بوڑھیاں کتنا کپڑا ضائع کرتی ہیں۔

ولیم گاؤں کے چوک میں پہنچا تو عجیب سرشاری میں چلا گیا۔ چوک بہت ہی بڑا سو مربع میٹر میں پھیلا ہوا تھا۔ جس کے عین درمیان میں غلہ پیسنے والا خراس تھا۔ پتھر کے اُوپر نیچے دو بڑے بڑے بھاری پُڑ گھرر گھرر کرتے گھوم رہے تھے۔ اتنے بھاری خراس کو چلانے کے لیے ایک اونٹ مسلسل دائرے میں چل رہا تھا، جس کے کوہان کے ساتھ خراس کے آنکڑے بندھے تھے اور آنکڑے کے آخری سرے پر چوڑی تختی پر ایک آدمی بیٹھا اُونٹ کو ہانکتا جاتا تھا۔ اس طرح اونٹ کے دائرے میں گھومنے سے پتھر کے پُڑ گھومتے تھے۔ بالائی پتھر میں ایک سوراخ تھا جس میں غلہ یا گندم متواتر تھوڑی تھوڑی کر کے ڈالی جا رہی تھی، جو آٹا بن بن کر نیچے بوریوں میں گرتا جاتا۔ ولیم نے ایسا منظر پہلی دفعہ دیکھا تھا، اس لیے دلچسپی سے دیکھنے کے لیے وہاں کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر اُس منظر کو دیکھنے کے بعد ولیم آگے چل دیا۔ اس چوک میں دو چار درخت بھی، بیری اور ٹاہلی کے کھڑے سایہ دے رہے تھے۔ یہ دن سردیوں کے تھے اس لیے کسی نے بھی اُن کے سایے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ چوک کے مشرقی کونے میں مسجد تھی۔ اُسے ولیم نے دُور ہی سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔ مغرب کی طرف ذرا ایک دوسری گلی میں گوردوارہ بھی تھا۔ مندر کہیں دکھائی نہ دیا۔ اب آگے آگے ولیم چل رہا تھا، اُس کے پیچھے ماتحت عملہ اور اُن کے پیچھے تماشا دیکھنے والے چھوٹے بڑے لوگوں کا پورا مجمع تھا۔ اُن کا ڈر مکمل طور پر دور ہو چکا تھا۔ اس لیے پیچھے پیچھے آنے والوں کی آوازیں اب شور کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ بچوں کا کوئی بھی مخصوص لباس نہیں تھا۔ کچھ نے محض نیکریں پہنیں ہوئیں تھیں۔ بعض دھوتی قمیض میں تھے اور کچھ ویسے ہی الف ننگے چھڑ نگیں مارتے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ نہ اُنہیں سردی کی پرواہ اور نہ ہی اُن پر سردی گرمی کے موسموں کا اثر تھا۔ یہ سب ولیم سے دُور دُور ہی تھے۔ ولیم نے پاس ہی کھڑے ایک شخص سے سکول

کے بارے میں پوچھا تو اُس نے گاؤں کے دوسرے کونے کی طرف اشارہ کیا اور بھاگ کر پھرتی سے آگے آگے چل دیا۔ گویا وہ انھیں وہاں تک پہنچانے کا پابند ہو گیا ہو۔

وہ شخص اُنھیں ایک بہت چوڑی گلی سے گزارتے ہوئے ایک جگہ لے گیا جہاں تین چار درخت ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ اُن سے تھوڑا ہٹ کے چار ٹولیوں میں تیس پینتیس کے قریب لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک بڑا سا کمرہ تھا اور بس۔ اِس کے علاوہ وہاں نہ کوئی دوسرا کمرہ تھا نہ کہیں چار دیواری کے نشان تھے اور نہ ہی اُستاد نظر آ رہا تھا۔ ولیم پاس پہنچا تو سب بچے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اکثر بچوں نے پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں۔ یہ سب زمین پر بغیر ٹاٹ یا کپڑا بچھائے بیٹھے تھے۔ اُسی شخص نے آگے بڑھ کر ایک بچے سے پوچھا، پُتر، ماشٹر موتی لال کدھر ہے؟ بچے یک زبان بول اُٹھے، وہ جنگلے گیا ہے۔ ولیم جب اُن کے جواب کو سمجھنے سے قاصر رہا تو اُسی دیہاتی شخص نے ولیم کو سمجھاتے ہوئے کہا، صاحب بہادر، ماسٹر جی جھاڑا کرنے گئے ہیں۔ ولیم پھر بھی کچھ نہ سمجھا تو اُس نے کچھ اور وضاحت کی، جی میرا مطبل ہے مُنشی جی جنگل کرنے گیا۔ یہ بات ولیم کے لیے مزید پیچیدہ ہو گئی کہ سکول کی بجائے وہ جنگل میں کیا کرنے گیا ہے۔ اس کشمکش کو دیکھتے ہوئے بیر داس نے آگے بڑھ کر ولیم سے کہا، سر یہ کہہ رہا ہے، ماسٹر موتی لال لیٹرین میں گیا ہے۔ ولیم یہ جان کر مسکرا دیا۔

ولیم پڑھنے والے بچوں اور سکول کی حالت دیکھ کر تذبذب کا شکار ہو گیا کہ یہ بچے بھی کیا پڑھتے ہوں گے؟ اُس نے بیر داس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، بیر داس کیا آپ بھی اسی طرح کے سکولوں میں پڑھتے رہے ہیں؟

سر وہ ذرا اِن سے بہتر تھے، مگر کچھ اسی طرح کے تھے، بیر داس نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

اتنے میں ایک شخص بھاگتا ہوا کھیتوں کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ اُسے دیکھ کر بچے ایک دم بول اُٹھے، وہ آ گئے ماشٹر جی، آ گئے۔

بیر داس نے سب بچوں کو بیٹھنے کا کہا۔ اتنے میں ماسٹر موتی لعل دھوتی اور پگڑی دُرست کرتا اور ہانپتا ہوا پاس آیا اور دونوں ہاتھ باندھ کر ولیم کو سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ اُسے ولیم کے عہدے اور اتھارٹی کا تو بالکل پتا نہیں تھا۔ البتہ اتنا ضرور باور ہو گیا کہ فرنگی ہے تو کوئی بڑا افسر ہی ہے۔ جس کے ہاتھ میں میری روزی روٹی کا بھی اختیار ہو گا۔ بچے بالکل سہمے ہوئے خاموش بیٹھ گئے تھے۔ کیونکہ جس قدر اُن کا ماسٹر ڈرا ہوا تھا اُس سے بچوں کو معلوم ہوا کہ کوئی بہت ہی بڑا افسر آیا ہے۔ ولیم نے آگے بڑھ کر موتی لعل سے کہا: موتی لعل، یہاں کتنے اُستاد ہیں؟

موتی لعل ہاتھ باندھے ہوئے "سرکار میں ایک ہی ہوں"۔

بچے کتنے ہیں؟

سرکار چالیس ہیں

اور بھاگ کر کمرے سے ایک رجسٹر لے آیا۔ پھر اُس کو کھول کر ولیم کے سامنے کر دیا۔

یہ سب بچے اسی گاؤں کے ہیں؟

ناں سرکار، اس گاؤں کے تو صرف بارہ بچے ہیں۔ باقی ادھر اُدھر کے گاؤں سے آتے ہیں۔

کیوں؟ اس گاؤں میں صرف بارہ ہی بچے ہیں۔ گاؤں تو کافی بڑا نظر آتا ہے۔

(سہمے ہوئے انداز میں) صاحب بہادر، مسلمان اپنے بچوں کو یہاں پڑھنے نہیں بھیجتے۔

وہ کیوں؟ ولیم نے حیرانی سے پوچھا۔

ولیم کے اس سوال پر موتی لعل گھبرا گیا اور مزید بولنے سے کترانے لگا کیونکہ مسلمانوں کا ایک بڑا مجمع تماشائیوں کی شکل میں سامنے کھڑا تھا۔ اُس بچارے کی ہمت نہیں تھی، اُن کے سامنے کوئی چغلی کی بات کرتا۔ اُسے جھجکتا ہوا دیکھ کر مالیکم آگے بڑھ کر بولا، سر اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پنجاب کے دیہاتوں میں ایسے مولوی کثرت سے ہیں، جو جگہ جگہ فتوے جاری کرتے ہیں کہ اپنے بچوں کو گورنمنٹ کے سکولوں میں مت بھیجو کیونکہ پڑھانے والے اکثر ہندو اور سکھ ہیں اور تعلیم نصاریٰ کی ہے۔ وہ انھیں ڈراتے ہیں کہ ان سکولوں میں پڑھنے سے مسلمانوں کے بچے یا تو ہندو اور سکھ ہو جائیں گے یا عیسائی۔ اسی لیے ہمارے سکولوں میں مسلمان بچوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

ہوں......" ولیم معنی خیز انداز میں ہنکارا اور اگر سکول ہیں بھی تو اسی طرح کے۔ مگر مالیکم آپ نے یہ بات پہلے مجھے" نہیں بتائی۔ یہ بہت خطرناک بات ہے۔ تُلسی داس نے بھی سرسری پہلے اسی طرح کی کوئی بات کی تھی۔ ہم کیوں ان بچوں کے لیے مسلمان ٹیچر کا بندوبست نہیں کرتے۔ فوراً تلسی داس سے اس بارے میں رپورٹ طلب کرو، خیر اس معاملے پر بعد میں بات کرتے ہیں اور یہ کیا ہے؟ ولیم کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

سرکار یہ گورنمنٹ کے سکول کی عمارت ہے، موتی لعل نے پہلو میں چلتے ہوئے کہا۔

ولیم کمرے میں داخل ہوا تو چکرا سا گیا۔ وہاں صرف خالی دیواروں پر نہائت بوسیدہ چھت تھی، جو بجائے آنکڑوں کے، سرکنڈوں کے گٹھوں سے تیار کی گئی تھی اور اب اُس میں بھی جگہ جگہ چھید نظر آ رہے تھے۔ کمرے کو ایک

دروازہ لگا ہوا تھا۔اس کے سوا نہ وہاں ڈیسکیں تھیں، نہ کرسی، نہ میز اور نہ خدا کی بھری پُری کائنات میں سے کچھ اور چیز، جو اُس تیس ضرب پندرہ فٹ چار دیواری میں موجود ہوتی۔

ولیم نے اس طرح کے سکول کب دیکھے تھے اور نہ ایسے سکول ماسٹر جن کی طرف سے نہ کوئی مطالبہ تھا اور نہ کوئی شکایت۔ ولیم کو شک ہوا کہ شاید اُسے تنخواہ بھی ملتی ہے کہ نہیں۔اس شبے کو دُور کرنے کے لیے اُس نے آخر موتی لعل سے پوچھ لیا، موتی لعل آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟

موتی لعل بولا، حضور آپ کے سایہ اقبال سے پچیس روپے ماہ بہ ماہ مل جاتے ہیں۔

اور ان بچوں کو پڑھاتے کیا ہو؟ ولیم کو حوصلہ ہوا کہ چلو خیر سے ایک کام تو ہو رہا ہے۔

سرکار سب ہی کچھ پڑھاتا ہوں، موتی لعل نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا، ریاضی، ابتدائی انگریزی، اردو، فارسی، تاریخ اور تھوڑا بہت جغرافیہ۔ بس سرکار پانچویں تک یہی کچھ ہے۔آپ کچھ بھی اِن بچوں سے پوچھ سکتے ہیں سرکار۔

ٹھیک ہے موتی لعل، ہمیں آپ پر اعتماد ہے اور کمرے سے باہر آتے ہوئے مالیکم سے مخاطب ہو کر، مسٹر مالیکم میرا خیال ہے، یہ مسئلہ آب پاشی کے نظام سے بھی زیادہ سنجیدہ ہے۔ کیا آپ یہ سب دیکھ رہے ہیں؟ ہمیں اس مسئلے کو اپنی اولین ترجیحات میں شامل کرنا ہو گا۔

یہ کہتے ہوئے ولیم واپس مُڑا۔ ولیم کے واپس ہوتے ہی مجمع ایسے چھٹ گیا جیسے کسی نے دھویں کا شیل مارا ہو۔ پلک جھپکتے میں راستہ صاف ہو گیا اور ولیم اُسی راستے چلتا ہوا اپنی جیپ تک آگیا۔

سچ بات تو یہ تھی کہ ولیم کو ایسے تعلیمی نظام کا بگڑا ہوا چہرہ دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ اُس پر ایک بددلی کی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ جلدی سے پلٹ کر اپنی جیپ کے پاس آیا۔ دلبیر سنگھ نے رولر پر رسا پہلے ہی چڑھا رکھا تھا۔ اُس نے ایک ہی جھٹکے سے رسا کھینچ کر جیپ کو اسٹارٹ کر دیا۔ اُس کے فوراً بعد ہی دوسری دونوں جیپوں کے رسے بھی بالترتیب کھینچ دیے گئے۔ اور یکے بعد دیگرے جیپیں روانہ ہو گئیں۔ گاؤں کے تماش بین وہیں کھڑے دیکھتے رہ گئے۔ انھیں اتنے افسروں کا اس گاؤں میں آنے اور اُسی طرح خالی ہاتھ چلے جانے پر تعجب ہو رہا تھا۔ نہ کسی کی سرزنش ہوئی، نہ کسی کو گرفتار کیا گیا اور نہ ہی لگان، ٹیکس یا کسی اور قسم کا مطالبہ یا فوج میں بھرتی کا اعلان ہوا۔ اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس قسم کا انگریز تھا اور انگریز پولیس کا دورہ تھا۔

اُنھیں اسی حیرانی میں چھوڑ کر ولیم اور اس کا عملہ آگے بڑھ گیا۔ گاؤں میں کافی وقت صرف ہو گیا تھا اور اب گیارہ بج چکے تھے۔ جیپ کچی سڑک پر دوڑتی جا رہی تھی۔ اُس کے ٹائروں کی موٹی گُڈیاں گرد اُٹھا اُٹھا کر پیچھے آنے والی جیپوں پر پھینک رہی تھیں۔ جن میں پولیس کے تھانیدار، سنتری اور دفتر کا دیسی عملہ آ رہا تھا۔ جیپ کی رفتار کے ساتھ ساتھ ولیم کا دماغ بھی دوڑ رہا تھا۔ اب اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کے کاندھوں پر کِس قدر بھاری ذمہ داری تھی۔ پورے علاقے کی معاشی اور تعلیمی حالت انتہائی ناگفتہ بہ اور اُس پر لڑائی فساد اور ڈکیتی کے کئی واقعات، سینکڑوں مسائل تھے۔ خاص کر دیہاتی علاقوں کی کسمپرسی دل دہلا دینے والی تھی۔ کرنے کے بہت سے کام تھے اور وسائل کم۔ لیکن اگر وہ ان سب کو نظر انداز کر کے سابقہ افسروں کی طرح دفتر میں بند ہو جائے تو سب کچھ خود بخود آسان تھا۔ یہ سوچ کر اُس نے جُھر جھری لی، یہ کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ اب تو ہندوستان اُس کا اپنا ملک تھا۔ پچھلی چار نسلوں سے اُس کا خاندان اِسی کی مٹی سے اپنا رزق اٹھاتا رہا اور اب تو اُس کی رگوں میں دوڑنے والا خون یہیں کے پانی اور سبزے سے تیار ہوا تھا۔ اُسے لندن سے صرف اتنی ہمدردی تھی جتنی ڈیڑھ سو سال کے مہاجرین کی نسلوں کو اپنے سابقہ وطن سے ہو سکتی ہے۔ ولیم نے اپنی زندگی کے بیشتر سال لاہور کے مال روڈ اور منٹگمری کی نہروں کے کناروں پر دوڑتے ہوئے گزارے تھے۔ اُس نے سوچا اُس کا دادا یہیں پیدا ہوا، باپ نے یہیں پر جنم لیا اور وہ خود اسی مٹی سے پھوٹا۔ اب کون ہے، جو اُسے کہے کہ ہندوستان اُس کا اپنا ملک نہیں ہے۔ وہ ہر حالت میں یہیں رہے گا اور انھی لوگوں کے لیے کام کرے گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

جیپ کے مسلسل دوڑتے چلے جانے سے اُس کے خیالات میں بھی تسلسل پیدا ہو گیا۔ دل ہی دل میں بہت سے منصوبے بنانے لگا، تعلیم، زرعی سٹرکچر، سڑکیں، پُل، عدل و انصاف اور شہری آبادیوں کا قیام۔ انھی خیالی منصوبوں کے دوران وہ جلال آباد کی تحصیل کو ہرے بھرے کھیت، باغات، خوشحال گاؤں اور ان کے اندر جگہ جگہ تعلیمی مرکزوں کو دیکھنے لگا۔ شاید وہ بنگلہ فاضل کے پہنچنے تک اسی رَو میں بہا جاتا مگر اچانک جیپ کے بریک لگے اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ چونک گیا۔

دلبیر سنگھ نے جیپ روکتے ہی چھلانگ لگائی۔ اُس کے ساتھ ہی ڈیوڈ اور جوزف بھی نیچے اُتر کر سڑک کے دائیں کونے پر لیٹے ہوئے سؤر کو دیکھنے لگے، جو اچانک مکئی کے کھیت سے نکل کر اور سرکنڈوں کی باڑ عبور کر کے سڑک پر

آتے ہی جیپ سے ٹکرا گیا تھا اور اب مرنے کے لیے ہونک ہونک کر سانس لے رہا تھا۔ اتنے میں پچھلی دونوں جیپوں کے سوار بھی اُتر کر وہیں آ کھڑے ہوئے۔

سؤر کی ٹانگ کو ہلاتے ہوئے دلبیر سنگھ بولا، صاحب جی ذرا دیکھیں مرگی پینا کیسے ادھوانے کی طرح پھولا ہوا ہے؟ گُلیاں کھا کھا کے چربی چڑھی ہوئی ہے۔ پورے دو من گوشت ہو گا۔

اتنے میں تحصیدار مالیکم بھی پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور اُسے دیکھنے لگا۔ ڈیوڈ، جوزف، مالیکم سب جی ہی جی میں خوش ہونے لگے کہ غیب سے کیا عمدہ گوشت مفت ہاتھ آ گیا ہے۔ جوزف سنتریوں کو کچھ حکم دینے ہی لگا تھا کہ ولیم نے آگے بڑھ کر دلبیر کو مخاطب کیا، دلبیر! اسے اُٹھا کر اُدھر پھینک دو اور آگے بڑھو۔

ولیم کے اس حکم کو سن کر تمام سنتری اور انگریز آفیسر حیران رہ گئے۔ پھر اس سے پہلے کہ کوئی بولتا، ولیم نے غصے سے دلبیر کی طرف دیکھا جو تذبذب میں کھڑا دوسرے افسروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ولیم کو اِس طرح اپنی طرف دیکھتے ہوئے دلبیر سنگھ مٹی اور گرد میں اَٹے اور ہونکتے ہوئے سؤر کو ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچنے لگا، جسے دیکھ کر ایک سنتری اور آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اتنا موٹا تازہ گوشت ہاتھوں سے نکلتے دیکھ کر مالیکم سے نہ رہا گیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ولیم سے کہا، سر آپ کیا کرتے ہیں؟ یہ سؤر ہے، آپ اسے پھینک رہے ہیں۔ ہم اسے جیپ میں ڈال کر بنگلہ فاضلکا میں لے چلتے ہیں۔ وہاں مزے سے رات کٹے گی۔

ولیم نے بے پروائی سے اپنی جیپ کی طرف مڑتے ہوئے کہا، لیکن مجھے اس کا گوشت پسند نہیں۔

تو سر آپ نہ کھائیں ہم کھا لیں گے، مالیکم نے زور دیتے ہوئے کہا، پھر دلبیر سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے" دلبیر اِسے پچھلی جیپ میں رکھ دو۔

اس سے پہلے کہ دلبیر سنگھ اور معاون سنتری مالیکم کا حکم مانتے، ولیم نے ڈانٹ کر دلبیر کو حکم دیا، دلبیر سنگھ میں نے کہا ہے اِسے پھینکو اور آ کر جیپ میں بیٹھو (پھر مالیکم کی طرف منہ کر کے) مالیکم صاحب، میں جانتا ہوں، آپ لوگوں کو سؤر بہت پسند ہے لیکن آج تو بہر حال میں آپ کو یہ نہیں کھانے دوں گا۔ مجھے اس سے کراہت آتی ہے۔ جب اکیلے ہوں تو شوق سے کھائیے گا۔ آپ جلدی سے جیپ میں بیٹھیں، میں آپ کو بنگلہ میں جا کر اپنی طرف سے بھیڑ کا گوشت کھلاؤں گا۔ فی الحال جلدی کریں، ہمیں بہت سے کام نپٹانے ہیں۔ ولیم کے اس دوٹوک فیصلے پر مالیکم کو

تھوڑی سی کوفت ضرور ہوئی مگر وہ پھر ہلکا سا مسکرا کر جیپ میں ولیم کے پہلو میں آ بیٹھا اور دلبیر سنگھ نے جیپ دوبارہ گیئر میں ڈال کر اُسے سرپٹ دوڑانا شروع کر دیا۔

ولیم نہایت سنجیدگی سے بیٹھا ہوا ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف منصوبوں پر غور بھی کر رہا تھا۔ ولیم کی اس قسم کی سنجیدگی کی وجہ سے مالیکم، جوزف اور ڈیوڈ نے اپنا رویہ نہایت محتاط کر لیا۔ جیپیں چک پکھی کو کراس کر گئیں اور اب اُن کا رُخ فاضلکا میلوٹ روڈ کی طرف تھا۔ مالیکم اب کی بار زیادہ گفتگو کرنے کی بجائے صرف مختلف جگہوں کے نام بتاتا گیا۔ چک پکھی سے آگے کی ڈھاریاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آنے لگیں اور ولیم کو یہ دیکھ کر کچھ حوصلہ بھی ہوا کہ یہاں کے علاقے کافی حد تک سرسبز تھے۔ آتے جاتے راہگیر جو زیادہ تر گدھوں اور گڈوں پر چارہ اور غلہ وغیرہ لادے چل رہے تھے، اُن کی حالت بھی کچھ بہتر تھی۔ سامی والا سے بناں والی اور وہاں سے عامی والا کو پیچھے چھوڑتی ہوئی جیپیں جیسے ہی شیخ سبحان میں داخل ہوئیں تو ولیم کو گاؤں کے مغربی کونے پر باغ کے کنارے بہت سے لوگوں کا مجمع نظر آیا۔ ولیم نے دلبیر سنگھ کو حکم دیا، دلبیر یہاں جیپ کو روک دو۔

اس گاؤں کا منظر ولیم کو انتہائی دلکش لگا۔ گاؤں بہت ہی چھوٹا تھا مگر سرسبز فصلوں اور درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ دلبیر سنگھ نے جیسے ہی باغ کے پاس جا کر جیپ روکی، لوگوں کی توجہ فوراً جیپوں کی طرف ہو گئی۔ وہ سب حیرت سے انھیں دیکھنے لگے۔ ولیم کے ساتھ دوسرا تمام عملہ بھی جیپوں سے اُتر کر مجمعے کی طرف بڑھنے لگا۔ پولیس اور انگریزی اور دیسی افسروں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر لوگ گھبرا گئے۔ وہ ڈر کر تتر بتر ہونے لگے اور بھاگ بھاگ کر چھپنے کا بندوبست کرنے لگے۔ کچھ بھاگ کر باغ میں چلے گئے۔ باغ امرود اور مالٹے کے ملے جلے پودوں سے نہایت ہرا بھرا اور پھلوں سے لدا پھندا بہاریں دے رہا تھا۔ ساتھ ہی دو رہٹ چل رہے تھے جنھیں بیلوں کی جوڑیاں چلا رہی تھیں۔ بیلوں کے مسلسل دائرے میں گھومنے سے کاریز کی ٹینڈیں کنویں سے صاف اور شفاف پانی بھر بھر کر نالیوں میں انڈیلتی جاتیں، پھر یہ پانی چنے اور گندم کی فصلوں کے درمیان سے ہوتا ہوا باغ کی کیاریوں میں بچھا جاتا۔ ولیم یہ سارا منظر دیکھ کر ایک دفعہ تو پچھلی تمام کوفتیں بھول گیا۔ اُسے فروری کے سرد دنوں میں مشرقی پنجاب میں ایسی کسی جگہ کا تصور بھی نہیں تھا۔ وہ اس سارے منظر کو دیکھتا ہوا جب بھاگے ہوئے مجمعے میں سے اُن چند لوگوں کے قریب آیا جو یا تو بھاگنے سے معذور تھے یا اُنھیں کسی قسم کا ڈر نہیں تھا، تو اُس پر کھلا کہ دراصل کچھ لوگ بانک اور پلتھا کھیلنے میں مصروف تھے۔ باقی سب لوگ اُن کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ مجمعے میں زیادہ تر سکھ اور مسلمان شامل تھے۔ ولیم کو دیکھ کر

پلتھا بازوں نے کھیل روک دیا۔ انھیں ڈر ہوا شاید انگریز صاحب بہادر کو اُن کا یہ کھیل حکومت کے خلاف ایک سازش لگا ہے اور وہ یہاں چھاپا مارنے آیا ہے۔ انہوں نے جلدی سے اپنی ڈانگیں اور گتکے چھپا دیے تھے۔ اُنھیں اس قدر گھبرایا دیکھ کر ولیم نے بیر داس سے کہا، بیر داس انھیں مطمئن کرو کہ ہم ان کا کھیل دیکھنے کے لیے رُکے ہیں۔ وہ اپنا کھیل جاری رکھیں، ہم انھیں انعام دیں گے۔

ولیم کا حکم پا کر بیر داس نے ایک سکھ سنتری کو اشارہ کیا۔ سنتری اشارہ پاتے ہی آگے بڑھا اور پکار کر بولا، بھائیو، صاحب سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ صاحب آپ کا کھیل دیکھنے کے لیے یہاں رُکے ہیں۔ ہم بنگلہ فاضل کا جا رہے ہیں۔ تمھارے بانک اور پلتھا بازی کا کھیل دیکھنے اور کچھ دیر آرام کرنے کے لیے یہاں ٹھہریں گے، تم اپنا کھیل جاری رکھو۔ صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ جو بھی اچھے کھیل کا نظارا دے گا، صاحب اُسے اپنے ہاتھ سے انعام بھی دیں گے۔

سنتری کا اعلان سُن کر لوگوں اور پلتھا بازوں کی ڈھارس بندھی۔ وہ دوبارہ اکٹھا ہونے لگے۔ اس کے بعد دلبیر سنگھ نے کہا، مترو اپنے گھروں سے صاحب کے بیٹھنے کے لیے دو چار منجیاں لاؤ۔

کچھ ہی دیر میں ولیم اور دیگر عملہ چار پائیوں پر آرام سے بیٹھ گیا۔ بھاگتے ہوئے لوگ بھی واپس لوٹ آئے اور کھیل دوبارہ شروع ہو گیا۔ دو دو سکھ اور مسلمان پلتھے باز جوان میدان میں آکر اپنی پُھرتیاں دکھانے لگے۔ گتکوں اور ڈنڈوں کے کھڑاک، ٹھکا ٹھک ہونے لگے۔ دوسری طرف دلبیر سنگھ اور دوسرے سنتری کافی اور کھانے کا سامان جیبوں سے نکال کر ولیم اور افسروں کے لیے تیار کرنے لگے۔ پلتھے بازی کے اس کھیل میں ڈنڈوں کی کھڑاک اور اُن کے تیزی سے گھوم کر ایک دوسرے پر پینترے بدل بدل کر وار کرنے سے ولیم محظوظ ہونے کے ساتھ لرز بھی رہا تھا۔ کھیل انتہائی دلچسپ ہونے کے ساتھ خطرناک بھی تھا۔ ایک دوسرے پر لگائے جانے والے واروں کی کاریگری کے متعلق ولیم کسی قسم کا علم تو نہیں رکھتا تھا۔ البتہ سکھوں کے ایک دم واہگرو اور مسلمانوں کے یا علی مدد کے نعروں سے اُسے یہ پتہ ضرور چل رہا تھا کہ اس جوڑ میں دراصل کِس کا پلہ بھاری رہا۔ لوگوں کا شور شرابہ اور جوش و خروش اس قدر تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جب ایک جوڑ کا مقابلہ ختم ہوتا تو دوسرا شروع ہو جاتا۔ ہر جوڑ کو لڑنے کے لیے دس فٹ اونچی لکڑی کے دو انچ سایہ ڈھلنے کا وقت دیا جاتا، جس میں وہ اپنے گتکے عجب عجب انداز کے مطابق ٹانگوں اور بازوؤں اور بغلوں کے اوپر نیچے سے نکال نکال کر چلاتے۔ ہر جوڑ کا مقابلہ ختم ہونے پر دو سکھ سردار اور دو

مسلمان پلتھے کی سمجھ رکھنے والے اپنا فیصلہ کسی ایک کے حق میں سنا دیتے جس میں اختلاف بالکل پیدا نہ ہونے پاتا۔ ولیم، ڈیوڈ، جوزف، مالیکم یہ کھیل انتہائی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ لوگ جو بھاگ کر باغ یا گاؤں میں گھس گئے تھے اب وہ بھی پلٹ کر آچکے تھے۔ دلبیر سنگھ نے اسی دوران کھانا اور کافی وغیرہ ولیم اور دوسرے افسروں کے سامنے رکھ دیا۔ اُن کے لیے یہ ایک عمدہ پکنک بن گئی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک یہ کھیل جاری رہا۔ جس میں آٹھ جوڑوں کے مقابلے ہوئے۔ ان میں ایک مقابلہ برابر اور باقی سات میں چار سکھ جوان اور تین مسلمان جوانوں نے جیتے۔ کھیل کے اختتام پر ولیم نے اعلان کیا کہ وہ اس میں شریک تمام جوانوں کو ابھی نقد انعام دینا چاہتا ہے۔ جیتنے والے کو دس روپے اور ہارنے والے کو پانچ روپے اور جو برابر رہے اُنھیں بھی دس دس روپے۔ ولیم کے اس اعلان پر تمام لوگوں نے نعرے اور تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ ہر طرف واہگرو اور یا علی مدد کا شور بلند ہونے لگا۔ ولیم حیران تھا کہ یہ دونوں شخص کون ہیں۔ انعام خود اُس نے دیا ہے۔ کھیل میں مختلف ناموں والے حصے لے رہے تھے اور نعرے یا تو واہگرو کے لگ رہے ہیں یا پھر علی مدد کے۔ حالاں کہ یہ دونوں یہاں موجود نہیں۔ واہگرو کے بارے میں تو اُسے کچھ معلومات تھیں لیکن یا علی سے آشنائی پہلی بار ہو رہی تھی۔ بہر حال کسی سے پوچھے بغیر ہی ولیم نے خیال کیا کہ یہ بزرگ بھی واہگرو کے مقابلے کا کوئی جواں مرد ہوگا۔ ولیم نے انعام دینا شروع کیا تو اُس کے نقش قدم پر جوزف، ڈیوڈ، براہم اور مالیکم نے بھی اپنی لاج رکھنے کے لیے جیتنے والوں کو اپنی طرف سے پانچ پانچ روپے دینے کا اعلان کر دیا۔ جس کی وجہ سے ایک دفعہ پھر بھرپور نعرہ بازی ہوئی۔ اب ایک دو نعرے انگریز سرکار زندہ باد کے بھی لگا دیے گئے۔ جن کو سُن کر ولیم اور انگریز افسروں کو ایک گُونہ مسرت ہوئی مگر اپنے انگریزی وقار کے پیش نظر اُس کا اظہار نہ کرنا ہی بہتر خیال کیا۔

ساڑھے چار بج چکے تھے اور بنگلہ فاضل کا کافی دور تھا۔ اس لیے یہ صلاح ٹھہری کہ آگے کا سفر مختصر کر کے جلدی سے "بنگلہ فاضل کا" پہنچا جائے۔ لہٰذا بستی شیخ سجان ہی سے دلبیر سنگھ نے جیپ کو دائیں ہاتھ موڑ کر اُس کا رُخ سیدھا بنگلے کی طرف کر دیا۔ جس کا مطلب تھا کہ روہی کے علاقے کا دورہ کل پر ملتوی کر دیا گیا ہے، جو بستی شیخ سجان سے جنوب میں ریاست بہاول نگر تک اور مغرب میں راجستھان کے ساتھ جا کر ملا ہوا تھا۔ اب شام ہونے میں کچھ ہی دیر تھی اور امید تھی کہ چھ بجے تک وہ بنگلہ پہنچ جائیں گے۔ جہاں ریسٹ ہاؤس میں دن کی تھکن دور کر کے اگلے دن ہیڈ اور نہر کے معاملات کا جائزہ لیا جائے گا۔ اُس کے بعد اگلا فیصلہ کیا جائے گا کہ دورہ مختصر کرنا ہے یا علاقے میں

مزید حالات کو دیکھنے کے لیے سیر کرنے کی ضرورت ہے۔البتہ ولیم کے خیال میں کسی علاقے کا دورہ اُس علاقے کی مشکلات پر قابو پانے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔

جاری ہے

قسط نمبر 12

(23)

ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کے بعد غلام حیدر اگر بہت زیادہ مطمئن نہیں تھا تو غیر مطمئن بھی نہیں تھا۔ کیونکہ پچھلے تین دن سے اُسے ایک تو اپنے سکول کے دوست کے ساتھ رہنے کا موقع مل گیا۔ جسے وہ پچھلے دو سال سے نہیں ملا تھا۔ یہ رفاقت اُسے گزری رُتوں میں لے گئی اور وہ دونوں بچپن کے دنوں کو دہراتے رہے۔ اگرچہ ابھی جوان تھے مگر بچپن کی یاد کچھ اپنا ہی مزار رکھتی ہے۔ نجم سے ملنے کے سبب غلام حیدر کے دل سے بار کچھ ہلکا ہو گیا اور وہ ایک بڑے سردار کی ذمہ داری سے کچھ وقت کے لیے کٹ گیا۔ دوسرا شیخ مبارک حسین کی صحبت نے اُسے باپ کی شفقت کا سا کام دیا۔ شیخ مبارک نے سمجھایا کہ جلدی کرنے کی ضرورت نہیں۔ عقل اور سمجھداری سے کام لو، رعایا کو سنبھالنا تمہاری ذمہ داری ہے لیکن اس طرح نہیں کہ عین انہی کی خواہش کو تکمیل تک پہنچاؤ۔ اپنے حساب سے کام کرو۔ رعایا تو چاہتی ہے، نتیجہ ایک دم نکل کے سامنے آ جائے اور دشمن سے فوراً بھڑ جاؤ۔ تو کیا تم اُن کی خواہش کو پورا کرنے پر قادر ہو گے؟ تم یا تمہاری رعایا جو کچھ بھی کرو گے، اُس کی ذمہ داری کا بوجھ صرف تمھی اُٹھاؤ گے۔ جو نتیجہ نکلا اُس کے مفید ثمرات میں تو رعایا تمھاری شریک ہو گی لیکن اُن کی کڑواہٹ صرف تمھارے حصے میں آئے گی۔ اس لیے خود کو سنبھالو اور رعایا کے ہاتھوں میں کھلونا مت بنو۔ کیونکہ آج تم اپنی رعایا کی ایک بات مانو گے تو کل وہ دوسری کی خواہش کر دیں گے۔ وہ تمھیں یہ تک ثابت کر دیں گے کہ تم وائسرائے سے زیادہ طاقت ور ہو۔ تو کیا تم اُسی سمجھ بوجھ سے کام لو گے؟ بیٹا میری ایک صلاح ہے، اُسے پلّے سے باندھ لو۔ انگریزی قانون ایک بم ہے۔ اسے جس گدھے نے دولتی ماری، اُس کے پرخچے اُڑ گئے۔ تم نہیں جانتے مگر میرا تجربہ بتاتا ہے کہ انگریز اپنے قانون میں کسی کی مداخلت جائز سمجھ لیتا تو ہندوستان میں ایک لمحے کے لیے راج نہ کر سکتا۔ سردار سودھا سنگھ تو دو ٹکے کا نہیں۔ یہاں نوابوں کی نہیں چلتی۔ غلام حیدر بات ابھی تک تمھارے ہاتھ میں ہے۔ سودھا سنگھ پر قتل اور ڈکیتی کا پرچہ کٹ چکا ہے۔ اُسے نہیں پتا کہ اُس پر کتنا بڑا وزن گر گیا ہے۔ دیکھ لینا، دو چار دن میں جب اُس پر راستے تنگ ہو جائیں گے تو بلبلا اُٹھے گا اور گردن بچاتا پھرے گا۔ تم ابھی حوصلہ رکھو۔ آخر وہ اس قتل کو کس کھاتے میں ڈالیں گے؟ حکومت کو اس کا کُھرا تو نکالنا ہے۔ اب تم آرام سے جلال آباد میں جا کر حالات کا جائزہ لو اور رعایا کو کسی بھی طریقے سے لگام میں رکھو۔ میرا خیال ہے، جلد معاملہ آگے بڑھے گا۔ ریل میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنے ڈرائیور ہاشم کو کہتا

ہوں، وہ تمھیں جلال آباد چھوڑ آتا ہے۔ جیپ دو گھنٹے میں پہنچ جائے گی، باقی اگر کچھ مسئلہ پیدا ہوا تو میں حاضر ہوں لیکن اُس وقت تک، جب تک تم قانون کے دائرے میں ہو۔ اگر تم نے خود اپنے فیصلے قانون کے متوازی شروع کر دیے تو بیٹا میرے لیے مشکل ہو جائے گی۔ میں ایک کاروباری آدمی ہوں، زیادہ مسائل میں میرا دماغ نہیں چلتا۔ تم مجھے نجم علی کی طرح ہو اس لیے میں نہیں چاہتا، تمھارا کچھ نقصان ہو۔

غلام حیدر کے دل پر شیخ مبارک کی باتوں کا کافی اثر ہوا۔ اُس نے فیصلہ کیا، واقعی اُسے جلدی نہیں دکھانی چاہیے۔ اس کے علاوہ غلام حیدر کے دل میں ایک اور بات بھی تھی کہ اُسے نواب افتخار کو ایک دفعہ ضرور تار دینی چاہیے لیکن فی الحال آرام سے شیخ مبارک کے مشورے کے مطابق چار چھ دن اور انتظار کر لینے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ ویسے بھی اُسے یہ اطلاع تو مل چکی تھی کہ ولیم اپنی طرف سے معاملے کو سنجیدہ لے کر تفتیش کر رہا ہے۔ بلکہ پہلی دفعہ کسی انگریز نے خود جا کر گاؤں میں پوچھ گچھ کی تھی۔ غلام حیدر نے سوچا، ہو سکتا ہے ڈپٹی کمشنر ٹھیک کہتا ہو کہ ولیم میری طرف داری میں ہے اور مجھے کسی وجہ سے ولیم کے ساتھ پہلی ملاقات میں غلط فہمی ہوئی۔ بہر حال اب اُسے جلد از جلد جلال آباد پہنچنا چاہیے کہ اس حالت میں اتنے دن باہر رہنا زیادہ ٹھیک نہیں تھا۔ ویسے بھی اُس نے جو کچھ کرنا تھا اُس حد تک تو کر لیا تھا۔

ٹھیک بارہ بجے وہ شیخ مبارک کی جیپ میں بیٹھ چکا تھا۔ ہاشم علی نے دو اور دوست بھی اپنے ساتھ لے لیے کہ رستے میں کوئی مسئلہ بھی پیش آ سکتا تھا، پھر اکیلا آدمی بہت خجل ہوتا ہے۔

نجم علی نے نہایت تپاک سے غلام حیدر کو رخصت کیا۔ جیپ کی گراری کا رسہ کھینچا گیا۔ اُس کے شور سے بازار میں چلنے والے ایک تانگے کا گھوڑا بدک گیا۔ بارہ بجے جیپ فیروز پور سے نکل پڑی۔ غلام حیدر اپنی رائفل بائیں کاندھے پر لٹکا کر ہاشم علی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ پف لگی پگڑی، جو چار دن سے اتار کر رکھی ہوئی تھی، وہ بھی سر پر رکھ لی۔

اب اُسے اپنے علاقے میں ایک بڑے چوہدری کی حیثیت سے ہی داخل ہونا تھا۔ غلام حیدر سر پر پگڑی باندھے، بائیں کاندھے پر رائفل رکھے، ہاشم علی ڈرائیور کے دائیں پہلو میں بیٹھا، رعب داب کی ایک نئی تصویر پیش کر رہا تھا۔ غلام حیدر کو اسلحہ لے کر اور پگڑی باندھ کر جیپ میں بیٹھنا اچھا لگا۔ اُس نے دل ہی دل میں خیال کیا، اب اُسے بھی اپنی ایک جیپ خرید لینی چاہیے۔ جیپ کی سواری ایک تو تیز ہے، دوسرا اس دور میں بگھی کی نسبت رعب بھی ذرا زیادہ ہے۔ غلام حیدر کے پیچھے بیٹھے ہوئے ہاشم علی کے دوست مسلسل باتیں کرتے جا رہے تھے۔ جس کی وجہ سے غلام حیدر

بار بار اپنے خیالات سے باہر نکل آتا۔ بالآخر اُس نے سیٹ کے ساتھ سر ٹکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ ہی دیر بعد جیپ کے جھولوں میں نیند کے جھولاٹے اُسے اپنی پناہ میں لے گئے۔ پھر جو آنکھ کھلی تو وہ جلال آباد میں تھا۔

جیپ حویلی کے دروازے پر پہنچی تو ایک اور ہی سماں تھا۔ سینکڑوں لوگ حویلی کے باہر کھڑے تھے۔ غلام حیدر جیپ سے نیچے اُتر کر آگے بڑھا تو سب اُس کے گرد جلد بھاگ کر اکٹھے ہونے لگے۔ وہ حیران تھا کہ آخر انھیں کیا ہو گیا ہے۔ اِن کو میری ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کی خبر لینے کی ایسی کیا جلدی ہے مگر ساتھ ہی تمام لوگوں کے چہروں پر تفکرات کی جُھریاں دیکھ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اُس کے دل میں خدشات کے جھکڑ چلنے شروع ہو گئے۔ حویلی میں داخل ہوا تو وہاں اور بھی بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ لوگ غلام حیدر کو دیکھ کر فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ خدا بخش نے آگے بڑھ کر غلام حیدر کے پہلو میں چلتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر پھر چپ ہو گیا۔ اتنے میں وہ ایک بڑے موڑھے پر بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی پوچھا، چاچا بخشے چاچا رفیق کدھر ہے، نظر نہیں آ رہا اور دوسرے بھی دکھائی نہیں دے رہے؟

خدا بخش فوراً اپنی سفید داڑھی کو مٹھی سے آزاد کرتے ہوئے بولا، سردار غلام حیدر وہ تو اسٹیشن پر تمھیں لینے کے لیے پہنچا ہے۔ اُسے کیا پتا تھا تم جیپ پر آ جاؤ گے۔

غلام حیدر نے اپنی خالص اُون کی سرمئی چادر اُتار کر ساتھ کے خالی موڑھے پر رکھی اور کہا، خدا بخش فوراً بندہ بھیج کر اُنھیں واپس بلا لو اور یہ اتنے لوگ یہاں کس لیے اکٹھے ہوئے ہیں اور سب کے چہرے کیوں مرجھائے ہوئے ہیں؟ اس کے ساتھ ہی غلام حیدر کی نظر غلام رسول پر پڑ گئی۔

غلام رسول پچاس کے پیٹے میں ادھیڑ عمر کا مگر منجھا ہوا شخص تھا۔ ہلکی سفید داڑھی جس میں کچھ بال ابھی تک سیاہ تھے۔ چہرے کی ہڈیاں چوڑی اور کُھلے کُھلے ہڈ کاٹھ۔ چرخے پر کاتے گئے دھاگے سے بُنا ہوا کھدر کا کھیس کاندھے پر تھا۔ جس کا ایک پلّو اُس نے دائیں بغل سے نکال کر بائیں کاندھے پر ڈال لیا تھا۔ اس طرح کھیس کاندھے پر رکھنے کا رواج پنجاب کے اکثر بڈھوں میں تھا۔ کھیس کے دونوں کنارے لال رنگ کے سوتی دھاگے سے بُنے ہوئے تھے۔ جو دیکھنے والے کی آنکھوں کو بھلے لگتے۔ پاؤں میں دیسی طرز کے جوتے بظاہر سادہ لیکن مضبوط چمڑے کے تھے اور گاؤں کے ہی موچی سے بنوائے ہوئے تھے۔ غلام رسول شاہ پور گاؤں میں شیر حیدر کا ہیڈ مُنشی تھا۔ جو شاہ پور کی زمینوں کا حساب کتاب رکھتا۔ اس کے ساتھ ہی رعایا کے معاملات کی خبر گیری کا کام بھی اس کے ذمے تھا۔ شاہ پور کے لوگوں کے

چھوٹے موٹے جھگڑے چُکا دینا بھی اُس کے دائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ نہایت ایماندار اور بھلا آدمی تھا اور شاہ پور میں بھی اُس سے کسی کو کچھ شکایت یا گلہ کم ہی پیدا ہوا تھا۔ پچھلے تیس سال سے شیر حیدر کا اہم ملازم تھا۔

غلام حیدر نے غلام رسول کو اچانک دیکھا تو مضطرب سا ہو گیا اور غلام رسول کی طرف منہ کر کے پوچھا، چاچا غلام رسول تم شاہ پور سے کب یہاں پہنچے؟

غلام رسول کا جواب سننے سے پہلے ہی غلام حیدر نے پہلی دفعہ لوگوں پر غور سے نظر ڈالی۔ اُسے اور بھی کئی چہرے شاہ پور کے نظر آئے۔ غلام حیدر کا دل دھڑکنے لگا، اُس نے سوچا، کوئی بات ہو گئی۔ اتنے میں غلام رسول بولنے لگا، اُس کا ایک ہاتھ حقّے کی نَے پر ہی رہا۔

چوہدری غلام حیدر، "غلام رسول نے نہایت کرب کے ساتھ بولنا شروع کیا" ہم آج گیارہ بجے جلال آباد پہنچے ہیں۔ اس دوران تمام لوگ بالکل ساکت و صامت بیٹھے اور کھڑے غلام رسول کی بات سننے کے لیے تیار تھے۔

غلام رسول نے اب ہمت کر کے بات سنانا شروع کی "غلام حیدر خیر ہی تو نہیں ہے۔ شاہ پور پر رات قیامت ٹوٹ گئی، دشمنوں نے حملہ کر دیا ہے، شاہ پور کا باڑہ اُجڑ گیا، پورے پچاس بندوں نے حملہ کیا اور آدھی رات اچانک باڑے میں برچھیوں اور چھوّیوں کا مینہ برسنے لگا۔ خدا جانے ویریوں میں اتنا کرودھ کس لیے آ گیا؟

غلام حیدر ہکا بکا ہو کر غلام رسول کی باتیں سُننے لگا۔ اچانک اُس نے محسوس کیا کہ اتنے بھرے مجمعے میں اُسے کچھ نہیں پوچھنا چاہیے۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے غلام رسول کو چپ کرا دیا۔ پھر خدا بخش سے کہا، خدا بخش تم ایسا کرو جلدی سے شیخ صاحب کے بندوں کے لیے کھانے کا بندوبست کرو، اور رفیق کو اسٹیشن سے بلانے کے لیے کوئی بندہ بھیجو۔

خدا بخش نے ہولے سے کہا، فیقے کی طرف تو حبیب کو بھیج دیا ہے چوہدری صاحب۔

اتنا کہہ کر خدا بخش وہاں سے اُٹھ کر حویلی کے زنانہ حصے کی طرف چل دیا۔

خدا بخش اور اُس کی بیوی جوانی کے دنوں سے ہی شیر حیدر کے ملازم ہو گئے تھے۔ گھر کے اندر خدا بخش کی بیوی فاتاں کے پاس باورچی خانہ اور نجی قسم کے چھوٹے چھوٹے معاملات کا بندوبست تھا۔ جبکہ باہر کی میزبانی کا بار خدا بخش کے ہاتھ میں تھا۔ اولاد کوئی نہیں تھی اور دونوں کی عمریں سڑسٹھ سال کے لگ بھگ ہو چکی تھیں۔ میاں بیوی حویلی کے وفادار ملازموں میں سے تھے۔ غلام حیدر کی ماں اور پورا خاندان ان پر بھروسا کرتے تھے۔ غلام حیدر کے ملازموں میں

بھی ہر دلعزیز ہونے کی وجہ سے نوکروں کی چھوٹی موٹی شکایات کو اُوپر ہی اُوپر نپٹا دیتے اور اُن کی رشتے داریوں میں بھی پوری طرح دخیل تھے۔ غلام حیدر نے خدا بخش سے فارغ ہو کر غلام رسول اور اُس کے ساتھ آئے ہوئے بندوں کو ڈیوڑھی کے ایک کمرے میں اُس کے پیچھے آنے کو کہا۔ وہ اُٹھ کر اُس کے پیچھے چل دیے، باقی سب وہیں بیٹھے رہ گئے۔

غلام حیدر کو پتا تھا کہ غلام رسول سب لوگوں کو کہانی پہلے ہی بتا چکا ہے اور یہ بات کوئی راز نہیں رہ گئی پھر بھی کچھ ایسی بات ہوتی ہے جس کا سب کے سامنے وضاحت کر کے اور کھُول کر بیان کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ قصہ اِن سب کے سامنے نہ ہی دہرایا جائے تو اچھا ہے۔ ڈیوڑھی کے کمرے میں داخل ہو کر غلام حیدر نے وہاں پڑی ہوئی چارپائیوں پر اُن سے بیٹھنے کو کہا اور خود بھی ایک چارپائی پر بیٹھ کر بولا، غلام رسول اب سارا قصہ سناؤ۔

غلام رسول نے بات دوبارہ شروع کر دی، اس دوران دوسرے تمام لوگ خاموش بیٹھے سنتے رہے۔

چوہدری غلام حیدر "غلام رسول بولا" یہ آج رات دس بجے کی بات ہے۔ آپ کو تو پتا ہے، پچھلے دس سال سے سارے شاہ پور کا مال مویشی اُسی باڑے میں اکٹھا بندھتا ہے جو شیر حیدر نے بنوا کر دیا تھا۔ اُس باڑے کی پہرے داری روزانہ دس بندے کرتے ہیں۔ جب سے سودھا سنگھ نے جودھا پور پر حملہ کیا، ہم نے یہ پہرہ اور بھی سخت کر دیا تھا بلکہ تیری ہدایت کے مطابق ڈانگ سوٹے کی پوری تیاری بھی وہاں کر کے رکھی ہوئی تھی۔ مگر پتا نہیں تھا کہ دشمن اتنی جلدی ایسی بے شرمی کی چال کھیلے گا۔ یہ آج رات دس بجے کی بات ہے، باڑے میں سارے بندے جاگ رہے تھے اور نذیر بھیکو قصہ شاہ داؤد سنا رہا تھا۔ ہم سوکھا گوہا اکٹھا کر کے آگ جلا کر سارے اُس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ دُھند کچھ زیادہ نہیں تھی اور تارے چمک رہے تھے اتنے میں ہمیں کچھ لوگوں کے قدموں کی آواز سنائی دی، ہشیار تو ہم پہلے ہی سے تھے۔ میں نے فوراً اُٹھ کر حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی، کیا دیکھتا ہوں کچھ لوگ گھوڑوں پر اور بہت سے پیدل، باڑے کے چاروں طرف بندے ہی بندے سر نکالے کھڑے تھے۔ میں فوراً پیچھے ہٹا اور بیلیوں کو کہا کہ تکڑے ہو جاؤ دشمن چڑھ آئے ہیں۔ ہم نے بھی فٹافٹ اٹھ کر اپنی ڈانگیں اور چھَویاں کَس کے دشمن کو للکار دیا اور دھویں کی آگ پر راکھ ڈال کر اُسے بجھا دیا۔

چوہدری صاحب باڑے کی دیوار دو ہاتھ سے زیادہ نہیں۔ منٹوں میں سارے بندے چھلانگیں مار کر اندر آ گئے۔ اللہ مولا جانتا ہے، پورا پچاس بندہ تھا۔ پَر میں نے شادھے خاں کو کہا، بھائی شادھے آج علی کا نام لے کر پلٹھے کے کرتب

دکھا دے۔ بس پھر آدھے بندے شادھے خاں کی پشت پر تھے اور آدھے خان دلاور کی چوکی میں کر دیے۔ اس کے بعد بغلوں کے وار چلنے لگے۔ پھٹیت میں تو میرا وار بھی ہلکا نہیں تھا۔ پَر رات شمّے کے دیگی لوہے والی برچھی نہ پورا بھرم رکھا۔ لو جی چودھری صاحب، پچاس بندوں نے ہمیں گھیر لیا، باقی مال کھولنے میں لگ گئے۔ ادھر میں نے للکارا مارا تاکہ جو گاؤں میں سو رہے ہیں وہ بھی آجائیں۔ ہم نے کہا مرنا تو ایک دن ہے ہی۔ کیوں نہ آج مردوں کی طرح جان دے دیں۔ چوہدری جی لوہے پر لوہا ایسے گرتا تھا جیسے فرنگی توپیں چلتی ہیں۔ یہ مندرے (پاس بیٹھے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس نے نوک دار مونچھوں کو وٹ دے کر اوپر کی طرف موڑی تھیں اور آنکھیں انگارے کی طرح سرخ تھی) نے بھی کمال کر دیا۔ ہم صرف دس بندے تھے اور دشمن کی تعداد ہم سے سات گُنا زیادہ تھی۔

جس کی وجہ سے لڑائی کے شروع میں ہمارے دو بندے گر گئے لیکن اس کے بعد ہم نے باندر کلّے کی طرح دائرہ باندھ لیا تاکہ کنڈیں بچی رہیں اور کوئی پیچھے سے وار نہ کرے۔ چھوّیوں اور ڈانگوں کا اتنا کھڑکا تھا، جس کی آواز فوراً ہی گاؤں والوں نے بھی سُن لی اور تھوڑے ہی وقت میں وہ بھی ڈانگیں پکڑے آ گئے۔ دشمنوں کو اتنی امید نہیں تھی کہ ہم اس طرح اُن کا مقابلہ کریں گے۔ جب انھوں نے گاؤں والوں کی للکاریں سنیں تو اُن کے جی چھوٹ گئے اور انھوں نے بھاگنے کا ارادہ کر لیا۔ اس وقت مَیں نے شادھے کو کہا، شادھے خاں یہی وقت ہے اِن کے بندے گرانے کا۔ عین اُسی وقت میرا سامنا بِلّے کمبوہ سے ہو گیا۔ اُس کا مڑاسا گر گیا تھا۔ تب میری آنکھیں کھُلیں۔ میں نے کہا رسُولے یہ کیا ہو گیا؟ یہ تو عبدل گجر کا خاص بندہ ہے۔ اتنے میں گاؤں والے سارے باڑے میں داخل ہو چکے تھے۔ بِلّا شاید بھاگ ہی جاتا مگر نذیرے بھیکو نے آگے سے رستہ روک لیا اور ایک برچھی کا الٹا ہاتھ بِلّے کے سر پر مارا۔ سَر تو اُس نے ایک طرف کر کے بچا لیا مگر برچھی دائیں موڈھے میں اُتر گئی اور بِلّا گر پڑا۔ اتنے میں شادھے نے دما سنگھ کو گرا لیا۔ اب میں نے ساری کہانی سمجھی۔ چوہدری غلام حیدر، ہم پر سودھا سنگھ اور عبدل گجر دونوں نے مل کر سٹ ماری کیونکہ دَما تو خاص سودھا سنگھ کا بندہ تھا۔ شادھیا کا وار دما سنگھ کی چوٹی پر سیدھا پڑا تو وہ نیچے بیٹھتا ہی چلا گیا۔ اُوپر سے میں نے دو وار کر کے اپنے لوہے کو گرم کیا۔ شادھا تو بِلے کو بھی مارنے لگا تھا پر میں نے کہا، فی الحال اِسے پکڑ لو۔ کوئی ثبوت تو پاس ہو۔ پھر یہ مسلمان بھی ہے۔ اس طرح ایک بندہ ہم نے مار دیا جو سودھا سنگھ کا تھا اور ایک بندہ زخمی پکڑ لیا ہے۔ اِس کے بعد غلام رسول نے سر نیچا کر کے کہا، لیکن چوہدری صاحب ہمارے تین بندے لطیف کمھار، دُلّا آرائیں

اور باہلی شیر گڑھیا بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں اور چار بندے پھٹڑ ہو گئے۔ ان بندوں کے علاوہ پندرہ بھینسیں بھی لے گئے۔ (آہ بھر کر) چوہدری، زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر مرنے والے تینوں ہی بڑی بے جگری سے لڑے ہیں۔

اُس وقت ذرا اندھیرا تھا اور وہ دونوں شادھے کی ٹولی میں تھے۔ مجھے تو بعد میں پتا چلا کہ سودھا سنگھ کے اور بھی بندے شامل تھے۔ نیک علی نے مجھے بتایا ہے۔ لطیف پر جس نے وار کیا وہ متھا سنگھ تھا اور شادھے نے رنگا کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ باقی تو کئی بندے پچھانے گئے جو عبدل گجر کے تھے۔ لڑائی کے دوران ہم مال مویشی پر توجہ نہیں دے سکے اس لیے جب تک لڑائی ختم ہوئی وہ بہت دور لے کر نکل چکے تھے۔ جب مجھے تھوڑا سا ہوش ملا تو میں نے کہا کہ جلدی سے لاھد کراؤ، یوں ہمارے دس پندرہ بندے اُن کے پیچھے لاھد کرتے ہوئے بھاگے۔ اس میں اتنا ہوا کہ وہ آدھا مال چھوڑ کر بھاگ گئے کیونکہ لاھد ہونے کی وجہ سے وہ انھیں تیز ہنکا نہیں سکتے تھے۔ پھر بھی نقصان کافی زیادہ ہو گیا ہے۔ کم از کم پندرہ بھینسیں چلی گئیں ہیں۔ چوہدری صاحب یہ قصہ ہے، جو آپ کے شاہ پور میں ہوا۔ ہمارے تین بندوں کا نقصان تو ہو گیا ہے پر رب نے شرم رکھ لی۔ اس واقعے کے بعد مَیں تو اطلاع دینے کے لیے صبح ہی اِدھر آ گیا، باقی گاؤں والے سارے اُدھر ہی ہیں۔ زخمیوں کو ہلدی اور دودھ پلایا جا رہا ہے، پٹیاں باندھ دی گئی ہیں۔ اُن میں سے خدا کا شکر ہے کسی کی جان کو خطرہ نہیں۔ اب تک پولیس بھی آ گئی ہو گی۔ اب ہمارے پاس اُن کے دو بندے ایک سودھا سنگھ کا حقہ بردار اور دوسرا عبدل گجر کا بندہ بِلّا کمبوہ ثبوت کے طور پر ہیں۔ میں نے ساری کہانی چاچے فیقے کو آپ کے آنے سے پہلے ہی بتا دی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا، آپ فیروز پور ڈپٹی صاحب بہادر سے ملاقات کے لیے گئے ہوئے ہیں اور آج واپس آنا ہے۔space:

غلام رسول اپنی رَو میں کہانی سنا گیا جبکہ غلام حیدر کا سر چکرا رہا تھا۔ اُسے ہرگز یہ گمان نہیں تھا کہ کل کے خارش زدہ کتے اُس پر بھیڑیوں کی طرح پل پڑیں گے۔ سودھا سنگھ تو خیر پھر بھی ایک حیثیت کا مالک تھا مگر عبدل گجر کی یہ جرأت ہو گی، یہ اُسے اندازہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے بِل سے باہر نکل کر اتنا زبردست حملہ کیا تھا کہ سچ بات تو یہ ہے، غلام حیدر کے اوسان ٹھکانے پر نہیں رہے تھے اور اُسے غلام رسول کی بات سن کر کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ البتہ یہ حوصلہ ضرور ہوا کہ اس کے بندوں نے کسی بھی محاذ پر پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔ یہی بات غلام حیدر کی ہمت بندھانے

والی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ ڈیوڑھی سے باہر نکل آیا اور کہا، غلام رسول گھبراؤ ناں، دیکھ مَیں اب کیسے سودھا سنگھ اور عبدل گجر کی ایسی کی تیسی پھیرتا ہوں۔

اتنے میں رفیق پاولی بھی حویلی میں داخل ہو گیا۔ رفیق پاولی غلام حیدر کے ساتھ سلام لے کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیچھے باقی بندے بھی خموش کھڑے تھے۔

تھوڑی دیر خموش کھڑا رہنے کے بعد غلام حیدر نے رفیق کو مخاطب کر کے کہا، چاچا فیقے جلدی سے شاہ پور چلنے کی تیاری کرو۔ اتنا کہہ کر وہ حویلی کے زنانہ حصے کی طرف بڑھا اور اندر داخل ہو گیا۔ غلام حیدر گھر میں داخل ہوا تو اس کی ماں فاطمہ بانو دوڑ کر بیٹے کے گلے لگ گئی اور رونے لگی۔ غلام حیدر کچھ دیر کھڑا اماں کا رونا سنتا رہا۔ حویلی میں اس تازہ واقعے کی خبر سن کر بہت عورتیں اکٹھی ہو چکی تھیں۔ وہ بھی اُٹھ کر غلام حیدر کے گرد جمع ہو گئیں۔ غلام حیدر نے سب عورتوں سے کہا کہ آپ سب فی الحال اپنے گھروں کو چلی جاؤ۔ پھر وہ اپنی والدہ کو لے کر صحن کے ایک کونے میں بیٹھ گیا جہاں دھوپ کافی چمک رہی تھی۔ فاطمہ بانو نے چارپائی پر بیٹھتے ہی کہا، پتر حیدر میں تجھے خدا کا واسطہ دیتی ہوں تُو شہر واپس چلا جا اور لاہور والے گھر میں ہی رہ۔ دشمن اپنی آئی پر آیا ہوا ہے۔ دیکھ، تُو چار دن فیروز پور رہا اور میری جان سوئی پر اٹکی رہی۔ خدانہ خواستہ تیرے دشمنوں کو کچھ ہو گیا تو میں زندہ مر جاؤں گی۔ میرا تیرے بغیر اب کوئی سہارا نہیں۔

فاطمہ بانو کی اس قدر آہ زاری اور سیاپا سُن کر غلام حیدر بولا، لیکن اماں یہ بتا میں اتنی زمینوں اور اتنے لوگوں کو بے سہارا چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں؟ سودھا سنگھ اور عبدل گجر میری رعیت کی بوٹیاں نوچ کھائیں گے۔ تمھیں نہیں پتا، میرے باپ کی عزت اور مال داؤ پر لگا ہوا ہے؟

فاطمہ بانو نے غلام حیدر کا جواب سنا تو تڑپ کر بولی، پتر آگ لگے اِن زمینوں کو۔ ہمیں یہ نہیں چاہئیں، مجھے تو تیری جان عزیز ہے۔ تمھیں نہیں پتا، جتنی دیر تم حویلی سے باہر ہوتے ہو مَیں انگاروں پر بیٹھی ہوتی ہوں۔ (پھر نزدیک ہو کر اپنے پلُو سے غلام حیدر کی چادر پر پڑی گرد کو جھاڑتے ہوئے) دیکھ میرا پتر، یہ ساری زمین رعایا میں بانٹ یا اِس کو تھوڑے بہت ٹھیکے پر دے دے اور لاہور چلا چل۔ مَیں بھی ترے ساتھ وہیں چلی جاؤں گی۔ اب تو یہ حویلی مجھے کاٹ کھاتی ہے۔ زندہ رہیں گے تو عزت بھی آ جائے گی۔ رعیت کا اللہ وارث ہے، جس نے پیدا کیا ہے، وہ اِن کو رزق بھی دے گا اور اِن کی حفاظت بھی کرے گا۔

غلام حیدر نے دیکھا کہ اُس کی ماں بہت زیادہ ڈری اور سہمی ہوئی ہے اوراس کی سب سے بڑی وجہ یہ عورتیں ہیں، جو رتی بھر کو سیر کر کے دکھاتی ہیں۔ لیکن فی الحال اُس نے عورتوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا بلکہ اپنی ماں کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا، ٹھیک ہے اماں جیسے تُو چاہتی ہے ویسے ہی کریں گے۔ ہم بہت جلد لاہور چلے جائیں گے لیکن اِس وقت توجو مصیبت آئی ہے، کسی طرح اُس کا اُپا کریں۔ پھر دو چار دن میں سارا کچھ فیقے پاولی کو سونپ کر ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ بس تو حوصلہ رکھ۔ اتنا کہہ کر غلام حیدر جیسے ہی باہر نکلنے کے لیے اُٹھا، فاطمہ بانو نے غلام حیدر کا بازو پکڑ کر کہا، بیٹا ایک بات تو بتا؟ یہ وائسرائے کی بیٹی والا کیا قصہ ہے؟ کہیں یہ سب کچھ اِسی غصے میں سرکار ہی تو تیرے ساتھ نہیں کرار ہی؟ بیٹا مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ یہ ساری مصیبتیں اُسی کی وجہ سے آرہی ہیں۔ دیکھ پتر ہم کتنے ہی زمینوں والے کیوں نہ ہوں، حکومتوں سے مقابلے نہیں ہوتے۔

غلام حیدر اپنی ماں کی یہ بات سن کر حیران رہ گیا۔ وہ ہکا بکا ماں کو دیکھنے لگا۔ کون سا وائسرائے اور کہاں کی بیٹی؟ غلام حیدر کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا یہ کیا معاملہ ہے اور یہ کون سا نیا قصہ کھل گیا ہے؟ اُس نے حیران ہو کر پوچھا، اماں یہ کیا بجھارتیں کہتی ہو؟ سیدھی بات کرو۔

لو بیٹا، اب ماں سے چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں، فاطمہ بانو نے غلام حیدر کے منہ پر پیار سے ایک چپت مارتے ہوئے کہا، دیکھ بیٹا میں ایک سے ایک اچھا رشتہ تیرے لیے ڈھونڈ نکالوں گی۔ تُو بس فرنگی کی بیٹی کا پیچھا چھوڑ دے۔ مجھے تیری زندگی چاہیے ورنہ یہ فرنگی تیرے پیچھے پتا نہیں اور کتنے کُتے لگائے گا۔

غلام حیدر نے جھنجھلا کر کہا، مگر اماں کون سی فرنگی کی بیٹی؟ مجھے تو کچھ خبر بھی نہیں، یہ کیا اشقلے چھوڑ رہی ہو؟ تو کیا یہ ساری عورتیں جھوٹ کہتی ہیں کہ تیرے ساتھ وائسرائے کی بیٹی کے تعلق ہیں؟ اور وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف تیرے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔

غلام حیدر نے غصے سے اٹھتے ہوئے کہا، لاحول لا قوۃ، اماں یہ کیا بکواس اور جھوٹ ہے۔ میں نے تو آج تک اُسے دیکھا بھی نہیں (عورتوں کی طرف دیکھتے ہوئے جو دور بیٹھی ماں بیٹے کی گفتگو تو خیر نہیں سن سکتی تھیں مگر دیکھ رہی تھیں) اماں سارے فساد کی جڑ یہ پھپا کُٹنیاں ہیں۔ تُو ان کی باتوں پر دھیان نہ دیا کر۔ اتنا کہہ کر غلام حیدر اٹھ کھڑا ہوا اور چلنے سے پہلے کہا، اماں دیکھ میں شاہ پور جارہا ہوں۔ آج رات شاید واپس نہ آسکوں اس لیے بجائے رونے پیٹنے کے میرے لیے دعا کر۔

بیٹا، کیا یہ نہیں ہو سکتا، تو شاہ پور رفیقے کو بھیج دے اور خود نہ جا۔

یہ جملہ فاطمہ بانو نے ایسی ملتجیانہ نظروں سے دیکھ کر کہا کہ غلام حیدر کا دل بھر آیا۔ اس نے ماں کو گلے سے لگا کر کہا، اماں حوصلہ رکھ کچھ نہیں ہو گا، دشمن تیرے بیٹے کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ اِتنا کہہ کر غلام حیدر باہر نکل آیا ہے حالانکہ جانتا تھا کہ اس بات سے ماں کی ڈھارس نہیں بندھے گی۔

سارے جوان بگھیوں پر تیار بیٹھے ہوئے تھے۔ غلام حیدر کے بگھی پر قدم رکھتے ہی گھوڑے دوڑ پڑے اور قافلہ شاہ پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب کے ہر ایک پر خموشی طاری تھی۔ دشمن کے تازہ حملے نے سب پر ایک قسم کا سکتہ کر دیا تھا اور کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ رفیق پاولی کا ذہن تو بالکل ہی ماؤف ہو چکا تھا۔ اُس کی زندگی میں ابھی تک ایسی پے در پے چوٹیں کبھی نہیں لگی تھیں۔

بگھیاں شاہ پور پہنچیں تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ ایک تو وقت ایسا تھا، اُوپر سے شاہ پور میں تین قتل اور مال کا نقصان الگ۔ ہر طرف ایک ماتمی اور سوگوار کیفیت نظر آ رہی تھی۔ شاہ پور کے لوگ تو ایک طرف، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے درخت اور جانور بھی چپ سادھے ہوں۔ فروری کا مہینہ تھا، اس لیے ہوا کی سرسراہٹیں اور پتوں کے مسلسل گرنے نے اُس پر مزید اُداسی پیدا کر دی تھی۔ غلام حیدر فوراً باڑے میں پہنچا جہاں یہ سارا واقعہ پیش آیا تھا۔ لاشیں ابھی تک وہیں پڑی تھیں۔ جن پر اُن کے بیوی بچوں کے بین جاری تھے۔ جب انھوں نے غلام حیدر کو دیکھا تو بین اور بلند ہو گئے۔ عورتیں اُٹھ کر دوہتھڑ پیٹنے لگیں جو پہلے ہی رو رو کر تھک چکی تھیں۔ غلام حیدر تھوڑی دیر لاشوں کے پاس کھڑا رہا۔ تھانیدار دیدار سنگھ اور کچھ سنتری بھی وہیں پر غلام حیدر کے آنے سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ وہ لاشوں کا اچھی طرح سے معائنہ اور وقوعے کا جائزہ لے رہے تھے۔ گاؤں والوں نے صبح ہی کھوجی بلا کر پیروں کے نشان محفوظ کرنے کی عقلمندی بھی کر لی تھی۔ تھانیدار کے ساتھ جیسے ہی غلام حیدر کی آنکھیں ملیں، اُس کی آنکھیں خود بخود نیچی ہو گئیں۔ وہ جانتا تھا کہ اب عذر خواہی کا وقت گزر گیا۔

سودھا سنگھ ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا تھا، جس کی وجہ سے یہ دوسری کارروائی ہو گئی تھی۔ اِس میں زیادہ کردار اگرچہ عبدل گجر کا تھا مگر کُھرے واضح طور پر سودھا سنگھ کی حویلی تک بھی جاتے تھے۔ لوگ جو پہلے کسی حد تک تھانیدار سے سہمے ہوئے دور کھڑے تھے، اب غلام حیدر کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ غلام حیدر نے فی الحال تھانیدار کو نظر

انداز کر کے گاؤں والوں کی طرف توجہ دی، جو بہت زیادہ بے بس اور ڈرے ہوئے تھے۔ وہ اس طرح غلام حیدر کو دیکھ رہے تھے، جیسے پوچھتے ہوں کہ اب کیا ہو گا۔

عورتوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں اور گاؤں والوں کی حسرت آمیز آنکھیں غلام حیدر کے دل پر چھُرے چلانے لگیں۔ وہ ایک چارپائی منگوا کر اُس پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنی رائفل کاندھے سے اُتار کر پائنتی رکھنے کی بجائے اپنی جھولی میں ہی رکھ لی اور اُس کی نال پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرنے لگا۔ اُس نے نہ تو کسی سے سوال کیا اور نہ ہی کسی نے واقعے کی تفصیل بتانے کی کوشش کی۔ البتہ عورتوں کے اُٹھتے ہوئے بین، جن کے اندر ساری کہانی موجود تھی، وہ سنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد تھانیدار دیدار سنگھ بھی اس کے سامنے چارپائی پر بیٹھ گیا اور بولا، غلام حیدر مجھے واہگرو کی سونہہ اِس حادثے پر بہت افسوس ہوا ہے۔ میں نے وقوعے کا سارا جائزہ لیا ہے۔ میں نہیں جانتا تھا عبدل گجر اور سودھا سنگھ اتنے گِر جائیں گے۔ بس اب آپ چنتا رکھیں۔ میں دونوں کو اُن کے بندوں سمیت گرفتار کروں گا۔ چاہے خون کے چھپے بہہ جائیں۔ مَیں نے گورنمنٹ سے اُس کی گرفتاری کے وارنٹ حاصل کر لیے ہیں۔ اِس سے پہلے کہ سودھا سنگھ پٹیالے چلا جائے، مَیں اُسے ٹوکرے کے نیچے سے ہی دبوچ لوں گا۔ مجھے مخبری ہوئی ہے کہ سودھا سنگھ مہاراجہ پٹیالے کے ساتھ رابطے میں ہے اور عبدل گجر منٹگمری میں اپنے رشتے داروں کے پاس جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ وقوعے کی ساری تفصیل اور بِلے اور دما سنگھ کی موجودگی بتاتی ہے کہ یہ کام اُن دونوں کی ہلاشیری سے ہوا ہے۔ میں کل ہی جھنڈو والا میں جاتا ہوں، سودھا سنگھ کی گرفتاری کے ساتھ اُس کا سارا مال بحق سرکار ضبط کر کے لے آؤں گا اور عبدل گجر کی طرف حوالدار شاد علی کو بھیجتا ہوں۔ بس تُو حوصلہ رکھ گرفتاری جرور ہو گی۔ سودھا سنگھ ابھی پٹیالا نہیں جائے گا کیونکہ ولیم کمشنر بہادر جلال آباد نے اُس پر پابندی لگائی ہے کہ وہ جھنڈو والا سے باہر نہ جائے۔ اُسے پتا ہے اگر اُس نے صاحب بہادر کے حکم پر عمل نہ کیا تو پکا مجرم ظاہر ہو جائے گا۔ آپ کل یا آج ہی آ کر تھانے گرو ہرسا اِس واقعے کی ایف آئی آر کٹوا دیں پھر دیکھیں میں کیا کرتا ہوں۔

غلام حیدر تحمل سے بیٹھا تھانے دار دیدار سنگھ کی باتیں سنتا رہا۔ غلام حیدر کو مسلسل خاموش دیکھ کر تھانیدار گھبراہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ شاید اِسی گھبراہٹ میں وہ کچھ اور بھی بول جاتا کہ اُسی لمحے رفیق پاولی نے تھانیدار کو مخاطب کر کے کہا، تھانیدار صاحب، آپ نے کیا کرنا ہے؟ بس یہ دیکھیں کہ اگلا حملہ ہم پر کب ہوتا ہے۔ اُس کے بعد پھر ایک وقوعے کا معائنہ کرنے آ جانا۔ آپ کا کام ختم ہو جائے گا۔

رفیق پاؤلی کے یہ جملے تھانیدار کی چھاتی پر لگے۔ اگر معاملہ اتنا سنجیدہ نہ ہوتا جتنا ہو چکا تھا تو وہ پاؤلی کے بچے کو اِس بد تمیزی پر یہیں پر لمبا کر لیتا اور اُسے سمجھ آ جاتی کہ انگریزی سرکار کے تھانیدار کے سامنے کیسے بولا جاتا ہے۔ اِدھر جب رفیق پاؤلی کچھ اور بولنے لگا تو غلام حیدر نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا، چاچا فیقے رہنے دے، کچھ کہنے کی تھانیدار صاحب مَیں کل (ضرورت نہیں۔ بھلا تھانیدار کا اس میں کیا گناہ ہے؟ (پھر تھانیدار کی طرف منہ کر کے سانجرے تھانہ گروہر سا پہنچ جاؤں گا ایف آئی آر درج کروانے۔ اگر آپ نے حالات اور وقوعے کا جائزہ لے لیا ہے تو جا سکتے ہیں۔ غلام حیدر کی بات سن کر تھانیدار اُٹھ کھڑا ہوا اور گھوڑی پر بیٹھتے ہوئے کہا، سردار غلام حیدر آپ لاشوں کو دفنا سکتے ہیں۔ مَیں کل سانجرے آپ کا تھانہ گروہر سا میں انتظار کروں گا۔

تھانیدار رخصت ہوا تو غلام حیدر نے رفیق پاؤلی سے کہا، چاچا رفیق اِن تینوں لاشوں کو قبرستان میں دفن کرنے کی بجائے شاہ پور کے چوک میں دفن کر دیں۔ میں اِن شہیدوں کا جب تک بدلہ نہ لوں گا، میرے سینے کی آگ ٹھنڈی نہ ہو گی۔

مگر چوہدری غلام حیدر تم نے تھانیدار کو کچھ نہیں کہا؟ یہ سب کیا دھرا اِسی پیٹو حرامی کا ہے، فیقے نے کہا، یہ سانحہ کبھی پیش نہ آتا اگر یہ سکھڑا سودھا سنگھ کو گرفتار کر لیتا۔ اب حرامی کا پُتر کہہ رہا ہے اُس کے مہاراجہ پٹیالہ کے ساتھ رابطے ہیں۔ میرا تو خیال ہے یہ اُس سے ملا ہوا ہے اور اُسی نے اِس کو مشورہ دیا ہے پٹیالہ جانے کا۔

غلام حیدر نے تحمل مزاجی سے آہ بھرتے ہوئے کہا، چاچا فیقے اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ تھانیدار بچارا تو اُس کے آگے بلی ہے۔ جن کی راجے مہاراجے میز بانیاں کریں وہاں بچارے دیدار سنگھ کو کون پوچھتا ہے؟ لیکن اب یہ نوکری اور عزت بچانے کے لیے ضرور اپنا زور لگائے گا۔ اِس لیے اِسے خلاف کرنے کی ضرورت نہیں بس دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے۔

دلبیر علی جو غلام رسول کا بڑا بیٹا اور ذرا زبان کا تیز تھا، پاس بیٹھا یہ باتیں سن رہا تھا، وہ ہمت کر کے بولا، مگر چوہدری غلام حیدر ہم کب تک بیٹھے منہ دیکھتے رہیں گے؟ ہمیں خود آگے بڑھ کے سودھا سنگھ اور اور عبدل گجر پر حملہ کر دینا چاہیے۔

دلبیر علی اپنے حواس کو ٹھیک کرو، غلام حیدر نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا، کیا تم چاہتے ہو مَیں بندے لے جا کر اِن کے گاؤں پر حملہ کر کے اسی طرح اوچھا وار کروں جس طرح اُنھوں نے کیا ہے؟ اس طرح سودھا سنگھ اور عبدل گجر کا تو کچھ نہیں بگڑے گا البتہ ہم ضرور مجرم بن جائیں گے اور وہ خوشی سے بغلیں بجاتے پھریں گے۔

پھر چوہدری صاحب آپ ہی بتاؤ کیا کریں؟ "دلبیر علی نے دوبارہ دھیمے لہجے میں سوال کیا" کل وہ سؤر کے پُتر تم پر حملہ کر دیں گے۔ پھر خدانہ کرے تیرے دشمنوں کا بال بیکا بھی ہوا تو ہم جیتے جی مر جائیں گے۔

غلام حیدر نے دلبیر کے کاندھے پر ہاتھ رکھا، دلبیر اب اِس کی نوبت نہیں آئے گی۔ خدا نے چاہا تو ہم پہلے ہی نپٹ لیں گے اِن دونوں خنزیروں کو۔ اس کے بعد غلام حیدر رفیق پاولی سے مخاطب ہوا، چاچا فیقے، تم کل منہ اندھیرے ہی چک عالمکے چلے جاؤ اور ملک بہزاد خان کو لے کر بارہ بجے سے پہلے جلال آباد حویلی پر آ جاؤ۔ مَیں بھی جنازہ پڑھ کے اور اِن لاشوں کو دفنا کے تھانہ گروہرسا پرچہ کٹوا کر بارہ سے پہلے ہی حویلی پہنچ جاؤں گا۔

اُس کے بعد تمام لوگ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ بہت ساری پاتھیوں اور لکڑیوں کو آگ لگا کر اُن کے گرد بیٹھ گئے۔ غلام حیدر سب لوگوں کے درمیان یونہی بیٹھا رہا۔ دونوں لاشیں اُٹھا کر ان کے گھر پہنچا دی گئیں جن پر ساری رات اُن کے بیوی بچے اور رشتے دار رو رو کر بے حال ہوتے رہے۔ شاہ پور کا کوئی فرد ہی ہو گا جو رات سویا ہو۔ لاشوں کو دوسرا دن ہو گیا تھا، مگر سردیوں کی وجہ سے خراب ہونے کا خطرہ نہیں تھا۔ ارد گرد سے بھی بہت سے لوگ، چوہدری اور جاننے والے، جو شیر حیدر اور غلام حیدر کے واقف کار تھے، اکٹھے ہوئے بیٹھے تھے۔ اسی طرح ساری رات گزر گئی۔ دوسرے دن صبح کی اذان سے پہلے ہی فیقا رات کے طے شدہ پروگرام کے مطابق چار بندوں کو لے کر چک عالمکے چلا گیا۔ مولوی اللہ دتہ نے آٹھ بجے ہی جنازہ پڑھ دیا اور نو بجے تک لاشوں کو شاہ پور گاؤں کے چوک میں دفن کر دیا۔ لاشیں دفنانے کے فوراً بعد باقی بندوں کے ساتھ غلام حیدر تھانہ گروہرسا پرچہ کٹوانے کے لیے روانہ ہو گیا۔

(24)

ولیم کی آنکھ صبح چھ بجے ہی کھل گئی۔ اُٹھتے ہی اُس نے بوٹ اور جرسی پہنی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ سب لوگ آرام سے سو رہے تھے۔ دن نکلنے میں پون گھنٹہ باقی تھا مگر پرندے، خاص کر کوؤں کی کائیں کائیں اور چڑیوں کے چہکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ولیم کمرے سے نکل کر ڈاک بنگلے کے صحن میں آیا۔ وہاں ملازم اور سنتری آگ کے گرد جھرمٹ

بنا کر بیٹھے ہوئے تھے، جو ولیم سے بھی ایک گھنٹہ پہلے جاگ گئے تھے۔ ڈاک بنگلے کا صحن دو ایکڑ کے قریب تھا۔ جس میں ایک طرف مالٹے اور امرود کے اور دوسری طرف ٹاہلیوں اور پیپل کے درخت کھڑے تھے۔ گیٹ کے پاس ایک برگد کا بہت ہی بڑا پیڑ تھا۔ اُس کی شاخوں سے داڑھیاں نکل کر زمین میں دور دور تک دوبارہ پیوست ہو کر اُن میں سے بھی شاخیں نکل آئی تھیں۔ جس کی وجہ سے مرکزی تنے کے ساتھ کئی ذیلی تنے بن گئے تھے۔ برگد پر پرندوں کی اتنی بہتات اور شور تھا کہ کان پھٹتے جا رہے تھے۔ صبح سے پہلے کی سرمئی خموشی اور پرندوں کی چہکار سے ولیم ایک وجد کی حالت میں چلا گیا کہ اُسے کچھ دیر کے لیے سب کچھ بھول گیا۔ وہ ڈاک بنگلے کی مسحور کن فضا میں گم ہو کر رہ گیا اور سوچنے لگا کہ خدا انسان پر اپنی رحمتیں کن کن رنگوں میں نازل کرتا ہے۔ ولیم کو دیکھ کر سنتری اور دوسرے ملازم فوراً باادب ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈر کے مارے اُنہیں کچھ نہ سوجھا کہ کیا کریں؟ صرف ریفلیں پکڑ کر جلدی جلدی ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ولیم نے اُن کے اس اضطراری عمل کو نظر انداز کرتے ہوئے سب انسپیکٹر کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ سب انسپیکٹر رام لال جو پہلے آگ کے پاس بیٹھا مسواک کر رہا تھا اور ولیم کو دیکھ اُس کی مسواک ہاتھ سے گر چکی تھی، پھُرتی سے آگے بڑھا، تو ولیم نے نرم مزاجی سے کہا، رام لال اپنے ساتھ تین سنتری لے کر میرے پیچھے آ جاؤ، باقی آرام سے بیٹھو۔ یہ کہہ کر چل پڑا۔

ولیم بنگلے سے باہر نکلا تو ہرے بھرے کھیتوں نے خوش نگاہی سے اُس کا استقبال کیا۔ جب وہ ڈاک بنگلے پہنچا تھا تو شام کا دھندلکا تھا۔ اِس کی وجہ سے صاف نہیں دکھائی دیا تھا۔ لیکن آج صبح کے روشن اندھیرے میں اُسے اپنی آنکھوں کی بینائی میں طراوت اُترتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک دفعہ اُس کے جی میں آئی کاش جلال آباد کی تحصیل ''بنگلہ فاضل کا، میں ہوتی۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ اُس کے پیچھے تین سنتری اور رام لال چلنے لگے۔

توریے، برسن، مکئی اور گندم کی فصلیں دور تک پھیلی تھیں۔ ولیم نے دل میں تہیہ کیا کہ وہ پورے جلال آباد کو ایسا ہی سر سبز کر کے رہے گا۔ اسی رو میں ندی نالے اور ہری بھری فصلوں کے قالینوں پر چلتا گیا۔ چلتے چلتے بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے رام لال سے سوال کیا، رام لال، یہاں سے ہیڈ سلیمان کی کتنے فاصلے پر ہے؟

رام لال نے تھوڑا سا تیز قدم اٹھا کر ولیم کے برابر سے قدرے پیچھے ہو کر جواب دیا، سر ویسے تو کاغذوں میں دو میل ہی لکھا ہے مگر فاصلہ پانچ میل سے کم نہیں ہے۔ میں ایک دو دفعہ پہلے بھی یہاں آیا ہوں۔

گڈ ہم وہیں پر جا رہے ہیں، ولیم نے مسکراتے ہوئے رام لال کی طرف دیکھا، آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہو گی؟

صاحب جی فاصلہ زیادہ ہے، آپ تھک نہ جائیں، رام لال نے حیران ہوتے ہوئے جواب دیا، اگر حکم ہو تو میں دلبیر کو جیپ نکالنے کا حکم دے دوں اور دوسرے سب افسروں کو بھی خبر دار کر دوں ؟

ولیم نے رُک کر رام لال کی طرف دیکھا اور کہا، ہم ان سنتریوں کے ساتھ پیدل ہیڈ سلیمانکی کی طرف چلتے ہیں۔ تم دلبیر سے کہو وہ ناشتہ وغیرہ کر کے آرام سے جیپ لے کر وہاں آ جائے۔ باقی لوگوں کو بھی اطلاع کر دو، وہ بھی وہیں آ جائیں۔ میں ذرا چہل قدمی کر لوں۔

جیسے آپ کا حکم سرکار، "رام لال نے سر نیچے کرتے ہوئے کہا"۔ اُس کے بعد سنتریوں کی طرف مخاطب ہو کر آہستہ سے کہا، مترو ذرا سنبھل کر کے، صاحب نال ہے گے نے "نئیں تاں بُھگتان پے جُو، اور پیچھے کی طرف دوڑ لگا دی تا کہ اُن کو جلدی سے بتا کر واپس آ ملے

ولیم نے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ قدموں میں پہلے کی نسبت تیزی آ گئی۔ سڑک کچی اور گرد سے اٹی ہوئی تھی جس پر رات بھر اوس پڑنے سے مٹی نم زدہ ہو گئی تھی۔ ولیم کے بوٹ گرد سے اَٹ گئے لیکن وہ چلتا گیا۔ پندرہ منٹ بعد دن کے آثار بہت قریب آ گئے۔ اب لوگ بھی اِکا دُکا فصلوں میں نظر آنے لگے۔ کوئی گڈے میں بیل جوتے کچی سڑک پر رواں دواں تھا اور گڈے کے بھاری پہیوں جو لکڑی کے تھے، سے آوازیں چیں چیں بن کر آتیں۔ کوئی کسان فصلوں میں چارا کاٹ رہا تھا، کسی نے کاندھے پر ٹوکی رکھی تھی اور گدھی پر واہنا رکھے ڈھچکو ڈھچکو چلا جاتا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے ولیم کو حیرانی سے کھڑے ہو کر دیکھتے اور چل پڑتے۔ ولیم نے سوچا اِن بے چاروں کو کیا پتا، اس وقت جلال آباد کا سب سے بڑا افسر یہاں اکیلا تین سنتریوں کے ساتھ پھر رہا ہے جس کی ملاقات کرنے کے لیے بڑے بڑے جاگیر داروں اور چوہدریوں کو وقت لینا پڑتا ہے۔ اب وہ بالکل اُن کے پاس سے گزر رہا ہے بغیر کسی روک ٹوک کے۔ اگر وہ چاہیں اور اُن کو پتا چل جائے تو وہ بغیر وقت لیے اُسے اپنی فریاد یہیں سُنا سکتے ہیں۔

ولیم کے پیدل چلنے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ سنتریوں اور چھوٹے تھانیدار کو وقفے وقفے سے بھاگنا پڑتا۔ جب اُن کا اور ولیم کا فاصلہ بہت کم رہ جاتا، پھر چلنا شروع کر دیتے لیکن دو ہی منٹ بعد ولیم اُن سے پھر کافی آگے بڑھ چکا ہوتا۔ فاصلہ زیادہ ہونے پر پھر دوڑ پڑتے۔ اسی طرح یہ کھیل جاری تھا اور وہ بچارے ہانپ رہے تھے۔ ولیم پورا نوجوان، تازہ خون اور خالی ہاتھ تھا۔ اِدھر یہ بچارے ادھیڑ عمر سنتری، بال بچوں والے، کچھ پیٹ بھی بڑھے ہوئے، اُوپر سے ستم یہ کہ بھاری بندوقیں کاندھوں پر، جان پر عذاب ہو گیا۔ دل ہی دل میں ولیم کو کوسنے دینے لگے اور سوچتے جاتے تھے

کہ آج تک ایسا کمشنر نہ دیکھا نہ سنا۔ جدھر جی چاہتا ہے، منہ اُٹھا کر اُٹھ دوڑتا ہے، مجال ہے ڈر اور جھجک اس کی رگوں میں آئے۔

رستے میں کئی چھوٹی چھوٹی بستیاں اور ڈھاریاں آئیں جن کے باہر ہی سے گزر جانا ولیم نے مناسب سمجھا۔ کھیت اور سبزہ ہر طرف تھا۔ درخت بھی کافی تھے۔ پگڈنڈیوں اور کھالوں کے کناروں پر ہری ہری گھاس اُگی تھی۔ فصلوں، گھاس اور درخت، ہر شے پر رات کو پڑنے والی اوس کا پانی موتیوں کی طرح بکھرا ہوا عجب دلنشینی اور ٹھنڈک کا احساس پیدا کر رہا تھا۔

اب سورج نکل چکا تھا لیکن اُس کی شعاعوں میں وہ تیزی نہیں تھی، جو گرمیوں کے پیدائشی سورج میں ہوتی ہے۔ البتہ ولیم، اور سنتری تیز چلنے کی صورت میں پسینے میں آ گئے تھے۔ خاص کر سنتریوں کے دل ڈوبنے کا سامان بن رہا تھا مگر ولیم اِس صورت حال سے بے نیاز فقط بڑھتا اور چلتا ہی جاتا تھا۔ اچانک ولیم کو ایک کھیت میں گُڑ بنانے والا بیلنا نظر آ گیا جس کے اِدھر اُدھر بہت سے گنّے کے کھیت تھے۔ تازہ گڑ بننے کی گرم گرم اور میٹھی خوشبو کے تیز لمس نے ولیم کو مسحور کر دیا۔

خوشبو بہت ہی مانوس اور منفرد تھی جس نے ولیم کو بچپن کے دن یاد دلا دیے جو اس نے وسطی پنجاب میں گزارے تھے۔ ولیم نے ایک دفعہ کھڑے ہو کر کھینچ کھینچ کر دو چار سانس لیے۔ اُدھر سنتری دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ وہ کچھ دیر کے لیے یہاں رُک ہی جائے تو اچھا ہے ورنہ جان نکلنے کے قریب تھی۔ بالآخر اُن کی سُنی گئی اور ولیم نے بیلنے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ کسان جن میں دو عورتیں اور چار پانچ مرد تھے، فرنگی افسر اور سنتریوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر حیرانی سے کھڑے ہو گئے۔ یہ سب کے سب سکھ تھے جو کماد کے گنوں کا گڑ اور شکر بنا رہے تھے۔ یہ پاس پہنچے تو سب ادب سے کھڑے ہو گئے۔ ولیم نے آگے بڑھ کر ایک سکھ، جو اُن میں کچھ سیانا نظر آ رہا تھا، سے کہا، بابا جی آپ اپنا کام جاری رکھو۔ مَیں تھوڑی دیر کے لیے دیکھنا چاہتا ہوں، گڑ کیسے بنتا ہے۔

ولیم کے رویے کو دیکھ کر ایک بڈھی عورت جس نے گھگھرا پہن رکھا تھا، نے آگے بڑھ کر اپنے میلے ہاتھوں سے ولیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولی آ پُت بیٹھ۔ گُڑ کھا، روہ پی، لسی وی ہیگی آ۔ لُون والی آ، مٹھی وی مل جاؤو۔ گرو دی رکھ آ پُت، گڑ شکر بہت آ۔ مینوں لگدا پُت توں وڈا تھانیدار آ۔ سویرے سویرے کہنو پھڑن چلے آ؟ لگدا کسے وڈے

باغی نوں کن پھڑاون داارادہ کیتا (پھر سنتریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پُت تُسیں وی بہہ جاؤ، جو کجھ کھاناوا، کھاؤ۔

ولیم کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ بوڑھی کیا کہہ رہی ہے۔اِس طرح کی گُوڑھی پنجابی سیکھنے کا ابھی اُسے اتفاق نہیں ہوا تھا اور نہ کوشش کے باوجود پنجابی کی کوئی گرائمر کی کتاب اُس کے ہاتھ لگی تھی۔ لیکن وہ یہ ضرور سمجھ رہا تھا کہ بوڑھی اُنہیں دعا دینے کے ساتھ ساتھ کچھ کھانے پلانے کے چکر میں بھی ہے۔ولیم پر کافی عرصے کے تجربات سے یہ بات تو ثابت ہو چکی تھی کہ عام پنجابیوں یا ہندوستانیوں کو، چاہے وہ سکھ تھے یا مسلمان، اس سے کچھ غرض نہیں تھی کہ اُن پر کون حکومت کر رہاہے اور یہ کہ حکومت کرنے والے کا مذہب کیاہے اور وہ کس نسل سے ہے ؟اُسے تو ان عام لوگوں سے امن اور محبت ہی کی خوشبو آئی تھی۔

وہی محبت اس بوڑھی خاتون اور گُڑ بنانے والے اُس کے بیٹوں میں نظر آرہی تھی۔ یہ سوچ کر ولیم کو وہ ہندو، مسلمان اور سکھ اشرافیہ کا خیال آگیا جو اِن سادہ لوحوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اُسی طرح اِن کا استحصال کرتے ہیں جس طرح غیر ملکی ان کا خون نچوڑتے ہیں۔ اِدھر یہ بڈھی ولیم اور سنتریوں کی آؤ بھگت کو لگ گئی، اُدھر دوسرے لوگوں نے اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا۔ بیلنے پر ایک سکھ بیٹھا مسلسل گراریوں کے درمیان گنے ڈال رہا تھا۔ گنے کی ایک طرف سے روہ (جوس) بہہ کر پیپوں میں جارہی تھی اور دوسری طرف سے گنے کا پیڑھ نکل کر اکٹھا ہو رہا تھا۔ دو بیل بیلنے کی گراریوں کو گھمانے کے لیے پنجالی میں جُتے ہوئے مسلسل ایک چکر میں گھوم رہے تھے۔ انھیں وقفے وقفے سے ایک آدمی چھڑی مار کر ہنکاتا جاتا۔ ایک آدمی چوبنے کے کنارے بیٹھا کُڈھن سے اُس میں پیڑھ پھینک رہا تھا، جس کی تیز آگ کڑاھے میں پڑی ہوئی پت کو پکا رہی تھی۔ چھاننی اور کڑچھے سے اُسے بار بار ہلایا بھی جارہا تھا۔ گنڈ میں پکی ہوئی راب سے ایک سکھڑا رنبی کی مدد سے گُڑ کی ڈلیاں کاٹ کاٹ کر بنانے لگا۔ یہ پورا منظر ولیم کے لیے انتہائی پرکشش تھا۔ دونوں سنتری بیٹھے لسی پینے کے ساتھ گُڑ بھی کھانے لگے۔

ولیم نے ایک سکھ سے کہا کہ وہ اُسے گنے کا جوس صاف کر کے دے۔ سکھ نے ولیم کا اشارہ پاتے ہی اُسی بڈھی سے کہا ”بے بے، صاحب واسطے چھنا دھو دے، پھر ایک لڑکے کو آواز دے کر، جو بیلوں کو ہنکانے پر معمور تھا کہا پُت جھج کے جا، دھیر سنگھ دے بوٹیاں توں دو کینو لے آ۔ لڑکا حکم سنتے ہی بھاگ اُٹھا۔ بھاگنے کے دوران اُس کی بودیاں کھل

گئیں۔ ولیم نے دیکھا کہ دُور ایک کھیت کے کنارے پر پانچ دس مالٹے کے پودے کھڑے تھے۔ لڑکا غالباً اُسی طرف گیا تھا۔ ولیم کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ تین چار کینو لے کر آ گیا۔

اُس سردار نے اُن میں سے دو کینو ایک صاف ستھرے گنے کے ساتھ ملا کر بیلنے کی گراریوں میں دے دیے اور چھنا نال کے سامنے رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر میں سیر بھر کا چھنا گنے اور مالٹے کے جوس سے بھر گیا۔ اُسی بوڑھی عورت نے وہ چھنا ولیم کے ہاتھوں میں دے دیا۔ ولیم نے ڈرتے ڈرتے کہ خدا جانے یہ جوس کیسا ہو گا؟ جب ایک گھونٹ لیا تو ایک کیف آفریں لطف اُس کے گلے سے ہوتا ہوا سینے میں اترتا چلا گیا۔ اُس نے آج تک اِس طرح کا تازہ اور مزے کا شربت نہیں پیا تھا۔ ولیم نے دل ہی دل میں سوچا کہ دنیا کی کوئی وہسکی اِس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس پورے قضیے میں اُن کو یہاں پر آدھ گھنٹہ گزر گیا اور سنتریوں نے خوب آرام کر لیا۔ چلتے ہوئے ایک سنتری نے اُسی بوڑھے سکھ سے پوچھا، ہیڈ سلیمانکی" یہاں سے کتنی دور ہے۔ بوڑھے نے بغیر غور و فکر کے فوراً جواب دیا، کچھ زیادہ نہیں پُت ایہا" باباجی بس دو میل ہو گا۔ ایہہ بیلا پار کرو گے، تاں ہیڈ آ جاؤو۔

ولیم بہت حیران ہوا۔ کم از کم چار میل کا سفر وہ طے کر آئے تھے اور بوڑھا ابھی دو میل کہہ رہا تھا، جبکہ نقشے پر "فاضل کا بنگلہ" کا ہیڈ سے فاصلہ محض دو میل درج تھا۔ ولیم نے سوچا یہ کس قسم کے نقشے تھے، جن کا ایک ایک میل چھ چھ کلومیٹر کا ہے۔ اب قریباً ساڑھے آٹھ کا وقت ہو چلا تھا۔ ولیم کو تو ایسا کوئی فرق نہیں پڑتا تھا البتہ سنتریوں نے دو میل مزید کا سن کر دل چھوڑ دیا لیکن چلنا تو بہر حال تھا۔ ولیم نے جیسے ہی دوبارہ چلنا شروع کیا اُسی وقت سنتری بھی تیز قدموں سے دوڑ پڑے۔ وہ جانتے تھے کہ ولیم کچھ دیر رُکنے کے بعد بالکل تازہ دم ہو چکا ہے اور اب اُس کا ساتھ دینا مزید مشکل ہو جائے گا لیکن ابھی وہ کھیت سے نکل کر کچی سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ اُنہیں دور سے جیپیں گرد اُڑاتی اپنی طرف آتی دکھائی دیں۔ سنتریوں نے جیسے ہی جیپوں کو اپنی طرف آتے دیکھا، بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنے لگے۔ کیونکہ ولیم کو تو اُن پر رحم نہیں آ رہا تھا لیکن واہگرو نے اُن کی سُن لی۔

جیپیں دس قدم دور ہی آ کر رُک گئیں تاکہ کمشنر صاحب بہادر پر گرد نہ پڑے۔

جیپ رکتے ہی مالیکم چھلانگ مار کر نیچے اُترا اور سلام کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا، سر آپ بھی کمال نکلے، ہمیں بھی خبر کر دیتے تو آپ کی ہم رکابی میں کچھ چہل قدمی ہم بھی کر لیتے۔

ولیم مسکرا کر بولا، مسٹر مالیکم ہماری ہم رکابی جنہوں نے کی ہے پہلے اُن کی حالت کا اندازہ تو کر لیجیے، خیر کوئی بات نہیں دوبارہ موقع آجائے گا۔

مالیکم نے خوشگواری کے تاثر کو کم کرتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے کہا، سر ابھی جلال آباد سے ایک خبر آئی ہے ذیلدار متوفی شیر حیدر کے گاؤں شاہ پور پر کچھ شرپسندوں نے بلوا کر دیا۔ جس میں تین بندے شاہ پور والوں کے مارے گئے اور ایک حملہ آوروں کی طرف سے مر گیا۔ حملہ کل رات دس بجے کیا گیا۔

ولیم خبر سُن کر ایک دم بے لطف ہو گیا۔ گویا سارے دورے کا مقصد فنا ہو گیا ہو۔ کچھ دیر کی خموشی کے بعد بے دلی سے جیپ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا، مالیکم دورے کو مختصر کرو اور ہیڈ سے ہو کر آج عصر تک جلال آباد پہنچو اور ڈی ایس پی لوئس صاحب کو اطلاع کر دو کہ وہ حلقے کے تھانیدار کے ساتھ آفس پہنچ جائے اور ہمارے جلال آباد پہنچنے سے پہلے تمام معاملات کی رپورٹ جمع کر لے۔

جاری ہے

قسط نمبر 13

(25)

ولیم ہیڈ سلیمانکی سے شام چار بجے جلال آباد پہنچا اور بنگلے پر جانے کی بجائے سیدھا دفتر چلا گیا۔ دفتر کا اکثر عملہ گھر جا چکا تھا لیکن نجیب شاہ اور دو چار کلرک ابھی موجود تھے۔

نجیب شاہ کو اطلاع مل چکی تھی کہ صاحب اپنا دورہ مختصر کر کے دفتر پہنچ رہے ہیں۔ نجیب شاہ نے اپنے ساتھ کچھ کلرک بھی روک لیے تھے کیونکہ کچھ ہی دیر پہلے ڈپٹی کمشنر فروزپور کی طرف سے ولیم کے لیے ایک میٹنگ کال موصول ہوئی تھی، جس میں ولیم کو فیروزپور طلب کیا گیا تھا۔ دوسرا شاہ پور کے کیس کی خبر بھی اُسے مل گئی۔ اُس نے محسوس کیا شاید اِن دو وجوہ اور ایمرجنسی میں کچھ کام کرنا پڑ جائے۔ ولیم نجیب شاہ سے سلام لیے بغیر سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اُس کے پیچھے ڈی ایس پی لوئیس بھی تھا، جو ابھی ابھی مگر ولیم کے آنے سے پہلے دفتر پہنچا تھا۔ ولیم اپنی کرسی پر بیٹھا تو سامنے ایک لیٹر پڑا تھا۔ اُسے پڑھتے ہی ولیم کا موڈ مزید خراب ہو گیا۔ اُسے کل صبح فیروزپور طلب کیا گیا تھا۔ ولیم کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی طبیعت میں مسلسل سفر کی تھکاوٹ کا بوجھ تھا۔ دوسرا جلال آباد کا چارج لیتے ہی یہاں امن و امان کی خرابی نے اُسے مضمحل کر دیا تھا۔ جو دوسرے کاموں کی طرف سے توجہ ہٹانے کا موجب بن رہا تھا۔ کچھ ہی دنوں کے اندر یہ دوسرا قتل اور لوٹ مار کا واقعہ پیش آگیا۔ غضب یہ کہ دونوں کی ذمہ داری ایک ہی شخص پر عائد ہوتی تھی اور وہی شخص ابھی تک گرفتار نہیں ہوا تھا۔ دیر تک خاموشی سے بیٹھے رہنے کے بعد ولیم نے لوئیس کو مخاطب کر کے کہا، مسٹر لوئیس یہ سردار سودھا سنگھ کیا بلا ہے؟ آخر یہ شخص جرم کرنے میں اتنا دلیر کیوں ہے؟ حالانکہ اچھی طرح جانتا ہے، گورنمنٹ اُس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرنے والی۔ یا (لوئیس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے) میں یہ سمجھوں کہ گورنمنٹ کے ساتھ اندر خانے اُس کے کچھ معاملات چل رہے ہیں، جس کی مجھے خبر نہیں ہے۔ اسی وجہ سے وہ ابھی تک جودھا پور والے معاملے میں گرفتار نہیں ہو سکا۔ یا یہ کہ اِن مجرموں کو گرفتار کرنے کی ذمہ داری بھی مجھی پر عائد ہوتی ہے؟ حالانکہ مجھے بتایا گیا ہے میں تحصیل کا پولیس افسر نہیں، اسسٹنٹ کمشنر ہوں۔ جس کا کام علاقے میں صرف امن و امان برقرار رکھنا ہی نہیں، تحصیل کو 1935 سے نکال کر 1936 میں داخل کرنا ہے۔ مجھے لگتا ہے جو وزن آپ کے اُٹھانے کے لائق ہیں، وہ بھی

میرے سر پر گریں گے۔ لوئیس اگر یہ سب کچھ اِسی طرح چلتا رہا تو لوگ سمجھیں گے، تحصیل میں پولیس افسر کی ضرورت نہیں۔ یہ بات شاید آپ کو اچھی نہ لگے۔ ایسے گاڑی چلنا مشکل ہے۔

ڈی ایس پی لوئیس نے ولیم کی دھمکی کی آواز صاف سن لی تھی لیکن کیا کیا جا سکتا تھا کہ غلطی اُسی کی تھی۔ اُس نے ایک دفعہ تو شرمندگی سے آنکھیں نیچی کر لیں اور کچھ لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ وہ جانتا تھا ولیم اپنی بات میں سچا ہے۔ اگر جودھا پور والے واقعے کے فوراً بعد سردار سودھا سنگھ کو گرفتار کر لیا جاتا تو معاملہ اتنا گمبھیر نہ ہوتا مگر افسوس اُس نے سارا کام تھانیدار پر چھوڑ کر خود چھٹی مکمل کرنے کی ضد پوری کی۔ جس کی وجہ سے سب معاملہ خراب ہو گیا۔ اِس سب سے بڑھ کر اصل خرابی یہ ہوئی کہ ولیم کے آتے ہی دشمنیوں کے پٹارے کھل گئے جس کی وجہ سے جلال آباد میں دنگا فساد شروع ہو گیا اور پولیس کی پے بہ پے سُبکی ہونے لگی۔

لوئیس کی خاموشی کو کافی دیر گزر گئی تو ولیم دوبارہ بولا، لوئیس کیا آپ جانتے ہیں مجھے دیوار سے باتیں کرنے کی عادت نہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا تو میں ایک ریکاڈر میں اپنی گزارشات جمع کر دوں تاکہ آپ تسلی سے وہ بار بار سُن کر مجھے ایک دو ماہ کے بعد جواب دے دیں۔

سر یہ بات نہیں، لوئیس نے ہمت کر کے ولیم کی طرف دیکھ کہا۔

پھر اگر آپ کو میری لفظوں کا مفہوم پہنچ گیا ہے تو میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔ مجھے بتایا جائے سودھا سنگھ ابھی تک کیوں گرفتار نہیں ہو سکا۔ آخر اِس سارے معاملے کے پیچھے کیا ہے؟

سر ایک دو باتیں ہیں، جس کی وجہ سے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے، لوئس بولا۔

وہ کیا باتیں ہیں؟ مجھے کھل کر بتائیں ولیم نے آگے جھکتے ہوئے کہا، اور یہ بھی یاد رکھیں کہ میں صبح فیروز پور جا رہا ہو ں ایک میٹنگ کے سلسلے میں۔ میں جانتا ہوں، یہ معاملہ سب سے پہلے زیرِ بحث آئے گا۔ مجھے پتا ہونا چاہیے حقیقت کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے سر، لوئیس تحمل سے بولا، سودھا سنگھ اِس وقت جھنڈو والا میں موجود نہیں ہے۔ پہلے کیس کے معاملے میں ہم سے واقعی غلطی ہوئی کہ بروقت کارروائی نہ کر سکے۔ جس میں تھانیدار دیدار سنگھ کا زیادہ ہاتھ ہے۔ وہ غالباً ڈر گیا تھا۔ اِدھر میں خود یہاں موجود نہیں تھا۔ اس لیے تفتیش میں کافی وقت لگ گیا۔ جس وقت آپ جھنڈو والا میں گئے، سردار سودھا سنگھ واقعی گورنمنٹ سے ڈر گیا تھا لیکن اُس نے اُس کا اُلٹا اثر لیا اور اُسی رات غلام حیدر کے خلاف

ایک سازش تیار کی۔ جس میں اُس نے دو مسلمان سرداروں کو بھی ملا لیا۔ وہ سردار کسی طرح سے پہلے ہی غلام حیدر کے باپ سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ اِس حملے میں سردار سودھا سنگھ خفیہ طور پر عبدل گجر اور شریف بودلہ کا پارٹنر تھا۔ لیکن سودھا سنگھ کے لیے بُرا یہ ہوا کہ اِس میں وہ بندہ مارا گیا جو خاص سودھا سنگھ کا آدمی تھا اور یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ اُس پر عدالت میں پہلے ہی بہت سے مقدمات چل رہے ہیں۔ وہ مرنے والا متھا سنگھ ہے۔ جس نے کئی لوگوں کا پہلے بھی قتل کیا ہے لیکن ظاہراً اُس پر کچھ ثابت نہیں ہو سکا۔ اس کی خاص وجہ سردار سودھا سنگھ سے لوگوں کا خوف ہے۔ یہ خوف اُس کی دولت کی وجہ سے نہیں، سردار امر سنگھ کے سبب سے ہے جو مہاراجہ پٹیالہ کے دربار میں معتمد ہے اور سردار سودھا سنگھ کا چچا ہے۔ اِس کے علاوہ سودھا سنگھ کی ایک خصوصیت اور بھی ہے کہ وہ اپنے گاوں کی رعیت کا خاص خیال رکھتا ہے۔ اُن کے دکھ درد میں شریک رہتا ہے۔ لہٰذا وہاں سے کوئی بھی شخص سودھا سنگھ کے خلاف گواہی دینے کے لیے تیار نہیں۔ البتہ یہ کام فوجا سیوئے کے بھتیجے کے ذریعے ہو گیا۔

یہ تو سودھا سنگھ کا خاص آدمی تھا، ولیم نے لقمہ دیا۔

جی سر اور اِسی وجہ سے اختلاف پیدا ہوا، لوئیس نے وضاحت کی، یہ جو کچھ بھی ہوا ہے، فوجا سیوئے اِس تمام واردات کے خلاف تھا لیکن سودھا سنگھ کے دوسرے آدمیوں نے اُس کی نہیں چلنے دی۔ اِسی وجہ سے اُن کے درمیان تلخی پیدا ہوئی۔ جس میں فوجا سئیو کے بھتیجے نے اپنی اور اپنے چچا کی سُبکی محسوس کی اور اُس نے تمام حالات کی مخبری تھانیدار دیدار سنگھ کو کر دی جو اُس نے میرے گوش گزار کر دی۔

اب کیا کرو گے اِن کا؟ ولیم نے بیل کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔

آپ جو حکم دیں گے ویسے ہی ہو گا، لوئیس نے ولیم کی خوشنودی کے لیے مکمل تابعداری سے کہا۔

اتنے میں ولیم کی بیل پر کرم دین اندر داخل ہوا، جس کے آتے ہی ولیم نے حکم دیا، کرم دین دو کپ کافی بنا لاؤ۔ حکم سنتے ہی کرم دین باہر نکل گیا۔ ولیم لوئیس سے دوبارہ مخاطب ہوا، لوئیس اگر آپ کے خیال میں میرے جھنڈو والا میں دورہ کرنے کی وجہ سے یہ بعد والا سانحہ پیش آیا ہے تو اب میرے حکم دینے کی وجہ سے ایک اور سانحہ پیش آ سکتا ہے۔ چنانچہ بہتر یہی ہے کہ آپ مجھے بتائیں اب آپ کیا کرنے والے ہیں؟ لیکن اس سے پہلے دیدار سنگھ کو معطل کر دو۔ ہماری حکومت میں ڈرپوک آدمی کا کام نہیں ہے؟

سر ایک بات طے ہے، لوئیس نے ولیم کے لہجے میں چھپی ہوئی گہری طنز کو محسوس کرتے ہوئے کہا، وہاں پر ہمیں سردار سودھا سنگھ نہیں ملے گا۔ وہ پٹیالہ چلا گیا ہے لیکن کل میں ایک سخت کارروائی کرنے کے لیے خود جھنڈو والا جا رہا ہوں۔ پہلے مرحلے پر سردار سودھا سنگھ کا تمام مال مویشی ضبط کر لیے جائیں گے۔ کچھ لوگوں کو ہراساں کرنے کے لیے گرفتار بھی کیا جائے گا تاکہ لوگ خوف میں مبتلا ہو کر حکومت کے سامنے وہ کچھ بول دیں جو وہ عام حالات میں کہنا پسند نہیں کرتے۔ یہی کچھ عبدل گجر کے ساتھ کیا جائے گا۔ یقیناً وہ خود تو ابھی روپوش ہے لیکن ہمارے پاس اُس کا خاص گواہ بلا کمبوہ اہم ثبوت ہے۔ جس کو زخمی حالت میں چک شاہ پور سے گرفتار کیا گیا ہے۔ اب رہا تھانیدار دیدار سنگھ، تو اُسے آپ کے حکم کے مطابق ابھی معطل کر دیا جائے گا۔

گُڈ لوئیس، ولیم نے مطمئن انداز سے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا، جو کچھ ہی دیر پہلے کرم دین وہاں رکھ کر چلا گیا تھا، اور یہ بات بھی یاد رہے کہ مَیں آئندہ کسی بھی ایسے واہیات واقعے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی میری سروس اجازت دیتی ہے کہ تحصیل میں روز روز اس طرح کے تماشے ہوتے رہیں۔ میں کل صبح سات بجے ہی فیروز پور نکل جاؤں گا اور کل شام تک لوٹ آؤں گا۔ آپ پرسوں پوری تحصیل کی پولیس کے افسران کو میٹنگ پر بلاؤ۔ مَیں دیکھنا چاہتا ہوں، جلال آباد میں کون کون سے سورمے بستے ہیں اور وہ کس طرح یہاں فساد برپا کر رہے ہیں۔ اتنا کہہ کر ولیم اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس کے ساتھ ہی ڈی ایس پی لوئیس بھی۔

شام کے چھ بج چکے تھے۔ ولیم اور لوئیس کمرے سے باہر نکلے تو رات کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ دونوں جیسے ہی ڈیوڑھیاں پار کر کے کھلی جگہ پہنچے تو انسپکٹر متھرا اور تھانیدار دیدار سنگھ وہاں موجود تھے، جو کئی گھنٹے پہلے ولیم کے دروازے پر آ بیٹھے تھے اور بہت خوف زدہ بھی تھے۔ دونوں نے آگے بڑھ کر ولیم کو ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا، جس کا ولیم نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ گویا اُنہیں جانتا ہی نہ تھا اور سیدھا آگے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ حالانکہ کچھ دن ہی پہلے انسپکٹر متھرا کے ساتھ ولیم نے ایک لمبا سفر بھی کیا تھا، جس میں بہت سی باتیں بھی ہوئی تھیں۔ سی آئی ڈی انسپکٹر متھرا ولیم کا یہ انداز دیکھ کر بہت گھبرا گیا۔ شاید وہ پیچھے چلنے کی کوشش بھی کرتا لیکن اُسے لوئیس نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ چنانچہ وہ دونوں وہیں رُک گئے اور حیران تھے کہ اِتنے گھنٹے دفتر میں انتظار کروانے کے بعد ولیم نے اُن سے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ پھر متھرا نے دل ہی دل میں سوچا کہ لوئیس صاحب نے معاملہ کچھ نہ کچھ نپٹا لیا ہو گا۔

ملک بہزاد ساٹھ کے پیٹے میں ایک منجھا ہوا شخص تھا۔ اُس کا گاؤں جلال آباد کے مشرق میں تیس کلو میٹر کے فاصلے پر عالمکے اُتر تھا۔ سر پر کُلے دار بھاری سفید پگڑی تھی۔ چہرہ کافی چوڑا اور ہڈ کاٹھ بھی کھلے کھلے تھے۔ رنگ سانولا سے زیادہ اب کالا ہو چلا تھا، جیسا عموماً جنوبی ایشین کا بڑھاپے میں ہو جاتا ہے۔ البتہ آنکھوں میں ابھی تک چمک باقی تھی، جو اس عمر میں بھی اُس کے زندگی میں بھرپور حصہ لینے کی غماز تھیں۔ بیسیوں دفعہ منٹگمری اور فیروز پور جیل کی ہوا کھائی لیکن اپنی کرتوتوں سے منہ نہ پھیرا۔ یوں تو اُس کی اپنی زمین بھی کافی تھی لیکن ساری عمر کام رسہ گیری اور چوری چکاری ہی سے رکھا۔ کوئی دن ہی ہو گا جب اُس کی عدالت اور کچہری میں تاریخ نہ لگی ہو۔ کچہری کے وکیل تو ایک طرف تحصیل جلال آباد، تحصیل مکھسر اور فیروز پور کے تمام جج بھی اُس سے واقف ہو چکے تھے۔ بعضوں سے تو اُس کے ذاتی مراسم بھی قائم ہو گئے۔ جیل میں اُس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ چنانچہ یہ اُس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔
اگرچہ ملک بہزاد کو بہت دعوے تھے کہ اُس نے سینکڑوں قتل کر رکھے ہیں لیکن اُن قتل کا ثبوت عدالت تو کیا وہ خود بھی کبھی پیش نہیں کر سکا تھا۔ لیکن پورے علاقے میں ملک بہزاد کی دھاک ضرور بیٹھ چکی تھی۔ تھانہ، عدالت یا دنگے فساد کا کہیں معاملہ پیش آجاتا تو ملک بہزاد کی خدمات مفت میں حاصل ہو جاتیں۔ ایسے ایسے مشورے دیتا کہ مخالف کو ضرور خبر لگ جاتی کہ مدعی کی پشت پر ملک بہزاد کا ہاتھ ہے۔ اِدھر ملک بہزاد بھی اپنے مدعی کی شکست نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر خدا نا خواستہ معاملہ ہر حالت میں ہاتھ سے نکلتا ہی دکھائی دے رہا ہوتا، پھر وہ جارحیت سے بھی باز نہیں آتا تھا اور مدعی کے ہاتھوں وہ کرا دیتا، جس کی خود مدعی بھی توقع نہ کر سکتا۔ اِنھی خدا واسطے کی دشمنیوں میں اُس نے خود بھی بہت سی گزند اُٹھائی لیکن ملک بہزاد کو اِن کاموں کا ایسا چسکا پڑ چکا تھا کہ اب اُس سے مر کر ہی جان چھٹتی۔ ملک بہزاد کو ایک اور بھی چسکا تھا کہ اُس کے پاس لوگوں کو سنانے کے لیے طرح طرح کی کہانیاں تھیں اور وہ کہانی ایسے سناتا کہ لوگ عش عش کر اُٹھتے۔ ملک بہزاد کا شیر حیدر سے پُرانا یارانہ تھا۔ ایک دوسرے کے پگڑی بدل بھائی بنے ہوئے تھے۔ شیر حیدر نے بہت سے معاملات میں ملک بہزاد کی مدد کی تھی اور بیسیوں دفعہ عدالت میں اُس کی ضمانت کے مچلکے جمع کروائے تھے۔ جو کئی ہزار روپے کے بن جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کئی بار ملک بہزاد نے غیر قانونی کارروائی کر کے شیر حیدر کے پاس آکر پناہ لی تھی اور اس پناہ میں احسان مندی کا جذبہ بالکل نہیں تھا بلکہ ایک برابری کی حیثیت تھی۔ جس کا زیادہ تر تعلق بھائی بندی سے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ملک بہزاد بہت دفعہ شیر حیدر کے بھی کام آچکا تھا۔ لہٰذا یہ بات روشن تھی کہ شیر حیدر کی وفات کے بعد ملک بہزاد کا تعلق غلام حیدر کے

ساتھ سابقہ بنیادوں پر ہی استوار ہونا تھا۔ شیر حیدر کی وفات پر ملک بہزاد نے غلام حیدر کو بار بار یہ بات باور کرائی تھی، پُتر میرے لائق کوئی کام ہو تو ضرور بتانا۔ تم میرے بھتیجے کی طرح ہو، مجھ سے جو ہو سکا،مَیں کروں گا۔ لیکن غلام حیدر اُس وقت پے بہ پے مصیبتوں میں کچھ ایسا حواس باختہ ہوا کہ اُسے ملک بہزاد کے بارے میں کچھ یاد نہ رہا مگر شاہ پور والے واقعے میں اچانک غلام حیدر کو اپنے اس رفیق کا خیال آیا، جو دراصل اُسے اِس مصیبت سے نکالنے کے لیے صحیح مہرہ ثابت ہو سکتا تھا اور برسوں کی رفاقت کے باعث اُس سے کچھ دھوکے کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔

ملک بہزاد آج صبح گیارہ بجے ہی جلال آباد غلام حیدر کی حویلی میں پہنچ چکا تھا اور اب آرام سے چارپائی پر بیٹھا حقے کے کڑوے تمباکو کے مزے لینے کے ساتھ ساتھ سب لوگوں کو معمول کے مطابق اپنی ایک کہانی سنا رہا تھا، جو اُسے منٹگمری جیل میں پیش آئی تھی۔ کہانی سننے کے لیے ارد گرد چارپائیوں پر بیٹھے تمام لوگ تازہ سانحات کو بھول چکے تھے۔ غلام حیدر حویلی میں داخل ہوا تو چارپائیوں پر بیٹھے تمام لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بڑھ کر ہاتھ ملانے لگے مگر غلام حیدر سب سے جلدی جلدی فارغ ہو کر آگے بڑھتا گیا۔ اُس کی نظر حویلی کا دروازہ پار کرتے ہی ملک بہزاد کو ڈھونڈنے لگی تھی، جو کئی لوگوں کے درمیان بیٹھا اپنی کتھا سنا رہا تھا۔ غلام حیدر کو دیکھتے ہی ملک بہزاد بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جیسے ہی غلام حیدر قریب ہوا، اُس نے کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور کاندھے پر تھپکی دی۔ جوش اور جاذبے سے ملنے کے بعد کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور دونوں نے جان بوجھ کر موجودہ سانحات کی بات نہ چھیڑی۔ ہندوستان اور اس میں بھی خاص کر پنجاب میں خیال رکھا جاتا ہے کہ مقصد کی بات کرنے کے لیے کچھ آداب ملحوظ رکھیں جائیں اور ملتے ہی اپنا رونا نہ رو دیا جائے۔ اس کے علاوہ رعیت کے سامنے اپنی کمزوری کا ذکر انتہائی بُزدلی تصور کیا جاتا ہے۔ کچھ دیر ایک دوسرے کا حال احوال پوچھنے کے بعد غلام حیدر نے تمام لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا۔ لوگوں کے ہٹتے ہی ملک بہزاد کو بات کرنے کا موقع مل گیا اور اُس نے غلام حیدر کو تسلی دینا شروع کر دی، پُتر گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تیرا چاچا ابھی زندہ ہے (پھر اپنی ہی چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا) پُتر غلام حیدر مصیبتیں اگر مردوں پر نہ آئیں تو پھر زنخے تو اِن کا بوجھ اُٹھانے سے رہے۔ بھتیج، مشکلیں اور اوکھے پانڈے مردوں کا زیور ہیں۔ تگڑا ہو، میں ہوں نا تیرے ساتھ۔ مجھے دیکھ کئی قتل کر کے اور کئی دفعہ منٹگمری جیل کی کوٹھیوں کی سیر کر کے تیرے سامنے بیٹھا ہوں۔ اب بھی کئی مقدموں کی تاریخیں میرے بوڑھے کاندھوں پر ہیں اور یہ میرے

قدموں کو دیکھتا ہے؟ یہ صرف دو ہی جگہوں کا نقشہ پہچانتے ہیں، عدالت کی سیڑھیاں اور دشمن کی جو نہہ۔ تیسری جگہ کا کبھی سوچا ہی نہیں۔ یہ کہ کر ملک بہزاد نے حقے کا ایک لمبا گھونٹ لیا اور تائید کے لیے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ ملک بہزاد کی بعض باتیں واقعی غلام حیدر کے لیے تسلی کا باعث تھیں۔ کیونکہ جتنی مصیبتیں ملک بہزاد نے اپنی زندگی میں دیکھیں تھیں، غلام حیدر پر تو ابھی اُن کا پاؤ پاسک بھی نہیں آئی تھیں۔ اگرچہ وہ مشکلیں اُس کے اپنے کرتوتوں ہی کی وجہ سے تھیں لیکن جیل اور عدالتوں کے عذاب کی تلخی تو سب ایک ہی طرح سے محسوس کرتے ہیں۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد غلام حیدر بولا، چاچا بہزاد دُکھ اِس بات کا نہیں کہ مجھ پر مصیبت آئی ہے، رونا تو یہ ہے دشمن نے بے وقتی ضرب لگائی ہے اور اگر تحمل سے سوچیں تو ابا کی توہین کی ہے۔ اِدھر اُن کا جنازہ پڑا ہے اُدھر سکھڑے نے چڑھائی کر دی۔ یہ کسی دشمن کا نہیں بلکہ نسلی کمینے کا کام ہے۔ اور قہر یہ ہے کہ کچھوؤں نے بھی ابا کے مرنے کے ساتھ ہی چوکیاں بھرنی شروع کر دیں اور مینڈکیاں شراب کے مٹکوں پر پل پڑی ہیں۔ اب یہ کون کہ سکتا تھا عبدل گجر اور شریف بودلے جیسے چوہے بھی دُموں پر کھڑے ہو جائیں گے۔

غلام حیدر، مجھے فیقے پاؤلی نے سب کچھ سے خبردار کر دیا ہے، ملک بہزاد اپنی سفید مونچھ کو مسلسل بل دینے کے ساتھ مسکرا بولا، تم کیا چاہتے ہو دشمن تمھاری بلائیں لے اور تمھارے سر سے کالے بکروں کے صدقے اُتارے؟ بھائی دشمن دشمن ہوتا ہے۔ اُس کے اپنے موڈ ہوتے ہیں۔ اُس سے شکوہ کرنے والے بُزدل ہوتے ہیں۔ تم اپنے ذمہ دار ہو اور سکول میں پڑھنے والیے لاڈلے نہیں بلکہ اپنی رائے اور فیصلوں پر اختیار رکھتے ہو۔ اس لیے اب دشمن سے شکوہ یا بچاؤ نہیں۔ اُس پر جارحیت کا سوچو۔ کیونکہ بچاؤ کمزور کرتا ہے اور آگے بڑھ کر حملہ کرنا مردوں میں حوصلے کا باعث ہوتا ہے۔ یہی شیروں کا کام ہے۔ یہ شریف بودلہ اور عبدل گجر تو کیڑوں کی طرح مَسلے جائیں گے۔ افسوس تو اُن تین چار بے گناہوں کا ہے، جو بے چارے تیری دشمنی میں کام آگئے۔ خیر یہ تو ہوتا ہی ہے کہ مردوں کو اپنے رشتوں کے دکھ اُٹھانے پڑتے ہیں۔ اب تو حکم کر بلکہ پہلے منہ ہاتھ دو اور گھر جا کر اپنی ماں کے پاس کچھ دیر بیٹھ۔ وہ پریشان ہو رہی ہو گی، اُسے حوصلہ دے اور بتا دے کہ وہ دلیری پکڑے۔ اُس کا بھائی بہزاد ابھی زندہ ہے۔ کچھ نہیں ہونے دے گا۔ ملک بہزاد نے غلام حیدر کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوبارہ تھپکی دی۔ جا اُٹھ کر آرام سے کھانا وانا کھا اور جی کو ہلکا کر پھر تسلی سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔

غلام حیدر چارپائی سے اُٹھا اور حویلی کے زنان خانے میں چلا گیا، جہاں اُس کی ماں انتہائی بے چینی کی کیفیت میں اُس کی منتظر تھی۔ غلام حیدر اپنی ماں فاطمہ بانو کی اکیلی اولاد تھی۔ وہ جانتا تھا، اُس کی والدہ کے پاس نہ تو کوئی اور راستہ تھا اور نہ ہی کوئی اور سرمایہ۔ اگر اُسے کچھ ہو گیا تو اُس کی ماں زندہ ہی مر جائے گی۔ اِس لیے اُسے اپنے سے زیادہ ماں کی فکر تھی۔ غلام حیدر کو دیکھتے ہی اُس کی والدہ اُٹھ کر لپٹ گئی اور صدقے واری جا کر اپنی چارپائی کے سامنے پڑے لال موڑھے پر بٹھا لیا۔ فاطمہ بانو کی چارپائی شادی کے وقت سے ابھی تک اُسی کمرے میں تھی، جس کمرے میں وہ دلہن بن کر آئی تھی۔ کمرہ بیس فٹ چوڑا اور تیس فٹ لمبا تھا اور آرائش کے اعتبار سے اِس قدر شاندار تھا کہ آنکھیں دیکھتے ہی دنگ رہ جائیں۔ لیکن اتنے لمبے اور چوڑے کمرے میں ایک دوہرا پلنگ اور چار پانچ رنگین موڑھوں کے سوا کوئی جگہ بیٹھنے کے لیے باقی نہیں بچی تھی۔ کہیں بڑے بڑے سنگھار آئینے کھڑے تھے اور کہیں رنگ برنگے دھاگوں سے بُنے ہوئے مختلف قلینوں کے ٹکڑے لٹک رہے تھے۔ کسی طرف سندھی، بلوچی اور پنجابی فوک پینٹنگز کے نقش کپڑوں پر کاڑھے ہوئے لکڑی کے مختلف ہینگروں میں ٹنگے تھے، جو تیز رنگوں میں اپنی شکلوں کو پورے کمرے پر حاوی کیے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بھی کچے رنگوں کی مٹی سے بڑی نفاست سے پینٹنگ کی گئی تھیں۔ اُن پینٹنگز سے پتا چلتا تھا کہ اُن کو بنانے والا آرٹ سے زیادہ آرٹ کا دعوہ رکھتا تھا مگر وہ پھر بھی اچھی لگتی تھیں۔ کمرے میں جو چیز سب سے نمایاں تھی، وہ پڑچھتیوں اور طاقوں میں ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے بے شمار کانسی اور تانبے کے چھوٹے بڑے برتن تھے۔ جن میں پراتیں، دیگچے، ڈونگے، چھنے، پلیٹیں، گلاس غرض ہر ایک کانسی اور تانبے کا برتن، جو اُس وقت پنجاب کے عام یا خاص بازار میں پایا جاتا تھا، اِس کمرے میں جمع تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کانسی اور تانبے کے دہکتے ہوئے زرد اور چمکیلے رنگوں سے کمرہ جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ جو رات کے اندھیرے میں دیے اور لال ٹین جلنے سے اور بھی دمک اُٹھتا اور ایسے محسوس ہوتا کہ پورے کمرے میں گویا سونے کے چراغ جل رہے ہوں۔ دیے کی زرد روشنی کی لَو تمام برتنوں کی دھات سے نکل نکل کر پھوٹ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے کمرہ دہک رہا تھا۔ بلکہ بعض چھوٹے چھوٹے برتن تو واقعی سونے کے تھے۔ جن میں فاطمہ بانو اپنے لیے مصری کی ڈلیاں، بادام یا گری وغیرہ رکھتی تھی۔ رواج کے مطابق ہر والدین اپنی بیٹی کو ایسی دھاتوں کے برتن دینا اپنا فرض خیال کرتا تھا۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا کہ یہ برتن زندگی میں کبھی استعمال میں آئیں۔ بلکہ کانسی کے برتن میں تو کوئی چیز قلعی کیے بغیر ڈال ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ فوراً خراب ہو جاتی اور قلعی کرانے کی صورت میں دھات کی اپنی حیثیت کی وقعت ظاہر نہ ہو پاتی۔ چنانچہ

یہ برتن کمروں کی پڑچھتیوں اور طاقوں پر ہی پڑے پڑے رونق دکھاتے رہتے۔جب بیاہ کے وقت اِن برتنوں کو ساتھ لانے والی دُلہنیں اُسی گھر میں زندگی کے تیس چالیس سال گزار کر پوتوں اور نواسوں والی ہو جاتیں تو پھر وہ اپنے نواسوں اور پوتوں پوتیوں کو ایک ایک برتن کے بارے میں تفصیل سے بتاتیں کہ بیٹا یہ پرات آپ کے پڑنانا حیدر آباد سے لائے تھے اور یہ کانسی کا دیگچا اُنہوں نے دہلی کے گنج منڈی بازار سے خریدا تھا۔اِس میں پورے پندرہ کلو چاول پکتے ہیں۔اِدھر آ،مَیں تجھے دکھاؤں،یہ جو کانسی کے چھنے اور گلاسوں کا سیٹ ہے،اِسے میری شادی سے بھی بارہ سال پہلے سندھ سے تمھاری پڑنانی لائی تھی،جب وہ حج کر کے کراچی بندرگاہ پر بحری جہاز سے اُتری تھی۔وہاں سے تو وہ سندھی چادریں اور شالیں بھی لائی تھی پر وہ تو تمھارے پڑنانا نے ہنڈا لیں۔اِس چھنے کا وزن دیکھو پورا دو سیر ہے۔الغرض یہ کمرہ ایک اچھا خاصا نگار خانہ تھا۔جس میں پورے پنجاب کا گھریلو کلچر ایک ہی جگہ جمع تھا۔

غلام حیدر کی دو پھپھیاں اور ایک خالہ بھی کئی دن سے یہیں پر تھیں۔جو فاطمہ بانو کی ڈھارس بندھائے ہوئے تھیں۔اُن کے علاوہ بھی خاندان کی کئی لڑکیاں اُسی وقت سے گھر میں موجود تھیں اور اُس کے اکیلے پن کو اُنہوں نے کسی حد تک دور بھی کر دیا تھا۔مگر بیٹے کے ساتھ مل کر اُسے ایک گونہ سکون سا آجاتا اور دل ہلکا ہو جاتا۔غلام حیدر نے والدہ کی کیفیت سمجھتے ہوئے کہا،اماں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔مَیں نے چاچے بہزاد کو چک عالمکا سے بُلوا لیا ہے۔وہ خود ہی اِس سارے مسئلے کو سنبھال لے گا۔

ملک بہزاد کا نام سن کر فاطمہ بانو ایک دم چونک گئی اور بولی،ہائے ہائے بیٹا اِس غنڈے کو تو صلح صفائی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔یہ کسی اور ہی پھڈے میں نہ ڈال دے۔تم نے اس کو کیوں بلایا ہے؟یہ تو نہ خود بیٹھتا ہے اور نہ کسی کو بیٹھنے دیتا ہے۔اس کا معاملہ تو،چور نالوں پنڈ کاہلئی،والا ہے۔میں کہتی ہوں اُسے واپس بھیج دے اور اُن ظالموں کو کچھ دے دلا کر صلح کر لے۔ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔اُس کے فضل سے کون سی کمی ہے۔

فاطمہ بانو کی بات ختم ہوئی تو غلام حیدر کی پھوپھی نے اپنا دوپٹا درست کیا اور رنگین موڑھا،جس پر وہ بیٹھی تھی،اُسے مزید آگے سرکا کر جھکی اور اپنی نصیحت چھیڑ دی،بیٹا تیری ماں ٹھیک کہتی ہے۔تیرے باپ شیر حیدر کی بات اور تھی،تیری بات اور ہے۔یہ غنڈوں سے مقابلہ اور لڑائی بھڑائی ہمارا کام نہیں ہے۔دیکھ تُو پڑھا لکھا ہے۔یہ لوگ جو تیری جان کے دشمن ہوئے ہیں،اِن ڈنگروں سے تیرا کیا لینا دینا۔تُو اِن کو اِن کے حال پر چھوڑ اور زمین کسی کو ٹھیکے یا گہنے پر دے کر لاہور چلا چل یا چاہے تو پاکپتن آجا،پر اب فیروز پور اور جلال آباد تیرے رہنے کے قابل نہیں رہا۔تُو نے

اندھیر سویر آنا جانا ہوتا ہے اور میں جانتی ہوں تیری ماں کس طرح سولی پر لٹکی رہتی ہے۔ یہ سچ کہتی ہے، ملک بہزاد سے تُو کوئی واسطہ نہ رکھ۔ یہ تجھے کسی اور ہی پھڈے میں پھنسا دے گا۔

غلام حیدر جانتا تھا کہ اماں اور پھوپھیوں کو سمجھانا بے کار تھا۔ وہ عورتیں ہونے کے ناتے سے اپنی جگہ پر سچی بھی تھیں۔ لیکن اُن کی دی ہوئی صلاح پر سوچنے کی حد تک تو ٹھیک تھا، عمل کرنا ناممکن تھا۔ زمینوں، مال مویشی اور رعایا کو بے وارث چھورنے کا مطلب یہ تھا کہ عزت، وقار، زمین سب کچھ سے ہاتھ دھو بیٹھنا اور اپنے باپ شیر حیدر کے نام تک کو ڈبو دینا، جو کسی طرح بھی گوارا نہ تھا۔ مگر اس وقت اُن سے بحث کرنا بھی فضول تھی۔ اس لیے غلام حیدر نے اپنی ماں اور پھوپھی کو دلاسا دیتے ہوئے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا، اماں جیسا آپ کہیں گی وہی کروں گا، فکر نہ کریں۔ میں ان سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ فی الحال تو مجھے بھوک لگی ہے۔ جلدی سے روٹی دے۔ آپ کے ساتھ بیٹھ کر روٹی تو کھالوں۔

فاطمہ بانو نے غلام حیدر کی اِس قدر اطاعت گزاری دیکھی تو باغ باغ ہو گئی۔ گویا سارے مسائل ایک لمحے میں حل ہو گئے ہوں۔ اِسی خوشی میں اُس نے فوراً ملازمہ کو آواز دی، نی سلامتے جلدی نال غلام حیدر واسطے تے ساڈے واسطے روٹی لے آ۔ مَیں اپنے پُتر نال بہہ کے روٹی تاں کھالاں۔

سلامت بی بی نے کھانا تپائی پر لگا دیا۔ پھر غلام حیدر، اُس کی ماں، دونوں پھوپھیاں اور خالہ نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران بھی غلام حیدر نے سب سے کافی نصیحتیں سنیں، جن پر وہ ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح ہاں ہاں کرتا گیا۔ اِس طرح عصر کا وقت ہو گیا اور فاطمہ بانو سمیت سب گھر والوں کا بھی جی بہل گیا۔ والدہ کے پہلو میں بیٹھ کر غلام حیدر کا بھی کچھ تکدُّر دور ہو گیا۔ گویا ملک بہزاد سے صلاح مشورہ کرنے کے لیے ایک قسم کا تازہ دم بھی ہو چکا تھا۔

عصر کے وقت، جو سردیوں کے موسم میں شام کے قریب پہنچ جاتا ہے، غلام حیدر حویلی کے بڑے صحن کے مہمان خانے میں آ گیا۔ مہمان خانہ ڈیوڑھی نما بیس فٹ اُونچی چھت والے بڑے کمرے پر مشتمل تھا۔ جس میں دس چار پائیاں بچھ جاتی تھیں۔ سردی کی وجہ سے سب لوگ ڈیوڑھیوں میں بیٹھ چکے تھے اور حقوں کی گڑ گڑاہٹوں کے ساتھ گپوں کے ہانکے چھوڑ رہے تھے۔ غلام حیدر کو دیکھ کر ایک دم خموشی چھا گئی۔ لیکن وہ کسی کے پاس نہ رُکا اور سیدھا

مہمان خانے میں جا کر ملک بہزاد کے سامنے والی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ ملک بہزاد تسلی سے حقہ پیتا رہا۔ اُس دوران دو چار لوگ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

غلام حیدر نے اصل بات چھیڑنے کی کئی بار کوشش کی لیکن ملک بہزاد فوراً ہی بات کو پلٹا دے کر کسی اور موضوع کی طرف موڑ دیتا۔ جب دو گھنٹے اِسی طرح گزر گئے تو ملک بہزاد نے سب لوگوں کی طرف، جو چھ چار وہاں بیٹھے تھے، اشارہ کر کے کہا، لو بھراؤ اب تم سب باہر جا کر تھوڑی دیر کے لیے تازہ ہوا کھاؤ، مَیں اپنے بھتیجے سے کچھ دکھ سکھ کی باتیں کر لوں۔ بڑے عرصے سے مل کر بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

ملک بہزاد کی بات سن کر سب لوگ اُٹھ گئے حتیٰ کہ رفیق پاؤلی بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا، میاں بہزاد میں بھی چلتا ہوں، اب کل ملیں گے۔ آج کافی تھک گیا ہوں۔ اِس لیے جلدی نیند آرہی ہے۔ وہ جان گیا تھا، ملک بہزاد غلام حیدر کے ساتھ دراصل اکیلے ہی میں بات کرنا چاہ رہا ہے۔

سب اُٹھ گئے تو ملک بہزاد نے اُٹھ کر اِس لمبے چوڑے کمرے کے دروازے کی دونوں بلیاں چڑھا دیں اور آ کر تسلی سے اپنی چار پائی پر بیٹھ کر گیا، جس پر ریشمی گدا بچھا کر پائینتی روئی کی ایک موٹی اور صاف ستھری رضائی رکھی ہوئی تھی۔ ملک بہزاد نے گول تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر رضائی اپنے قدموں کے اُوپر سے لا کر کمر تک اوڑھ لی۔ پھر حقے کی نے منہ میں لے کر ایک کیف آفریں سوٹا لگایا۔ اِس کے بعد ایک دو لمحے خموشی سے غلام حیدر کی طرف دیکھ کر بولا، جی پُتر غلام حیدر اب بتا۔ اب صرف دیواریں سن رہی ہیں۔ اور کھل کے بتا کہ اب کیا ارادے ہیں؟

غلام حیدر جو پہلے چار پائی کے کنارے پر پاؤں لٹکائے ملک بہزاد کو دیکھ رہا تھا کہ کب گفتگو شروع کرتا ہے، نے آرام سے اپنے جوتے اتار کر دونوں ٹانگیں اُوپر کر لیں اور کہنے لگا، چاچا بہزاد آپ کو بلانے کا آخر کوئی مقصد تو ہو گا اور جو مقصد ہے اُس کو حاصل کرنے کے لیے آپ کا وجود اِسی لیے ناگزیر ہے کہ مجھے شکست قبول نہیں اور یہ فیصلہ میں نے کافی سوچ سمجھ کے کیا ہے۔

ملک بہزاد غلام حیدر کی بات سن کر ہلکا سا مسکرایا پھر نہایت سنجیدگی سے بولا، بھتیجے میں مجھے آپ سے کچھ باتوں کے جواب سیدھے سیدھے چاہییں۔ اُس کے بعد میں اپنی رائے دوں گا کہ اِس قضیے میں کیا کرنا ہے۔ میری طبیعت سے تُو اچھی طرح واقف ہے اگر تیرا باپ بہشتی زندہ ہوتا تو اُس سے یہ باتیں کرنے کی نوبت پیش نہ آتی لیکن سچی بات یہ ہے کہ جب تک میں اپنی راہ آپ کے ساتھ صاف نہ کر لوں، اُس وقت تک یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مجھے کیا کرنا

چاہیے۔اب پہلے مجھے تُو یہ بتا کہ اگر مَیں تیرے ساتھ نہ ہوں تو پھر تُو کیا کرے گا۔
مَیں نے ایف آئی آر درج کروادی ہے دونوں قضیوں کے بارے میں۔ڈپٹی کمشنر نے مجھے انصاف کی توقع بھی دلائی ہے۔لیکن مَیں اُس سے زیادہ مطمئن نہیں ہوں اور کچھ مزید کرنا چاہتا ہوں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں ؟
تیرے خیال میں ایف آئی آر کا نتیجہ کیا ہو گا ؟ملک بہزاد نے غلام حیدر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔
۔اس سے یہ ہو گا کہ حکومت مجرموں کو پکڑنے کی پابند ہو گی۔
پھر اُن ملزموں کو گرفتار کر لیا جائے گا ؟
میرا تو یہی خیال ہے۔
اچھا اب یہ بتا کہ ملزم گرفتار ہونے کے بعد اپنی ضمانت کی کوشش کریں گے یا آرام سے اپنے آپ کو جیل میں سڑنے دیں گے ؟
وہ اپنی ضمانت کروانے کی کوشش تو ظاہر ہے کریں گے
اگر ضمانت ہو گئی تو پھر ؟
پھر مقدمہ چلے گا
پھر اُس کے بعد ظاہر ہے وکیل کیے جائیں گے، گواہ پیش ہوں گے۔پیشیاں ہوں گی، کبھی تم نہیں جاسکو گے، کبھی ملزموں کی طرف سے حاضری نہیں ہو گی۔ موسم آئیں گے گزر جائیں گے۔جج بدلیں گے۔پُرانے جائیں گے، نئے آئیں گے۔ سفارشیں چلیں گی۔ کبھی اُن کا پلڑا بھاری، کبھی آپ کا پلڑا بھاری اور یوں برسوں کا پینڈا نکل جائے گا۔یہی ہو گا نا؟ ملک بہزاد نے ایک طنزیہ لہجہ اپناتے ہوئے بات کو ختم کیا۔ پھر حقّے کا ایک اور گھونٹ بھرا۔
تو کیا مجھے ایف آئی آر درج نہیں کروانا چاہیے تھی؟ غلام حیدر نے ملک بہزاد کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔
وہ تو ہر حالت میں کروانا چاہیے تھی میرے بھائی کے پُتر، ملک بہزاد نے کمر کو تکیے سے ذرا سا اُٹھاتے ہوئے جواب دیا، مگر میرا سوال یہ ہے کہ صرف یہی کچھ کر کے بیٹھ جاؤ گے ؟
پھر اور کیا کروں ؟اسی لیے تو آپ کو زحمت دی گئی ہے، غلام حیدر بولا۔

دیکھ غلام حیدر، ملک بہزاد ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا جس کا مطلب تھا کہ اب وہ غلام حیدر کو اپنا مشورہ تفصیل کے ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا ہے، تیرے تین آدمی قتل ہو چکے ہیں، دو گاؤں پر حملہ ہوا ہے۔ تیری فصلیں تباہ کی جا چکی ہیں اور مزید کی تجھے توقع رکھنی چاہیے کہ ابھی تو ابتدا تھی۔ اب رہی بات ملزموں کی، تو جن ملزموں کو پرچے میں آپ نے نامزد کیا ہے، وہ گرفتار تو ہو سکتے ہیں لیکن اُن کو سزا ہرگز نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ہزار طرح سے ثابت کر دیں گے کہ وہ تو موقع پر موجود ہی نہیں تھے۔ نہ ہی ان قضیوں میں اُن کی ایما شامل تھی۔ تیرے گواہ کبھی یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ جو تیرے آدمی قتل ہوئے ہیں وہ بالکل عین انہی کی ڈانگوں اور برچھیوں کے وار سے قتل ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ پہلے اُن کی ضمانت ہو جائے گی، پھر سال ہا سال کی پیشیوں کے بعد وہ بَری ہو جائیں گے۔ اِس کے بعد ملک بہزاد نے ایک اور حقے کا گہرا گھونٹ بھرا اور دوبارہ بولنا شروع کیا، یہ تو اُس صورت میں ہے جب وہ تجھے آرام سے مقدمے کی پیروی کرنے کا موقع دیں۔ اگر اُنھوں نے آئے دن آپ کی زمینوں، گاؤں اور بندوں کے اُوپر مختلف سمت سے حملوں کا سلسلہ بھی جاری رکھا تو بھتیجے تُو مقدمہ کی پیروی بھی نہیں کر سکے گا۔ یوں ایک آدھ سال میں تیر ی ساری سلطنت کی کمائی لٹ جائے گی اور ٹھٹھہ الگ میں اُڑے گا اور یہ ٹھٹھہ غیر نہیں تیرے اپنے اُڑائیں گے۔ یہی تیری رعایا زمینیں تو تیری کاشت کرے گی اور اُس کا نصف تیرے دشمنوں کو دے گی۔ رہی بات انگریز سرکار کی، تو یہ کبھی ہوتی تھی جب انھوں نے دلی نئی نئی فتح کی تھی۔ اب اِن کے بھی کچھ اور ہی لچھن ہیں۔ کیا تو نہیں دیکھتا؟ یہ انگریزی بابو اور میمیں یہاں کتے لڑانے، زمینیں خریدنے، کبوتر اُڑانے اور کوٹھیاں بنانے کا دھندا کُھلے کھیتوں کرتے ہیں۔ اور یہ سب عیاشیاں رشوت کے بغیر نہیں ہوتیں۔ میرے بھائی کے بیٹے یہ رشوت کا خون اِن کے منہ کو بھی لگ چکا ہے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے، جہاں دیسی دلّا دس لیتا ہے، یہ گورا بیس لیتا ہے۔ مُل میں فرق ہے کرتوت میں نہیں رہا۔ کیا تو نہیں جانتا؟ اگر یہاں انصاف کی رتی ہوتی تو میں کب کا پھاہے لگ چکا ہوتا۔ پھر اب تیرے معاملے میں تو سکھ اور مُسلے دونوں اکٹھے ہو چکے ہیں۔ بندے اُن کے پاس زیادہ، پیسا اُن کے پاس زیادہ، اور حرامزدگیاں اُن کے پاس زیادہ۔ اِدھر تُو اکیلا، نہ تیرا یہاں دوسرا رشتہ دار اور نہ بازو۔ کب تک گرجھوں کی کھردری چونچوں سے بچو گے؟

غلام حیدر تحمل سے ملک بہزاد کی باتیں سن رہا تھا اور معاملے کی سنجیدگی کا اعتراف اُس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ ساری بات سننے کے بعد اُس نے نہایت بردباری سے کہا، چاچا بہزاد ایک بات تو طے ہے کہ نہ میں اپنی سلطنت لٹنے

دوں گا اور نہ سودھا سنگھ اور عبدل گجر کی سانسیں زیادہ دیر چلنے دوں گا۔ نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ میری رعایا میرے دشمنوں کی چلمیں بھرے۔ مَیں وہ کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں کہ لوگ صرف سن کر کانپ جائیں۔ بس تُو یہ بتا کہ کرنا کیا ہے؟

تو سُن، ملک بہزاد بولا، سب سے پہلا کام جو آپ نے کیا ہے، وہ بہت عمدہ ہوا کہ پرچوں کی ایف آئی آر میں تُو نے سیدھے انھی کے نام لکھوائے جن سے ہمیں غرض ہے۔ اِس سے یہ ہو گا کہ سودھا سنگھ اور عبدل گجر عدالت میں خود آنے کے پابند ہیں۔ یہی بات ہمارے کام کو آسان کر دے گی۔ لیکن اِس کے لیے چند باتیں دماغ میں رکھ لو۔ اول بھیگی بلی بن جاؤ۔ چاہے چھ ماہ انتظار کرنا پڑے، پورے صبر سے کرو۔ دوسری بات یہ کہ اپنے دونوں گاؤں میں اپنے لوگوں کو دن رات کے لیے ہشیار کر دو۔ اس طرح کے حملے مزید بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر ایک حملہ بھی اور ہو گیا اور اُس میں تمھارا بندہ مر گیا تو رعایا دل چھوڑ دے گی۔ پھر تم چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکو گے۔ تیسرا کام یہ کرو کہ اپنا تمام مال اور مویشی یا تو اپنے رشتہ داروں کے ہاں بھیج دو یا بیچ دو اور کوئی چیز جو کھلے بازار میں بِک سکتی ہے، وہ تیرے گھر میں نہیں ہونی چاہیے۔ چوتھا یہ کہ اپنی رِیفل کی گولیاں جتنی خرید سکتا ہے خرید لے۔ لیکن اِس کی نمائش کم کر دے اور گورنمنٹ کا بار بار دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ اُسے کہو، جو میرے ساتھ ظلم ہوا ہے، اُس کا حساب لے کر دو۔ اِس کے علاوہ بگھیوں پر سفر کرنا چھوڑ دے۔ والدہ کو اُن کے پیکے چھوڑ آو بلکہ ایسی جگہ بھیج دو جس کے بارے میں کسی کو بھی پتہ نہ ہو۔ تاکہ تجھے دوسری پریشانی کا سامنا نہ ہو۔

اتنا کہنے کے بعد ملک بہزاد کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اِس خاموشی کے وقفے میں سے جگہ بناتے ہوئے غلام حیدر نے سوال کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنی ذات کو تنہا کرنا پڑے گا اور تمام مصروفیات کو حویلی تک محدود کر دینا پڑے گا۔ لیکن زمین کے معاملات کس کو سونپوں؟

زمین کو فی الحال اپنے ہی پاس رکھ اور وقت کے آنے کا انتظار کر، ملک بہزاد نے اپنا پورا جسم لیٹ کر رضائی کے حوالے کرتے ہوئے کہا، کیونکہ یہی زمین تجھے طاقت بھی فراہم کرے گی اور یاد رکھ اپنے معاملات کے بارے میں اپنے خاص الخاص بندے حتیٰ کہ رفیق پاؤلی کو بھی آگاہ نہ کرنا کیونکہ ملازم خیانت کار نہ بھی ہو، تب بھی کمزور ضرور ہوتا ہے۔ اُس کی طاقت پر کبھی بھروسا نہ کرنا۔ اس لیے کہ ملازم کی طاقت بہر حال مالک سے اُدھار لی ہوتی ہے۔ اور ادھار لی گئی چیز کو بعض اوقات استعمال کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ اس لیے معاملہ بگڑ جاتا ہے۔ زندگی نے مجھے تجربہ

سکھایا ہے، انسان وہی کامیاب ہے جو اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرے۔ جو اپنی ذمہ داری دوسرے پر ڈالے گا وہ ہمیشہ اُسے ادھورا نبھائے گا۔ اس لیے سودھا سنگھ اور عبدل گجر کا معاملہ کسی دوسرے کے حوالے نہ کرنا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ اپنا ہتھیار صرف اپنے پاس رکھنا۔ مجھے بہت ایسے سرداروں کے قصے یاد ہیں۔ وہ انہی بازوؤں کے ہاتھوں مارے گئے جنہیں اُنھوں نے اپنے دشمنوں کے لیے تیار کیا تھا۔ جب سب کچھ تیرے خلاف جائے گا، اُس وقت تیرا دایاں بازو تیرے بائیں بازو کا ساتھ دے گا۔ یہ بھی یاد رہے کہ تیری مخبری پر تیرے دشمن کی مخبری غالب نہ آئے۔ اب جارحیت کی طرف قدم بڑھانے کا سلسلہ شروع کرو اور سب سے پہلے انتخاب طاقتور دشمن کا کرو۔ کچہری اور تحصیلوں کے معاملے مجھ پر چھوڑ دو۔ سودھا سنگھ، عبدل گجر اور شریف بودلے کو عدالتوں تک لانا اور غیر محفوظ راہوں پر دوڑانا میرا کام ہے۔ باقی موقع آنے پر میں تم کو سب سمجھاتا جاؤں گا۔

غلام حیدر اور ملک بہزاد کی اس گفتگوں میں دونوں کو ہی وقت کے گزرنے کا احساس نہ ہوا اور رات کا تیسرا پہر چل پڑا۔ جس کی وجہ سے ملک بہزاد کی آنکھوں پر نیند کا بوجھ بڑھنے لگا۔ یہی حالت غلام حیدر کی ہو چلی تو بات چیت ختم کر کے غلام حیدر حویلی کے زنانے حصے میں چلا گیا۔

جاری ہے

قسط نمبر 14

(27)

ہیلے نے آہستگی سے سلور کی دھات کے بنے ہوئے نہایت نفیس اور خوبصورت سگار کیس سے ایک سگار نکالا، اُس کو دو تین دفعہ ناک کے قریب لے جا کر ہلکے ہلکے اپنی سانس اوپر کھینچ کر پہلے سگار کے خوشبودار تمباکو کا سرور لیا پھر اُسے لیمپ کی آگ دے کر جلا لیا۔ اس کے بعد دو تین چھوٹے چھوٹے کش لے کر میز کے دوسری طرف بیٹھے ولیم کو دیکھنے لگا۔ ولیم اس سارے عمل میں خاموش بیٹھا ہیلے کی فطرت کا جائزہ لیتا رہا۔ ہیلے کی عینک کے شیشے نہایت چمکدار اور باریک تھے۔ کمانیاں اور کمانیوں کی زنجیر سنہری دھات کی تھیں۔ اُن کے بارے میں ولیم فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ سونے کی ہیں یا محض سونے کے رنگ میں تیار ہوئی ہیں۔ نیلے رنگ کی ٹائی پر چھوٹے چھوٹے زرد پھول بنے تھے۔ کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے اس لیے ٹائی اُس کی ناف تک لٹکی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ شرٹ بھی ہلکے نیلے رنگ کی بہت ہی عمدہ کپڑے سے بنی تھی، جو ولیم کے قدرے اُبھرے ہوئے پیٹ پر کافی جچ رہی تھی۔ شرٹ کے اُوپر کوٹ سُرمئی رنگ کا تھا، جس پر ہاتھی دانت کے بڑے بڑے بٹن تھے۔ یہ بٹن کوٹ کے ساتھ سلے ہوئے نہیں تھے بلکہ الگ سے نتھی کیے گئے تھے تاکہ دوسرا کوٹ پہننا ہو تو اُتار کر اُس کے ساتھ لگا لیے جائیں۔ ہیلے کی مونچھیں انتہائی سیاہ اور نوکدار تھیں مگر مونچھیں بھاری نہیں تھیں۔ منہ کا دہانہ کھلا ہوا اور چوڑا تھا اور آنکھیں خوفناک حد تک چمک دار تھیں۔ ایسی شخصیت جوانی میں زیادہ خوبصورت نہیں لگتی مگر اِس عمر میں، جس میں اب ہیلے پہنچ چکا تھا، کافی دیدہ زیب ہو جاتی ہے اور سامنے والے کو رعب میں دبا لیتی ہے۔ پچھلی ملاقات میں ولیم کو ہیلے کے چہرے میں ایک سادگی نظر آئی تھی۔ اُس کا تاثر اس دفعہ بدل رہا تھا۔ ہیلے کی آنکھوں اور ماتھے کی تیوریوں میں ایک کٹیلی عیاری اور اُس کے ساتھ اپنے جونیئر سے ایک قسم کی بے نیازی کا تاثر اُبھر رہا تھا۔ جس کا مطلب تھا ہیلے ولیم کو اپنے عہدے کی حیثیت سے خبردار کرنے کے لیے تیار ہو چکا ہے۔ ولیم کو اپنے باپ دادا کی سروس سے مشاہدہ تھا کہ ایک ضلع میں ڈپٹی کمشنر کے عہدے کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ اُسے یہ بھی خوب علم تھا کہ ہندوستانی سول سروس کے انگریز، برطانیہ میں موجود سول سروس کے لوگوں کے سامنے احساس کمتری کا شکار تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لاشعوری طور پر ہر نئے آنے والے آفیسر کو اپنے سینئر ہونے کا باور کرانا ضروری سمجھتے۔ اس سلسلے میں اُن سے عجیب عجیب حرکات سرزد ہوتیں۔ کبھی ضرورت سے زیادہ نصیحتیں، کبھی ڈانٹ اور کبھی اپنی ضروری اور غیر ضروری معلومات کا

وقت بے وقت اظہار۔ ہندوستانی سول سروس میں موجود دیسی لوگوں کی تو خیر اُن کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں تھی کہ وہ تو افسر ہو کر بھی اُن کے غلام تھے اور انگریز افسر کی سینیارٹی کو ضرورت سے زیادہ قبول کر لیتے مگر نئے انگریز افسر یہاں آکر بھی برطانوی شہریوں جیسی حرکتیں کرتے۔ اِس کی وجہ سے ہندوستانی سول سروس کی نوکری میں بزرگ انگریز افسروں کو اپنی عزت اور وقار پر ضرب پڑتی محسوس ہوتی، جو برطانیہ میں افسری کرنے والوں پر ممکن نہیں تھی۔ وہ مرکز میں ہونے کی وجہ سے فیصلے صادر کرنے والوں میں سے تھے اور اکثر شُرفا ہوتے جبکہ ہندوستان میں تو نچلی قوموں کے افسروں کی بہتات ہو چکی تھی اور اس بات کا اندازہ برطانیہ میں موجود بیوروکریسی کو تھا۔ بلکہ ہندوستانی بیوروکریسی کو بھی بخوبی تھا۔ ولیم کو ہیلے اب ویسا ہی احساس کمتری کا شکار آفیسر لگ رہا تھا اور یہ بات ولیم کے لیے خطرناک تھی۔ کیونکہ احساس کمتری میں مبتلا افسر کے ہاتھ سے سوائے نقصان کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ اب ولیم کو ہیلے سے کچھ کچھ ڈر محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ اِس انتظار میں تھا کہ جلد از جلد ہیلے اپنا منہ کھولے اور بات سامنے آئے۔ اُسے اندیشہ تھا، اُسے جلال آباد میں امن وامان کے حوالے سے ضرور ڈانٹ پلائی جائے گی۔

ہیلے نے کچھ دیر کی خموشی کے بعد بالآخر مُہر توڑی اور بولا، نوجوان آپ فیلڈ میں آکر کیا محسوس کر رہے ہیں؟

بہت اچھا سر، مزا آرہا ہے کام کرنے کا، ولیم نے تحمل سے جواب دیا۔

میں نے آج تک آپ کی بھیجی گئی تمام فائلوں کا مطالعہ کیا ہے، ہیلے نے گفتگو میں اطمنان پیدا کرتے ہوئے کہا، ولیم آپ بہت تیز دوڑ رہے ہیں۔ اِس میں ساتھ دینے والے ہانپ جائیں گے یا شاید آپ کی ہی سانس اُکھڑ جائے، اس کے بعد اس نے میز کے ایک کونے پر پڑی تانبے کی

خوبصورت گھنٹی کا بٹن دبا دیا جس کے بعد فوراً ایک ہندو ملازم اندر داخل ہوا، تحصل جلال آباد کی فائلیں لاؤ۔

ملازم ہیلے کا حکم سن کر باہر نکل گیا۔ ولیم نے سوچا ہیلے کا خاص جلال آباد تحصیل کا نام لینے کا مطلب یہ باور کرانا ہے کہ اُس کے ماتحت فیروز پور کی پوری پانچ تحصیلیں ہیں۔ جن میں سے ایک جلال آباد کی تحصیل بھی ہے۔ چناچہ ولیم سمجھ لے کہ ڈپٹی کمشنر اور اسسٹنٹ کمشنر میں بہت فرق ہے۔ ولیم انہی خیالات میں تھا کہ ہیلے کی دوبارہ آواز سُنائی دی، میں نے آپ کی تمام فائلوں کا مطالعہ کیا ہے۔ آپ بہت عمدہ کام کر رہے ہیں لیکن ہمیں بہت سے کام ایک ہی وقت میں نہیں چھیڑ دینے چاہییں۔

ولیم نے سر اُٹھا کر دیکھا تو جلال آباد سے بھیجی گئیں چاروں فائلیں میز پر پڑی تھیں، جنہیں ملازم چند ثانیے پہلے رکھ کر جا چکا تھا اور اُن پر ہیلے اب گفتگو کرنا چاہ رہا تھا۔ ولیم نے ایک لمحے کے لیے ہیلے کی طرف دیکھا اور اپنے لہجے میں تھوڑی سی خوشامد کا نمک ڈال کر بولا، سر میرا کام تو صرف یہ ہے کہ میں تحصیل میں گورنمنٹ اور عوام کے جو مسائل موجود ہیں، اُن پر آپ کی توجہ مبذول کرادوں۔ باقی تو جو آپ کہیں گے وہی ہو گا، میں تیز دوڑوں گا بھی تو تحصیل سے باہر نہیں جا سکتا۔

ہیلے ولیم کے اس جواب سے ہلکا سا مسکرا دیا اور دوبارہ بولا، ولیم جانتے ہو؟ مجھے اُس وقت اپنی خوشامد اچھی لگتی ہے جب کوئی میرا انگریز جونیر کرتا ہے ورنہ دیسی افسر تو بنے ہی خوشامد کے لیے ہیں۔ بہر حال یہ ایک بات تھی، ہم اپنے مقصد کی طرف آتے ہیں۔آپ سر دست اپنی ترجیحات ایک یا دو کاموں کو دو۔ ہم جانتے ہیں،اِن علاقوں میں اتنے مسائل ہیں جن پر برطانیہ حکومت اگر دو سو سال تک مسلسل کام کرے تو بھی وہ ان کے رنگ کی طرح صاف نہیں ہو سکتے لیکن یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ میں ایک فائل آپ کو دے رہا ہوں (ولیم کی طرف ایک فائل بڑھاتے ہوئے، جسے ولیم نے ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیا اور کھولنے لگا) اس میں کچھ ہندو بنیوں کے نجی سود در سود کے نظام اور اُن کے ہاتھوں پنجاب کے غریب دیہاتیوں کے استحصال کی کارگزاریاں ہیں۔ یہ وہ لعنت ہے جس کی ہم نے سختی سے حوصلہ شکنی کرنی ہے۔ یہ بنیے نا صرف پورے پنجاب کے غریب اور مالدار لوگوں کو رہن رکھے ہوئے ہیں بلکہ ہندوستان بھر میں اِن کی قینچیاں نوابوں سمیت ہر ایک کی جیب پر چل رہی ہیں۔اس کے بعد ہیلے ولیم کی طرف جھکتے ہوئے بولا، میں یہ بات آپ کو نہ تو فائل پر لکھ کر دے سکتا ہوں اور نہ ہی کسی اور طرح سے سمجھا سکتا ہوں، صرف زبانی کہہ سکتا ہوں۔ لیکن اس کو لکھے ہوئے احکام سے زیادہ اہم سمجھو۔ تمھیں یہاں بلانے کا سب سے اہم مقصد یہی تھا۔

ولیم ہیلے کی خوشامد والی طنز سے اتنا گھبرا گیا تھا کہ کچھ لمحے اُس کا دماغ بھی ٹھکانے پر نہیں رہا تھا لیکن جب ہیلے نے اپنی گفتگو آگے بڑھائی تو اُس کی خجالت جلد ہی صاف ہو گئی۔ اُسے اس گفتگو سے ایک گونہ اطمنان سا ہوا۔ وہ جس واقعے سے ڈر رہا تھا، اُس کے متعلق خوف رفع ہو گیا اور اب بغیر جھجھک کے بولا، سر عوام کا استحصال تو اور بھی کئی رنگ میں جاری ہے لیکن ان بنیوں پر ہی خاص توجہ دینے کی ایسی کون سی مجبوری لاحق ہو گئی۔

بہت سی، ہیلے نے وضاحت کرتے ہوئے کہا، ان کی وجہ سے حکومت کو بھی نقصان ہو رہا ہے۔ زمین داروں سے سود کی رقم ادا نہیں ہو پاتی، نتیجہ یہ کہ ان کا کیس عدالت میں آجاتا ہے اور عدالت قرضے کے عوض زمینداروں کے مالیاتی حقوق بنیوں کے نام کر دیتی ہے۔ بنیے خود زمین داری سے واقف نہیں۔ وہ سب کچھ مزارعوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ مزارع وہی ہوتے ہیں، جو ان بنیوں کے مقروض ہیں۔ چنانچہ یہی لوگ اُن زمینوں کی کاشت کرتے ہیں لیکن انہیں فصل سے بہت کم حصہ ملتا ہے اور اُن زمینوں میں مزارع دلچسپی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس سے علاقے میں کاشتکاری کا نظام آگے پنپ نہیں رہا۔ دوسرا بڑا نقصان یہ کہ اِن کے نجی بنکاری نظام نے سرکاری بنکوں کے نظام میں خلل ڈال رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے کئی بنکوں کا دیوالیہ نکل گیا ہے۔ اس عمل سے گائے کا دودھ بکری کے تھنوں میں منتقل ہو رہا ہے۔

تو سر اس میں مَیں کس طرح اپنا وجود ثابت کر سکتا ہوں؟، ولیم سمجھ گیا تھا کہ عوام کا استحصال تو خیر ایک بات تھی۔ اصل مقصد تو ڈپٹی کمشنر صاحب نے آخر میں بتایا لیکن اُس نے سوچا مُردے کی وراثت پانے والوں سے بچ کر مرنے والے کا اُسترا ابھی گورکن کو مل جائے تو یہ بھی غنیمت ہے۔

تم مالیات کے نظام میں پٹواری کے دخل اور زمین کی خرید و فروخت میں ٹیکس کو جتنا ہو سکے زیادہ فروغ دو۔ اگرچہ اِس کے نفاذ کے معاملے میں آپ کو تمام ہدایات تحریری ہی وصول ہوں گی۔ لیکن ایسا ہوتا ہے کہ لوگ باہر ہی باہر زمین فروخت کر دیتے ہیں، جس کا اندراج کاغذات میں نہیں ہوتا۔ ہوتا یہ ہے کہ نہری پانی کا مالیہ وہ ادا کرنا شروع کر دیتا ہے جس نے زمین مول لے لی ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ زمین خود بخود مالیہ ادا کرنے والے کے نام ہو جاتی ہے، جو عموماً بنیا ہوتا ہے۔ ہم اس نظام کو مشکل بنا رہے ہیں اور ہر حالت میں زمین خریدنے والے پر بھاری ٹیکس لگا رہے ہیں۔ وہ کسی بھی صورت میں بغیر گورنمنٹ کو ٹیکس دیے زمین اپنے نام نہیں کروا سکتا۔ دوسری طرف بہت سے فیصلے چونکہ تحصیل سطح پر آپ نے خود ہی کرنے ہیں۔ اِس لیے کوشش کرنا کہ بنیوں کو کم سے کم اُن فیصلوں میں فائدہ پہنچے۔ باقی تمام معاملات اِس بارے میں مالی تحصیل دار کو پتا ہے۔ وہ آپ کو مشورے دیتا رہے گا۔

ولیم تھوڑی دیر کے لیے چُپ بیٹھا رہا پھر مسکرا کر بولا، سر ایک کافی کا کپ مزید مل جائے گا؟

وائے ناٹ، ہیلے نے ایک بار پھر گھنٹی کا بٹن دباتے ہوئے کہا، اور ہاں ایک بات یاد آئی، آپ کوئی بھی کام براہِ راست خود کرنے کی کوشش نہ کیا کریں، مختلف کاموں کے لیے آپ کے پاس مختلف آفیسر ہیں بس انہی سے سروکار رکھیں

اور زیادہ دوروں سے پرہیز کریں۔ چوری ڈکیتی اور امن وامان پولیس کا کام ہے۔ آپ اُن کے لیے تمام ہدایات ڈی ایس پی کو دیا کریں۔ مَیں حیران ہوں یہ تمام چیزیں آپ کی ٹریننگ کا حصہ تھیں لیکن آپ پھر بھی جودھا پور اور جھنڈو والا کے چکر لگاتے پھرے۔ یہ پولیس کا کام ہے اُن کو کرنے دیں۔

ولیم کو ہیلے کے یہ جملے سُن کر ایک دفعہ پسینہ آگیا اور اُسے لگا جیسے اصل میں اسی لیے بلایا گیا ہے، باقی سب باتیں بہانہ تھیں۔ لیکن یہ بات کی سمجھ نہیں آئی کہ آیا ڈپٹی کمشنر صاحب ملزمان کی مدد کرنا چاہتے یا اُسے کسی نقصان سے بچانے کے پیشِ نظر سرزنش کر رہے ہیں۔ ولیم نے اس بات کو ذرا کھول دینا مناسب سمجھا اور کہا، سر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، کچھ دنوں سے جلال آباد میں شر پسندوں نے قتل و غارت کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ میں نے اُس کے لیے ڈی ایس پی لوئیس کو کچھ احکامات جاری کیے ہیں، جن میں سودھا سنگھ کے مال کو ضبط کرنے کے احکام بھی ہیں۔ اُن کے لیے آپ کی منظوری چاہیے، یہ کہ کر ولیم نے سودھا سنگھ کی فائل جو ڈی ایس پی لوئیس نے آج صبح ہی ولیم کے حوالے کی تھی، ہیلے صاحب کے آگے کر دی اور ولیم اُس وقت حیران رہ گیا جب ہیلے نے اُس پر بلا تردد دستخط کر دیے، تو گویا ملزموں کی پشت خالی تھی۔

فائل پر دستخط کے بعد ولیم قدرے پُر سکون ہو گیا۔ اُس نے کافی کی چسکیوں کے ساتھ دوسرے مسائل پر گفتگو شروع کر دی، جن میں دو مسئلے سب سے اہم تھے اور انہی پر ولیم اصل میں کام کرنا چاہتا تھا۔ اُن میں سے ایک تعلیم اور دوسرا جلال آباد میں نہری نظام کی مزید بہتری اور بڑے پیمانے پر کاشتکاری کو فروغ دینے کے لیے بنگلہ نہر کی تجویز۔ جسے ہیلے نے بہت سراہا اور اُس پر جلد از جلد رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی اور کہا کہ وہ چاہے گا، اسی ماہ کی چیف سیکرٹری صاحب سے ملاقات پر اُن سے اس کی منظوری لے لے۔ الغرض اِن مسائل پر ایک گھنٹے تک دونوں کے درمیان بات چیت ہوئی، جو نہایت خوشگوار ماحول میں تھی۔ اُس کے بعد ولیم نے اجازت چاہی اور ابھی اُٹھنے ہی لگا تھا کہ ہیلے نے ولیم کو روک کر پھر ایک جملہ کہ دیا۔

ولیم کیا نام ہے اُس لڑکے کا،، غلام حیدر،، ہاں اُس کو انصاف ملنا چاہیے۔ لیکن اُس کی ریفل دو مہینے کے لیے قبضے میں لے لو اور اُس پر خاص نظر رکھو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ملزموں کے ساتھ نرمی برتو۔ شر پسندوں کو سختی سے دبا دو۔ یہ کہ کر ڈپٹی کمشنر صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور ساتھ ہی ولیم بھی اُٹھ گیا۔

اب بارہ بج گئے تھے اور کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ اس لیے دونوں کھانے کے کمرے کی طرف چل دیے۔ اِسی دوران ولیم سوچنے لگا کہ خدا کی پناہ ہیلے کتنا چالاک آدمی ہے۔ اُس نے ہرگز پتا نہیں چلنے دیا کہ اصل میں اُسے کس لیے بلایا گیا ہے۔ تمام اہم مسائل پر اُس نے اس طرح گفتگو کی کہ وہ اُس کے اصل ارادوں سے بالکل بھی واقف نہیں ہو سکا۔

(28)

ڈی ایس پی لوئیس کی گھڑی صبح کے چھ بجا رہی تھی جب اُنھوں نے جھنڈووالا پر یلغار کی۔ اس بات کا پولیس کو پتا تھا کہ دماکے قتل کی خبر سنتے ہی سردار سودھا سنگھ پٹیالہ جا چکا ہے اور فی الحال اُس کے گرفتار ہونے کے امکانات صفر ہیں۔ لیکن پرچے میں کچھ اور لوگوں کے نام بھی درج تھے اس کے علاوہ سردار سودھا سنگھ کا بھائی سردار نتھا سنگھ بھی وہیں موجود تھا، جس کی گرفتاری اِس کیس میں کافی کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ علاوہ ازیں جھنڈووالا پر یہ چھاپہ اور بھی بہت سے عوامل کو سامنے لا سکتا تھا۔ اگر اس وقت بھی چھاپہ نہ مارا جاتا تو پورے علاقے میں لا اینڈ آڈر کا خطرناک تاثر پیدا ہو جاتا اور کہا جاتا کہ پولیس سردار سودھا سنگھ پر ہاتھ ڈالنا تو ایک طرف جھنڈووالا میں وارنٹ گرفتاری لے کر داخل بھی نہ ہو سکی۔

لوئیس صاحب خود جیپ پر سوار تھے جن کے ساتھ انسپکٹر متھرا، انسپکٹر مدن لال اور تھانیدار بلرام تھا۔ اِن کے علاوہ چار تھانوں کے چالیس گھوڑ اسوار تھے، جن میں سب انسپیکٹر، حوالدار اور سپاہی سب شامل تھے۔ پولیس کے سپاہی گھوڑوں پر اسوار کچھ جھنڈووالا کے باہر ناکہ لگا کر کھڑے ہو گئے تاکہ ملزم بھاگ نہ سکیں اور باقی گاوں کے اندر گلیوں میں پھیل گئے۔ ڈی ایس پی لوئیس اور باقی تمام عملے نے سودھا سنگھ کی حویلی کا گھیراو کر لیا۔ جھنڈووالا میں اِس قدر انگریزی افسر اور دیسی پولیس لوگوں نے پوری زندگی تو کیا خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔

اِکا دُکا لوگ جاگ اُٹھے تھے، جو ادھر اُدھر کام میں اور اپنی فصلوں میں ہل وغیرہ جوتنے کے لیے نکل رہے تھے۔ اِن لوگوں میں سے کچھ اُٹھنے کے باوجود نیند کے خمار میں تھے۔ اُن کی آنکھیں ابھی پوری طرح نہیں کھلی تھیں۔ کچھ بیل ہنکا کر لے جا رہے تھے۔ کوئی کسئی اور درانتی لے کر اور گدھی پر واہنا رکھے آنکھیں ملتے سانجرے ہی سانجرے چارہ لینے جا رہا تھا۔ اِنہیں اِس ناگہانی آفت کا کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے؟ جب جاگنے والوں نے جیپ کی آواز اور گھوڑوں کی دڑ دڑ سُنی تو اُنھوں نے سونے والوں کو جلدی جلدی اُٹھایا اور سب لوگ باہر کی طرف بھاگنے لگے۔ باہر ہر طرف فرنگی پولیس کے پہرے اور کالی نال والی بندوقیں ہی بندوقیں تھیں۔ پولیس مخبروں کی دی ہوئی اطلاع کے

مطابق کئی گھروں میں گھوڑوں سمیت داخل ہو رہی تھی اور بندوں کو گھسیٹ کر باہر نکال رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ بیتوں اور چابکوں سے اُن کی پٹائی بھی جاری تھی۔ اِن گرفتار ہونے والوں میں تھانیدار بلرام کے مطابق وہ لوگ تھے، جو جودھا پور کے چراغ دین کے قتل اور مونگی کی تباہی میں شامل تھے۔ اِن کے ناموں اور گھروں کی مخبری دیدار سنگھ کی رپورٹ کے مطابق جھنڈو والا ہی کے ایک شخص نے کی تھی۔

ملزموں کو نہایت بے دردی سے پیٹا بھی جا رہا تھا کہ اُن پر انگریزی قانون کی اچھی طرح سے دہشت طاری ہو جائے اور مکمل خوف وہراس پھیل جائے۔ جھنڈو والا میں ایک طرح سے یک دم قیامت برپا ہو چکی تھی۔ حملے کی شدت اور خوف سے عورتوں نے اونچی اونچی چیخنا اور رونا دھونا شروع کر دیا۔ مرد ادھر اُدھر بھاگنے لگے لیکن اب پولیس بھی، جو ہاتھ میں آتا پکڑ پکڑ کر کوٹا پا پھیرنے لگی۔

اس سارے عمل کے دوران ڈی ایس پی لوئیس سودھا سنگھ کے گھر کے سامنے سات آٹھ افراد کے عملے کی حفاظت میں کھڑا آرام سے اِس پورے منظر سے محظوظ ہو رہا تھا۔ جبکہ سنتری ملزموں کو پکڑ پکڑ کر اُس سے کچھ فاصلے پر ڈھیر کر رہے تھے۔ چھ سات سپاہی اور تھانیدار سودھا سنگھ کی حویلی میں داخل ہو چکے تھے تاکہ گھر کی مکمل تلاشی لی جائے۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ سودھا سنگھ وہیں پر موجود ہو اور یہ ہوائی اُڑا دی گئی ہو کہ وہ پٹیالا چلا گیا ہے۔ یقیناً تھانیدار اکیلا آتا تو اُس کی جرات نہیں تھی کہ وہ سودھا سنگھ کی حویلی میں داخل ہوتا لیکن اب تو تحصیل کا سب سے بڑا انگریز پولیس افسر اُن کے ساتھ تھا۔ اِس لیے سپاہی، حوالدار اور تھانیدار سب ہی دلیر ہو گئے۔ وہ سودھا سنگھ کی حویلی کی چارپائیاں اور موڑھے اُلٹ پلٹ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں سودھا سنگھ کے بھائی نتھا سنگھ کو بھی ڈپٹی صاحب کے سامنے لا کر پھینک دیا، جس کا ڈیل ڈول یوں تو بھائی ہی کی طرح تھا لیکن شخصیت میں رعب خاک نہیں تھا۔ فقط داڑھی کی لمبائی اتنی تھی کہ سودھا سنگھ کی داڑھی اُس کے نصف میں ہو گی۔ نتھا سنگھ لوئیس کے قدموں میں اِس طرح پڑا تھا جیسے چھوٹا سا بچہ پیاس سے بلک رہا ہو اور یہ ایسی گستاخی تھی، جس کو دیکھ کر پورے گاؤں والوں کے پسینے چھوٹ گئے۔ اُن کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ انگریز سرکار اِتنے غصے میں ہو گی۔ ابھی لوئیس صاحب نتھا سنگھ کی طرف متوجہ ہی تھے کہ کچھ سپاہی بیت سنگھ کو بودیوں سے پکڑ کر لے آئے۔

اب دن کا سورج سامنے چمک رہا تھا اور پندرہ بندے ہاتھ بندھے لوئیس صاحب کے آگے پڑے تھے، جن پر ڈنڈوں اور چابکوں کی لگاتار بارش نے اُن کے جسم بھی اُدھیڑ کر رکھ دیے تھے۔ جھنڈو والا کے لوگوں کو یہ تو پتا تھا کہ پولیس

کسی دن اُن پر ضرور چڑھائی کرے گی لیکن اُنہیں یہ گمان بھی نہیں تھا کہ معاملہ اِتنا سنجیدہ ہو جائے گا اور فرنگی اُن پر یوں لوہے کے گھوڑے اور آگ کے چابک لے کر چڑھ دوڑیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ اب ضرورت سے زیادہ حوصلہ چھوڑ بیٹھے۔ انگریز سرکار کی اتنی سختی دیکھ کر اُن کے اوسان جاتے رہے اور پیشاب خطا ہو گئے۔ سوائے رونے چیخنے اور واویلا کرنے کے اُنہیں اب کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

چھاپے کے شروع میں ایک دو عورتوں نے سپاہیوں کے ساتھ ہاتھا پائی کرنے کی کوشش بھی کی لیکن جب اُن پر بھی ڈنڈے چل گئے تو وہ بھی سہم کر چُپ ہو بیٹھیں۔ وہ سوچ رہے تھے، اچھا ہی ہوا سودھا سنگھ پٹیالا چلا گیا ورنہ آج اُس کی ساری عزت اور رعب فرنگی سرکار پاجامے کے رستے نکال دیتی پھر جھنڈو والا کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ لوگ اگر کسی کی ذلت کی مثال دیتے تو وہ جھنڈو والا کا نام لیتے۔

پولیس کا چھاپہ انتہائی صبح کے وقت پڑا تھا، اس لیے کافی لوگ سوئے ہوئے اچانک دبوچ گئے۔ بعض کو پولیس کی اتنی زیادہ نفری کے سامنے بھاگنے کی بھی جرات نہیں ہوئی۔ وہ جتنا بھی تیز دوڑتے، گھوڑوں سے آگے نہیں نکل سکتے تھے اور ہاتھ آنے پر پولیس کا غصہ برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے۔ پھر وہ پٹائی ہوتی کہ گرو جی بھی دنگ رہ جاتے۔ اِس کے علاوہ پکے مجرم بھی سمجھ لیے جاتے۔ چنانچہ اُنہوں نے بھی نہ بھاگنے میں ہی مصلحت جانی۔

کافی دیر تک یوں ہی پکڑ دھکڑ جاری رہنے کے بعد جب گاؤں کے مرکز میں ایک مجمع لگ گیا تو لوئیس صاحب نے تھانیدار کو حکم دیا کہ سودھا سنگھ، جگبیر سنگھ اور دوسرے نامزد مجرموں کا مال مویشی اور جو مخبری کے مطابق مشکوک مجرم ہاتھ نہیں آ سکے، اُن کا بھی مال آگے رکھ کے پھاٹک لے چلو۔ جو ملزم پکڑے گئے ہیں، اُن کا مال لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جب سب کچھ نپٹا لیا گیا تو لوئیس صاحب، جن کے سر پر پولیس کی ستارے والی ٹوپی اتنی بارعب ہو چکی تھی کہ اب اُسے بھنگی بھی پہن لیتا تو واہگرو سے زیادہ باعزت سمجھا جاتا، اُس نے اپنے دائیں پاؤں کے جوتے پر ہاتھ میں پکڑی ہوئی بیت سے ٹھوہکا لگاتے ہوئے گاؤں والوں کو مخاطب کر کے کہا، اہلیانِ جھنڈو والا، مَیں آپ کو دو دن کا وقت مزید دیتا ہوں، جن ملزمان کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں، تھانیدار اُن کے نام آپ کو پڑھ کر سُنا رہا ہے۔ اگر اُنہوں نے دو دن تک اپنی گرفتاری نہ دی تو یاد رکھو، سرکار اُن کا مال لے کر جا رہی ہے۔ سرکار اُن کا یہ مال نیلام کرنے کی مجاز ہو گی اور اُس کی رقم اپنے خزانے میں داخل کر لے گی۔ اِس کے علاوہ اُن کے گھروں کو کھُدوا دیا جائے

گا اور بیوی بچوں کو جلال آباد تھانے لے جا کر بند کر دیا جائے گا۔ یہ کہ کر لوئیس صاحب انسپیکٹر متھرا کی طرف مڑے اور بولے، متھرا صاحب آپ اِن سب کو اپنی نگرانی میں تھانے پہنچاؤ اور کل میٹنگ کے لیے تھانیدار کو ساتھ لے کر پہنچ جاؤ۔ ہم دیکھتے ہیں، کس طرح گورنمنٹ کے قانون کے ساتھ مذاق اُڑایا جاتا ہے اور سودھا سنگھ کتنا بڑا سورما ہے۔

اس کے بعد لوئیس صاحب جیپ پر بیٹھ گئے اور ڈرائیور نے انجن کی گراری کا رسّہ کھینچ دیا اور پورے بارہ بجے پولیس مجرموں کے قافلے کے ساتھ جلال آباد روانہ ہو گئی۔

تمام مجرم ہاتھ بندھے ایک گڈ پر بٹھا لیے۔ جس کے آگے دو بیل جُتے ہوئے تھے، جو اُسی گاؤں سے لیے تھے۔ گڈے کو بیس گھڑ سوار سپاہیوں کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ جن میں سے اکثر کے پاس لمبی نال والی توڑے دار بندوقیں تھیں۔ جب سپاہی فوجا سیو کے گھر کے سامنے سے گزرے تو فوجا سیو دروازے کے باہر کھڑا اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

حقیقت میں اُنہیں اِس طرح قید میں بندھے ہوئے جاتے دیکھ کر فوجا سیو کا جی اندر سے زار زار رو رہا تھا۔ جیسے کہ رہا ہو دیکھا، میں نہ کہتا تھا اِس کا نتیجہ بہت بُرا ہو گا لیکن کیا کیا جائے۔ اگر سرداروں کو شراب پینے کے بعد کچھ ہوش بھی رہتا تو آج اِس گڈ میں سرداروں کی بجائے فرنگی سوار ہوتے لیکن اب تو اِس کی حسرت ہی کی جا سکتی تھی۔ وقت گزر جائے تو سوائے سیاپے کی چوٹوں کے کچھ نہیں بچتا۔ اور حقیقت میں یہ مصیبت اُن پر جگبیر کی وجہ سے آئی تھی اور اب وہ حرامی سودھا سنگھ کے ساتھ پٹیالا میں بیٹھا مزے کر رہا تھا اور اِن غریبوں کو پھنسا دیا۔ پولیس مال مویشی اور ملزموں سمیت جھنڈو والا سے نکل گئی تو عورتوں کو رونے کا موقع مل گیا۔ اُنھوں نے بین کر کر کے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ بعض دو ہتھڑ پیٹنے لگیں۔ پورے گاؤں کی فضا انتہائی سوگوار ہو چکی تھی، جیسے سب گھروں میں ماتمی صفیں بچھ گئی ہوں۔ یہ دیکھ کر فوجا سیو آہستہ آہستہ چلتا ہوا گاؤں کے اُسی مرکز میں آیا جہاں تھوڑی دیر پہلے سب سے بڑا پولیس والا فرنگی کھڑا تھا۔ فوجا سئیو کو دیکھتے ہی اُس کے گرد تمام گاؤں کا مجمع لگ گیا۔ خاص کر عورتیں پیٹ پیٹ کر اپنا بُرا حال کر رہی تھیں۔ باقی لوگ یا تو طرح طرح کے تبصرے کر رہے تھے یا بولنے والوں کو فقط ٹک ٹک دیکھے جا رہے تھے۔ اس تمام صورت حال میں صرف فوجا سیو ہی تھا جس کے ہوش کچھ ٹھکانے پر تھے اور گاؤں والوں کے لیے دلاسے اور ڈھارس کی جگہ تھی۔ فوجا سیو نے جب دیکھا کہ سب اُسی کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ اب جو اُپا کرنا ہے، اُس کے بارے میں بتائے، تو فوجا سیو تمام متروں کی طرف دیکھ کر تلخی سے بولا، مترو، ہُن شیر بنو، جو کجھ تسیں کرنا سی، اوہ

کر لیا، ہن تاں شریکاں دی واری آ، ہن واری دی سٹ مرد بن کے سہوو۔ پھر تھوڑی دیر چپ کرنے کے بعد دوبارہ بولا، بیرو گھبران دی کوئی گل نہیں۔ ہُن آپاں مرداں طرحاں مقابلہ کراں گے۔ اَتے جلد ہی اپنے متراں نوں فرنگیاں کولوں لے کے آجاں گے۔ مَیں اَج ہی سردار ہرے سنگھ نوں جا کے مل ناں۔ باقی مال تاں آن جان آلی شے آ۔ اوندا دکھ نئیں کرنا۔ اِس کے بعد سردار فوجا سئیو نے دیون سیو کو آواز دے کر کہا، دیون پُت میری گھوڑی تے ساز کس دے۔ مینوں ہُن فیروز پور جانا ای پے گیا۔ بھجیاں باہواں تاں سیاناں کیہیا وا گل نوں ای اوندیاں۔ اُس نے سکھ عورتوں کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا، کوئی گل نئیں دھیوئے جے سودھا سنگھ اَتے جگبیر تُہانوں مشکل وچ چھڈ کے پٹیالا نس گئے نے۔ مَیں تہاڈے باپو دی تھاں تہاڈے نال آں۔ سردار ہرے سنگھ کولوں اودوں ہی اُٹھاں گا۔ جَد مال تے بندے جھنڈو والا اپنے گھر آجان گے، تسیں فکر ناں کرو۔

جاری ہے

قسط نمبر 15

(29)

مولوی کرامت سکول کے بڑے دروازے میں داخل ہوتے ہی اُس کی بلند و بالا سُرخ عمارت کی ہیبت میں دب کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے پہاڑ جیسی سرخ عمارت بڑی بڑی حویلیوں کا سر نیچا کر رہی تھی۔ جس کے کئی کئی دالان اور بیسیوں کمرے اِدھر اُدھر پھیلتے چلے گئے تھے۔ دائیں بائیں کے کمروں کے اندر راہداریاں اور راہ داریوں میں بلند و بالا تیں درجے کی ڈاٹ والے در۔ اِن دروں کے ستون گول اور اونٹوں کی قامت سے دگنے تھے۔ واقعی انگریز سرکار نے بڑے پیسے خرچ کر کے یہ عمارت بنائی تھی۔ جس کے ایک کونے میں چھوٹا سا گرجا بھی تھا۔ بڑے بڑے گھاس کے میدان اور اُن کے کناروں پر لگے ہوئے ٹاہلیوں، نیم، پیپل اور شریہنہ کے درخت چھاؤں کیے ہوئے تھے۔ کچھ بچے قطار بنا کر ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ اُن سب نے ملیشیے کی سیاہ رنگ کی قمیضیں اور شلواریں پہن رکھی تھیں۔ بچوں کے سروں پر پگڑیاں تھیں۔ کچھ ٹوپیاں پہنے ہوئے۔ ایک دو بچے ننگے سر بھی نظر آئے۔ مولوی کرامت کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اب کس سے ملے اور کیا کرے؟ وہ دیر تک گیٹ کے اندر داخل ہو کر سکول کے اُس چوکیدار کے پاس کھڑا رہا، جو گیٹ پر ڈیوٹی کے لیے بیٹھا تھا۔ چوکیدار اپنی ہی ذات میں مگن، سر نیچا کیے، کچھ منہ کے اندر ہی اندر گنگناتا رہا اور نظر اُٹھا کر مولوی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ یہ چوکیدار ایک سکھ نوجوان لڑکا تھا، جس کے سر پر اتنی بڑی پگڑی تھی کہ پورے جسم کو دبا رہی تھی۔ جب اُس نے مولوی پر کچھ توجہ نہ دی تو مولوی کرامت نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، سردار صاحب، ہیڈ منشی صاحب سے ملنا ہے اور جیب سے نکال کر وہ رقعہ دکھایا، جو تُلسی داس نے مولوی کرامت کو دیا تھا اور کہا تھا کہ جا کر منشی بھیم داس کو دکھا دینا۔ باقی وہ سب کچھ تمھیں سمجھا دے گا۔ چوکیدار نے مولوی کی آواز پر پہلی دفعہ سر اُٹھا کر غور سے دیکھا اور اُس کے لباس، داڑھی، پگڑی اور چہرے کی سادگی اور نفاست سے متاثر ہو کر بولا، شاہ جی کیہ کہنا ہیڈ منشی نوں؟

مَیں یہاں منشی بن کے آیا ہوں، اُسے رپورٹ کرنی ہے۔

یہ سُن کر وہ جلدی سے اُٹھا اور بِنا کچھ بولے مولوی کے آگے چل دیا۔ مولوی کرامت اُس نوجوان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا، یہاں تک کہ ایک کمرے کے سامنے جا کر، جس کی چھت پر دو جھنڈے لگے تھے۔ ایک برطانیہ سرکار کا اور دوسرا پنجاب ایجوکیشن منسٹری کے مونو گرام کا، وہاں پہنچ کر نوجوان نے مولوی کرامت سے کہا، مولوی صاحب ہیڈ ماسٹر

صاحب اندر بیٹھے آ۔

یہ کہ کر وہ وہیں سے اُلٹے قدموں واپس ہو گیا۔ جبکہ مولوی کرامت آگے بڑھ کر کمرے میں داخل ہو گیا اور جھٹ اسلام و علیکم کہ دیا۔ اندر دو تین منشی اور بھی بیٹھے تھے لیکن مولوی کرامت نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہیڈ منشی وہی ہے جو میز کی دوسری طرف بیٹھا ہے۔ کمرہ اندر سے کافی کھلا اور صاف ستھرا تھا۔ جس میں آٹھ دس لکڑی کی کرسیاں تھیں۔ ایسی کرسیاں وہ پہلے بھی ولیم کے دفتر میں دیکھ چکا تھا۔ سامنے ایک چوکور لکڑی کی ہی میز تھی، جس پر نیلے رنگ کا میز پوش بچھا تھا۔ اُسی میز کی دوسری طرف ہیڈ منشی صاحب بیٹھے تھے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی، جن پر بڑے اور موٹے شیشوں کی عینک چڑھی تھی۔ رنگ سیاہی مائل مٹیالا اور سر پر سفید رنگ کی دو پلّی ٹوپی اِس طرح دبا کے جمائی تھی کہ پورا سر اُس میں چھپ گیا تھا۔ منشی صاحب خود بھی کرسی پر بیٹھے میز کے پیچھے گویا چھپے ہوئے تھے۔ صرف اُن کی گردن سے اُوپر کا حصہ ہی نظر آرہا تھا۔ اُس کے اس طرح بیٹھے ہونے سے قامت کا اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ ساڑھے چار فٹ سے زیادہ نہیں ہو گا۔ لیکن آنکھوں سے اطمنان اور سکون صاف جھلکتا تھا۔ اِس بات سے ثابت ہو رہا تھا کہ ہیڈ منشی کو ہر طرف سے مکمل سکون ہے اور اُن کے خانگی اور روزی روٹی کے معاملات صحیح چل رہے تھے۔ مولوی کرامت نے سوچا کہ اب اُس کے حالات بھی جلد ہی اللہ نے چاہا تو اِسی منشی جیسے ہو جائیں گے۔

رقعہ ابھی تک مولوی کرامت کے ہاتھ ہی میں تھا۔ اِس سے پہلے کہ ہیڈ منشی صاحب سلام کا جواب دیتا، مولوی کرامت نے وہ رقعہ اُن کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ منشی نے رقعہ اُٹھا کر کھولا اور جیسے ہی اُس کی تحریر پڑھی، اُٹھ کر مولوی کرامت سے ہاتھ ملایا اور کہا، بیٹھیں مولوی صاحب، آپ کے بارے میں مجھے دو دن پہلے اطلاع مل چکی تھی اور میں آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ پھر ایک کُرسی کی طرف اشارہ کر کے، مولوی صاحب تشریف رکھیں۔

مولوی کرامت ہیڈ منشی کا اشارہ پا کر ایک کُرسی پر بیٹھ گیا لیکن اضطراری طور پر اِس طرح بیٹھا جیسے جمعے کا خطبہ دینے کے لیے منبر پر بیٹھا ہو۔ ہیڈ منشی صاحب بڑے کائیاں تھے فوراً بھانپ گئے اور بولے، مولانا آپ کہیں پیش امام تھے؟

جی حضور، تین پشتوں سے ہم یہی کرتے ہیں، ضلع قصور کے ایک گاؤں راڑے میں پیش امامت کرتا ہوں۔

تعلیم کی سرکار میں کوئی واقف تھا، جس نے آپ کی سفارش کی؟

بس سرکار خدا واقف تھا، یا ہماری سرکار انگریز بہادر کمشنر صاحب کی مہربانی تھی۔ ورنہ اس عاجز کو کون جانتا تھا۔

ہیڈ منشی سمجھا مولوی کرامت کی انکساری اصل میں اپنی سفارش کو چھپانے کے لیے ہے۔ ورنہ اسسٹنٹ کمشنر سے تو ملنا ہی ناممکن ہے۔ کجا وہ خود سر دردی لے کر اُسے سرکار میں منشی رکھیں۔ اس کے پیچھے لازماً کسی نواب کا ہاتھ ہوگا یا کوئی چال ہے۔ بہر حال جو بھی ہے تلسی داس نے بھی خبردار کر دیا تھا کہ مولوی کرامت کا خیال رکھنا صاحب کا خاص آدمی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس کے ساتھ تعاون ہی کیا جائے اور اسی کی مرضی کے مطابق کام بھی دیا جائے۔ کہیں شکایت کر کے ہماری نوکری کو ہی نہ لے ڈوبے۔

آپ کون سے درجے کو پڑھانا چاہیں گے؟

حضور، میں تو نوکر ہوں۔ جہاں سے کہیں گے، بچوں کو پڑھا دوں گا۔ درجوں کا تو مجھے حساب نہیں۔ اِس معاملے میں صاف کورا ہوں۔

ٹھیک مولانا، آپ آٹھویں کے درجے کو فی الحال فارسی اور عربی گرائمر کی مبادیات کا درس دے دیا کریں۔

بہتر سرکار، مولوی کرامت نے بے چینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلو بدلا۔

ٹھیک ہے مولوی صاحب، آپ اب آرام سے گھر جائیں۔ کل اتوار کی چھٹی ہے۔ پرسوں تشریف لے آئیں، ذکاء اللہ صاحب ہمارے ایک عربی اور فارسی کے منشی ہیں، وہ آج چھٹی پر ہیں، پرسوں وہ بھی آ جائیں گے۔ وہ آپ کا تعارف بچوں سے کرا دیں گے اور پڑھانے کے طور طریقے بھی بتا دیں گے۔ آج سے آپ کی حاضری اور تنخواہ شروع ہو گئی ہے (ایک رجسٹر مولوی صاحب کے سامنے کرتے ہوئے) اپنا نام مولوی صاحب اِس رجسٹر پر درج کر کے انگوٹھا بھی لگا دیں۔

مولوی کرامت نے ہیڈ منشی کے کہنے پر تمام کام نپٹا دیا، پھر کہا، حضور اب جاؤں؟

جی مولوی صاحب لیکن پرسوں ضرور تشریف لے آئیں۔

جی سرکار، اور اُٹھ کھڑا ہوا لیکن گھبراہٹ میں گرتے گرتے بچا۔

مولوی کرامت سکول کے بڑے دروازے سے باہر نکلا تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ گویا ایک جیل سے باہر نکلا ہے۔ ہیڈ منشی کے کمرے میں اُس کا دم گھُٹنے لگا تھا۔ پہلی بار سرکاری رجسٹر پر دستخط کرتے ہوئے اُسے لگ رہا تھا کہ شاید اپنی قید کے پروانے پر دستخط کر رہا ہے۔ اِسی وجہ سے گھبراہٹ شروع ہو گئی تھی۔ اب دروازے سے باہر نکلا تو گھبراہٹ کا تاثر فوراً ہی زائل ہو گیا۔

مولوی کرامت نے سکول جانے کے لیے کھدر کا سفید کُرتہ، سفید ہی کھدر کی چادر پہن لی۔ کبھی شادی بیاہ یا ختم درود کے لیے مولوی کرامت کی بیوی نے اُس کے لیے بنا کر لکڑی کے صندوق میں رکھے ہوئے تھے لیکن سال ہا سال سے اُن کے استعمال کا وقت نہیں آیا تھا۔ یا یہ کہیں کہ استعمال کرنے کو جی نہیں چاہا تھا کہ پھر کون روز روز اس طرح کے کپڑے بنائے گا۔ ویسے بھی کسی نہ کسی کے ہاں سے سال میں ایک لُنگی اور کُرتا فوتگی یا شادی پر مل ہی جاتا تھا۔ اِتنے سال پڑے رہنے کے بعد کپڑوں کی تہیں اِتنی جم گئیں اور سلوٹیں اتنی سخت ہو گئیں تھیں، جو کسی استری سے بھی جلد نہیں نکل سکتی تھیں۔ جس کا وجود ویسے بھی وہاں نہیں تھا۔ بلکہ مولوی کرامت نے تو ابھی تک استری کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اِن بے شمار سلوٹوں کے باوجود مولوی کے کُپڑوں میں صفائی اور نفاست موجود تھی۔ صافہ بھی بالکل نیا تھا، جو کل ہی جلال آباد کے بازار سے خریدا تھا۔ جوتے البتہ پُرانے ہی تھے۔ ویسے بھی جوتوں کو جب تک وہ نہ ٹوٹیں، کون پُرانا کہتا ہے۔ یہ جوتے انتہائی موٹے چمڑے کے تھے، جنہیں موچی نے سخت قسم کے دھاگے سے سیا تھا۔ تین سال گزرنے کے باوجود یہ نہ تو پھٹے تھے اور نہ ہی سلائی اُدھڑی تھی۔ پگڑی میں بھی کئی کئی پیچ دیے اور طرہ بھی چھوڑا۔ داڑھی ویسے بھی سفید ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے سفید لباس اور بھی بچ رہا تھا۔ القصہ مولوی پہلے دن بن ٹھن کے سکول میں گیا کہ سب دیکھنے والے اُس کے لباس اور چال ڈھال سے بہت متاثر ہوئے۔

مولوی یوں تو فارسی، عربی اور اردو کے ابتدائی اور بنیادی گرائمر اور زبان کے بارے میں کافی سُدھ بدھ رکھتا تھا لیکن اُسے سکول میں بچے پڑھانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ہر چند وہ اپنی معلّمی کے تمام کمالات فضل دین پر آزما کر اِس کام میں ماہر ہو چکا تھا لیکن دوسروں کے بچوں کو پڑھانے کا موقع پہلی ہی دفعہ ہی ملا تھا۔ اس لیے بہت زیادہ ڈرا ہوا تھا کہ خدا جانے کیا غضب ہو جائے۔ خاص کر اُسے سکول کے ہیڈ منشی سے انگریز افسر کی نسبت زیادہ خوف تھا۔ لیکن جب مولوی نے بچوں کو پڑھانا شروع کیا تو کام بہت آسان لگا۔ کیونکہ جو کتابیں مولوی کرامت کو بچوں کو پڑھانے کے لیے دی گئیں تھیں، وہ اِتنی آسان اور سادہ تھیں کہ اُنہیں فضل دین بھی پلک جھپکنے میں فر فر پڑھ جاتا۔ بلکہ پڑھانے پر بھی قادر تھا۔ یہ کتابیں عربی کے ابتدائی افعال اور گردانوں کے صیغوں پر مشتمل تھیں، جس میں چھوٹے چھوٹے جملوں کا استعمال تھا اور اُن کے اردو میں استعمال کے طریقے بتائے گئے تھے۔ مولوی کرامت کے سامنے فضل دین کی مثال موجود تھی۔ یہاں بھی وہی طریقہ لگاتے ہوئے سبق شروع کیا اور بچوں کو وہ وہ نقطے بتائے کہ وہیں

بیٹھے بیٹھے اُنہیں پورا پورا سبق یاد ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس کے منہ سے ایسی گالی نکل جاتی جس میں پنجابی کا ایک گُوڑا رچا ہو ہوتا کہ بچے پڑھنے کے ساتھ محظوظ بھی ہوتے رہے۔ آہستہ آہستہ اِسی وقت کے دوران مولوی کرامت کی ایک تو جھجک بھی دور ہو گئی، دوم آگے کے لیے رستہ صاف آسان ہو گیا۔ مولوی کرامت نے سوچا اگر یہی پڑھانا کہتے ہیں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ چھٹی ہوئی تو مولوی اتنا خوش تھا کہ بغلیں بجاتا ہوا گھر تک گیا۔

(30)

ولیم کے کمرے میں تمام تحصیل کابینہ جمع تھی۔ پولیس آفیسر لوئیس، ایجوکیشن آفیسر تُلسی داس، محکمہ مال کے آفیسر، محکمہ نہر کے آفیسر اور دوسرے آٹھ دس آفیسر مزید کرسیوں پر لکڑی کی لمبی میز کے دو طرفہ اپنی اپنی فائلوں کو سامنے رکھے مکمل تیاری کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ یوں تو یہ سب دیسی اور انگریزی افسر اپنے کام کو احسن طریقے سے سمجھتے تھے اور اُسے پورا کرنے کا تجربہ بھی کسی بڑے افسر سے کہیں زیادہ تھا کہ اگر اُن کو آزادی سے کام انجام دینے کی اجازت مل جائے تو منٹوں میں نپٹا دیں لیکن بیوروکریسی اِس بات کو نہیں مانتی۔ عموماً تحصیل جلال آباد میں ایسے افسر آتے رہے جو خود تو خیر کام کو سمجھتے نہیں تھے، اگر ماتحت کام کرنے کی صلاحیت رکھتا بھی تھا تو اُسے ایسی پیچیدہ اور نافہم قسم کی ہدایات میں اُلجھا دیتے کہ ایک آسان سا کام بھی اقلیدسی قاعدوں اور کلیوں کا اچھا خاصا تماشا بن جاتا۔ پھر یا وہ کام فائلوں ہی میں دب کر مر جاتا ورنہ نہایت بے کار حالت میں انجام پاتا اور بالآخر اُس کمشنر کا تبادلہ کہیں اور ہو جاتا۔ اِس طرح تحصیل کی ترقی ہو تو رہی تھی لیکن کچھوے کی چال سے۔ مگر ولیم کا معاملہ اور تھا اور یہ بات پچھلے عرصے کے دوران تمام افسر بھی جان گئے تھے کہ اُن کو ہرن کی قلانچوں کے حساب سے دوڑنا پڑے گا ورنہ ولیم آگے نکل جائے گا، وہ پیچھے رہ جائیں گے اور ولیم سے پیچھے رہ جانے کا مطلب نوکری سے فارغ ہونا تھا، جو کسی طرح بھی گوارا نہ تھا۔ ابھی ولیم صاحب کمرے میں داخل نہیں ہوئے تھے لیکن افسروں پر اس طرح خاموشی چھائی تھی جیسے جنازے کی دعا میں بیٹھے ہوں۔ ہر ایک اپنی فائل پر نظریں جمائے ولیم کے انتظار میں متوقع سوالات کا جواب سوچنے میں مگن تھا۔ سب افسران کو بیٹھے ہوئے پندرہ منٹ ہو چکے تھے اور اب کچھ ہی دیر میں ولیم صاحب کمرے میں داخل ہونے والے تھے۔ پھر چند ثانیوں بعد وہ وقت آگیا جب نجیب شاہ نے باہر سے ولیم کے لیے دروازہ کھولا۔ اُس نے بڑے احترام سے دروازے کے ایک طرف کھڑے ہو کر دائیں ہاتھ اُس کا ایک پٹ کھول دیا اور اُسی لمحے ولیم سُرمئی رنگ کے تھری پیس سوٹ میں اندر داخل ہو گیا۔ تمام افسر اُٹھ کر تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ نجیب شاہ نے

دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔ ولیم نے افسروں کو ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور دیر سے آنے پر سوری کرتے ہوئے لیڈنگ کُرسی پر بیٹھ گیا۔ یوں تو ولیم نے مسکراتے ہوئے اپنی دیر آید پر معذرت کی تھی لیکن سب جانتے تھے کہ یہ اُن وی آئی پی تکلفات میں سے ایک تکلف ہے جو ہر افسر کا اپنے جونیئر سے فرق واضح کرتا ہے۔ جس کا وہ خود بھی عملی طور پر اکثر مظاہرہ کرتے ہیں۔

ولیم کے کُرسی پر بیٹھنے سے پہلے ہی تمام لوگ اٹین شن ہو چکے تھے کیونکہ یہ ایک اہم میٹنگ تھی، جو فائلوں سے آگے عملی طور پر کام کرنے کے لیے بُلائی گئی تھی۔ اِس میٹنگ میں اصلاً وہی کام ڈسکس ہونے تھے، جن کے بارے میں ولیم ڈی سی صاحب سے بات کر چکا تھا۔ اُس نے لیڈنگ چیئر پر بیٹھ کر ایک دفعہ تمام آفیسرز پر ایک طائرانہ نظر ماری پھر سب سے پہلے ڈی ایس پی لوئیس سے مخاطب ہوا، لوئیس صاحب پہلے آپ بتایے، کیا بنا سردار سودھا سنگھ اور عبدل گجر کے حوالے سے؟

سوال کے دوران ولیم کا لہجہ اتنا سپاٹ اور دوٹوک تھا جس سے محسوس ہو رہا تھا کہ آج صاحب بہادر کا معذرت قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں اور یہ لوئیس صاحب کی خوش بختی تھی کہ اُس نے پچھلے تین دن میں اِس معاملے میں کافی کچھ کام کر لیا تھا۔ جس پر ولیم داد کے سوا کچھ کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا تھا۔

لوئیس نے فائل سے سر اُوپر اُٹھا کر ایک بار ولیم کو دیکھا اور بولا، سر مَیں نے سردار سودھا سنگھ اور عبدل گجر کے لیے باقاعدہ پولیس کارروائی کو عملی جامہ پہنا کر کچھ لوگوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ جو گرفتار نہیں ہو سکے اُن کا مال بحق سرکار ضبط کر لیا گیا ہے۔ اِن گرفتار ہونے والوں میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو شاہ پور اور جودھا پور کے واقعات میں ملوث تھے۔ اُن کے ملوث ہونے کا ثبوت مخبروں اور دیگر ذرائع کی ہم آہنگی سے مہیا کیا گیا ہے۔ جس کے لیے سی آئی ڈی آفیسر متھرا اور تھانیدار بلرام کے علاوہ تین سب انسپیکٹر بھی شامل تھے۔ اِس سے بڑھ کر یہ کہ ملزموں نے اقرار جرم بھی کر لیا۔ جھنڈو والا میں مَیں خود پولیس کے ساتھ تھا جبکہ عبدل گجر کی طرف انسپیکٹر ڈیوس کو بھیجا گیا۔ اُس نے نہایت کامیابی سے آپریشن کیا ہے۔ فی الحال واقعات کے مرکزی ملزم سردار سودھا سنگھ، عبدل گجر اور شریف بودلہ گرفتار نہیں ہو سکے۔ اُمید ہے اُنہیں بھی جلد ہی قانون کے چاک پر بٹھا دیا جائے گا (پھر فائل ولیم کی طرف بڑھاتے ہوئے) سر اِس فائل میں کیس کی تمام تفصیلات، گرفتار ملزمان اور مال کی ضبطی کے متعلق اہم معلومات موجود ہیں۔

لیکن لوئیس صاحب، ولیم نے فائل کو دیکھتے ہوئے کہا،اِس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہی مرکزی ملزم جنہیں آپ ابھی تک گرفتار نہیں کر سکے، وہ جلد ہی کوئی دوسری کارروائی نہ کریں گے؟اگراِسی طرح کی ایک اور کارروائی ہو گئی تو اِس کا مطلب ہے ہم اپنی جڑیں خود ہی کاٹ رہے ہیں۔

سر اب ایک اور کارروائی نہیں ہو گی، لوئیس نے انتہائی پُر اعتماد لہجے سے جواب دیتے ہوئے کہا،مزید کارروائی کے لیے نہ تواُن کے پاس آدمی ہیں اور نہ ہی ہمت۔ تیسری ضرب مَیں نے اُن پر اخلاقی بے توقیری کی لگائی ہے۔ میں نے اُن کواِس طرح ذلیل کیاہے کہ اب اُنہیں اپنے وقار کو سمیٹنے میں زمانے لگیں گے۔(ولیم کے ہاتھ کے نیچے پڑی فائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) سر اِس فائل میں کارروائی کی تمام تفصیلات درج ہیں۔آپ اِس کاآرام سے مطالعہ کر کے میرے لیے مزید جو حکم چھوڑیں گے، مَیں اُس پر عمل کرنے کا پابند ہوں گا۔

ولیم نے لوئیس کی کارروائی پر اطمنان کااظہار کرتے ہوئے کہا، گُڈ، مرکزی ملزم کب تک گرفتار ہوں گے؟

لوئیس نے اپنادایاں کان کھجا کر ولیم کی طرف دوبارہ دیکھااور کہا، سر اُس کے لیے میں نے مہاراجہ پٹیالا کو سردار سودھا سنگھ کے وارنٹ گرفتاری کے ساتھ خط بھیج دیاہے۔اب صورتحال یہ ہے کہ مہاراجہ نے سودھا سنگھ کی گرفتاری نہ بھی دی، جس کی ہمیں عین توقع ہے، تو ہم اُس کا عدالت میں انتظار کریں گے۔ وہ لامحالہ عدالت سے اپنی عبوری ضمانت کروائے گا، جب ہم اُسے گرفتار تو نہ کر سکیں گے۔ لیکن اُس کے فرار کی راہیں بھی مسدود ہو جائیں گی۔اِس طرح وہ عدالت میں حاضر ہونے کا پابند ہوگا۔اگر وہ عدالت میں حاضر نہ ہواتو مجرم قرار پا کراشتہاری ہو جائے گا۔اشتہاری ہونے کی وجہ سے مہاراجہ اُس کی کوئی مدد نہیں کر پائے گالیکن بات یہاں تک نہیں پہنچے گی۔ عبوری ضمانت پر حاضری کے وقت اُس کی ضمانت منسوخ ہو جائے گی اور ہم اُسے گرفتار کر لیں گے۔ یہی کچھ عبدل گجر اور شریف بودلہ کا معاملہ ہے۔ ہم نے کچھ اُن کے بندے پکڑے ہیں۔ وہ خوداُن کے خلاف ثبوت ہیں۔ یہ لوگ بھی عبوری ضمانت کے بعد عدالت میں حاضر ہونے کے پابند ہیں۔ کیونکہ انہیں بھی مقدمے کا سامنا تو بہرحال کرنا ہے، جو چند ہی روز میں شروع ہو جائے گا۔ بھاگ یہ اِس لیے نہیں سکتے کہ یہاں ان کی زمین، گھر بار، اولاد اور رشتے داریاں ہیں۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی گنوانے کی حماقت نہیں کریں گے اور یہیں رہیں گے۔ (مسکرا کر) زیادہ سے زیادہ حج پر چلے جائیں گے لیکن واپس یہیں آئیں گے۔

ویل ڈن مسٹر لوئیس، ولیم نے سنجیدہ لہجے میں لوئیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ لمحے سوچنے کے بعد سوالیہ انداز میں پوچھا، غلام حیدر کی کیا خبر ہے آپ کے پاس؟ میرا خیال ہے اُس پر ہمیں نظر رکھنی چاہیے۔ یہ اُس پر دوسرا حملہ ہے اور ایسے میں کوئی شخص کچھ بھی غلط کارروائی کر سکتا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں اِس بارے میں؟

سر آپ کی بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، لوئیس تائید میں بولا، احتیاط کا تقاضا تو یہی ہے، اُسے بھی عینک میں رکھا جائے۔ آپ جو بھی اُس کے بارے میں فرمائیں گے، اُس پر بھی غور ہو سکتا ہے۔

لوئیس، ولیم نے فائل کو بند کرتے ہوئے دوٹوک کہا، غلام حیدر کے پاس سُنا ہے ایک ریفل ہے۔ آپ اُس سے وہ ریفل فوراً تین ماہ کے لیے قبضے میں لے لیں اور اُسے پیغام بھیج دیں، وہ اپنے آدمیوں کا اسلحہ بھی کچھ دنوں کے لیے گورنمنٹ کو جمع کروا دے۔

جی بہت بہتر، لوئیس پوری فرمانبرداری سے بولا، یہ ہو جائے گا سر۔

کوئی اور بات؟ ولیم نے لوئیس سے بات قریباً ختم کرتے ہوئے پوچھا۔

نو سر، لوئیس نے جواب دیا

او کے، لیکن اس کیس کے بارے میں جو بھی اہم پیشرفت ہو، آپ مجھے اُس سے مطلع کرنے کے پابند ہوں گے، ولیم یہ کہ کر اب تحصیل ایجوکیشن آفسر تلسی داس کی طرف متوجہ ہوا، جو گول شیشوں کی عینک لگائے اپنی فائل کے اُوپر قریب قریب گرا ہوا تھا۔

تُلسی داس آپ بتائیں، آپ کی طرف سے کیا پرفارمنس ہوئی؟ ابھی تک، مجھے سب سے زیادہ تشویش آپ کے محکمے کی طرف سے ہے۔ جس کی کارکردگی خوردبین سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

تُلسی داس نے فائل ولیم کی طرف سرکا کر اپنی عینک کو اُتارا اور بات شروع کی، سر میں نے آپ کے حکم کے مطابق ایک تعلیمی پالیسی اس طرح ترتیب دی ہے کہ جلال آباد کے جتنے گاؤں ہیں، اُن کو دس پر تقسیم کیا گیا ہے اور ہر دس گاؤں کا ایک مرکزی گاؤں بنا دیا ہے۔ جس میں ایک آٹھویں درجے کا اسکول ہو گا۔ اُس میں پورے دس گاؤں کے بچے آ کر پڑھا کریں گے۔ اِسی طرح ہر پانچ گاؤں کے لیے ایک پانچویں درجے کا اسکول بنایا جائے گا۔ یوں تحصیل میں آٹھویں درجے کے مزید تیس سکول بنیں گے اور پانچویں درجے کے ساٹھ اسکول ہوں گے۔ جن پر کل لاگت اور اسکولوں کے مقام کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے، جو اس فائل میں درج ہے۔ اِسی طرح دسویں درجے کے اسکول

کے بارے میں بھی رپورٹ تیار کر لی گئی ہے جن کی تعداد مزید چار تک بڑھادی گئی ہے۔ یہ تمام کام دو سال کے عرصے میں مکمل ہو سکتا ہے۔

گُڈ تُلسی داس، ولیم نے خوش ہو کر تُلسی داس کو شاباش دی۔ ہم یقیناًاِس کے لیے اپنے پورے وسائل استعمال کریں گے اور جلد ہی گورنمنٹ سے اِس کے لیے فنڈ منظور کرالیں گے۔ تم کام کرنے کے لیے تیار رہو۔ یہ بتاؤ مسلمان بچوں کی اسکول میں حاضری پوری کرنے کے لیے کیا حل نکالا ہے آپ نے ؟

سر یہ ایک ٹیڑھی کھیر ہے، تُلسی داس نے معذرت دارانہ لہجے میں اپنی وضاحت پیش کی، جب تک مسلمان مولوی راستے میں حائل ہے، یہ کام مشکل نظر آتا ہے۔ لوگ کسی بھی طرح اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے پر تیار نہیں ہوتے۔ ہم نے لاکھ طرح سے کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔ آپ ہی کچھ اِس بارے میں حکم دیں یا پھر پولیس کے ذریعے جبر سے اُنہیں لایا جائے اور جرمانے یا سزا کا عمل دخل کیا جائے۔

اوں ! ولیم تھوڑی دیر کے لیے خموشی سے تُلسی داس کی بات پر غور کرنے لگا پھر سر اوپر اُٹھا کر بولا، تُلسی داس ! مَیں نے آپ کے حوالے ایک مولوی صاحب کو کیا تھا، وہ کہاں ہے ؟

اُسے سر آپ کے حکم پر جلال آباد کے مرکزی ہائی اسکول میں فارسی اور عربی کا مُنشی رکھ لیا ہے تیس روپے ماہانہ پر۔

تُلسی داس، ولیم بولا، مولوی، کیا نام ہے اُس کا؟

کرامت سر، تُلسی داس نے یاد دلایا

ہاں کرامت، مولوی کرامت۔ تُلسی داس اُسے آپ ٹارگٹ دو کہ سرکار کے اسکولوں میں مسلمان بچوں کو داخلے کے لیے لے کر آنا اُس کی ذمہ داری ہے۔ اُسے بتاؤ، وہ جس قدر مسلمان بچوں کی تعداد میں اضافہ کرے گا، سرکار اتنا ہی اُس کی تنخواہ میں اضافہ کرے گی۔ اِس لیے فی الحال اُس کا کام لوگوں کو اس بات پر تیار کرنا ہے۔ یقینا یہ کام وہی کر سکتے ہیں۔ آپ اِس فارمولے کو آزماؤ۔ اِس کے علاوہ اِس طرح کے مزید پانچ مولوی جلال آباد تحصیل کے ہی رہنے والے ملازم رکھ لو اور اِس مولوی کو اُن کا ہیڈ بنادو۔ میرا خیال ہے، اِس طرح سے اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔

ولیم کی اِس انوکھی ترکیب پر تُلسی داس سمیت سب ہلکا سا مسکرادیے۔ یہ ایک ایسا نکتہ تھا، جو ابھی تک کسی کو بھی نہ سوجھا تھا اور ولیم ہی کا خلاق ذہن تھا، جو ایسا بے ضرر اور زود اثر حل نکال سکتا تھا۔ مولویوں کو سرکاری اسکول کی

ملازمت دے کر اور اُنہیں مسلمان بچوں کے داخلے پر نامزد کر کے حقیقت میں ایک تیر سے دو کام لیے جا سکتے تھے کہ جو روکنے والے تھے، وہ اب دعوت دینے والے ہو جاتے اور لوہے سے لوہا کاٹنا نہایت ہی آسان ہو جاتا۔

تُلسی داس سے فارغ ہو کر ولیم نے تحصیل دار مالیکم کی طرف رخ کیا اور بولا، جی مالیکم صاحب آپ اور ڈیوڈ صاحب کا کام قریب قریب مشترک ہے۔ آپ کے کام میں کیا پیچید گیاں ہیں؟ آخر جلال آباد میں ہر طرف اُڑتی ہوئی خاک اور گرد و غبار کا کیا علاج ہے؟ مجھے حیرت ہے آپ پچھلے دو سال سے یہاں موجود ہیں لیکن یہاں کی مٹی جم نہیں پائی اور خاکی میدانوں نے سبزی کا لباس نہیں پہنا۔ آج یہ طے ہو جائے کہ اس تحصیل کے چہرے پر کب رونق آئے گی۔

مالیکم صاحب، جو بے چینی سے میٹنگ کا دورانیہ لمبا ہوتے دیکھ رہے تھے، نے آگے کی طرف ہوتے ہوئے وضاحت کی، سر اصل میں ہندوستانیوں کی جہالت کا علاج مشکل ہے۔ ورنہ تو چھ ماہ میں ہی خربوزوں کے کھیت اور آموں کے باغ لہلہا اُٹھیں۔

وہ کون سی جہالت ہے جس کا علاج نہیں؟ ولیم حیرانی سے بولا، اگر گورنمنٹ جہالت دور کرنے پر قادر نہیں تو ہمیں کوئی حق نہیں ملازمت کرنے کا۔ ہم آرام سے بستر سمیٹیں اور برطانیہ کی سردی میں آگ تاپیں اور دُھند سے لطف اُٹھائیں۔

مالیکم ولیم کے اِس تُرش جواب سے گھبرا گیا اور شرمندگی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُسے مشکل سے نکالنے کے لیے ڈیوڈ نے اپنی عینک اُتاری اور بات آگے بڑھائی، سر مالیکم کی بات کا مقصد ہے کہ عوام ساتھ نہیں دیتی۔ مثلاً بیلداروں اور نہری سُپر وائزروں نے ہمیں بتایا کہ لوگ نہر سے نکالے گئے کھالوں کے نکّال میں مٹی اور کوڑا کرکٹ بھر دیتے ہیں اور نہر کا پانی فصلوں کو لگنے نہیں دیتے۔ اُن کے خیال میں گورنمنٹ نے نہر کے پانی میں ایسی دوائی ملا رکھی ہے، جس سے فصلوں میں بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ جب اُس فصل کا غلہ لوگ استعمال کرتے ہیں تو وہ بیماری لوگوں میں پھیل جاتی ہے۔ یعنی انسان نامرد ہو جاتا ہے اور نسل آگے نہیں بڑھتی۔ اِس لیے یہ لوگ نہر کا پانی ہی فصلوں کو لگنے نہیں دیتے اور مکمل طور پر بارشوں کے سہارے رہتے ہیں۔

ڈیوڈ کی بات سے حوصلہ پا کر مالکم نے مزید وضاحت کی، سر ایک بات اور ہے۔ زمیندار سمجھتے ہیں گورنمنٹ اُن سے اِس پانی کا معاوضہ لے گی، جو اُن کی فصلوں کی قیمت سے بھی زیادہ ہو گا۔ اِسی ڈر سے ایک زمیندر نے اپنی بیسیوں ایکڑ کھڑی چاول کی فصل کاٹ کر اپنے مویشیوں کو کھلا دی تاکہ نہ ہو بانس نہ بجے بانسری۔ اب ایسے میں بتائیے کیا

کیا جائے؟

ولیم ان کی باتوں پر حیرانی کے ساتھ ہنس دیا، پھر تحمل سے بولا، مالیکم صاحب آپ مجھے بتایئے اگر یہ قوم اتنی جاہل اور سادہ نہ ہوتی تو کیا ہم پندرہ بیس ہزار لوگ اِن کروڑوں گدھوں پر حکومت کر سکتے تھے؟ اِن کی یہی جہالت تو آپ کے لیے نعمت ثابت ہوئی۔ لیکن اب ہمی نے اِن کو تعلیم دینی ہے، اِنہیں سکھانا ہے۔ اِن کی معاشی اور ذہنی ترقی کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ میں نے نہری منصوبے کی فائل لاہور تک پہنچا دی ہے۔ جلد واپس آجائے گی۔ چھ مہینے تک میں یہاں ایک مزید نہر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اُس سے پہلے آپ پر ایک بھاری ذمہ داری یہ ہے کہ جن کا پانی منظور ہو چکا ہے، اُن کی فصلوں تک پانی لے جانے کے ذمہ دار آپ دونوں ہیں۔ نہری پانی کے علاقوں کا دورہ کرو اور تمام زمینداروں کی حلقہ وار میٹنگ بلاؤ۔ انہیں بتاؤ، آیندہ کسی نے اپنا الاٹ شدہ پانی ضایع کیا تو اُس کو بھاری جرمانہ کیا جائے گا اور سزا بھی دی جائے گی۔ اپنے مالی اور نہری پٹواریوں کو اِس کا بنیادی طور پر پابند بناؤ۔ وہ اپنے اپنے علاقے کے گوشوارے ہر مہینے آپ کو جمع کرائیں۔ جو کچھ مالیے یا خراج کا حساب ہو اُسے تحصیل میں آکر کانوگووں سے پاس کروائیں۔ میں دو مہینے کے اندر یہ تمام کام درست دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہاں آئے چھٹا مہینہ ہے اور کارکردگی صفر ہے، جو مجھے منظور نہیں (پھر لوئیس صاحب کی طرف منہ کر کے) لوئیس صاحب آپ اس معاملے میں جو کچھ مدد اِن کو درکار ہو، بلا چون وچرا دیجیے گا۔

لوئیس نے فقط، ہاں، میں سر ہلانے پر اکتفا کی۔ کچھ دیر توقف کے بعد ولیم دوبارہ بولا، مَیں چار روز کے لیے چھٹی پر جا رہا ہوں۔ آج سے پانچویں روز واپس آؤں گا۔ آپ اِس عرصے میں اپنی تمام بریفنگ تیار کر لیں۔ مَیں نہیں جانتا، مجھے کتنے دن تحصیل جلال آباد میں کام کرنے کا موقع ملے گا لیکن میں چاہتا ہوں، جب یہاں سے جاؤں، لوگ خوشحال ہو چکے ہوں اور گورنمنٹ کا خراج بیس گنا زیادہ ہو چکا ہو۔ اِس گفتگو کے بعد ولیم نے میٹنگ کو ختم کرنے کا اعلان کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

جاری ہے

قسط نمبر 16

(۳۱)

غلام حیدر کو ڈپٹی پولیس آفیسر کی ملاقات کے لیے پیغام پہنچا تو حویلی میں رنگ رنگ کے افسانے کھل گئے۔ ہفتہ پہلے سردار سودھا سنگھ اور عبدل گجر کے بندوں کی گرفتاری اور مال کی ضبطی ہوئی۔ اِس کام نے غلام حیدر کی طاقت اور بڑے صاحب تک پہنچ کو سب پر روشن کر دیا تھا۔ اب اس بات میں کس کو شک تھا کہ پولیس کے بڑے افسر نے غلام حیدر کو دفتر میں بلا کر یہی کہنا تھا، بھائی ہم آپ کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں اور حکم کے بندے ہیں، دوبارہ بڑے صاحب کی طرف مت جائیں۔ ہماری نوکریوں کے لیے خطرہ ہے۔

غلام حیدر کی حویلی میں بیٹھے سب لوگ اپنی اپنی قیاس آرائیوں میں لگے انگریزی سرکار اور جھنڈو والا کی خبریں نون مرچ لگا کر اور ایک دوسرے کو سنا کر آنے والے وقت کے متعلق فیصلے صادر کر رہے تھے۔ سب سے زیادہ امیر سبحانی جوش میں تھا۔ امیر سبحانی بیس بائیس سال کا کوتاہ قامت مگر نہایت باتونی اور چرب زبان تھا۔ باتوں کی لشکر کشی ایسے کرتا کہ بڑے سے بڑا سیانا بھی قبول کر اُٹھتا۔ قصہ گوئی کا فطری مادہ اُس میں موجود تھا۔ وائسرائے کی بیٹی سے غلام حیدر کا ناطہ ثابت کرنے کے بعد اُس کی قدر میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ اِس لیے اُس کی باتوں پر پہلے سے زیادہ دھیان دیا جانے لگا۔ اُس کا اپنا علاقہ جلال آباد نہیں تھا۔ وہ فیروز پور شہر سے آوارہ گردی کرتے ہوئے یہاں پہنچا۔ اُس وقت اُس کی عمر پندرہ سال تھی۔ شیر حیدر نے اس کی چرب زبانی دیکھ کر اور لطیفہ گوئی سن کر یہیں رکھ لیا۔ کام وغیرہ کچھ نہیں لیا جاتا تھا۔ پچھلے چھ سات سال سے جلال آباد میں تھا اور زبان کا کھٹیا کھا رہا تھا۔ اس وقت بھی اپنے دیسی چمڑے کے جوتے کے تلووں سے لگی ہوئی مٹی ایک سخت تنکے سے کرید کرید کر جھاڑتا جاتا اور باتوں کے توتے مینا اُڑاتا جا رہا تھا۔

، یارو میری تو بات کو ہر ایک چوتڑوں میں دبا لیتا ہے اور سمجھتا ہے امیر سبحانی نے واہی بک دی۔ حالانکہ میں نے پہلے دن سب کو خبردار کر دیا تھا کہ اپنے غلام حیدر کی منگ میں جب واسرائے کی چھوکری آگئی ہے تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ انگریز سرکار سودھا سنگھ کے دونوں ہاتھ باندھ کے چکی کے پُڑوں کے نیچے دے دے گی اور اُس کی داڑھی کا رسہ وٹ کے سکھڑے کی ٹانگیں باندھ دے گی۔ اگر اب بھی میری بات کا یقین نہیں تو پھر کوڑھ مغزوں کے لیے بادام روغن کی ضرورت ہے، جو جلال آباد میں تو ملتے نہیں، کشمیر سے ہی منگواؤ تو منگواؤ۔

رشید ماچھی امیر سجانی کی طرف رشک سے دیکھ کر بولا، میاں سجانی پہلے یہ بتا، کس لدھو نے تیری بات کو چوتڑوں میں دبایا تھا اور یقین نہیں کیا تھا؟ میں نے تو اُسی وقت کہہ دیا تھا، اگر خبر امیرے نے دی ہے تو پکی سمجھو (آنکھ دبا کر خوشامد کرتے ہوئے) لیکن یار سجانی اب تو بتا دے تجھے کیسے پتا چلا تھا کہ اپنے چوہدری غلام حیدر کے ساتھ وائسرائے کی بیٹی کا یارانہ ہے؟

لو اور سنو بھائی فیقے، امیر سجانی نے رفیق پاؤلی کی طرف دیکھ کر کہا، او شیدے بونگے تُو بھی کتّوں سے دودھ نکالتا ہے۔ یہ باتیں کوئی پوچھنے کی ہیں؟ پھر اپنی چھدری کالی سیاہ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، یہ داڑھی کیا دھوپ میں سفید کی ہے؟ میاں، امیر سجانی نے صرف کبوتر نہیں اُڑائے، لوگوں کے کانوں کے فیتے کاٹے ہیں فیتے۔ لیکن تجھے بتا بھی دوں تو سمجھ نہیں آئے گا، اِس لیے فائدہ نہیں۔

رفیق پاؤلی نے امیر سجانی کی بات سُن کر کہا، سجانی کچھ ہمیں بھی تو پتا چلنا چاہیے، اِس بات کی خبر تجھے کیسے ہوئی؟ بھائی کبھی آل انڈیا ریڈیو دیکھا؟ امیر سجانی جوش اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں بولا، لیکن رفیق کے جواب دینے سے پہلے ہی، اچھا دیکھا تو خیر نہیں ہو گا کبھی نام بھی سنا ہے؟ جب تم نے نام بھی نہیں سنا تو تمھیں سمجھ خاک آئے گی۔ چاچا فیقے، یہ ایک جادو کا ڈبہ ہوتا ہے (ہاتھوں کے اشارے سے) اِتنا چوڑا اور اِتنا لمبا۔ اِس میں ایک جِن بیٹھا ہوتا ہے، جو غیب کی باتیں پڑھ پڑھ کے سناتا ہے۔ سننے والے حریان، پریشان دیکھتے ہیں یہ کیا ہے؟ مگر یہ بولتا جاتا ہے، بولتا جاتا ہے۔ بس میں نے بھی وائسرائے کی بیٹی اور غلام حیدر کی بات اِسی سے سُنی تھی۔ پر دیکھو یہ ڈبہ ہر ایک کو نہیں سناتا۔

امیر سجانی کی بات سن کر سب ہکا بکا رہ گئے۔ جانی بولا، اچھا چل اس بات کو چھوڑ، اب یہ بتا ڈپٹی صاحب نے غلام حیدر کو اپنی سرکار میں کیوں بلایا ہے؟ ذرا قیاس کر کے بتا؟

امیر سجانی نے اِتنی عزت افزائی دیکھی تو نئی نئی چھوڑنے لگا۔ اُس نے ایک دفعہ جوتے پاؤں سے اُتار کے زمین پہ پھینکے اور دونوں ٹانگیں چارپائی کے اُوپر رکھ کر بولا، لو جی اگر تم کو اتنی ہی بے چینی ہے تو سنو، یہ تو تمھیں پتا چل ہی گیا ہے چوہدری غلام حیدر کی اُوپر تک پہنچ کی وجہ سے کمشنر صاحب نے پولیس کے بڑے سنتری کے کان کھینچے ہیں، جس پر اُس نے مجبور ہو کر جھنڈو والا اور میگھا پور کی صفائی پھیری ہے۔ اب یہ بات تو سادھو کو بھی پتا چل جائے گی کہ بڑا سنتری چوہدری غلام حیدر سے یاری دوستی لگانا چاہتا ہے تاکہ چوہدری صاحب سے بڑی سرکاروں میں

سفارش کروا کے نوکری میں ترقی کروالے۔ او بھائی یہ انگریز بہادر بڑے سیانے ہوتے ہیں۔ بغیر مطبل کے کسی کے کام نہیں آتے۔ دیکھنا یہ بات نہ ہو تو میری داڑھی مونڈ دینا اِسی پتھورے پر۔

امیر سبحانی کا نیا انکشاف سُن کر سب عش عش کر اُٹھے۔ یہ بات تو کسی کو بھی نہیں سوجھی تھی کہ انگریز بہادر نے غلام حیدر سے ملاقات کیوں کرنا چاہی ہے۔ واقعی امیر سبحانی کی وہاں تک سوچ جاتی تھی جہاں تک رفیق پاؤلی اتنا سیانا ہونے کے باوجود بھی نہیں پہنچ سکا تھا۔

سب حویلی کے صحن میں بیٹھے قیاس آرائیاں کرتے کرتے اصل نتیجے تک پہنچے ہی تھے، اِتنے میں غلام حیدر زنان خانے سے نکل کر حویلی کے بیرونی صحن میں آتا دکھائی دیا۔ اُس نے ریشمی لاچے کے ساتھ پاؤں میں اُونچی کنی والا دیسی کھسہ ڈال رکھا تھا جس کی چرر چرر کی آواز سے عجیب سُر نکل رہے تھے۔ اِسی طرح سفید لٹھے کا کُھلا کُرتا اور کاندھے پر وہی پکی ریفل جو سرداری کے مزاج کو اور بھی آسمان پر لے جاتی تھی۔ اُس پر قدم اُٹھانے کا انداز، سب کچھ بڑا شاندار لگ رہا تھا۔ غلام حیدر کو دیکھ کر سب خاموش ہو گئے اور اُٹھ کر سلام لینے لگے۔ غلام حیدر نے سب کو ایک ہی سلام میں بھگتا کر رفیق پاؤلی سے کہا، چاچا رفیق کیا تحصیل جانے کی تیاری مکمل ہو گئی؟

جی تیاری تو مکمل ہے بس تمھارا ہی انتظار تھا، رفیق پاؤلی نے جواب دیا۔

تو چلیں؟ غلام حیدر بولا، اِس کے بعد بگھی کی طرف چل دیا، جو حویلی کے صحن میں دروازے کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ جب بگھی پر بیٹھ چکا تو دوسرے لوگ بھی اپنی اپنی سواری پر چھویوں اور ڈانگوں پر کسی کرپانوں کے ساتھ چڑھ گئے۔ پھر چند وقفوں کے بعد یہ سواریاں جلال آباد کی تحصیل میں پولیس کے بڑے صاحب کے دفتر کی طرف چل دیں، جو غلام حیدر کے مکان سے محض ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ رستے میں آگے پیچھے چلتی سواریاں اور سواریوں میں بیٹھے غلام حیدر کے آدمیوں کے چٹکلے اور ہنسی دور تک چلتے راہیوں کو رُکنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ لوگ غلام حیدر کی سواری کو دیکھ کر کچھ دیر کھڑے رہ جاتے۔ صبح دس بجے یہ سواریاں ڈی ایس پی لوئیس صاحب کے آفس کے سامنے جا کر رُک گئیں۔ لوئیس صاحب کے دفتر کی ساری عمارت پر پیلے رنگ کا چونا پھیرا گیا تھا۔ عمارت کے سامنے بڑا صحن تھا۔ جس کو ایک چھوٹے قد کی دیوار سے گھیر کر اُس میں لکڑی کا پھاٹک لگا دیا گیا تھا۔ صحن میں بڑے گراؤنڈ کے بیچ بڑی بڑی داڑھیوں والا آسمانی چھتری نما بوڑھ کا درخت عمارت کی شان و شوکت کا گواہ تھا۔ اس بوڑھ سے تھوڑا آگے ڈپٹی صاحب کے دفتر کی عمارت شروع ہو جاتی تھی۔ سب سے پہلے عمارت کا ہاتھی دروازہ اور اُس کی بڑی ڈاٹ

کے سِرے پر بانس کے ڈنڈے کے ساتھ لہراتا ہوا برطانوی سلطنت کا پھریرا سلطنت کی ہیبت کا مدعی تھا۔ غلام حیدر نے بگھی سے اُتر کر اپنی رائفل کاندھے سے اُتار کر رفیق پاولی کے حوالے کر دی اور عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ جبکہ اُس کے تمام بندے وہیں گراونڈ میں ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ بڑے صاحب کے کمرے میں صرف غلام حیدر ہی کو جانے کی اجازت تھی اور یہ بات قدرتی طور پر ہی تمام ملازمین جانتے تھے۔

غلام حیدر پھریرے والے دروازے سے گذر کر عمارت میں داخل ہوا تو کئی راہداریوں نے اُس کا سامنا کیا، جنہیں نیلے اور لال رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا۔ ایک حوالدار غلام حیدر کے ساتھ تھا۔ وہ رہنمائی کرتا ہوا اُسے ایک کمرے میں لے گیا۔ یہ کمرہ وٹینگ روم تھا۔ جس میں پہلے بھی کئی لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک کُلّے والے چوکیدار نے غلام حیدر کے نام کی آواز دے کر اُسے صاحب کی ملاقات کی اجازت دی۔ غلام حیدر اپنے کھُسے کی چرچراہٹ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو لوئیس نے اُٹھ کر غلام حیدر سے ہاتھ ملایا اور اُسے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ غلام حیدر خوش دلی سے ڈی ایس پی لوئیس کا شکریہ ادا کر کے کُرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے ایک طرف ایک تھانیدار بیٹھا تھا، جس سے غلام حیدر بالکل ناواقف تھا۔ واقف تو وہ ڈی ایس پی صاحب سے بھی نہیں تھا لیکن ایک ہفتہ پہلے جو کارروائی جھنڈو والا اور میگھا پور میں لوئیس کی نگرانی میں ہوئی تھی اور اُس کی خبر پوری تحصیل میں ہوا کی طرح پھیل گئی تھی، اُس وجہ سے ڈی ایس پی لوئیس کا نام نہ صرف جھنڈو والا اور میگھا پور میں بلکہ غلام حیدر کی پوری رعیت کی زبان کا ورد ہو گیا تھا۔ صاحب بہادر نے جس طرح کارووائی کر کے جھنڈو والا کی تباہی پھیر کر سودھا سنگھ کی چولیں ہلائیں تھیں، اُس سے غلام حیدر کو ایک گونہ اطمنان سا ہو گیا تھا۔ اُسے جو انگریز سرکار سے شکایتیں تھیں، وہ بھی دور ہو گئیں۔ اِس کاروائی سے لوگوں کو ذرا بھی شک نہیں رہا تھا کہ غلام حیدر کے لاہور میں بڑی سرکاروں کے ساتھ رابطے ہے۔ ورنہ کہاں مہاراجہ پٹیالا کے وزیر کا چہیتا سودھا سنگھ اور کہاں ایک بڑھا کولڑکا چوہدری غلام حیدر۔

چنانچہ جب غلام حیدر کو لوئیس صاحب کا پیغام ملا تو اِس میں شک نہ رہا کہ صاحب نے اُسے انصاف کی یقین دہانی کے لیے بُلایا ہے۔ حالانکہ ملک بہزاد نے غلام حیدر کو باور کرادیا تھا کہ انگریز افسر کے سامنے اُس وقت تک نہ جانا جب تک تمھاری جان کسی بھی جھگڑے سے بالکل پاک نہ ہو اور اُس میں بھی اپنے اسلحے کا خاص خیال رکھنا۔ یہ بات غلام حیدر کو یاد تھی لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ لوئیس صاحب، جس کے پاس ابھی تک غلام حیدر کے خلاف نہ کوئی ثبوت تھا اور نہ ہی اُس نے قانون کی بساط سے قدم باہر اُٹھایا تھا، وہ افسر غلام حیدر کے خلاف کچھ ناروا حکم دیتا۔ وہ لوئیس

کے دفتر میں داخل ہوا تو اُس کے مشفقانہ رویے نے مزید اچھا اثر ڈالا۔ اِس سے متاثر ہو کر غلام حیدر نے کہا، سر جس طرح جناب نے مجرموں کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا ہے، اُس پر آپ کی نذر کرنے کو سوائے شکریے کے میری گرہ میں کچھ نہیں ہے۔

مسٹر غلام حیدر! لوئیس بولا، کیا کبھی ایسا ہوا ہے، لڑکا اپنے گھر میں پیدا ہو اور مبارک پڑوسیوں کو دی جائے؟ اِس میں گورنمنٹ کا شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب جلال آباد میں سرکار برطانیہ کی ہے تو امن وامان کی ذمہ داری بھی اُسی کی ہے۔ آپ بے فکر رہیں اور گورنمنٹ کے ساتھ تعاون جاری رکھیں۔ اِس میں شک نہیں کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ جس میں کچھ شرپسندوں نے انگریزی قانون کو ہلکا سمجھ کر اُس کا مذاق اُڑایا ہے۔ اب اِس کا نتیجہ تو اُنہیں بہر حال بھگتنا تھا۔ اب آپ کو تشویش نہیں ہونی چاہیے۔ دل سے تمام خدشے دور کر کے مکمل طور پر گورنمنٹ پر بھروسا رکھو اور دل و دماغ سے دشمنی کی ہوا نکال کر صرف رعایا کی خبر گیری کی طرف دھیان دو۔

غلام حیدر نے لوئیس کی بات سُن کر تشکر آمیز لہجے میں کہا، ڈپٹی صاحب جب آپ جیسے آفیسر ہماری حفاظت کے لیے موجود ہیں تو تشویش کیسی؟ آپ جس قسم کا تعاون چاہیں گے، وہ میری طرف سے حاضر ہے۔

لوئیس نے اب ایک لمحہ غلام حیدر کی طرف دیکھا، پولیس کیپ میز سے اُٹھا کر اپنے سر پر رکھی۔ اُس کے بعد اپنی بید دائیں ہاتھ میں لے کر اُٹھا اور بولا، ویل غلام حیدر، ہمیں آپ سے یہی توقع تھی۔ آپ کو دفتر میں بلانے کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ بس یونہی کچھ امن وامان کے حوالے سے گزاراشات واضح کرنا تھیں۔ آپ اپنی رائفل اور اپنے آدمیوں کا تیز لوہا کم از کم تین ماہ کے لیے گورنمنٹ کو جمع کرا دو۔ تم اور تمھارے آدمی سوائے لکڑی کے کوئی چیز ہاتھ میں لے کر نہیں چل سکتے۔ فی الحال ہم آپ سے اس سے زیادہ نہیں چاہتے۔ میرا خیال ہے یہ بات آپ کے لیے زیادہ وزنی بھی نہیں ہے۔

سر یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ غلام حیدر لوئیس کا حکم سن کر حیران رہ گیا۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا لوئیس، جو ابھی ابھی اتنا شفیق نظر آرہا تھا، وہ اس قدر کڑوا حکم دے گا۔ چنانچہ اپنی کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولا، آپ جانتے ہیں میری کس قدر خطرناک دشمنی پیدا ہو چکی ہے۔ میرے باپ کے مرنے کے بعد جلال آباد کا سایا بھی میرے لیے بھوت بن چکا ہے۔ میرے دو گاؤں پر حملہ ہوا، تین بندے قتل ہو گئے، مال کا نقصان الگ ہوا۔ پھر بھی گورنمنٹ پر بھروسا کرتے ہوئے قانون کی ذرہ برابر نافرمانی نہیں کی۔ لیکن حیرت ہے، ابھی گورنمنٹ کو مجھ پر بھروسا نہیں۔

ڈی ایس پی لوئیس صاحب نے ایک قدم مزید آگے بڑھ کر کہا، غلام حیدر گورنمنٹ کے پاس اتنا وقت نہیں وہ اپنے فیصلوں کی وضاحت کرے۔ آپ سے جو کہا گیا ہے وہ کرو۔ جھنڈووالا سے لے کر جودھا پور تک، سب کی مالک گورنمنٹ ہے۔ اِس لیے آپ کا اسلحہ تین ماہ تک ضبط کیا جاتا ہے۔ اِسے گورنمنٹ کو جمع کروا دیں۔

یہ کہ کر لوئیس صاحب کمرے سے نکلنے کے لیے آگے بڑھ گئے۔ جبکہ غلام حیدر وہیں ہکا بکا کھڑا سوچنے لگا کہ صاحب نے کیسا گرگٹ کی طرح رنگ اور سانپ کی طرح کینچلی بدلی ہے۔ لوئیس صاحب نے دروازہ سے نکلنے سے پہلے ایک ثانیے کے لیے مڑ کر دوبارہ غلام حیدر کی طرف دیکھا اور بولا، مسٹر آپ کو یہ بات سمجھانے میں زیادہ دیر نہیں لگنی چاہیے، جو بھی گورنمنٹ کے حکم کی سرتابی کرنے کی زحمت کرتا ہے، ہم اُس کی گردن باندھ دیتے ہیں۔

آخری فقرہ لوئیس نے اِس کٹیلے لہجے میں کہا کہ غلام حیدر کو کھڑے کھڑے پسینہ آگیا۔

لوئیس غلام حیدر کا جواب سنے بغیر باہر نکل چکا تھا۔ ویسے بھی غلام حیدر میں جواب دینے کی سکت کہاں رہی تھی۔ اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور محسوس ہوا کلیجہ مسوس دیا گیا ہے۔ پھر اس سے پہلے کہ اُس کی طبیعت میں پھیلے انتشار کا کسی کو پتا چلتا، وہ خود بھی لوئیس کے کمرے سے نکل پڑا۔ اُس کے ساتھ ہی کمرے میں موجود تھانیدار بھی چل پڑا جو غالباً اُسی لیے وہاں بیٹھا تھا۔

غلام حیدر بھاری قدموں سے چلتا اپنی بگھی کے پاس پہنچا تو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُس کے بندے بھی خالی ہاتھ ہو چکے تھے۔ پولیس نے اُن سب سے اسلحہ قبضے میں لے لیا تھا۔ اب اُس کا اندراج ایک حوالدار رجسٹر میں کر کے اور انگوٹھوں کے نشان لے کر اُن کے رسیدی ٹکڑے واپس کر رہا تھا۔ بہت سے سپاہی بندوقیں پکڑے اُن سب کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ غلام حیدر کی رفیق پاؤلی اور اپنے بندوں سے آنکھیں چار ہوئیں تو ہر دو طرف سے شرمساری کی پکھیوں نے اُن پر سایا کر دیا۔ اِسی اثنا میں ایک سپاہی نے، جس کے ہاتھ میں غلام حیدر کی رائفل تھی، جو اُس نے رفیق پاؤلی سے قبضے میں لی تھی، غلام حیدر کے سامنے دستخط کے لیے وہ رجسٹر آگے کر دیا۔ جس میں اُس کی رائفل کا اندراج ہوا تھا۔ غلام حیدر مکمل طور پر بے بس ہو چکا تھا اور مزاحمت میں سوائے بے عزتی کے کچھ ہاتھ نہیں آسکتا تھا۔ اِس لیے اُس نے آرام سے دستخط کر دیے۔ دستخط کے بعد اُسے بھی حوالدار نے رائفل کے بدلے ایک رسید تھما دی۔ اُس پر صاف لکھا تھا، غلام حیدر ولد شیر حیدر سکنہ شاہ پور جلال آباد سے اُن کی رائفل دفعہ

تیس کے تحت تین ماہ کے لیے حکومت پنجاب اپنے قبضے میں لیتی ہے۔ رائفل ہذا تین ماہ بعد اُس کے وارث غلام حیدر ولد شیر حیدر کے حوالے کر دی جائے گی۔

اسلحہ کے ضبط ہونے کی کارروائی ختم ہو چکی تو غلام حیدر نے دوبارہ ایک نظر اپنے بندوں پر ڈالی اور ہلکی سی خجالت کی ہنسی ہنس کر اپنی بگھی کی طرف چل دیا۔ اُس کے پیچھے ہی رفیق پاؤلی اور اُس کے بندے بھی۔

بگھی پر بیٹھتے ہوئے غلام حیدر کو شدت سے ملک بہزاد کی یاد آئی اور اُس کے وہ جملے، خبر دار کسی بھی وقت انگریز بہادر کو اپنا دوست سمجھ کر اُس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش مت کرنا۔ کیونکہ حکومت اگر اپنی رعایا کے ارادوں کی رعایت کرنے لگے گی تو ایک دن ضرور ذلت کا منہ دیکھے گی۔ اور اس کی توقع فرنگی سرکار سے نہ رکھنی چاہیے۔ کبھی اپنا اسلحہ لے کر انگریز بہادر کے سامنے نہ جانا۔

غلام حیدر کے دماغ پر شدید کوفت اور بیزاری کے جھکڑ چلنے لگے۔ اُس نے جان محمد بگھی کوچ کو حکم دیا، جان محمد سیدھے چک عالمکے چلو۔

اسلحہ چھن جانے کی وجہ سے سب کو پتا چل چکا تھا کہ غلام حیدر کی بڑے سنتری صاحب سے کوئی کھٹ بٹ ہو چکی ہے۔ اس لیے چوہدری صاحب کے موڈ اس وقت سخت خراب ہیں۔ لہٰذا کسی نے بھی یہ نہیں پوچھا کہ اس وقت ملک بہزاد کے گاؤں کی طرف جانے کا کیا مقصد ہے۔ بغیر اسلحہ یہ قافلہ لوئیس صاحب کے دفتر سے نکلنے کے بعد سیدھا چک عالمکے کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھوڑوں کے مسلسل دوڑنے کی آواز میں تمام لوگ ایک دوسرے سے نظریں چرا کر خموشی سے اپنی اپنی ذات کے ساتھ گفتگو کرنے لگے اور گھوڑے دوڑتے گئے۔ حتیٰ کہ سہ پہر تین بجے یہ قافلہ چک عالمکے میں ملک بہزاد کے ڈیرے میں داخل ہو رہا تھا۔

ملک بہزاد کا ڈیرہ عام ڈیروں ہی کی طرح تھا۔ اُس کے نہ تو احاطے کی دیواریں اُونچی اور پائیدار تھیں اور نہ ہی ڈیرے کے مکانوں میں کوئی خصوصیت تھی، جسے بیان کیا جائے۔ البتہ احاطہ کافی کُھلا اور پُر سکون تھا۔ اُس کے صحن میں سرکنڈوں کے بان کی پندرہ سولہ کھری چارپائیاں بچھی تھیں۔ اُن میں سے ایک چارپائی پر ملک بہزاد بیٹھا حقے کے ٹکارے لے رہا تھا۔

ارد گرد گاؤں کے لوگ بیٹھے ملک بہزاد سے اُس کے کارناموں کی کوئی داستان سُن رہے تھے، جو اُس نے اپنی جوانی کے دنوں میں سرانجام دی ہو گی۔ ملک بہزاد غلام حیدر کو ڈیرے میں داخل ہوتے دیکھ کر حیران ہوا اور فوراً اُٹھ کر

استقبال کرنے کے لیے آگے بڑھا، او میرا بھتیجا غلام حیدر آیا، کہ کر باہیں پھیلادیں۔ ملک بہزاد کے ساتھ دوسرے لوگ بھی اُٹھ کر کھڑے ہوگئے اور غلام حیدر کے بندوں سے سلام دعا لینے لگے۔ غلام حیدر کے ڈیرے میں داخل ہونے کی وجہ سے لوگوں کی تعداد دگنی ہو گئی تھی۔ اس لیے نوکر مزید چارپائیاں بچھانے میں مصروف ہوگئے۔ کچھ لوگ بڑھ بڑھ کر غلام حیدر سے سلام لینے کی کوشش کرنے لگے۔ اُنھوں نے اُس کا نام تو سنا تھا کہ چوہدری شیر حیدر کا مُنڈا بڑے اسکولوں میں پڑھتا ہے اور ولایت بھی گیا ہے لیکن اُنہیں کبھی توقع نہیں تھی کہ ولایت جا کر پڑھنے والا غلام حیدر کبھی اُن کے گاؤں بھی آئے گا۔ نیم کے بڑے سے درخت (جس کی اکثر ٹہنیاں سردی کے موسم میں چھانگی جا چکی تھیں) کے نیچے چارپائیاں بچھی ہوئیں تھیں۔ موسم گرم نہیں تھا، اس لیے سائے کی ضرورت نہیں تھی۔ ملک بہزاد نے اپنے ساتھ ہی ایک چارپائی غلام حیدر کے لیے رکھوالی، جس کے پائینتی سفید کھدر کی دوہر اور سرہانے پھولوں کے ساتھ کڑھا ہوا ریشمی تکیہ تھا۔ تھوڑی دیر میں تمام آدمیوں کے لیے لسی بھی آگئی۔ پیتل کے بڑے بڑے گلاسوں میں بھری ہوئی سفید لسی جب منہ سے لگاتے تو اُس کی سفیدی مونچھوں کے کناروں پر جم جاتی۔ غلام حیدر کے لیے بھی لسی سامنے رکھ دی گئی۔ جس میں برف تو نایاب ہونے کی وجہ سے نہیں تھی لیکن کوری چاٹی اور سرد موسم کی ٹھنڈک نے اُسے اتنا مزیدار ضرور کر دیا تھا کہ غلام حیدر نہ چاہتے ہوئے بھی دو گلاس پی گیا۔ لسی پینے کے بعد کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ملک بہزاد نے اتنا اندازہ کر لیا تھا کہ غلام حیدر کے ساتھ کوئی خیر نہیں ہے۔ کیونکہ اطلاع دیے بغیر اچانک اور بالکل ہتھل ہو کر آنا خیر سے خالی تھا۔ لیکن ملک بہزاد نے غلام حیدر سے بات پوچھنے میں جلدی نہیں کی۔ قریباً ایک گھنٹے تک وہ اسی طرح بیٹھے ادھر اُدھر کی ہانکتے رہے۔ پھر اچانک غلام حیدر نے ملک بہزاد کو اُٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں اُٹھ کر ڈیرے کے ایک کمرے میں چلے گئے تاکہ تنہائی میں بات کر سکیں۔

کچھ دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد غلام حیدر بولا، چاچا بہزاد سب عزت خاک میں مل گئی۔ کوئی کام توقع کے مطابق نہیں ہو رہا۔ مَیں انگریز سرکار پر اچانک اندھا بھروسا کر گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دم اپنے بندوں کے سامنے ذلیل ہو گیا۔ پھر غلام حیدر نے سر جھکا کر اپنے ساتھ ہونے والی پولیس کی تمام کارگزاری ملک بہزاد کے سامنے رکھ دی۔

ملک بہزاد غلام حیدر کی داستان نہایت حوصلے اور تحمل سے سنتا رہا۔ درمیان سے اُس نے نہ توٹوکا اور نہ ہی بات بات پر اپنے تجربات کے افسانوں کے تڑکے لگائے۔ وہ جانتا تھا، غلام حیدر غلطی کر چکا ہے، جس پر اُسے پہلے سے خبر دار کیا گیا تھا۔ لیکن اب اُسے اپنی غلطی کا احساس شدت سے ہے، جس کی وجہ سے وہ ڈپٹی کے دفتر سے اپنے گھر نہیں گیا، سیدھا اُس کے پاس آیا ہے۔ اِس کا مطلب ہے، وہ اعتراف کا طوق گلے میں لٹکائے ہوئے آیا ہے۔ لہٰذا غلطی جتانے سے سوائے بیزاری بڑھانے کے فائدہ نہیں۔ اِسی کے پیش نظر ملک بہزاد خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ بالآخر سفید کھچڑی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولا، غلام حیدر ایک بات بتا، سُنا ہے تیری نواب افتخار کے ساتھ دوستی ہے، کیا یہ بات ٹھیک ہے؟

ہاں وہ دوست تو ہے، غلام حیدر نے جواب دیا، لیکن وہ لندن میں ہے۔ میں نے اُسے ساری صورت حال کے بارے میں خط لکھ دیا ہے۔ مگر اُس کا ابھی تک جواب نہیں آیا۔ بلکہ ابھی تو میرا خط بھی نہیں پہنچا ہو گا۔

ایسا کر تو اُسے تار بھیج دے، ملک بہزاد نے آہستہ سے کہا، اور یہ کام لاہور جا کر وہاں سے کر۔ فیروز پور یا جلال آباد سے ہر گز نہیں۔ دوسرا کام یہ کر، تین مہینے کے لیے تسلی سے بیٹھ جا۔ حویلی سے باہر بھی نہ نکل اور ایک درخواست عدالت میں جمع کروا دے کہ مجھے دشمنوں سے اپنی زندگی کا خطرہ ہے۔ لہٰذا جو پولیس نے میرا اسلحہ ضبط کیا ہے، وہ گورنمنٹ مجھے واپس کرے۔ اس کے علاوہ یہ خبر جھنڈو والا اور عبدل گجر تک بھی مشہور کر دے کہ تیرا اسلحہ ضبط ہو چکا ہے۔

اِس کا کیا فائدہ ہو گا؟ غلام حیدر نے حیرانی سے پوچھا

اِس کا یہ فائدہ ہو گا کہ جب تجھے تین مہینے سے پہلے بطور مدعی عدالت میں طلب کیا جائے تو تم عدالت کو باور کرا سکتے ہو کہ مجھے دشمنوں سے خطرہ ہے اس لیے میں بغیر اسلحے کے کسی بھی جگہ آنے جانے سے قاصر ہوں۔ اِس سلسلے سے متعلق میں ایک درخواست بھی جناب میں پیش کر چکا ہوں۔ چنانچہ اِسی خطرے کی وجہ سے میں عدالت بھی حاضر نہیں ہو سکتا۔ تمھاری اِس معذوری کی بنا پر عدالت یا تیرا اسلحہ بازیاب کرائے گی یا تین مہینے تک تمھیں عدالت میں حاضر نہ ہونے سے معذور قرار دے گی۔ اِدھر اِس درخواست کی وجہ سے انگریزی پولیس آپ کی رائفل تین مہینے کے بعد تمھیں واپس کرنے کی پابند ہو گی اور مزید ضبطی کے آڈر جاری نہ کر سکے گی۔ کیونکہ اِن سابقہ تین ماہ میں آپ کا کردار بالکل صاف رہا ہو گا۔ رہا آپ کے ہتھل ہونے کی خبر سردار سودھا سنگھ اور عبدل گجر وغیرہ تک پہنچانے کا

فائدہ، تو اِس سے یہ ہو گا، وہ تینوں بے خطر فیروزپور کی عدالت میں تاریخیں بھگتنے چلے آئیں گے۔ یہی وقت ہو گا ہماری کارروائی کرنے کا۔ تم اِس عرصے میں نواب افتخار کی پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اُس کی کان و کان کسی کو خبر نہ ہو۔

غلام حیدر دل ہی دل میں ملک بہزاد کی عقل کو داد دینے لگا اور تہیہ کیا کہ کبھی ملک بہزاد کے مشورے کے خلاف نہیں کرے گا۔ پھر سوچ کر بولا، لیکن چاچا بہزاد آپ کو میرے ساتھ ہر معاملے میں چلنا ہو گا۔ خرچے کی کوئی بات نہیں۔ میں سب دینے کو تیار ہوں، جتنا بھی آئے گا۔ تم کل میرے ساتھ جلال آباد چلو اور یہ درخواست بازیوں کے معاملات کو سنبھالو۔ اگر مجھ پر چھوڑو گے تو میں یہ کام نہیں کر سکوں گا۔ اِس کے بعد غلام حیدر نے اپنے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کے پانچ سو روپے کی ایک تھیلی نکالی اور ملک بہزاد کے سامنے رکھ دی۔

ملک بہزاد نے وہ تھیلی پکڑ کر واپس غلام حیدر کی جھولی میں رکھ دی اور بولا، بھتیجے تُو فکر نہ کر۔ مَیں کل تیرے ساتھ چلتا ہوں اور عدالت میں وکیل اور دوسرے معاملات کو دیکھتا ہوں۔ یہ پیسے میرے پاس بہت ہیں۔ اللہ کا دیا بڑا فضل ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔

اس گفتگو کے بعد دونوں اُٹھ کر باہر آ گئے۔ اُنہیں دیکھ کر سب ایک مرتبہ پھر اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ جب دونوں بیٹھے تو دوسرے بھی اپنی جگہ آرام سے بیٹھ گئے۔ شام کے سات بج گئے تھے۔ یہ وقت غلام حیدر کے جلال آباد جانے کا نہیں رہ گیا تھا۔ اِس لیے رات کے کھانے اور رات کے بسر کرنے کا سامان ہونے لگا۔ ملک بہزاد نے اُٹھ کر اپنے ملازموں کو حکم جاری کرنے شروع کر دیے۔

جاری ہے

قسط نمبر 17

(32)

ولیم کو جلال آباد سے چھٹی پر لاہور آئے دو دن ہو گئے تھے۔ اگلے دو دن نولکھی کوٹھی پر گزارنے تھے۔ جس کے لیے اُس نے اپنی ماما اور بہن لورین کو بھی تیار کر لیا۔ لورین ممبئی سے لاہور اپنی ماما کو ملنے کے لیے آئی تھی اور پچھلے دس دن سے یہیں تھی۔ اب جو ولیم آیا تو لورین کو بھی اپنی جنم بھومی یاد آ گئی۔ جہاں بگھیوں پر بیٹھ کر وہ دونوں رینالہ کی نہری کوٹھی اور مچلز کے باغوں میں جامنوں اور پاپلر کے پیڑوں کی گنگناتی لوریاں سنتے تھے۔ پھر وہاں سے محافظوں کی پلٹنوں میں خراماں خراماں نولکھی کوٹھی آ جاتے۔ اس سیر میں اُن کے دوست ایشلے، سمتھ اور ڈینی اکثر اُن کے ساتھ ہوتے۔ ایشلے جو اُس وقت بھی اُلٹی سیدھی نظمیں لکھ لکھ کر سناتا تھا اب بہت بڑا شاعر بن گیا تھا۔ یہ تمام زمین اُن کی اپنی ملکیت تھی لیکن رینالہ اور ستگھرہ اسٹیٹ کے درمیان اوکاڑہ کے پاس کلیانہ اسٹیٹ کی زمین اور آموں کے باغ میں گھری ہوئی نولکھی کوٹھی سے اُنہیں خاص اُنسیت تھی۔ کیونکہ اِسی کوٹھی میں وہ پیدا ہوا تھا۔ بڑی نہر جسے دوآبہ کہتے ہیں، کے دونوں کناروں پر دور تک پیپلیوں کے اُونچے اُونچے درختوں نے نہر کے صاف پانی پر اپنی چھتریوں کا سایہ کر کے اُسے جنت سے نکالی گئی نہروں سے ٹھنڈا اور بہشت آفرین بنا دیا تھا۔ پیپلیوں سے ہٹ کر نہر کے دونوں طرف کی زمین پر آموں کے باغ اگر ایک طرف سے مچلز کو چھوتے تھے تو دوسری طرف اوکاڑہ کینال بنگلوں کے ساتھ جا لگتے تھے۔ نہر لوئر باری دوآب، جس کا پاٹ اور پانی کا بہاؤ دریاؤں کی ناک کاٹتا تھا، کے دونوں کناروں پر کھڑے گھنے درختوں کی چھاؤں کے نیچے چوڑی اور سخت پٹڑی پر چلتی ہوئی بگھی کی روانی پانی کی روانی سے کم نہ تھی۔ مارچ کا آغاز تھا اور یہ دن لاہور میں غارت کرنے کا اُس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اِس کے ساتھ اُسے اپنی والدہ اور لورین کے ساتھ کچھ وقت صرف کرنے کی بھی خواہش تھی۔ کیونکہ کافی عرصے سے آبائی گھر میں پورے خاندان کو مل کر بیٹھنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ولیم آٹھ سال لندن رہا۔ اُس کی غیر حاضری میں ہی لورین بیاہ کر ممبئی جا پہنچی۔ جبکہ جانسن صاحب کا لاہور تبادلہ ہونے کی وجہ سے اُس کی والدہ بھی وہیں منتقل ہو گئی۔ اس طرح نولکھی کوٹھی، نہری کوٹھی، آموں کے وسیع باغ اور نہر کے آس پاس دور تک لہلہاتی سرسبز فصلیں اپنے مالکوں کا منہ دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔ ولیم نے اپنی ماں اور باپ جانسن صاحب کو بھی تیار کر لیا کہ چھیٹوں کے دو دن اوکاڑہ گھر میں

گزار لیں۔ لورین تو پہلے ہی بے تاب تھی۔ اب جانسن صاحب نے بھی تیاری پکڑ لی۔ اس طرح یہ چار افراد کا قافلہ سرکاری جیپوں پر لاہور سے اوکاڑہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ قافلے کی نگرانی اور پروٹوکول کے لیے دو مزید جیپیں ساتھ تھیں۔ جن پر حفاظتی پولیس اور دیگر عملہ سوار تھا۔ نولکھی کوٹھی پر پچیس تیس ملازم جانسن کی غیر حاضری میں بھی ہر وقت موجود رہتے تاکہ مویشی فارم، اصطبل، کوٹھی اور باغ کی حفاظت رہے۔ لیکن اُن کے کوٹھی پر جانے سے ملازم کم پڑ سکتے تھے۔ اس لیے جانسن نے ڈپٹی کمشنر منٹگمری کو اپنے آنے کی اطلاع کر دی۔ اُسے کہہ دیا کہ کچھ ملازم بھی وہاں بھیج دیے جائیں۔ چنانچہ رات ہی اُن کے استقبال کے لیے پچاس ساٹھ افراد مزید نولکھی کوٹھی پر پہنچ گئے تھے۔ موسم کافی خوشگوار تھا اور ولیم بھی بہت دنوں کے بعد جا رہا تھا۔ اس لیے اُسے کچھ زیادہ ہی لطف محسوس ہو رہا تھا۔ ہلکی ہوا کے جھونکوں اور روشن دن میں ولیم اور اُس کی فیملی نولکھی کوٹھی پہنچی تو دن کے دس بج رہے تھے۔ ادھر اُدھر بندوقیں تھامیں سنتری اور محافظ اِس طرح پھیلے تھے جیسے وائسرائے کا دورہ ہو۔ ان کے علاوہ دیسی عوام اور کاشت کار ستگھرہ روڈ پر دور تک سڑک کے کنارے سلامی کو حاضر ہوئے تھے۔ اِن میں نوئے فی صد تو وہ تھے جو جانسن صاحب کی زمین کی دیکھ بھال اور کاشت کرتے تھے۔ باقی کے بھی بالواسطہ انہی کے دامن سے بندھے اپنی روٹی پیدا کرتے تھے اور خوش اس لیے تھے کہ مقامی مالکان کی نسبت جانسن صاحب کا رویہ ان مزارعین کے ساتھ کافی بہتر تھا۔ نولکھی کوٹھی ایک فرلانگ رہ گئی تو ولیم نے خواہش ظاہر کی کہ وہ گاڑی سے اُتر کر اپنے گھر جائے۔ ولیم کی اس تجویز پر اُس کی والدہ، لورین اور بذاتِ خود جانسن صاحب بھی گاڑی سے اُتر گئے۔ اِن کو دیکھتے ہوئے باقی عملہ بھی احتراماً جیپوں سے اُتر گیا اور پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ولیم فیملی کے ساتھ آہستہ آہستہ گھر کے باغات کے درمیان چھوٹی نہر پر بچھی صاف سڑک پر جا رہا تھا۔ جبکہ مقامی چودھری، سردار اور سیاستدان کلے دار پگڑیاں سروں پر باندھے اور مزارع لوگ دھوتیاں، جانگیے پہنے، ہاتھ باندھے، استقبال میں چپ چاپ ولیم اور اُن کے خاندان کو گزرتے دیکھ رہے تھے۔ ان مقامیوں کے سیاہ رنگ کے چہرے، گال پچکے ہوئے اور سکڑی ہوئی کالی ٹانگیں بتا رہی تھیں کہ غلاموں کی حقیقی تصویر انہی لباسوں میں بنتی ہے۔ انہیں دیکھ کر ولیم نے ایک لمحے کے لیے خداوند یسوع مسیح کا شکر ادا کیا کہ اُس کی رگوں میں بہر حال انگریزی خون دوڑتا ہے۔ لیکن پھر اُن کی دل جوئی کے لیے اچانک ولیم نے اپنا ہاتھ اُوپر کر کے اُن مقامی مزارعوں کو سلام کر دیا۔ ولیم کے اِس عمل کو دیکھ کر سارے کا سارا عملہ، اُس کا باپ جانسن، ولیم کی والدہ، ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، تحصیلدار صاحب حتیٰ کہ دوسرا تمام عملہ بھی سکتے میں آگیا۔ ولیم نے مقامیوں کو سلام کر

کے پورے انگریزی وقار کو ہی داؤ پر نہیں لگایا تھا بلکہ اپنی ملازمت سے بھی کھیل گیا تھا۔ اُس کے اس عمل سے دیسی لوگ بہت خوش ہوئے لیکن معاملہ بہر حال خطرناک تھا۔ جسے ولیم بھی فوراً ہی بھانپ گیا اور اپنے آپ میں شرمندہ ہونے لگا۔ ایک اضطراب انگیز خاموشی میں چلتے ہوئے نولکھی کوٹھی کے صحن میں پہنچ گئے۔ صحن میں پہنچ کر جانسن صاحب نے جلدی سے سب کو رخصت کیا اور کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ ولیم جانسن صاحب کے اندر اُٹھنے والے طوفان کو جانتا تھا کہ وہ اُس کے اس عمل پر کتنا پریشان ہو گیا تھا۔ اُسے معلوم تھا، اگر یہ رپورٹ کمشنر صاحب کو پہنچ گئی تو ولیم کے لیے کیا خرابی پیش آسکتی ہے۔ جانسن کو اُس وقت ہرگز کوئی پریشانی نہ ہوتی، اگر یہ کام ولیم کی بجائے کوئی دوسرا انگریز افسر کرتا۔ ولیم اُس کا بیٹا تھا اور یہ بات ولیم بھی جانتا تھا کہ اُس کا باپ ڈپٹی کمشنر ہوتے ہوئے اس عمل کو کتنا ناگوار سمجھ رہا ہے۔ اب گھر میں خلوت کے دوران اُس کی سرزنش ہونے کا وقت قریب تھا۔ اِس کے باوجود اسے یہ حوصلہ تھا کہ ابھی اُسے اپنے ہی باپ سے واسطہ تھا، جو سرزنش کے علاوہ کچھ اور نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے اس بات پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ آخر اُس سے اچانک یہ غیر معمولی حرکت سرزد کیسے ہو گئی تھی۔

کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھ چکے تو ولیم اپنے باپ کی زبان سے شکوہ سننے کو تیار ہو گیا۔ وہ مدت کے بعد نولکھی کوٹھی میں داخل ہوا تھا اور نہیں چاہتا تھا اُس کا باپ ایسی بات کرے جو سارے مزے کو کرکرا کر دے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اُسے اپنے باپ سے نصیحتوں کا باب سنتے ہی بنی تھی۔ اِس کے برعکس جانسن نے ولیم کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بیگم کو مخاطب کیا اور بولا، حنا باورچی سے کہو چائے کا سامان لگائے، اِتنے میں میں نہا لوں۔ یہ کہ کر جانسن باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ ولیم وہیں بیٹھا لورین سے باتیں کرنے لگا۔ ولیم جانتا تھا جانسن صاحب نے نصیحت فی الحال معطل کی ہے بھلائی نہیں۔ لیکن فی الوقت تو جان چھٹی۔ حِنّا نے باورچی کو چائے لگانے کے لیے آواز دی۔ پھر بیٹے اور بیٹی کے پاس آبیٹھی۔ ولیم نے بھرپور نظر سے ماں کی طرف دیکھا اور متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ حِنّا کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی لیکن اُس کے جسم میں ابھی اتنی جاذبیت اور کشش تھی جو کسی بھی مرد کو ایک دفعہ چونکا دینے کے لیے کافی تھی۔ وہ ایک لحظے کے لیے باپ کی قسمت پر رشک کرنے لگا۔ لیکن چند ثانیوں بعد ہی ایک لرزش سی لے کر اُس نے یہ خیال جھٹک دیا اور لورین سے بولا، لورین کیوں نہ ہم آج ایشلے، سمتھ اور ڈینی کو بھی یہیں بُلا لیں، مل کر فلاش کھیلیں اور ایشلے سے شاعری سنیں؟

لورین نے نہایت جوش میں آکر ولیم کی بات سے اتفاق کیا اور کہا، ولیم یہ آئیڈیا آپ نے بہت عمدہ پیش کیا ہے لیکن اِس کے ساتھ ایک اور کام بھی ہو جائے، آج رات طوفانی قسم کی چاندی ہو گی۔ کیوں نہ نہر دواب کے بہتے پانی میں تختے بچھا کر رات وہاں پر ہی چاندنی کا نظارہ کیا جائے، وہیں پر فلیش کھیلی جائے اور ایشلے سے شاعری سنی جائے؟

لورین کیا دن یاد کرا دیے، ولیم نے بالکل لڑکپن کا سا انداز اپناتے ہوئے لورین کے شانے پر ہاتھ مارا۔
دونوں کی گرم جوشیاں دیکھ کر حِنّا بھی گفتگو میں شریک ہو گئی اور بولی، تم دونوں اپنے باپ پر بالکل نہیں گئے۔ عین میرا دماغ پایا ہے، مکمل عیاش اور بے تکا، لیکن پیار وہی زندگی ہے۔

حِنّا کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ جانسن صاحب باتھ روم سے وارد ہو گئے۔ انہوں نے حنا کی قریباً پوری بات سُن لی تھی۔ مسکراتے ہوئے بولے، ڈارلنگ حِنّا عیاشیاں تو ہم نے آپ کو کرائی ہیں۔ یاد کرو جب تم لندن چھوڑنے پر آمادہ ہی نہیں تھی اور ہم کتنی مشکل سے آپ کو بہلا پھسلا کر یہاں کھینچ لائے۔ اب ہمیں اتنا بھی خشک نہ جانو۔ یہ سب کچھ آپ کو اور آپ کے بچوں کو ہمیں نے سکھایا۔ یہ میرا پر دادا مارٹن ہی تھا، جو سوتی کپڑا لینے آیا اور کمپنی کا داماد بن گیا۔ پھر ایک دنیا نکل گئی لیکن ہم نے دیکھ لیا تھا کہ اصل میں ملٹن کی جنت گم گشتہ یہی ہے۔ جو اب ہماری پشتوں میں چلے گی۔ اِس لیے ہم نہ نکلے اور دانتوں سے ہندوستان کی ریشمی گرہ پکڑ لی۔ اِسی کا نتیجہ ہے کہ تم باغوں میں بیٹھی ہو۔ ورنہ کئی انگریز تو ابھی بھی ممبئی میں ٹین کے ڈِبوں میں بیٹھے ہیں اور دن رات بدبو اور پسینے سے کھیلتے ہیں۔

جانسن صاحب کی بات سن کر حِنّا سمیت سب ہنس دیے۔ اتنے میں باورچی چائے لگا کر ہاتھ باندھے ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ جانسن صاحب سیدھے چائے کی میز ہی کی طرف لپکے اور ایک نشست پر بیٹھ گئے۔ اُن کے بعد حنا، ولیم اور لورین بھی میز کی طرف بڑھے۔ اِس وقت سب کا موڈ خوش گوار تھا، اسلیے کھل کر باتیں ہونے لگیں۔ لورین نے جانسن صاحب سے کہا، پاپا آج ہمارا پروگرام فلیش اور شاعری کا بنا ہے۔ وہ بھی نہر دواب کے بہتے پانی پر تخت بچھا کر کینال بنگلہ کے پاس پیپلیوں کی چھاؤں میں۔ کیسا رہے گا؟

بھئی آپ نے خیال تو کمال کا سوچا ہے، جانسن صاحب نے کہا، میرا خیال ہے یہ منصوبہ بھی برخوردار اسسٹنٹ کمشنر جناب ولیم صاحب کی اختراع ہے۔ یہ ہمارا شاعر مزاج بیٹا کچھ نہ کچھ کر کے رہے گا۔

نو پاپا، ولیم بولا، یہ شاعرانہ اختراع آپ کی بیٹی کی ہے، ولیم شاید جانسن کی طرف سے اس منصوبے کی ذمہ داری قبول کر لیتا لیکن وہ جانتا تھا دراصل جانسن صاحب نے ولیم پر چوٹ کی تھی۔ جو اُس نے اپنے مزارعین کو سلام کرنے کی ایجاد کی تھی۔

جی، لورین نے مکا لہراتے ہوئے کہا، پاپا یہ منصوبہ میرے دماغ کا سرمایہ ہے، جو میں نے جناب میں گزارا ہے۔
حِنّا بولی، لو بھئی اب تو سارا گھر ہی شاعر ہو گیا ہے۔ ایشلے کی صحبت میں کچھ تو ہونا ہی تھا۔

جبکہ سارا گھر نواب پہلے ہی تھا۔ اب لکھنؤ لُٹنے میں کیا کسر باقی رہ گئی؟ جانسن صاحب نے لقمہ دیا، اس کے بعد ایک اور قہقہ لگا۔

چائے ختم ہو چکی تو جانسن صاحب نے نائب تحصیل دار کو طلب کیا جس کی ڈیوٹی جانسن صاحب اور اُس کی فیملی کے اوکاڑہ میں قیام تک اُن کے ساتھ لگ چکی تھی۔ نائب تحصیلدار جانسن صاحب کا بلاوا سنتے ہی بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا اور حکم سننے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جانسن کے چہرے پر نہایت سنجیدہ افسرانہ تمکنت سمٹ آئی، جو ایک ڈپٹی کمشنر کی طبیعت کو اِس وقت لازم تھی۔ مسٹر، لورین جو کچھ کہتی ہے، وہ غور سے سنو اور اُس پر جلدی عمل کرو۔ اب جانسن صاحب نے لورین کی طرف دیکھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی بات تحصیل دار کو سمجھا دے۔ لورین نے تحصیل دار کو وہ تمام ہدایات جاری کر دیں جس کا آئیڈیا پہلے وہ بیان کر چکی تھی۔ تحصیل دار ہدایات سن کر جیسے ہی مڑا ولیم نے اُسے دوبارہ آواز دی، سنیے مسٹر، رینالہ سے ایشلے اور ڈینی کو اطلاع کر دو، اُن کے دوست ولیم اور لورین نولکھی کوٹھی پہنچ گئے ہیں اور آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ سہ پہر تک آجائیں ہم کھانا اُن کے ساتھ کھائیں گے۔ اس کے علاوہ کچھ بٹیروں اور مرغابیوں کے گوشت کا بندوبست بھی کرادو۔

جی بہتر سر، تحصیل دار نے فرمانبرداری سے حکم سنا۔

حکم دینے کے بعد جانسن پھر حِنّا کی طرف متوجہ ہو گیا اور اُس کے ساتھ دوبارہ بات کرنے لگا، اس کا مطلب تھا کہ تحصیل دار صاحب جا سکتا ہے۔ اُس نے ہلکا سا ہاتھ اُٹھا کر ماتھے پر رکھا اور صحن سے باہر نکل گیا۔

اس وقت تک ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ اب جانسن نے اپنے خاص منشی تفضل شاہ کو بلانے کا ارادہ کیا، جو جانسن کی تمام زمینوں کا ذمہ دار تھا اور مزارعین کے ساتھ سارے حساب کتاب کا کھاتہ بھی اُسی کے پاس تھا۔ خانساماں نے کچھ ہی دیر بعد تفضل شاہ کو بلا لیا۔ تفضل شاہ پچاس پچپن سال کا نہایت شستہ آدمی تھا۔ وہ جانسن کے سامنے اپنے سادات پن کا وقار برقرار رکھنے کے لیے جھکنے سے گریز ہی کرتا، جس کا احساس جانسن کو بھی تھا۔ اور جانسن کو شاہ صاحب کا اتنا سا نخرہ اُن کی ایمانداری کی وجہ سے قبول تھا۔ ویسے بھی ہندوستان میں سادات کا جو احترام تھا، جانسن اُس سے خوب واقف تھا۔ اِدھر جانسن شاہ صاحب سے زمینوں کے حساب کتاب میں جُت گئے اُدھر ولیم، لورین اور اُن کی والدہ حِنّا مویشی فارم کا دورہ کرنے کے لیے چل پڑے، جو صرف دو سو قدم کے فاصلے پر نولکھی کوٹھی کے پچھواڑے واقع تھا۔ اِس فارم میں اعلیٰ قسم کی ساہیوال نسل کی گائیں اور نیلی کی سینکڑوں بھینسیں تھیں۔ ان گائیں اور بھینسوں کا دودھ اور مکھن سارا سال ہندوستان کے انگریز دوست احباب کے علاوہ انگلنڈ تک بھی جاتا۔ اکثر دفعہ نوابوں اور مہاراجاؤں کی خدمت میں بھی مکھن مہر بستہ بھیجا جاتا۔ جس کے عوض داد اور صلے حاصل کیے جاتے۔ فارم میں گائیں اور بھینسوں کے علاوہ شرطوں پر دوڑنے والے بیل اور گھوڑے بھی تھے۔ جن میں میم صاحبہ کی تو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ وہ جانسن کے شوق تھے اور بھرپور شوق تھے۔ فارم اور اُس کے مضافات میں پھیلی ہوئی تمام چیزیں باور کراتی تھیں کہ صاحب نوابوں سے کسی طرح بھی کم نہ تھے۔ بہت سے انگریز افسروں کو اس فیملی کے یہ نخرے اور نوابی انداز کھٹکتے تھے لیکن جانسن صاحب اور اُس کا باپ اور دادا ایسے چالاک تھے کہ جس افسر کی طرف سے اُنہیں حسد اور نقصان کا اندیشہ ہوتا اُسے اتنے زیادہ تحفے اور گھی مکھن بھیج دیتے کہ اُس بچارے کو مروتاً خاموش ہونا ہی پڑ جاتا۔ ایک دو دفعہ تو انتہائی مہنگے قسم کے دو گھوڑے بھی گورنر لاہور کی نذر کیے گئے۔ اصل پوچھو تو اسی کی وجہ سے جانسن صاحب اتنی جلدی اس اہم عہدے پر جا کر کھڑے ہو گئے تھے اور انہیں اُن کی مرضی کے بغیر کہیں ہلایا بھی نہیں گیا تھا۔

تینوں برٹش ماں، بیٹا اور بیٹی فارم کا دورہ کرتے جا رہے تھے جبکہ ملازم اُن کے ادھر اُدھر دوڑتے ہوئے ایک ایک مویشی کے متعلق معلومات دیتے جاتے۔ لیکن وہ ان سے ذرا فاصلے پر ہی چلتے، مبادا بدبو یا کسی دوسری حرکت سے میم صاحب اور ولیم صاحب ناراض نہ ہو جائیں۔ نیم اور پیپلیوں کے لاتعداد درختوں کے سائے میں نہر کے کنارے کنارے یہ فارم ایک مثالی حیثیت رکھتا تھا۔ جس کو دوسری طرف دور تک آموں، مالٹے، امرود اور جامنوں کے

باغوں نے اپنی پناہ میں لے رکھا تھا۔اِن باغوں کے درمیان سے لہریں لیتی صاف پانی کی ایک چھوٹی سی نہر تھی۔ جس کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔اُس کے کناروں پر بھی نیم اور پاپلر کے اُونچے پیڑوں کی سبز چھاؤں نے نہر کا دماغ نہر شداد کے پلے تک پہنچا رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی ولیم اپنی زندگی کے فسانے انہی بستیوں کے حوالے رکھنا چاہتا تھا۔فارم کے تمام مویشی انتہائی صحت مند تھے۔نہ تو کسی کی ہڈیاں نظر آرہی تھیں اور نہ ہی کسی جانور کے جسم پر میل کچیل تھا۔ ہر ایک مویشی لکڑی کی بنی ہوئی کُھرلیوں میں منہ دیے چارہ کھانے میں اور لمبی پوچھلیں ادھر اُدھر چلانے میں مگن تھا۔اِسی طرح چھوٹے کٹوں اور بچھڑوں کی کُھرلیاں الگ تھیں۔ جن پر یہ اگرچہ بندھے تھے لیکن بندھے ہوئے بھی دڑنگے مارنے سے باز نہیں آتے تھے۔اس طرح یہ اور بھی زیادہ بھلے لگتے تھے۔ بھینسوں کے جسم اتنے کالے اور شفاف تھے، چاہے تو منہ دیکھ لو۔ جبکہ گائیں گلابی رنگ کی بڑی بڑی ہرنیاں لگتی تھیں۔لورین چلتے چلتے کسی جانور کی دم کو ہاتھ لگاتی تو وہ ایک دم اچھل پڑتا مگر اتنے میں لورین شرارت کر کے پیچھے ہٹ چکی ہوتی۔ دور کھڑے ملازمین کے لیے ہر چند یہ معمولی بات تھی لیکن وہ محض لورین کو خوش کرنے کے لیے ایک بڑا سا قہقہ لگا دیتے۔ جیسے اُس نے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے دیا ہو۔

فارم کو عبور کر کے ولیم،لورین اور حنا نہر کے دامن میں چلنے لگے تو ایسے لگا جیسے تین گلابی سرو باغوں کے سائے سائے چلے جاتے ہوں۔ مقامی وہیں رک گئے تھے کہ وہ اِس سیر میں ہم قدمی کے قابل نہیں تھے۔ یہ بات ولیم اور دیسی سب ہی جانتے تھے۔

ولیم کے ذہن میں بچپن ہی سے ایک خیال تھا لیکن اُس پر واضح نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور جو سوچ رہا ہے وہ ٹھیک بھی ہے کہ نہیں۔ جس کا عملی مظاہرہ گاہے گاہے کرتا بھی رہا ہے۔اِسی ذہنی کیفیت کے تحت یا مقامی لوگوں کے چہروں کو دیکھتے ہوئے اُس نے چلتے چلتے حناؔ سے ایک سوال کر ہی دیا، ماما کیا ایسا نہیں ہو سکتا اِن دیسی لوگوں کے لیے ایک انگریزی سکول قائم کر دیں، جہاں اِن کی جاہل اولادیں کچھ پڑھ لکھ کر اپنی حالت سیدھی کر لیں؟ پھر حناؔ کے جواب دینے سے پہلے ہی خود دوبارہ بولا، میرا مطلب ہے اُس کی نگرانی ہم کیتھی کے حوالے کر دیں، کہ وہ یہاں آکر فارغ تو نہیں بیٹھے گی، گویا ثابت کرنا تھا کہ دراصل وہ یہ مقامیوں کے لیے نہیں کیتھی کے لیے کرنا چاہتا ہے۔

حنا نے ایک نظر ولیم کی آنکھوں میں جھانکا اور بولی، ولیم میرا خیال ہے تمھیں کیتھی سے زیادہ ان کالوں فکر ہے۔ تم ان کے بارے میں حاکم بن کر کیوں نہیں سوچتے؟ خداوند یسوع مسیح نے تم پر ایک برکت نازل کر کے کمشنر بنا دیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ اپنی برکت واپس لے لے اور تم انھی کالوں کے ساتھ عذاب میں گرفتار ہو جاؤ۔ کیونکہ اِنہیں ایسی حالت میں ہم نے نہیں خداوند یسوع مسیح نے رکھا ہے۔ اب اِن کو نہ یسوع مسیح جانتا ہے اور نہ یہ اُس کو جانتے ہیں۔ اس لیے ان سے دور رہو اور خدا برکتوں کو ضائع نہ کرو۔ جانسن صاحب تمھارے بارے میں بہت فکر مند ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے فیروز پور سے بھی ان کی رپورٹس اچھی نہیں آرہیں اور یہ کہ ولیم گورنمنٹ سے زیادہ رعایا کا وفادار ہے۔ اِس بات کے اثرات اِس کی ملازمت پر بُرے پڑیں گے۔

ولیم کو اپنی ماں کی بات سمجھ نہیں آرہی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے یسوع مسیح غریبوں اور ناداروں کا ساتھ دینے کے خلاف ہو۔ اگر یہ بات ٹھیک تھی تو پھر ہندوستان کے جتنے شودر اور دلت ہیں، یسوع مسیح کو مان کر اُن کی حالت کیوں ٹھیک نہیں ہوئی؟ وہ تو اِن مسلمانوں اور سکھوں سے کہیں زیادہ بدتر حالت میں ہیں۔ اور یہ ہندوستان کے نوابین، جن کی حالت ہم سے بھی کہیں بہتر ہے، یہ کس یسوع مسیح کو مانتے ہیں؟ لیکن یہ وہ باتیں تھیں، جن کے سمجھنے کی حناؔ صاحبہ کو ضرورت نہیں تھی۔ اِس لیے ولیم نے اپنی ماں کی بجائے چلتے چلتے ایک لمحے کے لیے لورین کی طرف دیکھا اور بولا، لورین میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر پورا ہندوستان اِسی طرح کا ہو جائے، جس طرح ہمارا یہ فارم اور زمینیں اور باغات ہیں تو گورنمنٹ کا کیا نقصان ہو گا۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں اُس کے خراج اور مالیے میں اضافہ ہو گا۔ اور جہاں برطانیہ میں آج یہاں سے دس روپے جاتے ہیں، وہاں اسے سو پونڈ جانے لگیں گے۔

لورین نے ولیم کی اس بات پر غیر استفہامی انداز میں سر جھٹکا اور بولی، ولیم مجھے ایسی باتیں سمجھ نہیں آتی۔ تم یہ بتاؤ کیتھی کو کب یہاں لا رہے ہو؟ اب وہ بے چاری کب تک سردی میں ٹھٹھرتی رہے گی۔ میں چاہتی ہوں اُسے ان آموں کے موسم تک بیاہ کر لے ہی آؤ۔
ولیم نے کاندھے اُچکائے اور حِنّا کی طرف دیکھا اور بولا، یہ بات تو ماما ہی طے کریں گی، اُسے کب لانا ہے؟ پھر مسکراتے ہوئے، میں نے تو اپنا کام مکمل کر دیا ہے۔

حنا نے ولیم کی طرف دیکھا اور بولی، ولیم تمھارے اشارے کی بات ہے۔ مَیں کمشنر صاحب سے ابھی بات کر لیتی ہوں لیکن پہلے یہ طے کرو اُس کے لیے کون سی قیام گاہ آپ کے حوالے کی جائے؟

ماما میرا تو خیال ہے اِس جگہ سے بہتر کوئی ٹھکانہ نہیں۔ وہ یہاں بہت خوش رہے گی۔ میں چاہتا ہوں میں اُس کے لیے یہاں ایک جدید اسکول قائم کر دوں، جہاں چھوٹے پیمانے پر مقامی عیسائی اور مسلمان بچوں کی تعلیم کا انتظام ہو جائے۔ وہ ویسے بھی اس کام کو پسند کرتی ہے۔

اوکے، جیسے آپ کی مرضی، لیکن میرا خیال ہے آپ پہلے اُسے بیاہ لاؤ۔ اُس کے بعد دوسرے منصوبوں پر عمل کر لینا، حنا نے ولیم کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

نہراب مالٹوں کے باغ سے آموں کے باغ کی طرف نکل گئی تھی۔ اِس لیے ولیم، لورین اور حنا نے اپنا راستہ بدل کر شریںنہ کے بڑے بڑے درختوں کے درمیان سے دوبارہ نولکھی کوٹھی کی طرف پھیر لیا۔ بہار شروع ہو رہی تھی۔ شریںنہ کی شاخوں پر پھوٹتی ہوئی تازہ پتوں کی کونپلیں ایسی میٹھی خوشبو چھوڑ رہیں تھیں، جن کے آگے سارے جہان کے پرفیوم ماند تھے۔ ولیم اور لورین اِن دھیمی خوشبوؤں کے درمیان لمبے لمبے سانس لینے لگے اور سینہ پھلا کر آکسیجن اندر کھینچنے لگے۔ آہستہ آہستہ اِسی طرح سیر کرتے ہوئے وہ سرسوں اور برسن کے کھیتوں میں کھڑے ہوئے میٹھے کے پیڑوں کے بیچ سے نولکھی کوٹھی میں آ نکلے۔ جہاں میٹھے کے پیڑ کے تیز خوشبو والے سفید سفید پھول لورین کو اتنے بھائے کہ اُس نے مٹھی بھر پھول توڑ کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیے اور نولکھی کوٹھی کے صحن میں پڑی خوبصورت لکڑی کی کرسیوں پر ایک دم گر کے بیٹھ گئی۔ اِسی صحن میں کچھ فاصلے پر جانسن صاحب تفضل شاہ سے حساب کتاب کر کے ابھی ابھی فارغ ہوئے تھے اور اب وہ اُٹھ رہے تھے۔ ڈیڑھ بج چکا تھا اور بھوک بھی خوب چمک گئی تھی، جس پر فارم کے بیچوں بیچ لمبی سَیر نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ لورین نے وہیں باورچی کو طلب کر کے لنچ کے بارے میں پوچھا، باورچی نے نہایت ادب سے جواب دیا، میم صاحبہ آپ کا ہی انتظار ہے، لنچ تو کافی دیر کا لگ چکا ہے۔ باورچی کی طرف سے کھانے کا سن کر سب ایک ہی دفعہ کوٹھی کے وسیع ڈائیننگ ہال کی طرف اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ڈائیننگ ہال کم از کم تیس فٹ لمبا اٹھارہ فٹ چوڑا اور پچیس فٹ اُونچی چھت پر محیط تھا۔ دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے طاق اور طاقوں میں سجے ہوئے فانوس، جھاڑ اور آتش دان لگے تھے۔ آتش دان کی خاص ضرورت تو نہیں تھی۔ کبھی کبھی ہی سخت سردی میں جلتا تھا لیکن انگریزی طرز تعمیر کے مطابق اُس کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ کمرے کے درمیان میں ایک بڑی اور صندلی ٹیبل، جس پر ریشمی دستر خوان اِس طرح بچھا تھا کہ اُس کے کنارے نیچے پاؤں تک چُھوتے تھے۔ چھت پر لٹکے ہوئے فانوس اور اُن کے درمیان بجلی کے پنکھے ڈائیننگ ہال کو ایک نوابی شان سے دوچار کرتے تھے، بجلی رینالہ بجلی گھر بن جانے سے کافی مقدار میں دستیاب تھی۔ اِس لیے بعض اور بھی چیزیں بجلی پر چلنے والی مہیا کی گئیں۔ جن میں سے اکثر اِسی ڈائیننگ ہال اور ڈرائنگ روم میں موجود تھیں۔ مثلاً گراموں فون، ریکارڈر سسٹم، بھاپ دان، کھانا پکانے کے لیے ہیٹر اور اِسی طرح کی بیشتر چیزیں۔ ڈائننگ ہال میں بچھا ہوا قالین بھی اپنی مثال آپ تھا، جو سپیشل نواب صاحب آف بہاولپور نے جانسن صاحب کو اُن کی بہاولپور ریاست میں تعیناتی پر تحفہ دیا تھا۔ اِس کے علاوہ بھی بہت ساری چیزیں مختلف جگہوں سے تحفہ میں آئی ہوئی ڈائننگ ہال اور ڈرائنگ روم میں موجود تھیں۔ اِن سب چیزوں کو انہی دو کمروں میں رکھنے سے جانسن صاحب کے نوابوں اور مہاراجوں سے تعلقات اپنے شریکے کے انگریزوں پر اچھی طرح کھل جاتے تھے۔ جن کی بعض انگریز افسر حسرت ہی کر کے رہ جاتے۔ کھانا میز پر دور تک چینی، کانچ اور سٹیل کے برتنوں میں سجا تھا۔ دوپہر کا یہ کھانا دودھ، مکھن، جیم، اچار، پلاؤ، روغنی روٹیاں، کھیر، جوس اور دو تین قسم کے گوشت پر منحصر تھا۔ سوئر کا گوشت اِس خاندان نے عرصہ پہلے چھوڑ رکھا تھا۔ اِس لیے اُس کا میز پر کوئی انتظام نہیں تھا۔ اِس معاملے میں جانسن اور ولیم کے اُن انگریز دوستوں کو کوفت ہوتی تھی جنھیں یہ گاہے بگاہے کھانے پر بلاتے لیکن باقی چیزیں کافی مزیدار ہوتیں اور کھانا بدمزانہ ہو پاتا اور سوئر کے بغیر بھی اُن کا گزارا چل ہی جاتا۔ ویسے بھی نولکھی کوٹھی پر اکثر اُن کے رینالہ اسٹیٹ، ستگھرہ اسٹیٹ اور مچلز والے انگریز مہمان ہی آتے تھے، جو خود بھی دیسی کھانوں میں رچ بس گئے تھے۔

کھانے کی میز پر بھی کافی گپ شپ رہی لیکن یہاں بھی جانسن صاحب نے ولیم سے اُس کی جلال آباد میں تعیناتی اور ملازمت کے تجربات سے متعلق کوئی سوال نہیں کیا۔ اِس پر ولیم حیران تھا لیکن خوش بھی تھا کہ ایسے خوشگوار ماحول میں اِس طرح کی گفتگو نامناسب تھی۔

دس پندرہ منٹ میں ہلکی وائین کے ساتھ مزیدار کھانا کھا کر سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور تھوڑی دیر کے لیے آرام کرنے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے کیونکہ چار بجے ریناالہ سے ولیم کے بچپن کے دوست ایشلے کے آجانے پر اُس کا استقبال بھی کرنا تھا۔ جس سے پچھلے سات سال سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ لندن سے آنے کے بعد ولیم کو مسلسل نوکری کے بکھیڑوں میں اتنا وقت ہی نہ مل سکا کہ وہ دوستوں کے ساتھ مل کر کچھ دیر گپ شپ کی چھلیں کر لے اور ایشلے سے اُس کی شاعری سن لے، جو بچپن کے وقت تو محض دل بہلانے کی ہوتی تھی لیکن بعد میں جب اُس نے ولیم کو اپنی نظمیں لندن بھیجیں تو وہ بہت عمدہ تھیں۔ آج ایشلے سے ہونے والی ملاقات کے تصور میں اُسے عجب سرشاری کا لطف محسوس ہو رہا تھا۔ لندن میں اُسے کیتھی نے کسی بھی قسم کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی لیکن ایشلے کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اِنہی احساسات میں اُسے اپنے اور ایشلے کے ساتھ گزارے ہوئے ایسے وقت کی جھلکیاں یاد آنے لگیں، جنہیں یاد کر کے وہ کچھ شرما سا گیا لیکن وہی جھلکیاں اُسے مزید لطف اندوز کرنے لگیں اور وہ ایشلے کی ملاقات کے لیے بے چین سا ہو گیا۔ لندن سے آنے کے بعد اُس سے ملاقات اس لیے بھی نہ ہو سکی تھی کہ وہ جب ہندوستان آیا تو ایشلے کلکتے میں ایک کالج میں بطور پروفیسر تقرری کے لیے اپنے آڈر لینے جا چکا تھا۔ اُس کے بعد ولیم لاہور سے فیروز پور چلا گیا۔ یوں اب تک دونوں میں دوری برقرار رہی تھی لیکن خوش قسمتی سے اب دونوں ہی اوکاڑہ میں موجود تھے اور ایک دوسرے سے ملاقات کرنے کے لیے بے چین تھے، جو چند لمحوں کے بعد ہونے والی تھی۔

جانسن صاحب قیلولے کے لیے جا چکے تھے لیکن ولیم باہر نکل کر صحن میں ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر ٹہلتے ٹہلتے اُس نے باورچی کو آواز دے کر کافی بنانے کے لیے کہا اور پھر اُسی طرح ٹہلنے لگ گیا۔ اگرچہ اُس کا چہل قدمی کرنے کو دل نہیں چاہ تھا لیکن اُسے بس ایشلے سے ملنے کی بے چینی لگی ہوئی تھی۔ اِسی کیفیت میں ولیم کو پندرہ منٹ گزر گئے۔ اتنے میں باورچی کافی بنا کر لے آیا اور وہ کوٹھی کے وسیع لان میں پڑی ہوئی کُرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ کر کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ ابھی اُس نے دو ہی گھونٹ لیے تھے کہ دور سے گاڑی کے آنے کی آواز سنائی دی۔ ولیم کافی کا کپ وہیں رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور آموں کے باغ کے دوسری طرف سے آنے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں اُسے ایشلے اور ڈینی کے چہرے نظر آ گئے جنہیں اِتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی۔ اُس نے دور ہی سے دونوں کی شکلوں میں واضح فرق کو محسوس کر لیا تھا۔ جیسے ہی جیپ پیپل کے درخت کے نیچے پکی انیٹوں کی سڑک پر آ کر رُکی، ولیم ملنے کے لیے تیزی سے اُس طرف چل پڑا۔ اُدھر سے ایشلے اور ڈینی بھی گاڑی سے

چھلانگ مار کر ولیم کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔اِس تیزی میں ڈینی کا کنٹوپ سر سے گرتے گرتے بچا۔اِس اشتیاق میں سب نے ملازموں کے سامنے اپنے پورے انگریزی وقار کو پاؤں کی ٹھوکر پر رکھ دیا اور ایک دوسرے کو بے انتہا جوش کے ساتھ گلے ملنے لگے۔ رہ رہ کر لپٹنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کے بوسے بھی لے لیے۔ ان کے اس انداز کو دیکھ کر ملازم حیران رہ گئے۔ اُن کی نظر میں یہ فعل انتہائی غیر اخلاقی اور تعجب انگیز تھا اور یہ بات راسخ کر دینے کے لیے کافی تھا کہ فرنگی قوم بہت زیادہ فحاشی پھیلانے والی ہے۔ کچھ دیر وہیں کھڑے اپنے اشتیاق کو کم کرنے کے بعد تینوں اسی جگہ لان میں بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ اِس جذباتی ملاقات میں ولیم کو یہ بھی نہ یاد رہا کہ دوستوں کو چائے ہی پوچھ لے۔ کچھ دیر چہلیں کرنے کے بعد اُس کو خیال آہی گیا اور اُس نے ملازم کو آواز دے کر کافی بنانے کے لیے کہا۔ ایشلے جو ولیم کا اصل میں جی کا دوست تھا، کچھ دیر جی بھر کے ولیم کی طرف دیکھتے ہوئے بچپن کے نظاروں میں کھو گیا پھر بولا، دوست میں نے تو خیال کیا تھا، آپ لندن کے ہو کر رہ گئے، ہندوستان نہیں لوٹو گے اور یہاں ہم آپ کی روح ہی تلاش کریں گے۔

ولیم ایشلے کی سبزی مائل نیلی آنکھوں میں دیکھ کر بولا، ڈیئر میں آپ کو ایک بات بتا دوں، آپ صرف شاعری کرتے ہیں لیکن اُس پر عمل مَیں کرتا ہوں۔ دیکھنا ایک روز آئے گا آپ میری روح ہندوستان کی خوشبوؤں میں ڈھونڈو گے (پھر آموں کے باغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اِن درختوں کے پتوں کی رگوں میں میری سانس چلتی ہے۔

ڈینی ولیم کو جذباتی ہوتے دیکھ کر بولا، چھوڑ یار آپ تو شاعری میں بات کرنا شروع کر دیتے ہو۔ یہ کام ایشلے کے لیے رہنے دے۔ تم نے ایک سال سول سروس میں گزار لیا ہے۔ کوئی اُن تجربوں کا حال سنا، کیسا لگا اِس نوکری میں آنا آپ کو؟ ولیم نے ڈینی کی بات کا مزا لیتے ہوئے ایشلے کی طرف دیکھا اور بولا، ایشلے، یہ ڈینی عجیب آدمی ہے، کوئی موضوع چھیڑو، یہ بات دوسری طرف گھمانے کی کرتا ہے۔ اچھی بھلی بچپن کی محفل جمنے لگی ہے تو یہ چاہتا ہے، مَیں ملازمت کے کریہہ پیشے کی الف لیلیٰ چھیڑ دوں۔ دوست یہ ایک ایسی ملازمت ہے جس میں اپنی طرف سے صرف ڈانس کر سکتے ہو۔ ہدایات کہیں اور سے ملتی ہیں۔ تم اِس ساری بکواس کو ایک طرف رکھو اور میری سنو، لورین بھی آئی ہوئی ہے۔ ہمارا پروگرام آج نہر کے پانی پر تخت بچھا کر رات کی سفید چاندنی میں فلاش کھیلنے اور ایشلے سے شاعری سننے کا ہے۔ یہ وہی نہر ہے ایشلے، جس میں آپ آٹھ سال کی عمر میں یسوع مسیح کے حوالے ہونے لگے تھے۔ پھر میری چیخ نے ایک

ملازم کو چھلانگ لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اِسی نہر میں آج رات ہم لکڑی کے تختوں پر جھولا جھولیں گے۔ یہ آئیڈیا لورین نے پیش کیا ہے۔ بتاؤ کیسا رہے گا؟

ایشلے اُچھلتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور بولا، ارے کمال ہے ولیم، لورین کے آنے کی خبر دے کر آپ نے صحرائے دل میں شبنم بھر دی۔ بہتی ہوئی نہر کے درمیان بیٹھ کر لورین سے باتیں کرنے کا لطف تو خوب آئے گا۔ لیکن یہ بتاؤ، اُس کا چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے) لیکن وہ نظر نہیں) خاوند تو ساتھ نہیں ہے؟ پھر باتیں کھل کر نہیں ہو سکیں گی آ رہی۔

اِس وقت سو رہی ہے۔ تھکی ہوئی تھی۔ ولیم نے وضاحت کی، اُس کا خاوند اُسے کچھ دنوں کے لیے یہاں چھوڑ کر بنارس گیا ہے کسی نواب کے کیس کی تاریخ پر عدالتی معاملے میں۔ اور ہاں آپ کو اگر نہانا دھونا ہے اور آرام کرنا ہے تو کر لیں۔ ابھی ساڑھے تین ہوئے ہیں، رات آٹھ بجے ہم وہاں جائیں گے۔

آرام کی ضرورت نہیں ہے جناب کمشنر صاحب، ایشلے نے ولیم کو طنز کرتے ہوئے کہا، اِس طرح کے چونچلے سول سروس والوں کے ہوتے ہیں۔ ہم تو ٹھہرے مست شاعر۔ رات کی تنہائیوں میں پہروں پھرنے والے اور خوبصورت شکلوں پر نغمے کہنے والے۔ یاد ہے نا آپ کو؟ آپ پر اور لورین پر بھی کئی کئی نظمیں کہہ رکھی ہیں۔ کیا لورین ویسی ہی ہے؟ مجھے تو اُس کو دیکھے بھی تین سال ہو گئے۔ ممبئی کیا گئی ہماری ذات ہی بھول گئی۔
ہاں ہاں ویسی ہی ہے، ولیم نے زور دے کر کہا۔

تینوں دوست کوٹھی کے صحن میں بیٹھے کافی کے ساتھ باتوں کے طوطے اُڑاتے رہے۔ بیچ بیچ میں ایشلے اپنی نظمیں بھی سناتا رہا، جن میں یورپ اور ہندوستانی فضاؤں کا امتزاج تھا۔ اِتنے میں دور سے آوازے لگاتی ہوئی لورین بھاگی آئی اور ایشلے کے آتے ہی گلے لگ گئی۔ اُس کے بعد ڈینی کو ملی اور بیٹھتے ہی ایشلے سے بولی، ایشلے آپ بہت یاد آتے ہو، ممبئی میں آپ کی نظمیں اکثر گنگناتی ہوں۔

ایشلے نے ولیم کی طرف دیکھ کر کہا، لیجیے ایک اور جھوٹ سن لیں۔ ایک خط تک لکھا نہیں اور لگیں مجھے یاد کرنے۔

لورین نے ڈینی کی ایک چٹکی لیتے ہوئے کہا، ڈینی، یہ ایشلے نرا شاعر ہے، احمق شاعر۔ ہم سے شادی کر لیتا، شاعری کے لیے اِسے دوسرے موضوع کی تلاش نہ کرنی پڑتی۔ جتنی چاہتا ہم پر نظمیں کہہ لیتا۔

لورین کے اس چھیڑ خانی والے جملے پر سب نے بلند قہقہ لگایا۔ اِس کے بعد لورین نے ولیم کی طرف دیکھ کر کہا، ولیم، ایشلے سے ذرا وہ کبوتروں والی نظم سنیے، بہت عمدہ ہے۔ جب آپ لندن میں تھے اِس نے مجھے سنائی تھی۔

ارے ایشلے کوئی ایسی نظم بھی لکھی ہے جو لورین کو بھی پسند آگئی؟، ذرا سنیں تو سہی، ڈینی نے ایشلے سے کہا۔
ایشلے نے اپنا ہیٹ اُتار کر میز پر رکھا اور شاعرانہ انداز سے ایک طرف پہلو بدلتے ہوئے نظم شروع کر دی۔
ڈینی، لورین اور ولیم ہمہ تن گوش ہو گئے۔

اپریل کا آسمان بلند ہے
ایک بڑے زمرّد کے انڈے کی طرح
نیلا اور شفاف
اس کی پہنائیوں میں اُڑتے کبوتروں کا
سفید رنگ سفید ہی نظر آتا ہے
اور پنجوں کے ناخن گلابی
مجھے اپنی آنکھوں پر کبھی اعتبار نہیں رہا
مگر میں اپریل کے آسمان سے دھوکا نہیں کھا سکتا
میں نے اسے پچیس بہاروں میں دیکھا
اُس وقت جب پرندے اُڑتے ہیں
اور پریاں ہواؤں میں پَر پھیلاتی ہیں
تمھیں خبر ہے، مَیں اِسے کبوتروں والا آسمان کہتا ہوں
چراگاہوں میں چرتے مویشوں کے درمیان دیکھتا ہوں

جب وہ چرتے چرتے اپنا منہ سبز چارے سے اُوپر اٹھا کر

خدا کو دیکھتے ہیں

کبوتروں کی پرواز کو دیکھتے ہیں

یہ کبوتر ہمیشہ اُڑتے رہیں گے

اُس وقت بھی جب میں نہیں ہوں گا

میرا یقین اعلان کرتا ہے

بڑے آسمان کے کبوتر ہی خدا ہیں

اب شام کے پانچ بج چکے تھے اور شفق کا سورج لال روشنی چھوڑ رہا تھا۔ اِس کے ساتھ ہی لان کے سبزے میں سیاہ مچھر تیرنے لگے جو اُڑ اُڑ کر آنکھوں کو آتے تھے لیکن ہوا ایسی خوشگوار اور رومان پرور تھی کہ ہر ایک کو غش آ رہا تھا۔ اتنے میں جانسن صاحب بھی باہر نکل آئے۔ اُن کے ساتھ حنا بھی تھیں۔ جانسن کے لان میں آتے ہی تمام لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈینی اور ایشلے نے آگے بڑھ کر جانسن صاحب کو سلام کیا اور ہاتھ ملایا۔ جانسن نے اُنہیں مربیانہ انداز میں سلام کا جواب دیا اور کہا، لڑکو! آپ کے لیے نہر پر تخت بچھا دیے گئے ہیں۔ مَیں اور حنّا بھی ڈنر آپ کے ساتھ ہی نہر پر کریں گے۔ اِس لیے تیار ہو جاؤ۔ اِتنا کہہ کر جانسن صاحب نے آگے قدم بڑھائے اور مالٹوں کے سفید چمکتے ہوئے پھولوں کی طرف بڑھ گئے جبکہ باقی دوبارہ وہیں بیٹھ گئے۔ اُن کے ساتھ حنّا بھی وہیں بیٹھ گئی، پھر دوبارہ باتیں اور شاعری شروع ہو گئی۔ مدتوں کے بعد ولیم کو اس طرح کی محفل پہلی دفعہ میسر آئی تھی۔ اِس لیے وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہ ہوا۔ حتیٰ کہ جانسن صاحب جو کچھ دیر ہی پہلے مالٹوں کے باغ میں نکل گئے تھے، دوبارہ نمودار ہوئے اور بولے، آپ ابھی تک یہیں بیٹھے ہیں؟ بھلے آدمیو اب تو ساڑھے چھ بج چکے ہیں۔ جانسن صاحب کے ہوش دلانے پر سب ایک ہی دم کھڑے ہو گئے۔ دیکھا تو صحن کے باہر خادمان اور مامائیں اور انتظامیہ کا عملہ اُن کے انتظار میں کھڑا تھا۔ ایشلے نے جانسن صاحب کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا، سر، ہم آپ کے غصہ سے مستثنیٰ ہیں کہ

شاعر ہونے کے ناتے اتنا تو حق رکھتے ہیں (پھر ولیم کی طرف دیکھ کر) جناب کمشنر صاحب، کیا ہم آپ کی اجازت سے نہا کر کپڑے بدل لیں۔

ولیم نے سر سے ہیٹ اُتار کر جواب دیتے ہوئے سر جھکایا اور کہا، مہاراج اب جلدی کریں ورنہ میں آپ کی اسٹیٹ ضبط کر لوں گا۔ سول سروس آپ کے خیال میں مذاق ہے؟اس فقرے پر سب ہنس دیے۔

اسکے بعد ولیم، جانسن، ڈینی اور لورین تیار ہونے کے لیے کوٹھی میں چلے گئے۔

رات کے دو بجے تک نہر کے چلتے پانی پر چاندنی رات میں شراب، بٹیروں اور مرغابیوں کے کباب، فلیش اور شاعری کرتے اور گاہے گاہے ہندوستان اور یورپ کی زندگی کا جائزہ لیتے سب ہی اتنا تھک چکے تھے کہ صبح گیارہ بجے آنکھ کھلی۔ البتہ جانسن صاحب صبح چھ ہی بجے دوبارہ جاگ گئے تھے اور فارم کی سیر کرتے ہوئے دور تک نکل گئے۔ گیارہ بجے اُٹھ کر سب نے نہایا اور کافی لی۔ حتیٰ کہ لنچ کا وقت ہو گیا۔ لنچ کے بعد ولیم نے اعلان کیا، دوستو میں نے ابھی براستہ ہیڈ سلیمان کی جلال آباد نکلنا ہے،اِس لیے میری رخصت کا وقت آرہا ہے۔ انشاء اللہ اگلے سینچر دوبارہ ملاقات ہو گی۔ آپ چاہیں تو یہاں رہیں اور چاہیں تو رینالہ جائیں۔ یہ کہ کر تیاری میں مصروف ہو گیا۔ دو بجے کے قریب جب ولیم بالکل تیار ہو گیا اور ڈینی اور ایشلے کو ملنے کے لیے باہر نکلا تو وہ دونوں بھی پیپل کے سائے تلے کھڑی اپنی گاڑی کے پاس رینالہ جانے کے لیے تیار تھے۔ ولیم دوستوں کے پاس جا کھڑا ہو گیا، جہاں لورین پہلے ہی موجود تھی۔ جانسن صاحب نے ولیم کو مخاطب کر کے کہا، ولیم دوستوں کو رخصت کر کے ذرا اندر آئیں۔

ولیم ڈرائینگ روم میں پہنچا تو جانسن صاحب اور حنّا دونوں بیٹھے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ ولیم ہیٹ اُتار کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا اور جانسن کی بات سننے کے لیے تیار ہو گیا۔

جانسن نے بلا کسی تمہید کے بات شروع کی، ولیم یہ ڈرائنگ روم میں جتنی تصویریں دیکھ رہے ہو، یہ سب آپ کے اجداد کی ہیں۔ اِن میں سے کوئی ایسا نہیں جس کی خدمات خاندان اور گورنمنٹ کے لیے یکساں فخر کا باعث نہ ہو۔ یہ

ہندوستان، جس کے رومان میں آپ مبتلا ہو، یہ ہمیں بھی اتنا ہی اپنی طرف کھینچتا ہے جتنا آپ کو، لیکن اِس کی محبت کے کچھ آداب ہیں اور وہ آداب تمھارے ہاتھ سے نکلتے جا رہے ہیں۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے، کالے اور سفید لوگوں کے درمیان ایک لکیر ہے۔ اُسے جب بھی عبور کیا جائے گا، اُسی وقت یہ زمین اپنے گلے سے ہمارے اقتدار کی رسی کاٹ دے گی۔ میں بھی اِس حق میں ہوں کہ کالوں کی غربت اور جہالت ختم ہونی چاہیے۔ اُسے بہت حد تک ہم نے ختم کیا بھی ہے، لیکن کیا آپ اِس بات کو بھول گئے کہ ہماری اِن پر حکومت کا سبب اِن کی یہی جہالت ہے۔ چنانچہ اُسے ایک حد تک ان پر مسلط رکھنا ضروری ہے۔

ولیم نے جانسن کی بات سنتے سنتے اپنا پہلو بدلا، جسے دیکھ کر جانسن نے بات جاری رکھی، آپ کے جانے کا وقت ہو رہا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایک دو باتیں اس وقت آپ کو بتا دینا بہت ضروری ہیں۔ ہم کچھ کام میں آزاد ہیں اور کچھ میں مجبور۔ یہ فارم اور یہاں جگہ جگہ ہماری نشانیاں، جو ہم نے اِس زمین پر ثبت کی ہیں، ہم چاہتے ہیں وہ ہمارے نام پر برقرار رہیں۔ حالات کے فیصلے ضروری نہیں ہمارے فیصلوں سے اتفاق کریں مگر ہم اپنی کوشش جاری رکھ سکتے ہیں۔ اگر ہم خود اپنے پاؤں کاٹنا شروع کر دیں، جیسا کہ آپ کی طرح انسانیت کا درد رکھنے والے کئی انگریز افسر کر رہے ہیں، تو ہمیں اپنی قسمتوں پر شکوہ نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے آپ کے متعلق کمشنر ہاؤس سے کچھ شکایات وصول ہوئی ہیں، جو بہت خطرناک ہیں۔ اپنے پیروں کی زمین دیکھ کر قدم اُٹھاؤ۔ ایسا نہ ہو اگلے قدم پر زمین ختم ہو جائے۔ تمھارا کام اِس وقت صرف نوکری کرنا ہے۔ فیصلے کرنا گورنمنٹ کے بڑوں کا کام ہے۔ میں چاہتا ہوں، آپ بڑوں میں شامل ہو جاؤ لیکن اُس وقت کا انتظار کرو۔ جو آپ کے پاس موجود ہے، اُس کو بچاؤ۔ میری نوکری تین سال رہ گئی ہے۔ اُس کے بعد مَیں بھی تمھارے رحم و کرم پر ہوں۔ اِس سے آگے میں آپ کو کچھ نہیں سمجھا سکتا۔ (پھر بات بدلتے ہوئے) میں یہ چاہتا ہوں، کیتھرین کو جلد بیاہ لیا جائے۔ یہ کوٹھی آپ کی ہے۔ آپ اس کے وارث ہو۔ جب چاہو، اُسے یہاں اُتار سکتے ہو۔ جلال آباد جا کر پہلا کام اُسے تار بھیج کر بُلانے کا کرو۔ میں اگست تک اُسے یہاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اِتنا کہ کر جانسن اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے بعد ولیم بھی باہر نکل کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا، جو سفر کے لیے تیار کھڑی تھی۔

جاری ہے

قسط نمبر 18

(33)

مولوی کرامت کی آنکھ کھلی تو ستارے اپنی ترتیب بدل رہے تھے لیکن کھتیاں صبح کاذب سے ابھی دور تھیں اور فجر کی اذان میں کافی وقت تھا۔ مولوی کرامت عادت کے مطابق بہت ہی سانجرے اُٹھ جاتا تھا۔ اِس لیے حاجات ضروریہ وغیرہ کے لیے کھیتوں میں نکل جاتا، جو اکثر لوگوں کا معمول تھا۔ پنجاب کے چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گھروں میں جھاڑے پیشاب کے لیے جگہ بنائی جائے۔ کھیتوں میں منہ اندھیرے اِس کام کے لیے جانے سے تازہ ہوا اور لمبی سیر کے ساتھ ساتھ رفع حاجت کے کام سے بھی فارغ ہو جاتا۔ کئی لوگ تو اِس سلسلے میں چلتے چلتے تین چار کلو میٹر تک نکل جاتے۔ بہر حال اِس کے بعد مولوی کرامت سیدھا پاس کی چھوٹی مسجد کا رخ کرتا جس میں زیادہ تر غلام حیدر کی رعایا اور چند ادھر اُدھر کے لوگ نماز پڑھنے آجاتے۔ مولوی مسجد میں پہنچ کر تہجد پڑھتا، پھر قرآن کھول لیتا اور جب تک نماز فجر کا وقت نہ ہو لیتا، اُسی کی تلاوت کرتا رہتا۔ اِس مسجد کا مولوی پہلے سے ایک موجود تھا، جو غلام حیدر کا خاندانی مولوی بھی تھا۔ اِس لیے مولوی کرامت کو اُس کے پیچھے نماز پڑھنا پڑتی لیکن دل ہی دل میں اِس بات کا دکھ بھی تھا۔ اور خواہش تھی، کاش وہ اِس مسجد کا مولوی بن جائے۔ کبھی اُس کے جی میں خیال آتا، خدا کرے یہ مولوی مر جائے۔ پھر اُسی خیال میں اپنی امامت کے منصوبے بنانے لگتا۔ مگر تھوڑی دیر بعد جھر جھری لے کر اس سوچ کو جھٹک دیتا اور خدا سے توبہ کرتا۔ ایک دفعہ اُسے یہ خواب بھی آیا کہ پہلا مولوی مر گیا ہے اور وہ لوگوں کو نماز پڑھا رہا ہے۔

اب اُسے جلال آباد میں آئے ہوئے اور سکول میں پڑھاتے کئی دن ہو گئے تھے۔ رہنے کے لیے چوہدری غلام حیدر کی حویلی میں انتظام بھی تھا۔ حویلی کی ڈیوڑھیوں میں سے ایک ڈیوڑھی کے چھوٹے سے کمرے میں چراغ دین کا رشتے دار ہونے کے ناطے بستر جمانے کی جگہ مل چکی تھی اور ناشتے کے علاوہ دو وقت کا کھانا بھی مل جاتا۔ ہیڈ منشی اُس کی کارکردگی سے کافی مطمئن تھا۔ سکول سے چھٹی کے بعد مولوی صاحب فارغ ہوتا۔ ان اوقات میں وہ جلال آباد اور اُس کے مضافات کی سیر کو نکل جاتا۔ اِس طرح کچھ ہی دنوں میں اُس نے یہ علاقہ بھی قریب قریب دیکھ لیا۔

جلال آباد کہنے کو تحصیل تھی لیکن اس کی آبادی بنگلہ فاضلکا سے بھی کم تھی۔ مشکل سے چار سو گھر کا شہر تھا۔ گویا ایک قصبہ تھا، جسے فیروز پور ضلع کے مرکز میں ہونے کی وجہ سے تحصیل کا درجہ دے دیا گیا۔ جلال آباد میں تحصیل کمپلیکس کے علاوہ ایک چھوٹی سی غلہ منڈی تھی، جس کے زیادہ تر آڑھتی ہندو تھے اور کاروبار پر قابض تھے۔ منڈی میں جن اجناس کا لین دین تھا وہ بھی مخصوص تھیں۔ جیسا کہ جو، باجرہ، چنے اور گندم۔ ان کے علاوہ نہ ہی جلال آباد میں کوئی فصل تھی اور نہ بڑے پیمانے پر کسی اور شے کا کاروبار تھا۔ البتہ سُرخ مرچیں، پیاز، لہسن اور سستے پھل، جن میں سے اکثر سڑے ہوتے تھے، یہاں تھوڑے بہت دستیاب تھے۔ منڈی کے باہر بھی کچھ دوکانیں تھیں لیکن وہ دوکانیں جلال آباد کے بازار میں تھیں۔ بازار مشکل سے بیس پچیس دوکانوں پر مشتمل تھا۔ اِنہی میں ایک دو کپڑے کی بھی تھیں۔ اُن میں بھی کھدر اور سوتی کپڑے کے علاوہ دوسرا کپڑا نظر نہیں آتا تھا یا ہاتھ کے بنے ہوئے کھیس، چادریں اور رنگ برنگی لنگیاں تھیں۔ منڈی کے برعکس یہاں کچھ سکھ دوکاندار بھی نظر آجاتے مگر اُن کی حالت ہندوؤں سے کافی پتلی تھی اور مسلمان تو سرے سے نہیں تھا۔ دکانوں میں روزمرہ استعمال کی چیزیں اور چھوٹی موٹی کھانے کی اشیا مثلاً دیسی شکر، گُڑ، نمک، مسالہ جات، ٹانگر، میدے کی برفی اور کھانڈ کی چوسنے والی گولیا ں، چاول، دال اور اسی طرح کی دیگر چیزیں بوریوں میں کُھلے منہ پڑی رہتی تھیں۔ اکثر دکانداروں نے تیسرے درجے کی کھجوریں بھی رکھی تھیں، جن پر ہر وقت مکھیاں بھنبھناتی رہتیں اور گاہک مکھیوں سے بے پروا یہ سستی کھجوریں لے جاتے۔ کھجوریں اور ٹانگر عموماً دیہات سے آئے ہوئے لوگ ہی اپنے ساتھ لے کر جاتے۔ یہ چیزیں سستی ہونے کے ساتھ میٹھی اور مزیدار بھی لگتیں اور بچے اِنہیں کھا کے خوش ہو ہو کر اُچھلتے کودتے۔ اِن کے علاوہ ایک حلوائی تھا، جس کی دوکان تو نہیں تھی، بس ایک پھٹے پُرانے شامیانے کے نیچے دو چولہوں کے اُوپر دو کڑاہیاں رکھ کر ایک میں جلیبی اور دوسری میں پکوڑے تل تل کر پراتوں میں ڈھیر لگاتا جاتا۔ یہ حلوائی مسلمان تھا۔ بازار میں آنے والے ہر ایک نے اپنے اُوپر لازم کر لیا تھا کہ وہ اِس سے پکوڑے اور جلیبی ضرور لے کر کھائے اور گھر لے جائے۔ ایک مدت ہو گئی تھی لیکن اِس کا یہ ٹھڑا دوکان میں نہیں بدلا تھا اور نہ اس نے کاروبار میں کچھ اضافہ کیا تھا۔ ان دکانوں اور منڈی کے علاوہ جلال آباد میں ایک مسجد، ایک گوردوارہ اور ایک مندر بھی تھا اور یہ تینوں مذہبی عمارتیں اپنے اپنے مکینوں کے درمیان ہی تھیں۔ اِن کے علاوہ کوئی ایسی خاص چیز نہیں تھی جس کا ذکر کیا جائے۔ ہاں ریلوے اسٹیشن البتہ جلال آباد کے شمال کی طرف تحصیل کمپلیکس کے بالکل ساتھ پڑتا تھا۔ یہ اُس وقت واحد سواری تھی، جو

جلال آباد کے رہنے والوں کو دور دراز لے جاتی اور لے آتی۔ اکثر دیہاتی بھی اِسی ریل کے ذریعے جلال آباد آتے۔ کیو نکہ اُس وقت ریل اکثر بڑے بڑے دیہاتوں میں رُکتے ہوئے آتی تھی۔ کرایہ سستا ہونے کی وجہ سے لوگ اپنی اشیاء بھی اِسی کے ذریعے منڈی میں لا کر بیچتے یا پھر یہاں سے فیروز پور لے جاتے۔ ریل کے علاوہ سواری اور بار برداری کے لیے جو ذرائع تھے، اُن میں زیادہ تر گدھے، اونٹ اور گڈے تھے جسے آپ بیل گاڑی کہہ لیں۔ بعض لوگ گھوڑے کو بھی استعمال میں لاتے مگر یہ خال خال ہی تھا۔ کچھ بڑے زمینداروں یا پولیس کے پاس۔

محکمہ تعلیم کے طرف سے مولوی کرامت کو نیا حکم نامہ ملے تین دن ہو چکے تھے مگر ابھی تک اُس نے کام شروع نہیں کیا تھا۔ وہ اِسی شش و پنج میں تھا کہ کیا کرے اور کس طرح لوگوں کو اُسی کام کے لیے تیار کرے؟ جس کے خلاف خود وہ یا اُس کے بھائی بند فتوے دے چکے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے؟ جب تین دن اِسی سوچ بچار میں گزر گئے تو اُسے اچانک ایک ترکیب سوجھی اور آج مولوی نے اُس پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔ اُس نے تہیہ کر لیا کہ جلال آباد کی جامع مسجد سے اپنی ڈیوٹی شروع کرے گا۔ مولوی کرامت نے بستر سے اُٹھ کر سر پر اچھے طریقے سے پگڑی باندھی۔ اُس کے بعد بستہ بغل میں دبایا اور چھڑی پکڑ کر کمرے سے باہر نکل پڑا۔ باہر نکل کر اُس نے ایک دفعہ بستہ اور چھڑی زمین پر رکھ کر اپنے کمرے کو تالا لگا کر چابی ازار بند سے باندھی پھر بستہ اور چھڑی زمین سے دوبارہ اُٹھائی اور چل دیا۔ باہر اُس کی گدھی موجود تھی، جس کے آگے مولوی صاحب نے رات بہت ساری چاولوں کی پھک ڈال دی تھی۔ پھک ابھی تک کافی مقدار میں پڑی تھی، جسے مولوی کی گدھی وقفے وقفے سے کھا رہی تھی۔ یہ گدھی اُس نے سواری کے لیے جودھا پور سے پورے سات روپے کی لی تھی لیکن اُس پر سواری کرنے کا ابھی موقع نہیں ملا تھا کیونکہ سکول نزدیک تھا۔ مگر اب مولوی کو جو ڈیوٹی دی گئی تھی، اُس کے مطابق اُسے ارد گرد کے گاؤں میں بھی جانا پڑنا تھا۔ سفر طے کرنے کے لیے اُسے گدھی کا سہارا چاہیے تھا۔ لیکن اس وقت مولوی نے اُسے وہیں بندھا رہنے دیا کیونکہ جامع مسجد زیادہ دور نہیں تھی۔

ابھی اندھیرا تھا اور بہار کی ہوا ہولے ہولے چل رہی تھی۔ ہوا کے اندر سردی کا لمس بالکل ختم ہو چکا تھا کیونکہ فروری کب کا نکل گیا تھا اور مارچ اپنے آخری دن پورے کر رہا تھا۔ مولوی کرامت زمین پر چھڑی ٹکاتا ہوا مسجد کی طرف بڑھنے لگا۔ اِدھر اُدھر لیٹے آوارہ کتوں نے مولوی کرامت پر اس طرح بھونکنا شروع کر دیا، جیسے اُن کی سلطنت

میں ایک اور اُن کا شریک آگیا ہو۔ مولوی کرامت دور ہی سے کتوں کو چھڑی دکھاتا آگے بڑھتا گیا۔ ابھی وہ مسجد کے دروازے پر ہی تھا کہ موذن نے اذان دینا شروع کر دی۔ مولوی کرامت نے جلال آباد کی مسجد میں قدم رکھا تو اُس کا دل ایک مرتبہ بالکل ڈگمگا سا گیا۔ کہاں تو اپنے گاؤں کی مسجد کا واحد مالک تھا، جو اُس کا ایک قسم کا گھر تھی۔ وہ اُس میں جب چاہتا اذان دیتا، جب چاہتا نماز کا وقت آگے پیچھے کر دیتا اور جیسے چاہتا مسجد کے در و دیوار کے اور صفوں کے بارے میں فیصلے صادر فرماتا۔ ایک یہ مسجد تھی جس کی ہر شے اجنبی تھی۔ یہاں نہ کسی نے اُس سے پوچھ کے اذان دینا تھی اور نہ دوسرے کسی معاملے میں کوئی مشورہ لینا تھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے روح گھٹتی جا رہی ہو اور وہ ابھی مر جائے گا۔ عین ممکن تھا مولوی کرامت گھبرا کے واپس مڑ جاتا، اُسی وقت اُس نے اپنے پیچھے ایک شخص کے قدموں کی آواز سُنی جس کے سبب مولوی کرامت نے اپنے دل کو سنبھالا دیا اور مسجد کے صحن میں داخل ہو گیا۔ مسجد کے دائیں بائیں برآمدے تھے، جن میں صفیں بچھی ہوئی تھیں لیکن ان برآمدوں میں ایسے لگتا تھا جیسے مدت سے کسی نے نماز نہیں پڑھی تھی۔ صفوں پر گرد اور سفید سیم اُبھری ہوئی تھی، جو لالٹین کی روشنی میں صاف نظر آ رہی تھیں۔ شاید سردی کی وجہ سے برآمدوں میں نماز نہ پڑھنے کے ساتھ اُن کی صفائی کا خیال بھی نہیں رکھا گیا تھا۔

مولوی کرامت نے اپنا بستہ اُتار کر وہیں برآمدے میں رکھا اور طہارت خانے کی طرف رُخ کیا۔ کچھ دیر میں حاجت سے فارغ ہو کر پہلے آرام سے وضو کیا پھر خاص مسجد میں آکر محراب کے پاس کھڑا ہو گیا تاکہ باجماعت فرض ادا کرنے سے پہلے نماز سُنت ادا کر لے۔ مولوی نے دیکھا، جس موذن نے اذان دی تھی، وہ بیٹھا تسبیح کے دانے گن رہا تھا۔ غالباً اُس نے اپنی نمازِ سُنت ادا کر لی تھی۔ مولوی کرامت نے اُسے سلام علیکم کہا اور جواب سُنے بغیر ہی نماز کے لیے اللہ اکبر کہہ دیا۔

نماز باجماعت میں کم از کم ڈیڑھ سو آدمی جمع تھے اور یہی بات مولوی کرامت کے لیے خوشی کا باعث تھی۔ جب سب لوگ نماز پڑھ کر دعا مانگ چکے اور اُٹھ کر جانے لگے تو مولوی کرامت کھڑا ہو گیا اور بولا، بھائیو کچھ دیر کے لیے اگر بیٹھ جاؤ اور میری بات سُن لو تو تمھاری مہربانی ہو گی۔ لوگ مولوی کرامت کی بات سُن کر بیٹھ تو گئے لیکن ذرا بددلی سے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے مولوی صاحب کچھ دیر تقریر کرنے کے بعد اپنی کسی ضرورت کے لیے چندہ مانگ لے

گا جیسا کہ اکثر اس طرح کے ملاّ حضرات کا معمول تھا۔ پھر بھی اُنھوں نے سوچا، کچھ دیر کے لیے سُن لینے میں کیا حرج ہے۔

سب لوگ بات سننے کو تیار ہو گئے تو مولوی کرامت نے بولنا شروع کر دیا۔ اِس تقریر کے لیے اُسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی کیونکہ جب سے ہوش سنبھالے تھے، مولوی کرامت نمازیوں کو باتیں ہی سناتا آیا تھا۔

میرے مسلمان بھائیو، مَیں جلال آباد کے اِس بڑے اسکول میں منشی بن کر آیا ہوں جو انگریز بہادر نے ہمارے بچوں کے لیے بنایا ہے۔ میرا ارادہ ہے مَیں تمھارے بچوں کو عربی، فارسی اور حساب کتاب پڑھاؤں تاکہ یہ بڑے ہو کر بابو بنیں۔ گورنمنٹ انگریز بہادر نے مجھے کچھ ہی دن پہلے اِس نوکری پر رکھا ہے لیکن جب میں نے دیکھا، اِس بڑے اسکول میں تو مسلمان بچے نام کو بھی نہیں۔ سارے بچے ہندو، سکھ اور چوہڑے ہیں تو میرا جی بہت دُکھا۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا مَیں آپ کو خود آکر گزارش کروں کہ اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کراؤ۔
مولوی کرامت کی بات سُن کر سب لوگ حیران ہوئے۔ اُنھیں یہ خیال تک نہیں تھا کہ کوئی مولوی ہم سے چندے کے علاوہ اِس طرح کے سوال بھی کرنے آئے گا۔ یہ تو بالکل ہی انوکھا آدمی تھا، بلکہ اُن کی حیرت اِس لیے بھی زیادہ ہو گئی کہ اسکول میں داخلے کی بات ایک مولوی کر رہا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں، اِن اسکولوں میں مسلمان بچوں کو نصاریٰ کی تعلیم دے کر کرستان بنایا جاتا ہے۔ اِسی لیے تو چوہڑوں کے پورے گاؤں کے گاؤں کرستان ہوئے ہیں۔

اُن کی حیرانی اور پریشانی دیکھ کر مولوی کرامت مزید بولا، بھائیو، میرے اور آپ کے رسول اور اللہ کے پیارے نبی محمد عربی نے فرمایا ہے، علم حاصل کرو چاہے تمھیں چین جانا پڑے لیکن کتنی بد بختی ہے ہمارے لیے کہ ہمارے نبی کے اس فرمان پر ہندو اور چوہڑے تو عمل کر رہے ہیں مگر ہم نافرمانی کر رہے ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ ہم اپنے گھر کے پاس بننے والے اسکولوں میں ہی بچے نہیں بھیجتے، چین میں جانا تو دور کی بات ہے۔ میرا اور آپ کا نبی جانتا تھا، میری امت غریب ہے، ان کے پاس چین جانے کا خرچہ نہیں ہو گا اس لیے اُس نے کرستان، جو شروع دن سے ہی ہمارے نوکر اور ہمارے لیے کام کرنے والے رہے ہیں، اُن کو اس کام پر لگایا کہ وہ ہمارے لیے اِس طرح کے سکول اور مدرسے بنائیں جس طرح چین میں ہوتے ہیں۔ اب آپ ہی بتاؤ ہم چین جا سکتے تھے؟ نہیں جا سکتے تھے نا؟ تو بھائیو، اِس گورنمنٹ کا شکر کرو کہ جس نے چین لا کر جلال آباد میں اور فیروز پور میں رکھ دیا اور ہمیں دور نہیں جانا پڑا۔

مولوی کرامت کی بات سُن کر مسجد کے پیش امام نے فوراً ٹوکا، لیکن وہ تو مولوی صاحب، رسولِ پاک نے دین کے علم کی بات کی تھی کہ دین کا علم اگر تم کو چین میں جا کر حاصل کرنا پڑے تو اتنا لمبا بھی سفر کرنا مگر یہ انگریزی سکولوں میں تو کرسٹان کا علم ہے۔ ان سکولوں میں جا کر ہمارے بچے کرسٹان ہو جائیں گے اور دین خراب ہو جائے گا۔ تم نے فرنگی سرکار سے پیسے کھا لیے ہیں۔

مولوی کرامت کو اُس کی بات بہت بُری لگی۔ اُس نے سوچا اگر اسی طرح یہ خبیث مولوی مجھے ٹوکتے رہے تو نوکری ضرور چلی جائے گی۔ اگرچہ اُس نے خود بھی قصور میں کئی بار اِن اسکولوں پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا اور لوگوں کو روکا تھا کہ وہ ان اسکولوں میں نہ جائیں لیکن اب معاملہ وہ نہیں رہا تھا۔ اُس کے خیال میں اب گورنمنٹ نے بچوں کو کرسٹان بنانا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اِس جاہل مولوی کو کیا پتا سرکار کا نظریہ بدل چکا ہے۔

مولوی کرامت نے دیکھا کہ بات بگڑ سکتی ہے تو اُس نے بڑے تحمل سے ایک نئی چال چلی اور کہا، پہلی بات تو یہ ہے بھائیو کہ اب گورنمنٹ سرکاری اسکولوں میں مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے مولویوں کو رکھ رہی ہے۔ سرکار نے اعلان کیا ہے، جو مولوی اچھی طرح سے دین اور عربی فارسی پڑھا ہو گا، اُسے سرکار اسکولوں میں تنخواہ پر مُنشی رکھے گی تا کہ وہ خود مسلمان بچوں کو پڑھائیں۔ اِس طرح کوئی خطرہ نہیں رہے گا اُن کے کرسٹان بننے کا۔ مجھے یہ مولوی صاحب ایک بات بتائیں، چین میں کون سے دین کی تعلیم دی جاتی تھی؟ ہمارا پیغمبر تو آیا عرب میں۔ اِس لیے دین اور اُس کا علم تو سارا وہاں تھا لیکن آپ نے یہ کیوں کہا، تم چین میں جانا؟ بتاؤ؟ (اپنی سفید ڈاڑھی میں انگلیوں سے خلال کرتے ہوئے) اِس کا مطلب ہے، وہ کوئی اور علم تھا، جس کے لیے چین جانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ پھر چند لمحے رُک کر اور پیش امام کی طرف رُخ کر کے، جس کے آگے مولوی کرامت نے گورنمنٹ کی نوکری کا لقمہ پھینک دیا تھا اور وہ ذہنی طور پر شکست تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہو چکا تھا، مجھے ایک بات بتاؤ مولوی صاحب! جب بدر کی جنگ ہوئی اور کافر پکڑے گئے تو اُن کو آزاد کرنے کی ہمارے نبی نے کون سی شرط لگائی تھی؟ پھر لوگوں کی طرف دیکھ کر، پوچھو اِس سے؟

ایک شخص جو اُن میں سب سے معزز نظر آ رہا تھا اور ہلکی سی ڈاڑھی بھی رکھتا تھا، ایسے محسوس ہوتا تھا، پیش امام کا زیادہ تر خرچہ اِسی کے گھر سے پورا ہوتا ہے۔ اُس نے پیش امام سے پوچھا، جی مولوی صاحب آپ بتائیں کس شرط پر ہمارے رسول نے اُن قیدیوں کو چھوڑا تھا؟

جب پیش امام نے چند لمحے تک کوئی جواب نہ دیا تو اُس شخص نے مولوی کرامت سے کہا، مولوی صاحب آپ ہی بتائیں، وہ کون سی شرط تھی؟

اب مولوی کرامت کو اپنی فتح قریب نظر آرہی تھی۔ نوکری کی نوید سُن کر پیش امام نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ لہٰذا مولوی کرامت نے بولنا شروع کیا، ہوا یہ مومنو، جب نبی پاک اُن قیدیوں کو پکڑ کر مدینے لے آئے تو آپ نے اعلان کیا، جو کافر قیدی ہمارے دس مسلمان بچوں کو تعلیم دے گا اور اِنہیں پڑھنا لکھنا سکھائے گا، ہم اُس کو آزاد کر دیں گے۔ اِس حکم پر بیس قیدیوں نے مدینے کے پورے دو سو مسلمان بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا اور ہمارے نبی پاک نے اُن کو شرط کے مطابق آزاد کر دیا اور پیسے بھی دیے۔

یہ کہہ کر مولوی کرامت خموشی سے مسجد میں موجود لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جب چند ثانیے اسی طرح گذر گئے اور کسی نے اُس کی بات کو رد نہ کیا تو مولوی کرامت نے مزید اپنی بات کو پختہ کرنے کے لیے کہا، اب مسلمانو آپ ہی بتاؤ، وہ قیدی تو پکے کافر تھے۔ رسول تو رسول، خدا کو بھی نہیں مانتے تھے، پھر بھی رسول پاک نے مسلمان بچوں کو اُن سے پڑھانے سے گریز نہ کیا لیکن نصاریٰ تو پھر بھی خدا کو مانتے ہیں اور مفت میں آپ کے بچوں کو تعلیم دینا چاہتے ہیں تاکہ مسلمان خود حکومت کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ہندوستان پر حکومت کرنا مسلمانوں کا حق ہے اور گورنمنٹ بہادر چاہتی ہے، ہم پڑھ لکھ جائیں تاکہ وہ ہماری امانت ہم کو سونپ کر چلے جائیں۔ یاد رکھو اگر تم اپنے بچوں کو ان گورنمنٹ کے اسکولوں میں نہیں پڑھاؤ گے تو یہ ہنود اور چوہڑے اور سکھ، یہ سب فرنگی سرکار کے جانے کے بعد ہم پر حکومت کریں گے۔

او بھلے لوگو، تمھارے علاوہ یہ سب قومیں فٹافٹ اِن اسکولوں میں جا کر تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور ہمارے بچے ایسے ہی ڈنگر کے ڈنگر بھیڑ بکریاں چرا رہے ہیں۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ کیا تم نے نہیں دیکھا، عدالتوں اور کچہریوں میں سب ہندو لوگ ہیں جو فیصلے بھی ہمارے خلاف کرتے ہیں اور یہ بنیے جو چاہیں اپنے بھئی کھاتوں میں لکھ دیں۔ پھر تمھاری گردن پر ناخن رکھ کر جتنا چاہیں وصول کر لیں۔ تمھیں تو نہ پڑھنا آئے اور نہ اُن کھاتوں کے حساب کتاب کے دیکھنے کا طریقہ۔ اِسی لیے ہمارے قرضے بڑھتے جاتے ہیں اور پشتوں سے لے کر اب تک ادا نہیں ہوتے۔ یاد رکھو اگر ہمارے بچے نہیں پڑھیں گے تو پنجاب پھر سکھوں کے پاس چلا جائے گا۔ بھلا تمھیں پتا ہے؟ مہاراجہ رنجیت نے

کیا کیا تھا؟ اُس نے ہماری بادشاہی مسجد میں اپنی فوج کے گھوڑے باندھ کر اُسے اصطبل بنا دیا تھا۔ جہاں اُنھوں نے لید اور پیشاب کر کر کے اتنی بدبو پھیلائی اور اتنا گند مارا کہ بچارے گنبد اور میناروں کے کبوتر بھی ہجرت کر گئے۔ یہ انگریز بہادر ہی تھے، جنہوں نے وہ شاہی مسجد ان سے آزاد کرا کے ہمیں دی۔ اگر فرنگی سرکار مسلمانوں کی دشمن ہوتی تو اُس مسجد کو سکھوں سے آزاد کیوں کراتی؟ پھر اُس جگہ اپنا گرجا بنا لیتی۔ اِسی دوران مولوی کرامت کو یاد آیا کہ جب فرنگیوں نے دہلی فتح کیا تھا، تو انھوں نے بھی جامع مسجد دہلی میں اپنے گھوڑے باندھ دیے تھے اور اُسے اصطبل بنا دیا تھا۔ مگر شکر ہے کہ اِس بات کا کسی کو بھی پتا نہیں تھا، ورنہ بات بگڑ جاتی۔ یا اگر پیش امام کو پتا بھی تھا، تو اب وہ نہیں بول سکتا تھا۔ کیونکہ نوکری ملنے والی تھی۔ بہر حال مولوی کرامت نے اس بیہودہ خیال کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، مگر صدقے جاؤں اِس منصف اور عادل گورنمنٹ کے، جنہوں نے مسلمانوں کے لیے یہ سب کچھ کیا اور ہم ہیں کہ اپنے ہی دشمن۔ سکولوں میں اپنے بچوں کو نہیں بھیجتے اور چوہڑے جو ہمارا گند صاف کرنے والے ہیں، وہ پڑھ پڑھ کر بابو بنتے جا رہے ہیں۔ یہی حالت رہی تو ایک دن آئے گا ہماری اولادیں اُن کا گند صاف کریں گی۔ جس سے سرکار ہمیں بچانا چاہ رہی ہے۔

مولوی صاحب یہ بات آپ نے پہلے ہمیں کیوں نہیں بتائی، ایک شخص جس کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی، اُس نے سر سے صافا اُتار کر گھٹنوں کے نیچے رکھا اور بولا، ہم تو خط پتر بھی نہیں پڑھ سکتے۔ کہیں سے شادی موت کا لفافہ آ جائے تو بیس دروازے بھونکتے ہیں، تب جا کر کوئی پڑھ کے سناتا ہے۔ وہ بھی سو سو نخرے کرتا ہے۔

مولوی کرامت نے اپنا وار کارگر ہوتے دیکھا تو مزید اُس پر جملہ کسا، تو اور کیا؟ پھر سو باتیں ایسی ہوتی ہیں کسی غیر کو نہیں بتانی ہوتیں، جس سے خط پڑھواتے ہیں وہ اُنہیں بھی جان جاتا ہے اور گھر کی بات خواہ مخواہ باہر نکل جاتی ہے۔ پھر یہ ہندو اور چوہڑے تو ہمارے ویسے بھی دشمن ہیں۔ بھائی تعلیم بہت ضروری ہے۔

اس کے بعد مولوی کرامت نے اپنا بستہ کھولا اور اُس میں سے ہاتھ بھر لمبا اور آدھ ہاتھ چوڑا رجسڑ اور ایک قلم اور دوات نکال کر بیٹھ گیا اور کہا، جلدی سے اب اپنے اپنے بارہ سال سے کم عمر کے بچوں کے نام لکھواؤ۔

جاری ہے

قسط نمبر 19

(34)

پچھلی دو پیشیوں پر سردار سودھا سنگھ نے نہ جا کر سخت غلطی کی تھی۔ جس کے نتائج نہایت غلط برآمد ہو رہے تھے اور عدالت نے واضح کر دیا تھا کہ آئندہ سردار صاحب عدالت میں حاضر نہ ہوئے تو اُن کے خلاف عدالت سخت کارروائی کے حکم جاری کر دے گی۔ جس میں کسی طرح بھی رو رعایت نہیں رکھی جائے گی۔ اگر سردار سودھا سنگھ واقعی بیمار ہے اور حاضر نہیں ہو سکتا، تو اُس کے معائنے کے لیے باقاعدہ عدالت ایک ڈاکٹر بھیج دیتی ہے۔ وہ رپورٹ کرے گا۔ اس کے بعد اُس کا میڈیکل سرٹیفکیٹ قبول کیا جائے گا۔ کیونکہ عدالت اُس کی بیماری کے متعلق جاننا چاہتی ہے۔ عدالت کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ مقدمے کو زیادہ عرصہ روکے رکھے۔ اُدھر عبدل گجر اور شریف بودلہ عدالت میں حاضر ہو کر اپنے اُوپر لگائے گئے الزامات کا دفاع کامیابی سے کر رہے تھے۔ اُن کے علاوہ وکیلوں نے بھی سردار سودھا سنگھ کو تسلی دی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ غلام حیدر کا کیس بہت کمزور ہے۔ اُس نے ایف آئی آر میں آپ کا نام دے کر سخت غلطی کی ہے۔ وہ کسی بھی طرح ثابت نہیں کر سکے گا کہ آپ حملے میں باقاعدہ ساتھ تھے اور چراغ دین آپ ہی کے ہاتھوں سے قتل ہوا ہے۔ لہٰذا چار چھ تاریخوں میں ہی آپ باعزت بری ہو جائیں گے۔ لیکن عدالت میں حاضر نہ ہونے کا مقصد ہے، آپ پر لگائے گئے الزامات سچ ہیں۔ دوسری طرف مہاراجہ پٹیالا تو صرف اتنا ہی کر سکتا تھا، اُس نے آپ کے عدالت میں حاضر ہوئے بغیر ہی عبوری ضمانت کے بعد پکی ضمانت بھی کروا دی، لیکن اب کیس تو بہر حال آپ کو لڑنا ہی پڑے گا۔ جس کے لیے مہاراجہ کچھ نہیں کر سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ آپ عدالت جائیں گے تو بری ہوں گے۔ گھر بیٹھے تو سزا کی ہی توقع کی جا سکتی ہے۔ رہی بات غلام حیدر کی، تو اُس میں اتنا زور نہیں کہ ڈانگ سوٹے کی لڑائی لڑ سکے۔ اُس کی رائفل پچھلے تین ماہ سے پولیس نے ضبط کی ہوئی ہے۔ ویسے بھی رائفلیں
چلانا پڑھا کووں کا کام تھوڑا ہی ہے؟ اس کے لیے جگرے والے لڑا کو چاہییں۔ اگر اُس کے گٹوں میں پانی ہوتا تو وہ آج سے چار مہینے پہلے ہی کچھ کر دیتا۔ مان لیا ملک بہزاد اُس کا ساتھ دے رہا ہے مگر بوڑھا شیر تو سردار جی بھیڑ سے بھی سستا ہوتا ہے۔ اُس کے لڑنے مرنے کے دن اب گئے۔ ویسے بھی پرائی آگ میں کون جلتا ہے۔ اِس لیے اُس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ قانونی نکتے بتانے کے سوا اب کچھ نہیں کر سکتا۔ البتہ سنا ہے، نواب افتخار ممدوٹ

غلام حیدر کے ساتھ اُدھر لاہور کے ملک میں پڑھتا رہا ہے اور دونوں متر ہیں۔ مگر مہاراجہ کی طاقت کے سامنے اُس کی کیا حیثیت ہے؟ جب عبدل گجر اور شریف بودلے کا کچھ نہیں کر سکا۔ وہ اپنے بندوں کے ساتھ دیدہ دلیری سے کوٹ کچہری میں آتے جاتے ہیں تو پھر آپ تو سردار سودھا سنگھ ہیں۔ جس کے سائے سے پوری تحصیل کانپتی ہے۔

اِن تمام نکتوں کو دیکھتے ہوئے سردار سودھا سنگھ نے بالآخر اِس پیشی پر جانے کا فیصلہ کر ہی لیا اور اِس کا انتظام سردار صاحب نے ہرے سنگھ کے ہاتھ میں دے دیا۔ سردار ہرے سنگھ سودھا سنگھ کا خاص مِتر رنگا کے بعد لڑائی بھڑائی کے علاوہ عدالت کچہری سے بھی پوری طرح واقف تھا اور دس بر چھیوں والے بندوں کا اکیلا مقابلہ کرنے میں ہر طرح سے طاق۔ ایک بنیے کی ٹانگیں توڑنے کے سلسلے میں کچھ عرصہ کے لیے جیل جانا پڑا۔ چراغ دین کا قتل اور شاہ پور پر حملہ کے دنوں میں یہ منٹگمری جیل میں تھا۔ ہرے سنگھ جیل سے نکلا تو سردار سودھا سنگھ میں نئے سرے سے جان پیدا ہو گئی۔ کیونکہ رنگا کے مارے جانے کی وجہ سے سودھا سنگھ کی طاقت آدھی رہ گئی تھی۔ اِس بار پیشی پر جانے کے لیے تیار ہو جانا اصل میں سردار ہرے سنگھ ہی کی وجہ سے بھی تھا لیکن ابھی یہ طے نہیں ہو پایا تھا کہ فیروز پور جانے کے لیے کون سی سواری اختیار کی جائے۔ سردار سودھا سنگھ نے سب متروں کو جمع کر کے صلاح کے لیے بلا لیا، جس میں فوجا سیوئے نے آنے سے انکار کر دیا۔ اُس کی اب ویسے بھی کسی کو پروا نہیں تھی کہ پچھلے ایک دو واقعات کی وجہ سے وہ سردار سودھا سنگھ کی نظروں سے گر چکا تھا۔ اب بھی اگر اُسے بلایا تھا تو مروتاً اور اگر وہ نہیں آیا تھا تو اچھا ہی ہوا کیونکہ ہر بار کوئی نہ کوئی بُزدلی کا مشورہ دیتا۔ بیدا سنگھ، رتا سنگھ، بیت سنگھ، جگبیر، ہرے سنگھ اور سودھا سنگھ کا سگا بھتیجا شمشیر سنگھ الغرض فوجا سیوئے کو چھوڑ کر باقی سب ہی لوگ حویلی میں موجود تھے اور تین دن بعد والی پیشی پر جانے کے لیے غور ہونے لگا۔ بیدا سنگھ نے کرپان کا پٹا دائیں پہلو کی طرف موڑتے ہوئے، اُس کا کڑا سیدھا کیا اور کہا، سردار صاحب، یہ بات سچ ہے کہ غلام حیدر ایک نا تجربہ کار منڈا ہے پَر مُسلے کا کوئی اعتبار نئیں۔ اپنی حفاظت کرنا گرو جی نے لازم قرار دیا ہے۔ اس لیے فیروز پور عدالت میں حاضری دینے کا پروگرام اِس طرح بناؤ کہ دشمن دانتوں سے انگلی نہ نکال سکے۔ اِس کے ساتھ یہ بھی طے کر لو کہ فیروز پور میں رہنے اور وہاں سے واپسی کا کیا پروگرام ہونا چاہیے کہ دشمن کسی طرح کا وار نہ کر سکے۔ بیدا سنگھ اِتنی ہی بات کر کے بیٹھ گیا۔ اُس کے بعد جگبیر سنگھ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی بڑی بڑی مونچھوں کے درمیان سے بولا، سردار سودھا سنگھ، سب سے بڑا خطرہ غلام حیدر کی طرف سے نہیں عدالت سے ہے۔ مُسلے میں اِتنی جان نہیں آپ پر ہاتھ اُٹھائے۔ ہم تیس بندے ڈانگوں اور برچھیوں سے لد کر نکلیں

گے تو غلام حیدر کے بندوں کے پر نکل جائیں گے۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس ہر طرح سے اسلحہ ساتھ بنھ لو اور واہگرو کو یاد کر کے چل پڑو۔ یہ کہہ کر جگبیر سنگھ بھی بیٹھ گیا پھر دو تین متروں نے مزید اپنی صلاح دی۔ جب سب لوگ مشورہ دے چکے تو آخر ہرے سنگھ بولا، سردار جی میری صلاح ہے کہ ہم فیروز پور چار تاریخ کو پیشی پر جانے کی بجائے پرسوں ہی نکل جاتے ہیں اور ریل کے ذریعے ہی جاتے ہیں۔ منڈی گروہرسا سے دو بجے گاڑی نکلتی ہے۔ ہم اگر جھنڈو والا سے صبح دس بجے نکلیں تو آرام سے ساڑھے بارہ بجے اسٹیشن پر پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے سیدھا صادق والا کے راستے سے فیروز پور جا پہنچیں۔ یہ رستہ محفوظ بھی ہے اور غلام حیدر کی جونہہ سے بھی دور پڑتا ہے۔ اگرچہ لمبا کاٹ کے آنا پڑتا ہے مگر ہے یہی رستہ مناسب۔ اِس راہ سے ہم پانچ بجے شام تک فیروز پور میں داخل ہو جائیں گے اور بھائی پھجا سئیوں کے ڈیرے پر جا کر آرام کریں گے۔ پھر اگلے دن سویرے ہی عدالت کی چوکی پر جا بیٹھیں گے۔ کرپانیں ہماری ڈھبوں میں ہوں گی اور ڈانگیں ہاتھوں میں۔ اگر ذرا بھی خطرہ نظر آیا تو فوراً نکال کر ڈانگوں پر چوڑیاں کس لیں گے۔ پر میرا خیال ہے، یہ نوبت نہیں آئے گی۔ کیونکہ غلام حیدر کی ریفل فرنگیوں نے اپنے قبضے میں کی ہوئی ہے، جو میری اطلاع کے مطابق ابھی تک اُسے واپس نہیں ملی اور اُس کا اصل ہتھیار ہے۔ ڈانگ سوٹا وہ چلانا نہیں جانتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ غلام حیدر عدالت میں حملہ کرنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ اِس صورت میں موقع پر ہی پکڑا جائے گا۔ اگر اُس نے یہ پاگل پن کر ہی دیا تو سردار جی واہگرو کے صدقے سے ہم چھویاں چلانا جانتے ہیں۔ پھر مُسلوں کے ساتھ میدان کے بیچ اُسی عدالت میں جپھا ڈال دیں گے۔ سرداروں کے سینے بھی مجھّوں کے جگرے لے کے پیدا ہوتے ہیں۔ میرا تو یہی مشورہ ہے۔ سردار جی، اِسی طرح واپسی بھی اِسی رستے سے پیشی کے اگلے دن کریں گے۔ پیشی والے دن فیروز پور ہی رہیں لیکن واپسی میں گروہرسا تک جانے کی بجائے پہلے ہی ورکاں خورد اسٹیشن پر اُتر جائیں۔ جہاں ہمارے بندے اسواریاں لے کے کھڑے ہوں گے۔ یہاں سے جھنڈو والا تک فاصلہ کچھ زیادہ طے کرنا پڑے گا لیکن یہی مناسب ہو گا۔ باقی گرو جی شرماں رکھو۔

اُس پروگرام میں ہر ایک نے اپنی اپنی صلاح مزید پیش کی اور بیدا سنگھ نے ریل کے سفر سے اجتناب کرنے کا کہا اور بجائے گروہرسا کے فرید کوٹ کی طرف سے فیروز پور جانے کا مشورہ دیا مگر یہ ناممکن تھا۔ گرمی زیادہ تھی اور جانوروں کے لیے ساٹھ ستر میل کا سفر طے کرنا ممکن نہیں تھا۔ اِس لیے ریل کے ذریعے ہی فیروز پور جانے کا پروگرام بنا۔ البتہ بیس بندوں کی بجائے اُن کی تعداد تیس کر لی گئی، جو ہر قسم کی ڈانگوں اور برچھیوں سے لیس سردار سودھا

سنگھ کے ساتھ ہوں۔ اُن کی کمان ہرے سنگھ کے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ ہوا۔ اِس کے بعد سب متروں کو اپنی اپنی تیاری کرنے کا کہہ کر سردار سودھا سنگھ حویلی کے اندرونی حصے میں چلا گیا، جہاں بینت کور اُس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ بینت کور سردار سودھا سنگھ کو دیکھتے ہی اُٹھ کر کھڑی ہوئی اور بھاگ کر قریب آگئی۔ سودھا سنگھ اُس کی طرف دیکھ کر فقط مسکرا دیا لیکن بولا کچھ نہیں۔ مسکراہٹ سودھا سنگھ کے دل سے نہیں نکلی تھی۔ اُس میں ایک طرح سے اُکتاہٹ کا رنگ نمایاں تھا، جسے بینت کور محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔ سردار سودھا سنگھ آگے بڑھ کر پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھا تو بینت کور سردار صاحب کے پاؤں سے کھسّہ اُتارنے لگی۔

رات کا ایک پہر گزر چکا تھا۔ سودھا سنگھ پر نیند کے کہیں آثار نہیں تھے۔ گرمی کی وجہ سے پلنگ کمرے کی بجائے صحن میں موجود تھے اور صحن بھی کافی کھُلا تھا۔ جس میں بینت کور اور سردار سودھا سنگھ کے پلنگوں کے علاوہ کوئی دوسری چارپائی نہیں تھی۔ ہوا چل رہی تھی مگر سودھا سنگھ کو اپنی سانس گھُٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ بینت کور سردار جی کے جوتے اُتار چکی تو سودھا سنگھ کو بینت کور پر ایک دم پیار آگیا۔ سردار نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر سینے پر لٹا لیا اور اُس کا منہ چومنے لگا۔ اِس رویے سے مغلوب ہو کر بینت کور مکمل طور پر سردار جی کے پہلو میں دبک گئی اور لیٹے ہی لیٹے سردار جی کی پگڑی اُتار کر جُوڑے کے بل کھولتے ہوئے بولی، سودھے، کیا ایسا نہیں ہو سکتا تُو پیشی پر نہ جائے؟

بینت کور نے التجا کچھ ایسے غمگیں لہجے میں کی کہ سردار سودھا سنگھ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ بولا، بنتو دل تو میرا بھی یہی کرتا ہے کہ نہ جاؤں، پر کیا کروں یہ فرنگی نہیں مانتے۔ سچ پوچھو تو اب میرا دل یہی کرتا ہے حویلی ہی سے باہر نہ نکلوں۔

بینت کور سردار جی کے جُوڑوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے دوبارہ بولی، سردارا، آج تیرے آنے سے تھوڑی دیر پہلے میری کچھ دیر کے لیے آنکھ لگ گئی تھی اور میں خواب دیکھ کر ڈر گئی۔ کیا دیکھتی ہوں، تیرے جُوڑے کھُلے ہوئے ہیں اور تجھے کوئی بگھیاڑ کھینچ کے لے جا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر میں چیخ مار کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سودھے، اگر تو نے فیروز پور جانا ہی ہے تو مجھے ساتھ لیتا جا ورنہ نہ جا۔

سردار سودھا سنگھ کا دل بنتو کا خواب سُن کا کانپ گیا، لیکن جی کو سنبھالا دیتے ہوئے بولا، او کملیے حوصلہ رکھ، واہگرو شرماں رکھے گا، تو اُدھر کیا کرے گی؟ میرے ساتھ میرے بڑے متر ہیں۔ گامے (غلام حیدر) دی اپنی تڑ نہیں کہ وہ مجھ پر حملہ کرے۔ ہرے سنگھ، جگبیر، بیدا سنگھ اور دوسرے سب مِتر میرے ساتھ ہیں نا۔

سردار جی تُسیں ناراض نہ ہو تو میں ایک بینتی کرتی ہوں، بینت کور نے اب کے سردار جی کی داڑھی میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

دس بنتو، سردار بولا۔

سردار جی، میں کہتی ہوں، یہ لڑائی بھڑائی اب چھوڑ ہی دے۔ دیکھ، کیکروں کے تُکلے دوبارہ گرنے والے ہوگئے، پَر اپنی اولکھ نہیں گئی۔ آرام سے بیٹھ کے بستے ہیں اور یہ جو من من روٹیاں کھانے والے تیرے متر ہیں نا، ان کو کہہ دے، اب اُن کا اور تیرا کوئی لین دین نہیں ہے اور غلام حیدر سے صلح کرلے۔ یہ مُسلے مَر جانے بڑے بُرے اور چیڑ پھاڑ کر کھا جانے والے کُتے ہوتے ہیں۔ سُنا ہے دشمنی اور لڑائی بھڑائی میں اِن کا کوئی مقابلہ نہیں۔

سودھا سنگھ کو بینت کور کی یہ بات بُری لگی لیکن آج وہ کسی بھی طرح سے بنتو کو کڑوا بول نہیں کہنا چاہتا تھا۔ وہ غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے بولا، بنتو، ایسی بات نہ کیا کر جس سے مجھے غصہ آتا ہے۔ غلام حیدر سے صلح کرنے کا مطلب اُس سے معافی مانگنا ہے اور یہ بات سرداروں کو مِہنا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ایک بار اِس رولے سے جان چھوٹ جائے تو بنتو تیرے سر کی سونہہ دوبارہ کسے نوں تنگ نہیں کروں گا۔ یہ کہ کر سردار سودھا سنگھ نے ایک ہاتھ سے پاس ہی تپائی پر جلتی ہوئی لالٹین کی بتی مروڑ کر اندھیرا کر دیا اور دوسرے ہاتھ سے بینت کور کی شلوار کا ازار بند کھینچ دیا۔

(35)

جون کا آغاز ہو چکا تھا، سخت گرمی اور دھوپ نے تمام کام معطل کر دیے تھے۔ اِس کے باوجود ولیم نے بہت سی چیزوں کو اس طرح منضبط کر دیا کہ اکثر تحصیل میں شروع کیے گئے کام چل رہے تھے۔ ولیم کے دماغ میں ایک بات بڑی شدت سے چکر کھا رہی تھی۔ مون سون کی بارشوں کا زمانہ قریب تھا، جس میں قریباً سارے پنجاب میں ہر طرف پانی کے غبارے چھوٹ پڑتے تھے اور یہ سارا پانی بے کار ہی چلا جاتا۔ ولیم اِس پانی سے کچھ کام لینا چاہتا تھا، جس کے لیے

اُس نے ایک ترکیب سوچی تھی۔ جلال آباد کے مضافات میں وہ تمام زمین جو ابھی تک زیرِ کاشت نہیں تھی اور گورنمنٹ کے حساب میں پڑی ہوئی تھی۔ اُسے پہلے مرحلے میں جلال آباد کے کم از کم ایک ہزار خاندان میں تقسیم کرنے کا فرمان جاری کرنا تھا، جس کے لیے صرف اُن خاندانوں کا انتخاب کرنا تھا، جو بے زمین ہوں اور کاشت کاری میں بھی تجربہ رکھتے ہوں۔ اِس منصوبے پر ولیم پچھلے تین مہینوں سے خفیہ طور پر کام کر رہا تھا اور اب جا کر اُس کی منظوری ہوئی تھی۔ وہ یہ تقسیم اپنی نگرانی میں کروانا چاہتا تھا تا کہ منصوبہ فیل نہ ہو۔ اُسے خاندانوں کے کوائف اور اُن کی صلاحیتوں کو جاننے میں گزٹ نے بڑی سہولت فراہم کی تھی لیکن مختلف اوقات میں لوگوں کو بلا کر بات چیت کرنے سے بھی کئی باتیں سمجھ میں آئی تھیں۔ اِس سلسلے میں اُس نے کسی سفارش اور رعایت کو استعمال نہ ہونے دینے پر ارادہ کر رکھا تھا۔ اسی لیے آج اُس نے محکمہ مال کے تمام افسروں کا اجلاس طلب کیا ہوا تھا اور صبح سے اُس پر عمل کرانے کے سلسلے میں صلاح مشورہ جاری تھا۔ دراصل ولیم نے اوکاڑہ چھٹی گزار کر آنے کے بعد بہت ہی گرم جوشی سے فرائض انجام دینے کی طرف دھیان دیا اور تحصیل کی معاشی ترقی کے لیے خاص کر متوجہ ہوا۔ جس میں کچھ کام کی طرف تو اُس نے آتے ہی دماغ لڑا دیا تھا۔ ان کے علاوہ ولیم کو آٹھ نو ماہ یہاں گزارنے کے بعد احساس ہو رہا تھا کہ تحصیل کی اکثر عوام ایسی ہے جن کے پاس نہ زمین ہے اور نہ ہی ایسا کاروبار، جو اُن کے دال پانی کا سہارا بن سکے۔ وہ محض بڑے زمین داروں کے باجگزار ہی بن کر رہ گئے تھے۔ اِس کی وجہ سے اپنے آپ کو چوری اور ڈکیتی میں بھی ملوث کر کے جرائم کا سبب بنتے تھے۔ اِن کاموں میں خاص کر ضلع فیروز پور مشہور ہو چکا تھا اور اُس میں بھی تحصیل جلال آباد سر فہرست تھی۔ گزٹ کی تمام رپورٹ میں یہ بات واضح تھی کہ تحصیل جلال آباد میں ایک طرح سے انگریزی قانون نافذ العمل نہیں ہے۔ ستلج کے قریبی جنگلات اِن مجرمانہ کاروائیوں کے لیے بڑی محفوظ پناہ گاہیں تھیں۔ جہاں پولیس کو کارروائی کرنے میں نہ صرف مشکل پیش آتی بلکہ اُن کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو جاتا۔ اس لیے پولیس اِن علاقوں میں جانے سے گریز کرتی۔ چور اور ٹھگ وغیرہ اکثر اسی بات سے فائدہ اُٹھاتے۔ یہی وجہ تھی کہ مال مویشی کی چوریاں معمول بن چکی تھیں۔ آئے دن گورنمنٹ کے لیے مسائل پیدا ہو جاتے اور چوری کا پیشہ نہایت ترقی کر گیا۔ بار بار کی تنبیہ اور سرزنش کے باوجود جب معاملہ بڑھتا ہی گیا تو ولیم نے خاص کر پندرہ بیس اُن زمینداروں کو دفتر میں طلب کر لیا جن کے متعلق خاص کر رپورٹیں تھیں کہ وہ رسہ گیری کرتے ہیں اور چوروں کو پناہ دیتے ہیں۔ بلکہ غریب اور بے روزگار لوگوں کو چوری اور ڈکیتی پر یہی لوگ لگاتے ہیں۔ یہ زمین دار زیادہ تر اِٹھاڑ

کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے، جن پر ہاتھ ڈالنا پولیس کے لیے سر دردی کا باعث تھا۔ دوپہر کی گرمی میں تحصیل کمپیلیکس کے لان میں موجود برگد کے نیچے یہ زمیندار آج صبح آٹھ بجے ہی آکر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی سفید پگڑیوں پر پفیں لگی تھیں اور پگڑیوں کے کنارے اس طرح ہوا میں لہرا رہے تھے، جیسے سانپوں کے پھن جھول رہے ہوں۔ یہ سب چوہدری اپنے اپنے علاقے کے وائسرائے تھے لیکن برگد کے پیڑ تلے بیٹھے طویل انتظار کے باوجود ان کو کسی قسم کی اُکتاہٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ انہیں نہ صرف خود بلکہ ان کے عزیز واقربا کو بھی احساس تھا کہ یہ اُن کی زندگی کا پہلا موقع تھا جب کسی انگریز افسر نے انہیں اپنے دربار میں بلا کر ملاقات کا شرف بخشا تھا۔ اب جتنی دیر تک زندہ رہیں گے، یہ فخر اُن کے ساتھ چلے گا۔ اِس لیے انگریز بہادر کا اتنا انتظار کروانا اُن کے لیے زیادہ تکلیف کا باعث نہیں تھا۔ پھر ایک ہی تو دن کی بات تھی۔ اِن میں زیادہ تر زمیندار وٹو، بودلے، بھٹی راجپوت اور کھرل قبیلوں سے تھے اور سب کے سب مسلمان تھے۔ ویسے بھی ایک دوسرے کے واقف ہونے کی وجہ سے اِن کا آپس میں کھل کر باتیں کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں تھی۔ یہ سب چودھری برگد کی ٹھنڈی چھاوں میں لکڑی کی بنچوں پر بیٹھے حقوں کی گڑگڑاہٹ سے کسیلے دھویں کی لہریں چھوڑ رہے تھے۔ اِن کے حقے نہایت شاندار اور بڑی بڑی چلموں اور پیندوں والے تھے۔ جن کی نڑیاں نوکروں نے تھامی ہوئی تھیں۔ زمین دار اپنے ساتھ یہ چرب زبان نوکر اِس لیے لائے تھے کہ حقہ پکڑنے کے ساتھ دوسروں کو اپنے مالک کے سچے جھوٹے قصے بھی نون مرچ لگا کر سنائیں۔ یہ فریضہ وہ اچھے طریقے سے ادا کر رہے تھے اور ایسی دور دور کی ہانک رہے تھے کہ خدا کی پناہ۔ ہر ایک نوکر اپنے مالک زمین دار کو دوسرے پر فوقیت دینے میں ایسی لمبی چھوڑتا کہ اگلے نوکر کے لیے مشکل پیدا کر دیتا مگر جب دوسرا بات شروع کرتا تو وہ بھی اِس مشکل کو عبور کر کے اپنی زبان دانی اور چرب زبانی کا ثبوت مہیا کر ہی دیتا۔ اِن گپوں اور زبان کے چٹخاروں میں کسی کو کچھ پتا نہ چلا کتنا وقت نکل گیا ہے۔ اِسی طرح ان کو گیارہ کا وقت ہو گیا۔ اِدھر تو یہ بیٹھے ان شغلوں میں تھے اُدھر ولیم مال افسروں کے ساتھ منصوبہ بندی میں مشغول تھا۔ میٹنگ کے دوران ہی اچانک ولیم نے اپنے منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے کے لیے نجیب شاہ کو کمرے میں طلب کیا اور پوچھا، نجیب شاہ کیا اِٹھاڑ کے سب لوگ آ گئے ہیں؟

نجیب شاہ نے جواب دیا، سر وہ تو صبح آٹھ بجے سے سرکار کے دفتر میں حاضری کے لیے برگد کی چھاؤں میں بیٹھے ہیں۔ اگر حکم ہو تو میں اُن کو حاضر کر دوں؟

نہیں اندر بلانے کی ضرورت نہیں۔ ہم اُن سے وہیں جا کر بات کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ولیم اُٹھ کر کمرے سے باہر نکلا اور کمپلیکس کے لان میں اُسی طرف چل پڑا جہاں یہ سب بیٹھے تھے۔ اُس کے پیچھے نجیب شاہ اور چار پانچ پولیس سنتری بھی تھے۔

انگریز سرکار کو اپنی طرف آتے دیکھ کر سب اپنی بنچوں سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے لیکن ولیم نے سب کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنے کے لیے کہا اور خود وہیں کھڑا ہو گیا۔ سب بیٹھ گئے تو ولیم نے ایک ایک سے اُس کا نام اور علاقہ پوچھا اور وہ جواب دیتے گئے۔ چند لمحے اسی تعارف میں گزرنے کے بعد ولیم نے اُن کی طرف ایک بھرپور نظر ماری اور بولا، حضرات شاید تم کو یہ نہیں بتایا گیا کہ تمھیں یہاں کس لیے زحمت دی گئی ہے اور گورنمنٹ تم لوگوں سے کیا چاہتی ہے؟ میں تم کو زیادہ دیر اس جگہ بے زاری اور تجسّس کی حالت میں نہیں رکھنا چاہتا۔ نہ ہی مَیں ایسی فرصت کی حالت میں ہوں کہ تم سے لمبی چوڑی گفتگو کے لیے وقت نکال سکوں۔ تم سب لوگ اپنے کانوں سے پگڑیوں کے کونے اُٹھا کر میری بات سُن لو۔ مَیں جلال آباد میں امن و امان اور خوش حالی چاہتا ہوں۔ مجھے تم سب کی کارگزاریوں کی مکمل رپوٹ ہے، جو حوصلہ افزا نہیں۔ تم جانتے ہو، تمھارے علاقوں میں چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں عروج پر ہیں۔ جو عوام اور گورنمنٹ کے لیے مستقل پریشانی کا باعث ہے۔ گورنمنٹ آپ کی رسہ گیریوں سے خوش نہیں ہے اور چاہتی ہے آپ اُس کا ساتھ دیں (اس کے بعد ولیم مزید آگے ہوا اور اپنا ہیٹ سر سے اُتار کر سخت لہجے میں بولا) اگر آئندہ مجھے پتا چلا کہ مویشی چوروں پر تمھاری شفقت ابھی تک موجود ہے تو میں تمھاری گردنیں اِنہی پگڑیوں سے باندھ دوں گا، جن کو پان دینے پر اتنا خرچہ آتا ہے جتنا تمھارے سال بھر کے آٹے پر۔ یہ کہ کر ولیم واپس مُڑا اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ نہ تو اُس نے کسی کی بات سنی اور نہ مزید کچھ کہا۔ انگریز افسر کو اِس طرح آتے اور جاتے دیکھ کر تمام زمینداروں اور چوہدریوں کے سر گھوم گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ملاقات اتنی مختصر اور تلخ ہو گی۔ اب وہ ایک دوسرے سے نظریں بھی ملانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ادھر ولیم اُن کو سرزنش کرنے کے بعد ایک پل میں یہ جا وہ جا۔ دفتر کی راہداریوں سے ہوتا ہوا کمرے میں غائب ہو گیا۔ اُس کے پیچھے دفتر کا دوسرا عملہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ اِدھر اِٹھاڑ کے زمیندار اپنا سا منہ لے کر لکڑی کے بنچوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کپڑے جھاڑ کا آہستہ آہستہ باہر کی طرف نکلنے لگے، جہاں اُن کے گھوڑے بندھے تھے۔ اب اُنھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بھی کوئی بات نہیں کی اور آرام سے نکل گئے۔ اُن کو اپنے آپ پر تو غصہ آ ہی رہا تھا مگر اپنے سے زیادہ اُن نوکروں پر تھا جو

اس رسوائی پر خوامخواہ موقع کے گواہ بن گئے تھے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا، سوائے اِس کے، کہ اُن نوکروں کو ایک دوسرے سے جدا ہو کر تنبیہ کرتے کہ علاقے میں جا کر اِس بات کو مشتہر نہ کریں۔ بلکہ ہو سکے تو اُن کی انگریز بہادر کے ساتھ آبرومندانہ گفتگو کے جھوٹے واقعات سنائیں۔ مگر ہر ایک یہ بھی جانتا تھا کہ اُس کے متعلق دوسرا اپنے علاقے میں جا کر سارا پول کھول دے گا۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ولیم کی طبیعت میں شاعرانہ قباحتیں موجود تھیں لیکن یہی وہ قباحتیں تھیں جو بعض اوقات کام کے سلسلے میں مفید ثابت ہوتی تھیں۔ اُن کی وجہ سے وہ اپنی مرضی سے کیے گئے کاموں میں زیادہ پائدار ثابت ہوتا تھا۔ اِسی کے تحت اُس نے جلال آباد کو ایک طرح سے برطانیہ کا ایک قصبہ بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ جس کے لیے اُس کے ذہن میں عجیب عجیب ترکیبیں ایجاد ہونے لگیں۔ اِس سلسلے میں ولیم نے اپنی طرف سے کچھ دفتری حکم نامے جاری کیے۔ مثلاً ہر ایک پر لازم کر دیا گیا کہ وہ اپنے گھروں کے صحنوں اور بازاروں اور جلال آباد کے مضافات میں شہتوت کے پودے لگائے۔ اِس کے علاوہ کمپلیکس سے ایک کلومیٹر دور پچیس ایکڑ رقبہ کی جگہ کا انتخاب کیا گیا، جہاں شہتوت کے پودوں کی کاشت کا بندوبست کیا جانا تھا تاکہ جلال آباد تحصیل میں ریشم کے کیڑوں کا کاروبار چلایا جا سکے۔ اِس کی ترکیب ولیم کے ذہن میں اُس وقت آئی جب اُسے فاضل کا بنگلہ جاتے ہوئے ایک جگہ پر بہت سے شہتوت کے درخت دکھائی دیے۔ اِس مقصد کے لیے ولیم نے بدر دین کی ڈیوٹی لگا دی اور فنڈ مختص کر دیا، جو اِس سے پہلے بھی نجی سطح پر یہی کام کرتا تھا۔ علاوہ ازیں جلال آباد کی گلیوں اور بازاروں کی نئی سکیم تیار کر کے اُن کی تعمیر کا حکم جاری کیا گیا اور بلدیہ کو شہر کی توسیع کے لیے ایک نیا منصوبہ بنانے کا حکم جاری کیا۔ اِس سلسلے میں تحصیل کے بڑے زمین داروں سے رابطہ کر کے اُنہیں شہر میں اپنے گھر تعمیر کرنے کی طرف متوجہ کیا اور تاجر پیشہ لوگوں کو، جو زیادہ تر ہندو تھے، اِس بات پر اُکسایا کہ وہ اپنا سرمایہ یا پیسہ کپڑے، قالین بافی یا زرعی پیداوار کی خرید و فروخت پر لگائیں۔ جس کے لیے گورنمنٹ اُنہیں آسانیاں فراہم کرے گی۔ اگرچہ ولیم نے جانسن صاحب کی ہدایات کے مطابق اپنے رویے میں احتیاط کو بہت دخل دینا شروع کر دیا تھا لیکن جن کاموں کو وہ کسی طرح سے شروع کر بیٹھا تھا، اُن کی انجام دہی کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ خاص کر تعلیم اور نہری نظام کے سلسلے میں کسی قسم کی رو رعایت سے کام نہ لیا۔ جو کام اُس نے انتہائی پھرتی سے مکمل کروا دیے اور کسی کو اُن کاموں پر اعتراض بھی نہیں ہو سکتا تھا، اُن میں سب سے پہلے ولیم نے تحصیل کمپلیکس میں دو تین رہٹ لگوا کر پانی کا انتظام کروا کے کمپلیکس کی

راہداریوں اور ارد گرد دور تک ہزاروں ہی درخت لگوا دیے، جو پھل دار بھی تھے اور اور سایہ دار بھی۔ سایہ دار درختوں میں ولیم کو برگد، پیپل اور نیم کے درخت بہت پسند تھے۔ اس لیے اُنہی کے پودے ہر طرف فروری کے مہینے میں ہی لگوائے تاکہ بہار اور پھر مون سون کے موسموں میں اُن کی نمو کا عمل جاری رہے۔ اِس کے علاوہ تمام مالی اور نہری پٹواریوں سے زمینوں کے گوشوارے منگوا کر مال افسروں کے ذریعے زمین داروں تک ہدایات پہنچا دی گئیں کہ اگر اُنھوں نے دیے گئے ٹارگٹ کے تحت اپنی زمینوں میں فصل کی کاشت اور شجر کاری نہ کی تو اُن کو جرمانے اور زمینوں کی ضبطی کی سزا دی جائے گی۔ اِن احکام کا خاطر خواہ نتیجہ جلد ہی سامنے آنے لگا۔

حکم کے مطابق ایک دو زمینداروں کی جب زمین واقعی ضبط کر لی گئی تو دوسروں نے ہدایات پر پورا پورا عمل کرنے کی طرف توجہ دی۔ ولیم نے بذات خود کئی جگہ کا دورہ کر کے حالات کا جائزہ لیا، جس پر تحصیل کے تمام عملے کو کان ہو گئے۔ ایک اور بات جو ولیم کے کہے ہوئے کام کو پورا کرنے کے لیے مفید ہو رہی تھی، وہ اُس کی یادداشت تھی۔ ولیم ایک دفعہ جو کام کہہ دیتا پھر اُسے بھولتا نہیں تھا اور گاہے گاہے اُس کے متعلق پوچھتا رہتا۔ محکمہ تعلیم کے بارے میں مولوی کرامت کی خدمات پر بھی ولیم کی تلسی داس سے بات ہو چکی تھی۔ مسلمان بچوں کی تعداد بڑھانے میں مولوی کرامت نے معجزانہ طور پر کردار ادا کیا تھا۔ اُس نے صرف دو ماہ کے اندر سو بچوں میں اضافہ کر دیا۔ مولوی کی اس کامیابی پر ولیم نے تلسی داس کو مولوی کرامت کا خاص خیال رکھنے کا بھی کہا اور ہدایت کی کہ اُسے ایک رہائشی مکان تحصیل کمپلیکس میں الاٹ کر دیا جائے اور اسی طرح کے چار مولوی مزید بطور منشی رکھ کر اُن سے بھی یہی کام لیا جائے۔ لڑکوں کے لیے نئے اسکولوں کے قیام، بچیوں کے لیے بھی کچھ اسکول کھولنا اور نئے منشیوں کی بھرتی کے علاوہ بنگلہ نہر کے بارے میں جو کیس تیار کر کے ولیم نے اسٹیبلشمنٹ کو بھجوائے تھے، اُن پر بھی اپروول آ چکی تھی اور اُن پر کام کروانے میں ولیم کا کسی بھی قسم کی نرمی کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اُن پر انتہائی تیزی سے کام شروع ہو چکا تھا۔ ڈپٹی کمشنر ہیلے بھی ولیم سے اس بارے میں مکمل تعاون کر رہا تھا جس کے متعلق پہلے پہل ولیم کو بعض اندیشے تھے لیکن اب وہ اندیشے بھی ختم ہو چکے تھے۔ البتہ امن و امان کے حوالے سے اپنے آپ کو ثانوی حیثیت میں رکھ کر یہ کام لوئیس صاحب کے حوالے ہی رکھا اور کبھی زیادہ پوچھ گچھ کی ضرورت محسوس نہ کی۔ لوئیس صاحب غلام حیدر اور سودھا سنگھ کے بارے میں ضروری معلومات ولیم صاحب تک پہنچاتا رہا جس میں غلام حیدر سے اسلحہ کی ضبطی سے لے کر سردار سودھا سنگھ کی ضمانت کے متعلق تمام خبریں شامل تھیں۔ ولیم کو ہر چند سودھا سنگھ کی پکی

ضمانت ہو جانا کافی گراں گزرا لیکن اب وہ عدالتی نظام میں مہاراجاؤں کی دخل اندازیوں کا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اِس لیے ولیم نے لوئیس کی زبانی یہ خبر سُن کر فقط سر ہلا دیا اور کہا، لوئیس، اب تمھاری ذمہ داری ہے کہ اِس طرح کے ناخوشگوار واقعے دوبارہ اس تحصیل میں جنم نہیں لینے چاہیئں۔

لوئیس نے ولیم کو اطمنان دلاتے ہوئے کہا، سر آپ آئندہ سکون رکھیں۔ اس کے ساتھ ہی لوئیس نے ولیم کے سامنے ایک فائل رکھ کر بتا دیا کہ عدالت نے غلام حیدر سے ضبط کیا گیا اسلحہ اُسے واپس کرنے کی ہدایت جاری کر دی ہے جس پر اُن کے دستخط ہونا ضروری ہیں۔ ویسے بھی قانون کے مطابق اسلحے کی ضبطی کو تین مہینے ہو چکے تھے اور غلام حیدر کے ذاتی ریکارڈ کے حوالے سے بھی یہ رپورٹ اطمنان بخش تھی۔ ولیم نے اُس فائل پر دستخط کر کے غلام حیدر کی رائفل لوٹانے کی اجازت دے دی۔

ولیم نے کیتھی کو جانسن صاحب کے حکم کے مطابق اُسی دن ہی تار بھجوا دیا تھا، جس کے جواب میں کیتھی نے جولائی کے مہینے میں ہندوستان آنے کی خوشخبری سنائی تھی۔ ویسے بھی ولیم سے شادی کرنا کیتھی کے لیے کسی پرنس کا ہاتھ آجانے سے کم نہ تھا۔ جس کا خواب انگلستان کی اکثر لڑکیاں وہاں دیکھتی رہ جاتیں۔ ہندوستانی سول سروس میں کسی انگریز کے ساتھ بیاہ کرنا ایسے ہی تھا جیسے شاہی خاندان کی بہو بن جانا ہو۔ اِس لیے انگلستان میں رہنے والی نوعمر لڑکیاں اِس تاک میں رہتیں کہ کسی طرح سی ایس ایس کرنے والے لڑکے کو پھانس لیا جائے۔ ایک دفعہ ایسا لڑکا ہاتھ میں آجاتا تو اُس کی زندگی سنور جاتی۔ پھر وہ ہندوستان پہنچ کر ایک دم میم بن جاتی اور واپس اپنی سہیلیوں کو یہاں کے واقعات اور عیش و عشرت کی زندگی کے عجب عجب قصے لکھ کر بھیجتیں، جن کو پڑھ کر اُن کے کلیجوں میں سیخیں لگتیں۔ چنانچہ کیتھی کسی طرح اِس موقعے کو ضایع نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے فوراً ہی لکھ بھیجا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ولیم کے پاس ہندوستان آرہی ہے۔ کیتھی کے ٹکٹ کا انتظام ہوائی کمپنی ہی کے ذریعے کر دیا گیا تھا۔ اب وہ بیس جولائی یعنی دس دن بعد دہلی پہنچ رہی تھی۔ ولیم کا اُسے وہاں سے خود جا کر وصول کرنے کا ارادہ تھا۔ جس کے لیے اُس نے اپنے قریبی دوست جان لیور کو پیغام بھیج دیا کہ وہ اگلے پیر کو دہلی آرہا ہے۔ یہ سفر اُس نے ریل پر ہی کرنے کا ارادہ کیا تاکہ کیتھی کو لے کر سیدھا لاہور چلا جائے، جہاں تمام رسوم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مال روڈ کے کیتھڈرل چرچ میں نکاح پڑھ لے۔ اُس کے بعد دوستوں کو غیر رسمی دعوت پر بلا کر معاملہ جلد نپٹا دے۔ اِس سلسلے

میں ولیم نے ایک ماہ کی چھٹیوں سمیت چند مزید انتظامات کر لیے کہ اپنی نو لکھی کوٹھی کی کافی آرائش کروادی، جو پہلے بھی کسی طرح کم نہیں تھی۔ اِس بات کا بھی خیال رکھا کہ اگر اُسے چھٹیوں کے بعد جلال آباد منتقل ہونا پڑے تو اُس لحاظ سے بنگلے کی بھی درستی کر دی جائے۔ جس پر کام جاری تھا۔ اِس کے علاوہ ولیم نے اوکاڑہ میں چرچ روڈ پر ایک کرسٹان مشنری سکول کی بنیاد رکھنے کا بھی منصوبہ بنالیا اور اُس کا انتظام اپنے دوست ڈینی کے ہاتھ میں دے دیا۔ اِس کو چلانے کے لیے رقم کا بندوبست بھی دونوں دوستوں نے مل کر کرنا تھا لیکن سر دست کیتھی سے شادی کرنا سب سے اہم معاملہ تھا اور اُس کا موقع انتہائی قریب تھا جس کا خیال ہی ولیم کو سرشار کر دینے کے لیے کافی تھا۔ غرض یہ کہ پچھلے دس دن کے دوران ولیم نے اپنے ماتحت تمام تحصیل کی سطح کے انتظامی شعبوں کا فرداً فرداً جائزہ لیا اور اُن پر مختلف ہدایات جاری کیں۔ جس کی تفصیلی رپورٹ اُسے چھٹی کے دوران بھی پہنچانے کا پابند بنایا تاکہ کام تعطل کا شکار نہ ہوں۔ اِس طرح اپنا کام نپٹا کر اور ہر طرح سے دفتری امور سے مطمئن ہو کر ولیم پانچ بجے اپنے کمرے سے نکلا۔ شام کا وقت قریب آگیا تھا لیکن گرمی میں ابھی بھی اتنی شدت تھی کہ جلد جھلس جانے کا اندیشہ ہو رہا تھا۔ ولیم کو لگا ابھی لو لگ جائے گی لیکن آج اُسے اس طرح کی گرمی کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ کیتھی کا خیال ہی اُس کی طبیعت میں بہار پیدا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ ولیم آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے بنگلے پر آیا اور دہلی کے لیے اپنے ملازموں کو ہدایات دیں۔

جاری ہے

قسط نمبر 20

(36)

معاملات تیزی کے ساتھ آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جن کی نہج کے بارے میں نہ غلام حیدر کو پتا تھا اور نہ ہی ملک بہزاد جانتا تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ البتہ غلام حیدر کی نواب افتخار حسین سے تار پر ہونے والی بات اور نواب افتخار کے والد نواب سر شاہنواز سے ملاقات کے بعد کام کافی آسان ہو گیا تھا۔ بلکہ اتنا آسان کہ اب غلام حیدر کو خود پر غصہ آ رہا تھا کہ اُسے پہلے ہی یہ بات کیوں نہ سوجھی، اور وہ ممدوٹ ولاز میں جا کر سر شاہنواز سے کیوں نہ ملا؟ جو غلام حیدر کو اپنے بیٹے نواب افتخار کا دوست ہونے کے ناتے اچھی طرح نہ صرف جانتا تھا بلکہ کہہ بھی چکا تھا، بیٹا افتخار لندن جا رہا ہے تو یہ نہ ہو، تم اپنے چچا کو ملنے ہی نہ آؤ۔ گاہے گاہے آتے رہنا۔ اگر مجھ تک کام ہو تو بلا جھجک کہہ دینا۔ مگر غلام حیدر کو آپا دھاپی میں یہ خیال ہی نہ آیا کہ سر شاہنواز سے مل کر اُسے اپنی ساری کتھا سنا دے۔ بہر حال دیر آید درست آید۔ نواب صاحب نے تھوڑی بہت ردو کد کے بعد غلام حیدر کی بات مشروطی طور پر مان لی، جس کا سارا منصوبہ ملک بہزاد نے تیار کیا تھا۔ اب جب کہ نواب صاحب نے تھانیدار ضمیر شاہ کو بلا کر اُسے غلام حیدر کے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں مدد کرنے کا حکم دے دیا تو مزید دیر کرنے کی تُک نہیں تھی۔ غلام حیدر نے نواب صاحب سے ملنے کے بعد گھر آ کر تین چار دن میں اپنا سارا کام نپٹایا اور سیدھا ملک بہزاد کے گاؤں کا رُخ کیا۔ اُسے ساری تفصیل سے آگاہ کر کے اُس کی عملی شکل تیار کرنے کی کارروائی کی طرف متوجہ ہوا۔ ملک بہزاد غلام حیدر کی نواب صاحب کے بنگلے سے واپسی کا بے چینی سے منتظر تھا۔ اُسے خوف تھا، نواب صاحب کہیں انکار نہ کر دیں۔ لیکن جو قیمت ملک بہزاد نے غلام حیدر کو اس کام کے عوض ادا کرنے کا کہا تھا، اُس پر اُسے یقین تھا کہ نواب صاحب ضرور مان جائیں گے اور وہی ہوا۔ اب اگلی پیشی بالکل قریب تھی، جس پر سردار سودھا سنگھ کا پیش ہونا قرین قیاس تھا، تو مزید دیر کام میں بھنگ ڈال سکتی تھی۔ پندرہ دن پہلے غلام حیدر کو اپنی رائفل اور دوسرا ضبط شدہ اسلحہ واپس مل چکا تھا لیکن اُس کی ملک بہزاد کے مشورے کے مطابق ہوا بھی باہر نہیں نکالی تھی۔ لوگوں کی نظر میں رائفل اور دوسرا اسلحہ ابھی تک گورنمنٹ کے قبضے میں تھا۔

غلام حیدر نے ملک بہزاد کو اپنے معاملات کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا، چاچا بہزاد، اماں جان کو میں نے پاکپتن کی بجائے کہیں اور بھیج دیا ہے۔ اس کے علاوہ مال کا فی سارا بیچ کر بقیہ نواب صاحب کی فرید کوٹ والی حویلی میں منتقل کر دیا ہے۔ نواب صاحب پوری طرح دوستی کا حق ادا کرنے کو تیار ہیں۔ اِس سلسلے میں اُنہوں نے مجھے اپنی ایک جیپ بھی ڈرائیور سمیت بھیج دی ہے، جو نواب صاحب کی گروہر سا والی حویلی میں موجود ہے۔ اگر اُس کی ضرورت پڑی تو استعمال کر سکتے ہیں۔ اِس کے علاوہ گروہر سا کے تھانیدار کو بلا کر منصوبے پر عمل کروانے کا حکم بھی دے دیا ہے۔ تھانیدار نے کہا ہے، اگر میں کارروائی کر کے دو گھنٹوں کے اندر دوبارہ تھانہ گروہر سا کی حوالات میں پہنچ جاوں تو پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ پھر ساری بات وہ سنبھال لے گا۔ وہ مجھے ناجائز اسلحہ رکھنے کے عوض حوالات میں بند کر کے عین واردات کے وقت باہر نکال دے گا۔ میں اور میرے بندے کارروائی کر کے دوبارہ وہیں پہنچ جائیں گے۔ اِس طرح یہ کارروائی مکمل ہو جائے گی لیکن مجھے اِس میں خطرہ ہے کہ کام صرف سودھا سنگھ کا ہی ہو گا، دوسرے دونوں بچ جائیں گے۔ کیونکہ اُس کے لیے وقت نہیں ہو گا۔

ملک بہزاد نے غلام حیدر کی بات سُن کر ایک لمبی، ہوں، کی پھر حقے کی نے ہاتھ سے رکھ کر بولا، غلام حیدر اُن دونوں کی بالکل پروانہ کر۔ ہم ایک ہی ہلے میں یہ دونوں قصے پاک کر دیں گے بلکہ یہ اور بھی اچھا ہوا نواب صاحب نے اپنی جیپ عنایت کر دی جس سے کوسوں کا پینڈا چھپا کوں میں نکل جائے گا لیکن ایک بات یاد رکھنا جیپ تجھے پھنسا بھی سکتی ہے۔ اس لیے اُس کا استعمال اُس وقت ہی کرنا جب کوئی چارا نہ رہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات کہ تُو کبھی بھی اپنے آپ کو حوالات میں بند نہ کروانا۔ نہ کام کرنے کے بعد تھانے کا رخ کرنا۔ اگر تھانیدار پر انگریز سرکار کا دباؤ بڑھا تو تھانیدار یہ وزن نہیں اُٹھا سکے گا۔ پھر تجھے ریشمی رسے میں سر دینا پڑے گا۔ ہاں اپنے بندوں کو اِس پیشی سے کم از کم دو دن پہلے گروہر سا تھانے میں بند کروا دینا۔ اُنہیں عین وقت پر تھانے سے نکلوانا اور کاروائی کرتے وقت اپنی پشت پر رکھنا۔ مَیں نے دریا پار چک ڈھبی سے اپنے بھانجے امانت خاں وٹو کو بلا لیا ہے۔ اُس کے پاس اپنی رائفل بھی ہے۔ وہ اس معاملے میں تیرا صحیح جوڑ ثابت ہو گا۔ کاروائی مکمل کر کے تُو اور امانت خاں وٹو ہر صورت فرار ہو جانا اور تیرے بندے اس کے بعد آرام سے اُسی تھانے میں جا بیٹھیں۔ اس طرح سودھا سنگھ کا صفایا کرنے کے بعد چک میگھا جانے کا اور پھر وہاں سے کسی بھی طرف فرار ہونے کا تیرے پاس بہت وقت ہو گا۔ جیسا کہ نواب صاحب نے حامی بھری ہے وہ تجھے پناہ دے سکتا ہے۔ یہی بات اُس سے پکی کر کہ تُو کاروائی کرنے کے بعد حوالات میں نہیں

جائے گا۔ خود کو حوالات میں بند کروالینا ایسے ہی ہے کہ اپنے ہاتھ پہلے ہی کاٹ کے دے دینا۔ اگر کسی انگریز افسر کو شک بھی پڑ گیا تو تھانیدار کی تو صرف نوکری جائے گی یا تھوڑی بہت سزا ہو جائے گی لیکن تیری گردن لازمی کنویں کے تختے پر کسی جائے گی۔ قانونی طور پر تھانے میں حاضری ہونے کی وجہ سے تیرے بندوں پر شک کم ہو گا۔ اگر وہ شک کی بنا پر پکڑے بھی گئے تو بمشکل دو یا تین سال کی سزا ہو گی۔ کیونکہ سودھا سنگھ کے وارث ہر حالت میں تجھے ہی نامزد ملزم قرار دیں گے۔ امانت خاں وٹو تیری اُمید پر پورا اُترے گا، اُسے یہاں کوئی پہچانتا بھی نہیں، وہ کام کر کے واپس چلا جائے گا۔ انشاء اللہ کل تک یہاں پہنچ جائے گا اور پرسوں ہم مل کر سب پروگرام مکمل کر لیں گے۔ سودھا سنگھ اس دفعہ جیسے بھی اور جدھر سے بھی جائے گا، اُس کی ایک ایک لمحے کی خبر ہمیں ملے گی۔ میں نے ایک بندہ وہاں، خاص، اسی کام پر لگا دیا ہے۔ اور وہ ہے اُن کے گاؤں کا لوہار نندا، جو جگبیر کا بڑا یار ہے۔ کل وہ ایک خبر دے گیا ہے۔ ہم اُسی کے مطابق اگلا پروگرام بنائیں گے لیکن، ملک بہزاد وضاحت کرتے ہوئے بولا، اس کام میں اگر کوئی گڑ بڑ ہوئی تو اُس کے لیے بھی تیار رہو۔ ضروری نہیں ہر کام منصوبے کے عین مطابق ہی ہو۔

چاچا بہزاد اُس کے لیے میں بالکل تیار ہوں، غلام حیدر نے پورے جوش اور دلیری سے جواب دیا، نواب صاحب ایسی حالت میں بھی اُس وقت تک پناہ دیں گے، جب تک بہتر صورت پیدا نہیں ہو جاتی۔ اس کے لیے چاہے کئی سال ہی کیوں نہ لگ جائیں۔ اُنھوں نے یہ بھی ذمہ داری لی ہے کہ وہ میری زمین کی ضبطی بھی نہیں ہونے دیں گے۔ میرے تمام آدمی اُس کو اُسی طرح کاشت کرتے رہیں گے جیسے وہ کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں صاف بتا دیا ہے کہ میں یہ کام کیے بغیر نہیں ٹلوں گا۔ لہٰذا نواب صاحب کی طرف سے آپ بے فکر ہو جائیں اور اپنا پروگرام بتائیں۔ میرا تو یہی خیال ہے، اِس دفعہ بھی سودھا سنگھ فیروزپور نہیں آئے گا۔ اُسے ہماری طرف سے اب بھی ڈر موجود ہے۔ میں نے اپنی تیاری ہر طرح سے مکمل کر لی ہے۔ اب ہمارے پاس چار سانڈنیاں اور پچیس گھوڑے، ایک جیپ اور دو ریفلیں ہیں، مگر میدان لگتا دکھائی نہیں دیتا۔

بس ٹھیک ہے غلام حیدر، ہم اِس دفعہ بھی پچھلی بار کی طرح منصوبہ بنائیں گے، ملک بہزاد نے مشورہ دیتے ہوئے کہا، مجھے سب سے زیادہ فکر نواب صاحب کی طرف سے تھی، وہ تمھارا ساتھ دیتا ہے کہ نہیں؟ اب میدان ضرور لگے گا، یہ مجھے پکا یقین ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم کارروائی کر جائیں۔ اس دن کا مجھے عرصے سے انتظار تھا۔

لیکن چاچا بہزاد، چوہا بِل سے باہر نکلے تو کڑکی میں آئے، غلام حیدر غصے سے بولا، اتنا عرصہ ہو چکا ہے اور مَیں کچھ نہیں کر سکا۔ رعایا میرے منہ کو آ رہی ہے۔ میں جانتا ہوں، لوگ میرے منہ پر کچھ نہیں کہتے لیکن میری غیبت میں مجھے ضرور بزدل کہتے ہیں۔ مَیں اتنا عرصہ انہیں باتوں میں لگا کر لے آیا ہوں۔ اب اُن کی پکی ضمانتوں نے تو اُنہیں اور بھی شیر کر دیا ہے۔ اِدھر مَیں مرنے والوں کے وارثوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔

ملک بہزاد غلام حیدر کا شکوہ سن کر بولا، میں جانتا ہوں غلام حیدر یہ صبر کے گھونٹ تیرے لیے زہر کے اچھو ہیں لیکن مجھے پکا یقین ہے، اِس دفعہ چوہا کڑکی میں آ ہی جائے گا۔ میرے مخبر کی رپورٹ کچی نہیں ہو سکتی۔ خدا کے ہر کام میں مصلحت ہے۔ اب دیکھ، اگر تیرا اور اُس کا ٹاکرا تیری رائفل کی ضبطی اور بغیر منصوبہ بندی کے ہو جاتا تو معاملہ خراب ہو سکتا تھا۔ ڈانگ سوٹے کی لڑائیوں میں اکثر وار اوچھے پڑتے ہیں۔ پھر مجھے تیرے بندوں پر بھی اعتبار نہیں۔ غریب آدمی کے ہاتھ چوہدریوں پر اُٹھتے ہوتے کانپ جاتے ہیں۔ سودھا سنگھ کے علاوہ تُو سارے جھنڈو والا کو قتل کر دے تو کوئی فایدہ نہیں۔ یاد رکھ، سودھا سنگھ کا قتل ہوا نہیں، اُدھر جھنڈو والا تیرے قدموں میں ہو گا اور سارے علاقے کے بدمعاش تیری ذات سے خدا کی پناہ ڈھونڈتے پھریں گے۔ رہا تجھ پر پُلس اور مقدمہ، اُس کی حالت گواہوں اور ثبوت کے بغیر وہی ہو گی، جو اِس وقت ہمارے مقدمے کی ہے۔

لیکن چاچا، اگر تُو نہ روکتا تو مَیں عبدل گجر اور شریف بودلہ کا تو کب کا گھونٹ بھر دیتا۔ کچھ تو دل کو تسلی ہوتی۔

بھتیجے میری بات سمجھ، ملک بہزاد کہنے لگا، پھر اس کے بعد کیا ہوتا؟ دیکھ، ہم جس کو بھی قتل کرتے، اُس کے بعد ہمارے پاس آزادی کا کوئی دن نہ ہوتا۔ نہ ہی دوسری کارروائی کے لیے ہمیں سکون ملتا اور نہ وقت۔ بلکہ ہم خود پولیس سے بھاگتے اور چھپتے پھرتے۔ ہمارے قابو میں سودھا سنگھ نہیں آ سکتا تھا۔ اِن دونوں حرامیوں، عبدل اور شریف کو تو ہم جا ہی پہنچیں گے۔ یہ تو ہمارے لیے گھڑے کی مچھلی ہیں۔ جس کے لیے اگر وقت کم ہوا تو نواب افتخار کی جیپ بھی تمھارے کام آ سکتی ہے، جو اِن میں سے کسی کے پاس نہیں۔ مگر میرا خیال ہے اُس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سارا کام اُس کے بغیر ہی ہو جائے گا۔ ہم سودھا سنگھ سے فارغ ہو کر سیدھا چک میگھا جا نکلیں گے۔ جہاں عبدل گجر صبح ایک پہر دن نکلے سے لے کر شام ڈیگر تک نیم کی گہری چھاؤں میں دُلے ماچھی سے ٹانگیں دبواتا ہے

اور پندرہ بیس گیدڑوں کے ساتھ بیٹھا سارا دن ڈیگیں سنتا ہے۔ وہیں منجی پر بیٹھے بٹھائے سُلادیں گے۔

:اور تاریخ پر پیشی؟غلام حیدر نے پوچھا

ہماری پیشی اب دو جگہ پر ہو گی، ملک بہزاد نے منصوبے کی وضاحت کی،ایک گروہر سا اسٹیشن پر دوسری چک میگھا۔ چک میگھا عبدل گجر اور شریف بودلہ کو ہم چار تاریخ دوپہر ملیں گے لیکن پہلے سودھا سنگھ کی بارگاہ میں۔

اگر سودھا سنگھ نے واصل کے سے جا کر ریل پکڑی اور ہم گروہر سا ہی بیٹھے رہ گئے، تو؟ پھر ساری پلاننگ خاک میں مل جائے گی،غلام حیدر نے شُبے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

واصلکے اسٹیشن سے وہ دو وجہ سے نہیں چڑھے گا، ملک بہزاد نے داڑھی کو انگلیوں سے کھرچتے ہوئے اپنا فلسفہ بیان کیا،ایک تو یہ، وہ اتنا نادان نہیں کہ اپنے آپ کو خود موت کے چونبے میں جھونک دے۔ اُسے سراسر پتا ہے، واصلکے غلام حیدر کا علاقہ ہے۔ دوم اُسے اگرچہ گروہر سا سے ریل پر بیٹھ کر فیروزپور جانے میں لمبا چکر کاٹنا پڑے گا لیکن اُس کو جھنڈووالا سے گروہر سا تک بہت کم گھوڑوں پر طے کرنا پڑے گا۔ جبکہ واصلکے آتے آتے اُس کے جانوروں کی اس گرمی میں تباہی بول جائے گی اور سفر بھی محفوظ نہیں ہے۔ اِس لیے اُسے کسی کتے نے نہیں کاٹا کہ گروہر سا کو چھوڑ کر واصلکے کی طرف آئے۔ ہمارے مخبر کی پکی اطلاع بھی یہی ہے لہٰذا ہم اُسے گروہر سا پر ہی ملیں گے اور اگر بالفرض ایک فیصد وہ واصلکے سے گیا بھی، تو ہمارے آدمی سانڈنیوں پر مٹی تو نہیں چاٹنے کے لیے بیٹھے ہوں گے؟ وہ ہم کو آکر فوراً بتادیں گے، پھر جیپ پر کوئی دیر نہیں لگے گی اور وہ کوئی بڈاوے نہیں کہ غائب ہو جائیں گے۔

اِس کے بعد ملک بہزاد نے غلام حیدر کو تمام منصوبہ سمجھا دیا اور منصوبے کے ہر پائے کی چولیں اچھی طرح سے ٹھونک بجا کر سیدھی کر لیں۔ جس میں غلام حیدر اور ملک بہزاد کا بھانجا امانت خاں وٹو منصوبے کے مرکزی کردار نبھانے والے تھے۔ منصوبے کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے کے مطابق کل صبح برچھیوں، کرپانوں اور چھویوں سمیت گروہر سا تھانے کے سامنے جا کر دو پارٹیوں نے ایک دوسرے کے ساتھ دنگا شروع کرنا تھا۔ جس میں ایک دو بندے بھی پھٹڑ ہونا تھے۔ اِن دو پارٹیوں میں ایک پارٹی غلام حیدر کے بندوں کی تھی اور دوسری ملک بہزاد کی۔ اِس لڑائی کے بعد تھانیدار ضمیر شاہ کا کام اُن سب کو، سات اکیاون، میں حوالات میں بند کرنا تھا۔ اِس کے بعد اگلا کام غلام

حیدر اور میاں امانت خاں کا تھا، جو بصیر پور کا مناً پروناً رائفل چلانے والا تھا۔ اِن دونوں کے ساتھ وقتی طور پر حوالات میں بیٹھے ہوئے سب لوگ عین وقت پر شامل ہونا تھے لیکن لڑائی میں حصہ اُنہیں نہیں لینا تھا۔ کیونکہ تمام کام رائفلوں کے ذریعے ہونا تھا۔ کارروائی کرنے کے فوراً بعد ہی اُنہیں دوبارہ آکر حوالات میں بیٹھ جانا تھا۔ جبکہ غلام حیدر اور امانت خاں نے فرار اختیار کرنا تھی۔

(37)

جولائی کی گرمی نے آسمان کو تانبے کا کڑاہا بنا رکھا تھا۔ بادلوں کا تو کہیں مہینوں تک بھی نام نشان نہیں تھا اور ہَوا ایسی گرم جیسے دوزخ کی بھٹی سے آگ کی لپکیں پھیلتی جا رہی ہوں، جو ہٹ ہٹ کر یوں تھپیڑے مارتی تھیں کہ انسان تو کیا صحرا بوندلا جائیں۔ دور تک کوئی ذی روح اول تو نظر نہ آتا تھا، اگر کوئی تھا، تو کفن کے چار کپڑوں میں لپٹا ہوا۔ دھوپ ایسی روشن اور تیز کہ پسینہ بھی بو کھلا گیا تھا۔ جو بار بار پیدا ہوتا اور اُسی کی وجہ سے سوکھتا بھی جاتا۔ گرمی اور دھوپ کے یہی حرارے بھوتوں کی طرح گھوم گھوم کو آسمان کو چڑھ رہے تھے۔ چری اور گاچے کی فصلیں تو خیر ویسے ہی اپنی نزاکت کی وجہ سے کب کی جھلس چکی تھیں، اس گرمی میں برگد اور پیپل تک مرجھا گئے۔ الغرض جانوروں سے لے کر پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں، سب نے گویا فیروز پور ضلع سے فرار کی راہ اختیار کر لی۔ ایالی اور چرواہوں کے علاوہ ہر ایک اپنے ہی گھر کا مہمان بن چکا تھا۔ گرمی کیا تھی خدا نے مخلوقات کو عذاب دینے کا جولائی ایک بہانہ گھڑا تھا۔

سورج طلوع ہوتے ہی اِس قدر جوش میں اُٹھتا جیسے ہر شے کو بھون کے کھا جائے گا۔ ایک پہر گزرنے کے بعد تو اُس کی جولانی آنکھیں دیکھ نہیں سکتی تھیں۔ دھوپ کی لپٹوں سے دھندلا کے رہ جاتیں۔ اِس شدید گرمی میں سردار سودھا سنگھ نے اپنے سفر میں تھوڑی سی مزید ترمیم کر لی۔ ایک تو اُس نے تمام حالات کے پیشِ نظر اسٹیشن گروہر سا پر پہنچنے کا وقت دو بجے کر لیا اور دوسرا تیس بندوں کی بجائے اُن کی تعداد پندرہ کر دی۔ سردار سودھا سنگھ نے اپنی اِس ترمیم کی اطلاع ہرے سنگھ کو رات ہی چھدو کو بھیج کر سمجھا دی تھی اور فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ دن چڑھتے ہی اسٹیشن گروہر سا پہنچ کر ریل کے آنے تک نتھا سنگھ کے پاس، اُس کے ڈیرے پر آرام کریں گے اور چار بجے ریل پر سوار ہو جائیں گے۔ فیروز پور ایک دن کی بجائے تین دن رہیں گے۔ پھر کسی بھی وقت وہاں سے جھنڈو والا آپس آجائیں گے۔

سردار سودھا سنگھ رات کے تیسرے پہر اُٹھ کر گردوارہ چلا گیا۔ وہاں اشنان کرنے کے بعد دیر تک گرنتھ پڑھتا رہا اور دل میں واہگرو سے وعدہ کرتا رہا کہ آج کا دن سلامت نکل جائے۔ اُس کی دشمنوں اور مقدمے سے جان چھوٹ جائے تو وہ کبھی ایسی حماقت نہیں کرے گا۔ ویسے بھی اُس کے دل میں شیر حیدر کے خلاف جو ایک کسک تھی، وہ اب دور ہو چکی تھی۔ گرنتھ پڑھنے کے بعد سودھا سنگھ نے سَنت کو چاندی کے دس روپے دیے اور باہر نکل آیا۔ واپس حویلی پہنچا تو دروازے پر ہرے سنگھ، جگبیر سنگھ اور بیدا سنگھ دوسرے بندوں کے ساتھ انتظار میں کھڑے تھے۔ سردار سودھا سنگھ کو دیکھ کر سب نے ست سری اکال کا نعرہ مارا، جس کا سودھا سنگھ نے بھی واہگرو کے نعرے سے جواب دیا اور حویلی کے زنانہ حصے میں داخل ہو گیا۔ سردار سودھا سنگھ کو دیکھ کر بینت کور گرنتھ ہاتھ میں لے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سات چکر سر پر سے وارے، پھر اُسے طاق میں رکھ کر سردار صاحب کے پاس آ گئی۔ سردار سودھا سنگھ نے بینت کور کے گالوں کو چومتے ہوئے کہا، بنتو چھیتی نال روٹی دے دے، سفر لمبا ہے اور دھپ دا کڑاہا تپ دا جاندا۔

بینت کور نے آج پہلی دفعہ کامی کو آواز نہیں دی۔ بھاگ کر خود روٹی کا سامان کرنے لگی۔ بینت کور کی اِس قدر محبت اور چاہت دیکھ کر سردار سودھا سنگھ کی آنکھوں میں بینت کور کے لیے جذبے سے بھرپور محبت غالب آ گئی۔ وہ اُسے چپکے سے دیکھنے لگا۔ بینت کور اپنے ہاتھوں سے لقمے توڑ کر سردار سودھا سنگھ کو کھلانے پر مصر ہوئی تو سودھا سنگھ منع نہ کر سکا۔ وہ اُسی کے ہاتھ سے کھانے لگا اور کہا، بنتو آج تو نے مجھے کل کا مُنڈا بنا دیا ہے۔

بینت کور سودھا سنگھ کی بات سُن کر مسکرائی اور بولی، سردار جی تسیں لوکاں واسطے وڈے سردار ہون گے۔ میرے واسطے تاں کل دے مُنڈے ای جے۔

کھانا کھانے کے بعد سردار سودھا سنگھ بینت کور کے ساتھ کم سے کم دو گھنٹے تک پیار محبت کی باتیں کرتا رہا۔ اُس وقت تک دن کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ تب سردار سودھا سنگھ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بینت کور نے سودھا سنگھ کو اپنے ہاتھ سے پانچوں ہتھیار باندھے۔ جُوڑے لپیٹ کر پگڑی درست کی، پھر گرنتھ کو سات دفعہ سر پر سے دوبارہ پھیرے دیے۔ اُس کے بعد حویلی کے اندرونی دروازے تک رخصت کرنے آئی۔ جب تک سردار سودھا سنگھ بگھی پر

قدم رکھ کے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوگیا، بینت کور وہیں کھڑی دیکھتی رہی اور اُس کے اوجھل ہوتے ہی اپنے سینے کو پکڑ کر دروازے پر ہی بیٹھ گئی۔ بنت کور کو اِس طرح بیٹھے دیکھ کر، شماں اور اجیت بھاگی ہوئی آئیں اور اُسے اُٹھانے لگیں۔ ساتھ ہی اونچی اونچی رونا شروع کر دیا۔ سودھا سنگھ بگھی پر بیٹھ کر جھنڈو والا کی گلیوں سے نکلا تو دس بجے کا سورج سامنے آچکا تھا۔ گاؤں والے بعض لوگوں نے واہگرو کی سرکار میں، اُس کی رکھ کے لیے جی سے دعا کی پھر اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔

سودھا سنگھ کی بگھی اور اُس کے متروں کے گھوڑے گروہر سا کی طرف دوڑنے لگے۔ سڑک کچی گرد غبار سے اِس قدر بھری تھی کہ گھوڑوں کی ایک ایک ٹاپ سے دو دو کلو گرد کا میدہ اُٹھ اُٹھ کر منہ کو آتا، جو نتھنوں سے ہوتا ہوا تلی تک چلا جاتا۔ یہ گرد اِس لیے بھی زیادہ تھی کہ ایک تو پورے چھ ماہ سے بارش کا قطرہ نہیں گرا تھا، دوسرا ہر وقت لکڑی کے پہیوں والے گڈے چلنے اور چارا ڈھونے والی گدھیوں اور بیلوں کے کُھروں سے پس پس کر اتنا باریک ہو گیا کہ اُسے مٹی کا میدہ ہی کہ لیجیے۔ سڑک کے دونوں طرف سرکنڈوں کے کَت والے اُونچے جھاڑ اور کیکر کے سیاہ پیڑ سردار سودھا سنگھ کی بگھی کے اُلٹی سمت بھاگتے جاتے تھے۔ دھوپ اتنی زیادہ تھی کہ اُس سے کیکروں کے سائے بھی ڈر کر کہیں روپوش ہوگئے تھے۔ خشک ٹہنیوں پر پیجٹروں کے آہلنے لٹکتے ہوئے ایسے ہلتے جیسے اُن کے اندر بھوت ہو نکلتے ہوں۔ کبھی کبھی سرمئی فاختہ یا بجٹرا سامنے سے ایک دم پھڑ پھڑا کر اُڑتا اور دور تک دھوپ میں غائب ہو جاتا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھاڑیوں سے چوہے، کرلے اور گلہریاں بھی ایک طرف سے نکل کر دوسری طرف کو بھاگ اُٹھتیں۔ جن کی پروانہ گھوڑوں کو تھی اور نہ ہی اسواروں کو۔ سودھا سنگھ کو پٹیالے سے آئے ایک مہینہ ہوگیا تھا لیکن وہ ابھی تک جھنڈو والا سے باہر نہیں نکلا تھا۔ جس کی ایک وجہ تو دشمنی تھی لیکن اصل میں اِس بار گرمی بھی اتنی تھی کہ گھر سے باہر نکلنا بھٹی میں سر دینے کے برابر تھا۔ گروہر سا جھنڈو والا سے پندرہ میل تھا، جو بگھی اور گھوڑوں کے لیے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ لیکن لُو کے تھپیڑوں اور دھوپ کے غبار سے جانوروں کو بخار سا چڑھ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اُنھیں تیز دوڑانا بھی درست نہیں تھا۔ لہٰذا وہ دُلکی چال چلتے گئے۔ ریل میں ابھی کافی دیر تھی۔ ادھر اُدھر خطرے والی کوئی بات نظر نہیں آرہی تھی۔ اِس لیے جانوروں کو دوڑانے کی ضرورت نہیں تھی۔ گھوڑے چلتے چلتے جب بارہ میل کے فاصلے پر دیوے کھوہ پہنچے، تو سردار سودھا سنگھ نے کہا، مترو کچھ دیر کے لیے سواریاں روک دو اور جانوروں کو پانی پلالو۔ خود بھی آرام کر لو۔

دیوے کھوہ کی یہ جگہ سردار دیوے سنگھ کی ملکیت تھی، جو سودھا سنگھ کے والد کا بڑا ہی گہرا متر تھا اور اب اُس پر اُس کے بیٹے سردار ٹہل سنگھ کا قبضہ تھا۔ یہاں ایک بڑے سے بوڑھ کے سائے والی ٹھنڈی جگہ تھی۔ جس کے نیچے ایک ٹھنڈے پانی کا رہٹ بھی چل رہا تھا۔ ہریاول پینے والے اور بھنگ کوٹنے والے سارا دن اِس کھوہ پر بیٹھے باتوں کے طوطے اُڑاتے اور نشے میں غین ہوئے لیٹے رہتے اور سارے جہان کی خبریں یہیں بیٹھے لیتے دیتے۔ اکثر راہی پاندھیوں کا بھی یہی ٹھکانا تھا۔ سردار سودھا سنگھ گروہر سا منڈی آتے جاتے یہاں آرام کر کے بوڑھ کی چھاؤں سے لطف لیا کرتا۔ یہ بات ہر کوئی جانتا تھا کہ سردار صاحب کو اِس بوڑھ سے خاص رغبت تھی۔ آج بھی سودھا سنگھ یہاں پہنچا تو اُس کا بوڑھ کو دیکھ کر جی للچا گیا۔ اُس نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر رُکنے پر ہی اکتفا کیا۔ اگرچہ یہ قیام منصوبے میں شامل نہیں تھا اور منڈی گروہر سا بھی اب تین میل ہی رہ گیا تھا۔ سردار ہرے سنگھ نے سودھا سنگھ کو ایک دفعہ نہ رکنے کا ہلکا سا کہا بھی، لیکن سردار سودھا سنگھ نے کہا، ہرے سنگھ بہہ جا، کجھ دیر آرام کر لے، جانور گرمی سے بوندلا گئے ہیں۔

سردار سودھا سنگھ کو دیکھ کر ٹہل سنگھ اور دوسرے تمام لوگوں نے اُٹھ کر پرنام کیا، پھر بھاگ کر مونڈھے اور چارپائیاں اکٹھی کرنے لگے تاکہ سب بیٹھ جائیں۔ سردار سودھا سنگھ نے ہر ایک کو الگ الگ پرنام کا جواب دیا اور ایک بڑی سی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا، لو بئی، مترو کسی نے اشنان کرنا ہے تو کر لو اور جانوروں کو بھی پانی وانی پلا کے تازہ دم کر لو۔ (پھر ٹہل سنگھ کی طرف منہ کر کے) او بھلیا لوکا، سب متروں کو اور مجھے لسی پلا، گرمی نے تو پورے ہڈوں سے پانی کھینچ لیا۔ اِتنا کہ کر سردار سودھا سنگھ اُسی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اِسی اثنا میں ایک پاندھی جو وہاں بیٹھا آرام کر رہا تھا، اُٹھا اور اپنی سانڈنی پر سوار ہو گیا، جو تھوڑے فاصلے پر بیٹھی جگالی میں مصروف تھی۔ ٹہل سنگھ لسی لینے کے لیے اپنی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا اور سودھا سنگھ کے بندے گرمی کے مارے رہٹ کے ٹھنڈے پانی میں نہانے کے لیے لنگوٹ کسنے لگے۔ چند ہی لمحوں میں تیس فٹ لمبے چوڑے کھاڈے میں داخل ہو گئے۔ اِتنے میں سانڈنی سوار نظروں سے اوجھل ہو گیا، جس کی کسی نے بھی پروا نہ کی۔

برگد کا تنا کم سے کم بھی بیس فٹ قطر کا تھا اور اُس کے بڑے بڑے ٹاہنوں کا پھیر قریب چار کنال میں تھا۔ بوڑھ کی شاخوں پر چوڑے پتوں کی سبز چادریں، سینکڑوں پرندوں کی سریلی آوازیں اور پھریریاں لیتی اُن کی اُڈاریاں، اُن کے

بار بار ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدکنے اور چہچہانے کے ساتھ رہٹ کی ٹینڈوں سے نالیوں میں بہتے شفاف اور ٹھنڈے پانی کے تریڑے موسم کی حدت کو اتنا کم کر رہے تھے کہ سردار سودھا سنگھ کو نیند آنے لگی۔ مگر اُسے خوب پتا تھا کہ ریل کا وقت اُس کی اپنی ملکیت میں نہیں، جسے تبدیل کر کے دو گھنٹے مزید بڑھا دیا جاتا۔ پھر بھی دو بجنے میں کافی دیر تھی کیونکہ ابھی تک بارہ ہوئے تھے۔ اِس لیے کچھ دیر آرام کر لینے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ سودھا سنگھ آرام سے چارپائی پر لیٹ گیا تو ٹھنڈی چھاؤں نے اتنا سرور دیا کہ اُس نے ارادہ کیا، اب ننھا سنگھ کی حویلی میں جا کر آرام کرنے کی بجائے یہیں پر ٹکتے ہیں۔ ریل جانے میں ایک گھنٹا رہ جائے گا، تو یہیں سے اُٹھ کر بھاگ چڑھیں گے۔ کون سا اب منڈی گروہر سا دور رہ گیا ہے۔

تھوڑی دیر گزری تھی، ٹہل سنگھ لسی کے دو دونے بھر لایا۔ لسی کافی گاڑھی تھی، اِس لیے اُس نے اُس میں رہٹ کا ٹھنڈا پانی بھی ڈال دیا۔ پھر پیتل کے قلعی شدہ چھنّے بھر بھر کے سب کو پلانے لگا۔ پیت سنگھ، جگبیر، بیدا سنگھ وغیرہ کو نہاتے ہوئے دیکھ کر ہرے سنگھ کا بھی دل کر رہا تھا کہ وہ بھی کپڑے اُتار کر پانی کے کھڈے میں اُتر جائے لیکن وہ لسی پی کر وہیں بیٹھ گیا۔

سودھا سنگھ لسی پی کر دوبارہ چارپائی پر لیٹ چکا تھا بلکہ اب اُس کے خراٹے بھی شروع ہو گئے تھے۔ اُدھر سب متر کھاڈے سے نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اُن کے گنڈاسے، چھویاں اور کرپانیں چارپائیوں پر پڑی اُونگھ رہی تھیں۔ حتیٰ کہ پیپل نے اپنا تمام سایہ مغرب کی طرف سے کھینچ کر شاخوں کے نیچے کر لیا اور دوپہر ایک بجے کا طبل بجا دیا۔ ہرے سنگھ پہلے تو اس ساری کیفیت سے اُکتا رہا تھا لیکن جب اُسے بھی بیٹھے بیٹھے بہت دیر ہو گئی تو اُس نے بھی چند لمحے لیٹ کر آرام کرنے کی ٹھانی۔ ہرے سنگھ سر سے پگڑی اُتار کر ابھی سیدھا ہی ہوا تھا کہ اُسے دُور سے دھوپ کی چندھیا دینے والی سفیدی میں گہرا گرد غبار اُٹھتا دکھائی دیا۔ ہرے سنگھ کے دل میں جو چھپا ہوا ڈر اور ہول تھا، وہ اب بالکل سامنے آنے لگا۔ اُس نے جلدی سے پگڑی دوبارہ سر پر رکھی، برچھی پکڑی اور اُٹھ کر سودھا سنگھ کو سختی سے جھنجھوڑا۔ سودھا سنگھ اُٹھ کر آنکھیں ملنے لگا مگر اُسے ابھی تک کچھ سجھائی نہ دیا۔ ہرے سنگھ نے نہانے والوں کو بھی اضطراب انگیز آواز میں پکارا، جسے سُن کر سب ایک مرتبہ دہل گئے۔ کچھ نہا کر پہلے ہی نکل چکے تھے۔ جو نہا رہے تھے وہ ہرے سنگھ کی آواز سُن کر پٹکے باندھے کھاڈے سے باہر چھلانگیں مارنے لگے لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ سچ پوچھیں

تو سردار ہرے سنگھ کے سوا کوئی بھی اِس اچانک موقع کے لیے تیار نہ تھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے، چوہدری غلام حیدر اُن کے سر پر آن پہنچا اور چند قدم کے فاصلے پر رک کر چنگھاڑتے ہوئے ایک بلند آہنگ نعرہ مارا اور گولیوں سے بھری ہوئی ولائتی رائفل سیدھی کر لی، جس کا گھوڑا پہلے ہی چڑھا ہوا تھا۔ غلام حیدر کے علاوہ امانت خاں کے ہاتھوں میں بھی رائفل تھی۔ باقی سب کے ہاتھوں میں برچھیاں اور ڈانگوں پر چڑھی ہوئی چھویاں چمک رہی تھیں۔ جن کی تعداد پینتیس کے قریب تھی۔ وہ سب بھی نعرے مارنے لگے اور ہتھیار کس کے دس بندوں نے آناً فاناً برگد کے پیڑ کو چاروں طرف سے گھیر لیا تاکہ کوئی بھاگنے نہ پائے۔ دوسرے پچیس آدمی ہر طرح سے مسلح غلام حیدر کی پشت پر جم گئے۔

ہرے سنگھ، جو سودھا سنگھ کے باقی بندوں کی نسبت لڑنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھ کر وار کرتا، امانت خاں وٹو نے پہلے سیدھا اُسی پر فائر کھول دیا۔ گولی ہرے سنگھ کے سینے میں لگی اور وہ لڑکھڑا گیا۔ اِس کے باوجود اُس نے آگے بڑھ کر انتہائی بہادری کے ساتھ واہگرو کا نعرہ مارا اور امانت خاں کے اُوپر برچھی کا ایک بھرپور وار کیا، جو امانت خاں کے گھوڑے پر بیٹھے ہونے کی وجہ سے دائیں ٹانگ پر لگا اور اُس کی ٹانگ شدید زخمی ہو گئی۔ پھر اِس سے پہلے کہ ہرے سنگھ دوسرا وار کرتا، امانت خاں رائفل میں کارتوس دوبارہ بھر چکا تھا، اُس نے رائفل کی نال ہرے سنگھ کے سینے پر رکھ کر دوسرا فائر کر دیا۔ اِس فائر کے لگتے ہی ہرے سنگھ کی آنکھیں بے نور ہو گئیں اور وہ ایک ہی دم لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔ اِسی اثنا میں غلام حیدر بھی اپنی میگزین سودھا سنگھ کے بندوں پر خالی کر چکا تھا۔ اچانک اِن بلاؤں کو دیکھ کر سودھا سنگھ کے بندوں نے ہتھیار تو سنبھال لیے تھے مگر وہ جم کر مقابلہ کرنے سے قاصر تھے اور سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ چوہدری غلام حیدر اور امانت خاں کی رائفلوں کا اپنی ڈانگوں کے ساتھ کیسے مقابلہ کریں؟ دوسری طرف غلام حیدر کے ڈانگوں اور برچھیوں والے ساتھی بھی اِن سے دگنی تعداد میں وہاں کھڑے تھے۔ اِس لیے بجائے اِس کے کہ آگے بڑھ کر حملے کا جواب دیتے، گولیوں سے بچنے کے لیے ادھر اُدھر اوٹوں کا سہارا لینے لگے۔ لیکن غلام حیدر نے اُن کو اس طرح گھیر لیا کہ ہر طرف سے اُن کی پشتیں خالی ہو گئیں۔ اِس سوڑ کو دیکھتے ہوئے آخر جگبیر اور پیت سنگھ نے واہگرو کا نعرہ مارا اور شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے ہجوم میں داخل ہو گئے۔ مگر اُن کو بھی اپنے جوہر دکھانے کی مہلت نہیں ملی۔ گولیوں نے اُنھیں بھی ہرے سنگھ کی طرح اوٹ سے نکلتے ہی زمین بوس کر دیا۔ غلام حیدر کی رائفل ولایتی ہونے کی وجہ سے اُس کی میگزین میں چھ گولیاں موجود تھیں، جنھیں وہ ایک ایک کر کے لگاتار چلا رہا

تھا۔ ایک میگزین ختم ہو جاتی تو وہ اُسے اُتار کر اپنے پیچھے کھڑے جانی چھینبے کی طرف بڑھا دیتا اور بھری ہوئی میگزین اُس سے پکڑ لیتا۔ جانی اگلی میگزین خالی ہونے تک پہلی میگزین میں گولیاں بھر دیتا۔ اِس افراتفری میں سودھا سنگھ کو سنبھلنا تو ایک طرف چارپائی سے بھی اُٹھنے کا موقع نہ مل سکا۔ چارپائی پر بیٹھے ہی غلام حیدر اور امانت خاں کے فائروں اور اپنے بندوں کو گرتے دیکھتا رہا۔ سودھا سنگھ کی چارپائی کو غلام حیدر کے بندے گھیر چکے تھے اور اُس کو اُٹھنے کی نوبت نہیں دی۔ فائر سودھا سنگھ کے کئی بندوں کو لگے، جس کی وجہ سے وہ نیچے گر گر کر لوٹنیاں لینے لگے۔ فائر بہت نزدیک سے کیے گئے تھے۔ اِس لیے بہت موثر ہوئے۔ جب تک غلام حیدر کی رائفل سے گولیاں نکلتی رہتیں، امانت خاں اپنے بندوں کی اوٹ میں جا کر بندوق میں نیا کارتوس بھر لیتا اور گھوڑا دوڑا سودھا سنگھ کے بندوں میں سے کسی ایک کو تاک کر نشانہ مارتا۔ سودھا سنگھ کے بندے بھاگنے لگے تو غلام حیدر نے بھی اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور پیچھے بھاگ کر اُن پر فائر کرنے لگا۔ نعروں کی گونج اور گولیوں کی آگ میں اِتنا شور بلند ہوا کہ انسان تو کیا، برگد کی شاخوں میں پھدکنے والے پرندے بھی ایک ہی دم اُڑ کر دھوپ کی پناہ میں چلے گئے اور دہکتی سفید فضا میں اُڑنے اور شور مچانے لگے۔ اِن پے بہ پے دو رائفلوں کے فائروں میں سودھا سنگھ کے بندے ایک طرف، خود غلام حیدر کے بندوں کو بھی ڈانگ برچھی کے جوہر دکھانے کا موقع نہ مل سکا۔ اِتنا ضرور ہوا غلام حیدر کے بندے دُگنے ہونے کی وجہ سے سودھا سنگھ کے لوگوں کو آگے بڑھنے کی ذرا بھی جرات نہ ہوئی۔ اِس مار دھاڑ میں سودھا سنگھ کے جگرے والے آدمی ہرے سنگھ، جگبیر، بیدا سنگھ اور پیت سنگھ تو پہلے ہی گر چکے تھے۔ باقی کو بھی غلام حیدر اور امانت خاں آگے بڑھ کر اور اُنہیں گھیر گھیر کا فائر مار رہے تھے۔ سودھا سنگھ چارپائی پر صدمے سے گرا ہوا تھا اور اُسے جانی چھینبے نے جُوڑوں سے پکڑ رکھا تھا۔ آپا دھاپی اتنی بڑھی، کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا اور سودھا سنگھ کے دس بندے وہیں ڈھیر ہو گئے۔ دو بندے بھنگ پینے والے بھی اسی فائرنگ میں چل بسے۔ باقی کے پانچ چھ بندے گھوڑوں پر چڑھ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ غلام حیدر نے اُن کا پیچھا کرنا مناسب نہ سمجھا اور واپس بوڑھ کے نیچے سردار سودھا سنگھ کی چارپائی کے پاس آ گیا۔ سودھا سنگھ کا جُوڑا کھل چکا تھا اور چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ لیکن ابھی ہوش حواس ضایع نہیں ہوئے تھے۔ غلام حیدر نے سودھا سنگھ کو جُوڑوں سے پکڑ کر سیدھا کیا اور کہا، سودھے مجھے پہچان، مَیں ہوں شیر حیدر کا بیٹا غلام حیدر، جس کی ملاقات کا تجھے بڑا شوق تھا اور جس کے بندوں کو تو نے ناجائز مار دیا۔ تجھے اپنے ہرے سنگھ، جگبیرے اور دمے پر بڑا مان تھا۔ وہ دیکھ مَیں نے اُن کی چھاتیاں کھول دی ہیں۔ کہاں گئے اُن کی دیگی لوہے والی

برچھیاں اور گنڈاسے ؟اب تُو سمجھ لے، غلام حیدر نے اسی برگد کے نیچے تجھے سزائے موت سنادی ہے۔ اب چل تو بھی اِنہی کے پاس۔ مگر تیرا اور اُن کا ٹھکانا ایک جگہ پر نہیں ہو گا۔ سودھا سنگھ نے آنکھیں اُوپر کر کے غلام حیدر کی طرف دیکھا، جو موت کا فرشتہ بن کر اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ غلام حیدر کا لمبے بَر والا لال رنگ کا لاچا، سفید کُرتہ اور سنہری تلے والا کھُسہ، سودھا سنگھ کی آنکھوں میں تیر بن کر لگا۔ غلام حیدر کی آنکھیں سُرخ انگارا تھیں اور اُن میں خون چڑھا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں رائفل، جس کی نال سے بارود کی بُو دھواں بن کر نکل رہی تھی اور سودھا سنگھ کی ناک کو چڑھ رہی تھی۔ سودھا سنگھ نے غلام حیدر کو آج سے بارہ تیرہ سال پہلے جب وہ یہی دس سال کا ہو گا، اپنے باپ شیر حیدر کے ساتھ تحصیل مکھسر میں ایک پنچایت میں دیکھا تھا۔ اُس وقت تو یہ لڑکیوں کی طرح چٹا گورا، ایک بچو نگڑا سا لگتا تھا، مگر اب کتنا بڑا قاتل ہو گیا تھا۔ سودھا سنگھ نے اِسی حالت میں سوچا، بنتو سچ کہتی تھی، یہ مُسلے بڑے بگھیاڑ ہوتے ہیں۔ اِن کے بچے بھی بگھیاڑ ہوتے ہیں، آخر یہ غلام حیدر مجھے کھا ہی گیا۔ جب سودھا سنگھ کو بچنے کا گمان نہ رہا، تو اُسے پھر بنتو یاد آئی، اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور رینت کور کو دوہتھڑ زور زور سے پیٹتے اور بین کرتے دیکھنے لگا۔ اِسی اثنا میں اُس نے دوبارہ غلام حیدر کی آواز سنی، سودھے، یہ نہ کہنا، مَیں تیری ہی موت بن کر آیا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد عبدل گجر اور شریف بودلہ بھی تیرے ساتھ آملیں گے۔ مَیں نے فیصلہ کر لیا تھا، اِس دفعہ کی پیشیاں فیروز پور کی عدالت کی بجائے تحصیل جلال آباد میں ہی لگا دی جائیں۔ میرے پاس بار بار فیروز پور جا کر تاریخیں بھگتنے کا وقت نہیں۔ اِس لیے میں نے یہیں عدالت لگا کر فیصلہ کر دیا۔ سودھا سنگھ نے غلام حیدر کی بات سنی، تو ایک دم تڑک کر بولا، غلام حیدر، کوئی گل نئیں، سودھا سنگھ مرد ہے، زنانی نہیں کہ تیرے آگے بینتی کرے گا، مار دے گولی۔ پَر گولی سینے پر مارنا اور یاد رکھنا، کسی مرد کو مارا تھا۔ غلام حیدر نے سردار سودھا سنگھ کے دل پر رائفل کی نال رکھ کر گھوڑا دبا دیا۔ غلام حیدر نے میگزین ایک دفعہ پھر بھر لی تھی۔ اِس لیے وہ پوری کی پوری سودھا سنگھ پر خالی کر دی۔ اِس فائر کے چلنے کے ساتھ ہی خون کے تیز فوارے نے پوری چار پائی لال کر دی۔

سودھا سنگھ کو مارنے کے بعد غلام حیدر نے کچھ دیر تک تمام لاشوں کا جائزہ لیا۔ پھر اپنے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور سب ساتھیوں سے کہا، بھائیو، امانت خاں کے علاوہ تم سب سیدھے تھانے گروہرسا جا کر حوالات میں بیٹھ جاؤ اور یہ برچھیاں اور ڈانگیں وہیں تھانے میں جمع کرا دو اور سمجھ لو، تم ہمارے ساتھ آئے ہی نہیں (پھر امانت خاں کی طرف منہ کر کے) مَیں اور امانت، اللہ نے چاہا تو جلد ہی چک میگھا پہنچتے ہیں۔ پھر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ غلام حیدر کے تمام

بندوں نے تڑپتی ہوئی لاشوں کو وہیں چھوڑا، جن میں اب کوئی بھی زندہ نہیں رہا تھا،اور سیدھے تھانہ گروہر سا کی طرف سانڈنیوں اور گھوڑوں پر چڑھ کر چل پڑے۔

ایک گھنٹے بعد جب چک میگھاایک میل رہ گیا تو غلام حیدر نے کہا، میاں امانت، تھوڑی دیر کے لیے گھوڑوں کو آرام دے لیں تاکہ تازہ دم ہو جائیں۔ آگے ہمیں اِس قہر کی گرمی میں مسلسل بھاگنا پڑے گا۔ دونوں شرینہہ کے سائے میں اپنے گھوڑوں کو ٹھہرا کر نیچے اُترے۔ گھوڑوں کو شرینہہ کے نیچے کھڑے ہوئے نلکے سے پانی پلایا، خود پیا، پھر گھوڑوں کو سانس دلانے لگے۔ غلام حیدر نے، کہاامانت خاں گھبرانا نہیں، اپنی رائفل کی نال کو اچھی طرح صاف کر لے۔ مجھے پکا یقین ہے، ابھی سودھا سنگھ کے مرنے کی خبر چک میگھا نہیں پہنچی۔ البتہ تھانہ گروہر سا اِس خبر سے گونج گیا ہو گا۔

امانت خاں بڑی بڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنس پڑااور کہنے لگا، چوہدری غلام حیدر، گھبرانا نامردوں کے حصے میں لکھا گیا ہے۔ مَیں تو پیدا ہوا ہوں تواِنہی چکروں میں پڑ گیا تھا۔ یہ میری پہلی لڑائی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر منڈی گروہر سا میں خبر پہنچ گئی تو مجھے پکا یقین ہے، فرنگیوں کی جیپیں ہمارے کُھرے میں ہوں گی۔ لیکن خطرے امانت کی زندگی کا حصہ ہیں۔ اِتنا کہہ کر امانت خاں اُٹھ کر گھوڑے کو کھولنے لگا۔ غلام حیدر نے بھی اپنے گھوڑے کی لگام شرینہہ کے تنے سے کھول لی۔ اُس کے بعد دونوں چھلانگیں مار کر پر چڑھ گئے اور رائفلیں کاندھوں پر رکھ کر چک میگھا کی طرف چل پڑے۔

چک میگھا تین سو نفر کی آبادی کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جس میں زیادہ بڑے زمیندار نہیں تھے۔ لوگوں کے پاس پچاس پچاس یا سو سو ایکڑ کے قریب رقبہ تھا۔ اُس میں وہ گندم اور چارا کاشت کرتے۔ اِس کے علاوہ ایک دو سیوٗ بیریوں کے باغ بھی تھے۔ چک میگھا کے مغرب کی طرف سے ایک نہر حکومت نے کافی پہلے نکال دی تھی، جو قصور کے مقام سے دریائے ستلج سے نکال کر فیروز پور کو کاٹتی ہوئی بنگلہ فاضلکا تک چلی جاتی۔ چک میگھا کی زمینوں کو اِسی نہر کا پانی سیراب کرتا اور لوگ قدرے خوش حال تھے۔ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے زمین داروں میں عبدل گجر اور شریف بودلہ ہی کچھ بڑے تھے، جن کی زمین ڈھائی تین تین سو کے لگ بھگ تھی۔ یہ زمین غلام حیدر کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی لیکن اِن دونوں میں خود سری اِنھیں کسی نہ کسی دشمنی میں ضرور اُلجھائے رکھتی اور گاؤں میں

بھی اُن کا فساد اپنے سے چھوٹے زمینداروں کے ساتھ چلتا رہتا۔ اکثر کو یہ دونوں مل کر دبائے رکھتے۔ ڈیرہ کافی کھلا تھا۔ جس کے اندر نیم کے دو پیڑ انتہائی گہرا سایہ کیے ہوئے تھے۔ اس سائے میں پانچ چھ چارپایوں پر کچھ لوگ بیٹھے اِدھر اُدھر کی ہانک رہے تھے، جن میں عبدل گجر اور شریف بودلہ صاف نظر آرہے تھے۔ گھوڑوں کے رُکتے ہی لوگوں میں ایک ہڑبونگ مچ گیا۔ وہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے لیکن ڈیرے سے باہر نکل کر بھاگنے کی جرات کسی کو بھی نہیں ہو رہی تھی کیونکہ دروازے پر غلام حیدر اور امانت خاں رائفلیں لیے کھڑے تھے۔ غلام حیدر نے عبدل گجر کو مخاطب کر کے کہا، او حرامی تیار ہو جا، غلام حیدر نیو دراڈا لنے آگیا ہے۔ یہ بھی جان لے، تیرے باپ سودھا سنگھ کو اُس کے گرو جی کے حوالے کر آیا ہوں لیکن افسوس کہ تو اُس کی چتا کی آگ نہ سیک سکے گا، وہ بچارا بھی تیرے سیاپے اور تیری چارپائی کو کندھا دینے جوگا نہیں رہا۔

موت کو اتنا سامنے دیکھ کر عبدل اور شریف کے ایک بار اوسان تو خطا ہو گئے لیکن اُنہوں نے پھر بھی ہمت کر کے اپنے بندوں کو کہا، دُلے کیا دیکھتے ہو؟ پکڑو اِس کو اور ڈانگوں سے کچل دو۔ عبدل کی آواز سُن کر کچھ لوگ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن اتنا وقت کہاں تھا، دونوں نے فائر کھول دیا اور لگاتار گولیاں برسانے لگے۔ جس سے تین چار بندے گر گئے۔ کافی سارے چارپائیوں کے نیچے گھس گئے۔ اِسی اثنا میں موقع پا کر عبدل گجر بھاگنے لگا، اِتنے میں غلام حیدر اور امانت خاں رائفل میں دوبارہ گولیاں بھر چکے تھے۔ اُنہوں نے دوبارہ تاک تاک کے فائر کرنے شروع کر دیے، جو عبدل گجر اور شریف بودلے کے جسموں کو چھیدتے ہوئے نکل گئے اور ڈیرے کا ویہڑا منٹوں میں لہولہان ہو گیا۔ ہر طرف لاشیں اور خون ہی خون پھیل گیا۔ نیم کے درختوں سے پرندے اُڑ اُڑ کر شاخوں کو چھوڑنے لگے۔ باقی لوگ یا تو بھاگ گئے یا چارپائیوں کے نیچے گھسے ہوئے تھے اور کسی کی جرات نہیں تھی کہ سامنے آجائے۔ اِس کے بعد غلام حیدر اور امانت خاں گھوڑے آگے بڑھا کر لاشوں کے قریب آئے اور دوبارہ عبدل اور شریف پر ایک دو دو فائر کیے پھر واپس چل دیے۔ باہر نکلتے ہی دونوں نے گھوڑوں کو ایڑیاں لگا دیں۔ اِدھر چک میگھا میں ہر طرف چیخ چنگھاڑ اور ماتم شروع ہو گئے۔ عبدل گجر اور شریف بودلے کے ساتھ تین اور لاشیں بھی اُوندھے منہ زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا، جیسے لوگوں پر ایک خواب کا سماں گزرا ہو۔

جاری ہے

قسط نمبر 21

(38)

جھنڈووالا میں سردار سودھا سنگھ سمیت ایک دم دس لاشیں پہنچیں تو اندھا کر دینے والا حبس چھا گیا۔ لاشیں دو گڈوں پر لادی ہوئی تھیں۔ گولیوں سے چھلنی اور خون سے لت پت گویا مَسلی جا چکی تھیں۔ لاشوں سے مسلسل رِستے ہوئے خون کی وجہ سے گڈوں کی حالت بھی لاشوں سے بدتر تھی اور گڈوں کے اُوپر جُڑے ہوئے تختوں کے فرش سے لے کر لکڑی کے پہیوں تک خون میں نہا چکے تھے۔ بہت سا خون تختوں پر جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔ لاشیں اگرچہ تازہ تھیں اور قتل ہوئے مشکل سے ہی پانچ یا چھ گھنٹے ہوئے تھے لیکن شدید گرمی کی وجہ سے اُن کی حالت بہت ہی خوفناک اور بدبو پیدا کر دینے والی تھی۔ اُن کو دیکھنا تو الگ بات، قریب جانا بھی اذیت ناک تھا۔ لاشیں پولیس کی نگرانی میں جھنڈووالا پہنچی تھیں، اِس لیے پولیس کی بھی کافی نفری وہاں موجود تھی لیکن وہ اب لا تعلق سی ایک طرف کھڑی تھی، جیسے اُنھیں اس بات سے صرف اتنی غرض ہو کہ جتنی جلدی ہو سکے ان کا کریا کرم ہو جائے اور اس بدبو، پسینے، اور شور شرابے سے جان چھوٹے۔ جھنڈووالا کے مرد تو ایک طرف ہینت کور سمیت وہاں کی تمام عورتیں لاشوں کے اُوپر گری پڑی تھیں اور ایسے ایسے بین اُٹھا رہی تھیں کہ خدا پناہ۔ سر کے بال بکھیر کر اور اُن میں راکھ ڈال کر اپنے آپ کو دوہتھڑ پیٹ رہی تھیں، جیسے چڑیلیں بن گئی ہوں۔ بیہوش ہو کر کبھی نیچے گرتیں کبھی اُوپر اُٹھ کر گڈے پر چڑھنے کی کوشش کرتیں۔ کسی کو جرات نہ تھی، اُن کے قریب جا کر دلاسا ہی دے۔ سب سے بُری حالت ہینت کور کی تھی۔ لوگوں کی بھی زیادہ تر ہمدردیاں سردار سودھا سنگھ اور ہینت کور ہی کے ساتھ تھیں۔
لاشیں کافی دیر اسی طرح گڈوں پر پڑی رہیں۔ مردوں اور عورتوں نے جی بھر کر ماتم اور رونا پیٹنا مچایا۔ مرنے والوں کے اقربا غش کھا کھا کر گرتے تھے جبکہ لوگ بھاگ بھاگ کر اُن کے منہ میں پانی ڈالتے تھے۔ پانی پلانے والے کم تھے اور رونے پیٹنے والے زیادہ کیونکہ پوری دس لاشیں تھیں۔ وہ بھی ساری کی ساری جھنڈووالا کی۔ یہ سب قتل ہونے والے پورے گاؤں کے کسی نہ کسی طرح قریبی رشتہ دار تھے۔ جو آدمی بھی لاشوں کو دیکھتا اور اُن کی بُری حالت پر نظر کرتا تو کلیجہ پھٹ کے رہ جاتا۔ وہیں لاشوں سے لپٹنے کی کوشش کرتا۔ تھوڑی دیر پہلے صبح کے وقت اچھے بھلے شینہہ جوان اور سوہنے سنکھنے تھے اور اب گڈوں پر اس طرح لیٹے تھے جیسے کبھی دھرتی پر چلے پھرے ہی نہ ہوں۔

پولیس نے دیر تک اُنہیں یونہی اُن کے حال پر چھوڑے رکھا اور الگ بیٹھی رہی لیکن جب رونے دھونے اور پیٹ پٹیسے کے عذاب کو دو گھنٹے گزر گئے تو اُنھوں نے مداخلت کر کے لاشیں گڈوں سے اُتارنا شروع کر دیں۔ ینت کور اور دو تین خواتین ویسے بھی روتے پیٹتے غش کھا کر اپنے حواس سے بیگانہ ہو چکی تھیں۔ مردوں کو پیچھے کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ ایک ایک کر کے تمام لاشیں گڈوں سے اُتار کر سودھا سنگھ کی حویلی میں لائی گئیں اور اُنہیں چارپائیوں پر لٹا دیا گیا۔ سودھا سنگھ کو اُسی چارپائی پر لٹایا گیا جو اُس نے خاص اپنے لیے بنوائی تھی اور اُس پر کسی دوسرے کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ جب تک لاشیں اُتاری گئیں، ینت کور کو دوبارہ ہوش آچکا تھا۔ وہ بھاگ کر پھر لاش سے لپٹ گئی۔ سودھا سنگھ کی شکل خوفناک حد تک مسخ ہو چکی تھی اور دیکھنے سے کراہت محسوس ہوتی لیکن ینت کور اُسے اُسی طرح چوم رہی تھی جیسے اُس میں خوبصورتی کے شعلے دہک رہے ہوں۔ پورا دو تین سو بندہ حویلی میں جمع ہو تھا۔ اُن کے علاوہ ارد گرد گاؤں کے لوگ بھی اس ہیبت ناک خبر کو سن کر وہاں آگئے۔ اِس طرح جھنڈو والا میں لوگوں کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ زیادہ تر لوگ لاشوں سے دور حویلی کے باہر ہی مختلف ٹولیوں میں ادھر اُدھر بیٹھے اور کھڑے، اِس واقعے پر طرح طرح کے تبصرے بکھیر رہے تھے۔ اُنہیں اِس سانحے پر دُکھ سے زیادہ تعجب اور غلام حیدر کی جرات پر حیرانی تھی۔ اُن میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کو لاشیں دیکھنے سے دلچسپی نہیں تھی، نہ ہی وہ چاہتے تھے، اُن کا نام گواہی کے طور پر استعمال ہو۔ فقط تماشا دیکھنے میں اُن کی طبیعت کو ایک قسم کا سکون ملتا تھا۔ جھنڈو والا میں اب سکھ، مسلمان سب ہی جمع ہو چکے تھے۔ مسلمان بظاہر مرنے والوں کے لیے چہروں کو سنجیدہ بنا کر پھر رہے تھے لیکن دل ہی دل میں اُن کا ایمان انہیں غلام حیدر کو داد دینے پر اُکسا رہا تھا۔ وہ جی میں بغلیں بجا رہے تھے اور غلام حیدر کی بہادری پر اُن کے سینے فخر سے پھولے ہوئے تھے۔ بعض چپکے چپکے آپس میں اِس بات کر اظہار بھی کر رہے تھے کہ بھائی مُنڈے نے اپنے اُوپر نیو درا نہیں رکھا۔ بدلے کا حساب پورا پورا کھول کے چکایا ہے۔ غلام حیدر آخر شیر حیدر کا بیٹا تھا۔ یہی کچھ ہونا تھا۔ لوہے کی گولیاں مار مار کے بچاروں کے حلیے ہی بگاڑ دیے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے ظلم کی انتہا بُری ہوتی ہے۔ پھر بھی جیسا بھی تھا، میاں سودھا سنگھ تھا اچھا آدمی۔ اپنی رعایا پر بچارا بڑا مہربان تھا۔ غلام حیدر کو حوصلے سے کام لینا چاہیے تھا۔ معاف کر دیتا تو زیادہ اچھا تھا، پر غصہ بُری چیز ہے، بھائی ہوا بُرا۔ بچارے سودھا سنگھ کو کیا پتا تھا، اُس کے دن گنے جا چکے ہیں؟ چلو مولا بھلی کرے، اب بچاروں کی لاشیں خراب ہو رہی ہیں۔ جتنی جلدی ہو سکے، ان کی ہوا کو آگ دے دینی چاہیے۔ غرض یہ کہ مسلمان، جو اِس وقت جھنڈو والا میں کھڑے تھے، وہ بظاہر تو

ہمدردی کے کلمات کہہ رہے تھے لیکن دل میں ایک مسلمان کی بہادری پر خوش ہو رہے تھے۔ اُدھر سکھوں کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی، وہ یا تو کچھ بول نہیں رہے تھے اور زبانوں پر مہریں لگی ہوئی تھیں یا وہ رو رہے تھے، بولیں تو کیا؟ کہ ایک مُسلے نے دس سرداروں کی ایک وقت میں چتا کی راکھ اُڑا دی۔

تھانہ گروہرسا کی پولیس حادثے کے فوراً بعد ہی وہاں پہنچ گئی تھی حتیٰ کہ جھنڈووالا کے لوگوں سے بھی پہلے۔ تھانیدار ضمیر شاہ نے وقوعے کی تمام رپورٹ درج کر کے گواہوں کے بیانات قلم بند کر لیے۔ جس کے مطابق سودھا سنگھ اور اُس کے بندوں پر حملہ کرنے والے صرف دو ہی آدمی تھے، جن کے پاس پکی رائفلیں تھیں اور وہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ مگر اُن کے چہروں پر منڈاسا ہونے کی وجہ سے وہ پہچانے نہیں جا سکے۔ البتہ سودھا سنگھ کے بھاگے ہوئے بندوں کے مطابق، اُن دو کے علاوہ اور بھی کافی سارے آدمی تھے، جن کے پاس ڈانگیں اور برچھیاں تھیں اور وہ بھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ اُنہیں یہ بھی شبہ تھا کہ رائفلوں والے جو دو آمی تھے۔ اُن میں سے ایک غلام حیدر تھا، مگر اُن کی یہ بات پولیس کی سمجھ سے باہر تھی۔ اگر سودھا سنگھ کے اُن گواہوں کے بیانات کو مان لیا جائے، تو مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی بھی مرنے والے اور زخمی ہونے والے یا بھاگنے والے پر تیز دھار لوہے کا ایک بھی زخم موجود نہیں تھا۔ نہ ہی اُن لوگوں کا نام نشان وہاں موجود تھا، جن کے پاس ڈانگیں یا برچھیاں تھیں۔ یا اُن میں سے کیوں کوئی بھی آدمی سودھا سنگھ کے ہاتھوں زخمی نہیں ہوا۔ یہ تمام باتیں جزیات کے ساتھ تھانیدار ضمیر شاہ نے اپنے نقشے اور پہلی انکوائیری میں درج کر لیں۔ باقی پورے کیس کی بنیاد اِسی پہلی انکوائیری پر تھی۔ عصر تک تھانیدار نے واقعے کے شاہدین، جگہ کا نقشہ اور وقوعے کی رپورٹ تیار کر کے لاشیں چھوٹے تھانیدار دیوان سنگھ اور حوالدار چندن لعل سمیت چھ سپاہیوں کی نگرانی میں جھنڈووالا کی طرف روانہ کر دیں اور خود ڈی ایس پی لوئیس صاحب کو رپورٹ کرنے کے لیے جلال آباد روانہ ہو گیا۔

گھوڑے دلکی چال چل رہے تھے۔ غلام حیدر براستہ سلیمانکی حویلی لکھا پہنچا، تو رات کا ایک پہر گزر چکا تھا۔ گرمیوں کی راتیں مختصر اور نہایت گرم ہونے کی وجہ سے لوگ اتنی جلدی چارپائیوں پر کم ہی جاتے ہیں۔ غلام حیدر کے اس پورے علاقے میں کئی رشتے دار اور دوست پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن وہ کہیں بھی قیام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا

تھا، واقعے کے فوری بعد مشرقی اور وسطی پنجاب کے تمام تھانوں میں اُس کے متعلق اطلاع کر دی گئی ہو گی۔ اِس لیے وہ کوئی بھی خطرہ فی الحال مول نہیں لینا چاہتا تھا اور کسی بھی ایسی جگہ نہیں رکنا چاہتا تھا، جہاں اُس کی رشتہ داری یا دوستی کا لوگوں کو کچھ پتا تھا۔ غلام حیدر نے چلتے چلتے امانت خاں سے کہا، میاں امانت، تم نے جو آج میرے لیے کیا ہے، اُس کی قیمت تو میں کسی بھی طرح ادا نہیں کر سکتا لیکن میں چاہتا ہوں، اِس دوستی کے عوض تم سے کچھ نہ کچھ ضرور سلوک کروں۔ مجھے نہیں پتا، کتنا عرصہ اب مسافرت میں گزارنا پڑے لیکن میرا وعدہ ہے، اِس غربت کے بعد میں تمھیں اپنا سگا بھائی بنا کر رکھوں گا۔ مگر اس وقت میرا خیال ہے، ہمیں اکٹھے نہیں رہنا چاہیے اور الگ الگ ہو جائیں۔ یہ کہہ کر غلام حیدر نے اپنی کمر سے بندھی ہوئی ایک بھاری تھیلی کھولی اور چلتے چلتے ہی اُسے امانت خاں کی طرف بڑھا دیا اور کہا، اِس میں ایک پاؤ سونا ہے۔ یہ میری طرف سے تحفہ سمجھو اور اِسی وقت سیدھے اپنے علاقے میں چلے جاؤ۔

امانت خاں نے تھیلی غلام حیدر سے پکڑ لی اور کہا، چوہدری غلام حیدر، میں تیرے ساتھ اِن پیسوں کے لالچ میں نہیں آیا تھا لیکن یہ سونا مَیں ضرور اپنے پاس رکھوں گا، اُس وقت تک جب تم دوبارہ نہیں ملتے۔ یہ سونا میرے پاس تمھاری امانت ہے۔ اگر مشکل پڑی اور اِن کی ضرورت ہوئی تو اپنی امانت مجھ سے آ کر لے لینا۔ ملک بہزاد، میرا ماما ہے اور اُس کے مجھ پر ہزاروں احسان ہیں۔ مَیں یہ کام پیسوں کے لیے نہیں کرتا۔ اِس کے بعد دونوں گلے ملے اور دونوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں مخالف سمت میں موڑ دیں۔ غلام حیدر نے اپنا گھوڑا نواب سرفراز کی حویلی کی طرف دوڑا دیا، جہاں کچھ دن آرام کرنے کے بعد منصوبے کے مطابق اُسے نواب افتخار کے ماموں کے پاس کشمیر جا کر پتا نہیں کتنے برس تک روپوش ہونا تھا۔ تاکہ وقت کا انتظار کیا جا سکے۔

\-\-\-\-\-\-

گرمی کی وجہ سے لاشوں کو زیادہ دیر تک نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی تمام قانونی کارروائی مکمل کی جا چکی تھی۔ اِس لیے پولیس چاہتی تھی کہ لاشوں کو اپنی نگرانی میں ٹھکانے لگا دے تاکہ لاشیں خراب ہو کر بدبو نہ مارنے لگ جائیں۔ اب رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ اِس سخت گرمی میں اِتنا وقت بہت زیادہ تھا۔ ورنہ مزید کوفت پھیل جاتی۔ خون، بدبو اور لوگوں کا ہجوم اس میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ لوگوں نے ایک ہی وقت میں اتنی لاشیں پہلے کبھی نہیں دیکھی

تھیں، نہ اِس طرح کا قہر پہلے نازل ہوا تھا۔ اِس لیے ہر کوئی دور دور سے بھاگا ہوا آیا اور یہاں جمع ہو گیا تھا۔
سر دار سودھا سنگھ کے رشتے داروں کے بھی سینکڑوں لوگ تھے، جو لاشوں کو دیکھ کر جذباتی ہو رہے تھے۔ اِس ساری آنے والی خرابی کو دیکھتے ہوئے پولیس نے اپنا کردار شروع کر دیا اور فیصلہ کیا کہ اب چتاؤں کو آگ دینے اور راکھ بنانے میں دیر نہ کی جائے۔ چنانچہ رات آٹھ بجے کے قریب سر دار سودھا سنگھ، دما سنگھ، جگبیر، بیت سنگھ، بیدا سنگھ، ہرے سنگھ، کڑے مان، لہنگا سئیو اور دوسرے متروں کی لاشوں کو شمشان گھاٹ میں لے جا کے آگ اور لکڑیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ سر دار سودھا سنگھ کا تین سالہ بیٹا سر داو جیوا سنگھ، جسے ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا تھا کہ کون سی قیامت اُس کے سر سے گزر چکی ہے، کے ہاتھ میں جلتی ہوئی لام دے دی گئی تا کہ وہ سر دار سودھا سنگھ کے گولیوں سے چھلنی بدن کو دکھا دے، جو سوکھی لکڑیوں کے درمیان بے خبر پڑا تھا۔

اِدھر سر دار سودھا سنگھ کی لاش کا کریا کرم ہونے لگا، اُدھر لوئیس صاحب پولیس کو لے کر اپنی کارروائی کرنے کے لیے جلال آباد میں چوہدری غلام حیدر کی حویلی پر چڑھ دوڑا۔ چالیس سنتریوں اور تھانیداروں سمیت گھوڑوں نے پوری حویلی کو گھیرے میں لے کر اُس کا اپریشن شروع کر دیا۔ مگر وہاں دو ملازموں کے علاوہ کوئی موجود نہ تھا، جو حویلی کا دروازہ بند کرنے اور کھولنے کے لیے موجود تھے۔ لوئیس نے دونوں ملازم حراست میں لے کر کونے کونے کی تلاشی شروع کر دی۔ لیکن وہاں کچھ ہوتا تو ملتا۔ رات بارہ بجے تک لالٹینوں کی روشنی میں تلاشی جاری رہی۔ مگر ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ بالآخر لوئیس صاحب نے وہاں دو سنتری متعین کر کے اور دونوں ملازموں کو، جنہیں خود بھی کسی بات کا پتا نہیں تھا، اُنہیں اٹھا کر اپنے دفتر لے آیا اور باقی کارروائی اگلے دن پر ڈال دی۔

لوئیس صاحب کے لیے معاملہ بہت گھمبیر ہو چکا تھا۔ اُسے یہ توقع ہر گز نہیں تھی کہ غلام حیدر اتنا بڑا قدم اُٹھا لے گا اور اِس میں اپنے نفع نقصان کو بالائے طاق رکھ دے گا۔ اِدھر اُسے ولیم صاحب سے انتہائی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جسے اُس نے مطمئن رہنے کا سر ٹیفیکیٹ عطا کر دیا تھا۔ اب مجرم موجود نہیں تھا، جسے گرفتار کر لیا جاتا۔ جبکہ اُس کے تمام آدمی تھانہ گرو ہرسا کی حوالات میں ناجائز اسلحہ کے جرم میں بند پڑے تھے۔ اُن کا موقعہ واردات پر موجود ہونا ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ پورا تھانہ گواہی دے رہا تھا کہ اِنہیں دو دن پہلے ناجائز اسلحے اور ایک دوسرے گروہ کے ساتھ دنگا کرنے کے جرم میں گرفتار کر کے فیروز پور عدالت میں پیش کرنے کے لیے چالان تیار کیا جا چکا ہے اور واقعہ کے

عین روز اُنہیں پولیس کی حراست میں عدالت لے جایا جارہا تھا کہ سردار سودھا سنگھ، شریف بودلہ، عبدل گجر اور دوسرے کئی آدمیوں کا قتل ہو گیا۔ لوئیس صاحب کو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ ضمیر شاہ کی انکوائری رپورٹ کے مطابق ایک یا دو بندے کس طرح اِتنے قتل اِس قدر قلیل وقت میں کر سکتے ہیں؟ مگر وہ اُن بندوں کو وہاں کیسے ثابت کرے؟ جن کی خبر سردار سودھا سنگھ کے بھاگنے والے بندے دے چکے تھے۔ دوسری طرف سردار دیوے کھوہ کے مالک کے بیان کے مطابق بھی دو بندے تھے، جن کو وہ نہیں پہچانتا تھا۔ اُس نے بس اتنا دیکھا تھا کہ اُنہی دونوں نے ریفلوں سے فائرنگ کر کے اِن سب کو قتل کیا تھا اور اُن کے چہرے کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اِس لیے پہچانے نہیں گئے۔ اِس بات کی تصدیق اِس سے بھی ہوتی تھی کہ عبدل گجر اور شریف بودلے کے قتل کے گواہوں نے بھی دو بندوں ہی کی تصدیق کی تھی۔ لوئیس صاحب جانتا تھا، کہیں دال میں کالا ضرور ہے۔ لیکن اتنی جلدی پتہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ مگر اُسے پوری تحقیق کرنے کے لیے وقت بھی ملتا ہے کہ نہیں؟ اب اِس کا خطرہ موجود تھا۔ کیونکہ ولیم اب کسی بھی طرح کا رسک لینے کے لیے تیار نہیں ہو گا اور اُس کے خلاف کاروائی کر دے گا۔

تفتیش کو تیسرا دن تھا۔ کوئی سرا ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ اُدھر ولیم شادی میں مصروف تھا۔ اور اِس وقت اُسے اِن کاموں میں اُلجھانا نامناسب ہی نہیں، اصولوں کے بھی خلاف تھا۔ اگرچہ لوئیس صاحب نے فیروزپور جا کر ساری بات ضلع پولیس افسر کے سامنے رکھ دی تھی اور اپنی پوزیشن واضح کر دی تھی۔ لیکن معاملہ اُلجھتا ہی جا رہا تھا۔ البتہ غلام حیدر کی پوری زمین اور جائداد قبضہ میں لے لی گئی اور تمام لوگوں کو خبردار کر دیا کہ جو اِس معاملے میں ملوث ہے، وہ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے ورنہ گورنمنٹ انتہائی سخت ایکشن لے گی۔ لیکن اِس کی نوبت نہیں آئی۔ کیونکہ اِس ہولناک واقعہ کی اطلاع جب ولیم صاحب کو پہنچی تو اُنہوں نے ڈپٹی کمشنر صاحب کو صاف لکھ دیا کہ یہ پولیس افسر اُسے نہیں چاہیے۔ یوں ولیم کے تقاضے پر ڈی ایس پی جلال آباد مسٹر لوئیس صاحب کو دس دن کے اندر ہی تبدیل کر کے لدھیانے بھیج دیا گیا اور اُن کی جگہ لاہور سے تحصیل پولیس آفیسر مسٹر جان میلکم کو جلال آباد تعینات کر دیا گیا۔ جس کی سفارش کچھ دن پہلے سر شاہنواز نواب ممدوٹ نے بھی کی تھی۔ جان میلکم کے آنے کے بعد کیس کی تحقیق نئے سرے سے شروع ہو گئی۔ اُنہوں نے چند دنوں میں سودھا سنگھ کے قتل کے متعلق اپنی پچاس صفحات کی رپورٹ تیار کر لی۔ اُس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

سودھا سنگھ اور شیر حیدر کے درمیان دیرینہ دشمنی چلی آرہی تھی، جو دونوں طرف سے ایک دوسرے کے معمولی نقصان کرنے پر منحصر تھی۔ یہاں تک کہ شیر حیدر فوت ہو گیا۔ اُس کا بیٹا غلام حیدر تعلیم کے سلسلے میں اکثر لاہور میں رہتا تھا اور اُس کے وہاں کافی بااثر دوست تھے، جن میں کچھ انگریز بھی تھے اور کچھ نواب حضرات۔ اِن لوگوں میں اُٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے اُس کے اندر ایک قسم کی خود سری پیدا ہو گئی۔ جس کو ہوا اُس وقت ملی جب سودھا سنگھ نے شیر حیدر کے مرنے کے بعد فوراً اُس کی زمینوں پر حملہ کر کے ایک بندہ قتل کر دیا اور بیس ایکڑ مونگی کی فصل تباہ کر دی۔ اِس حملے کے بعد پولیس کی سُستی نے سودھا سنگھ کی مزید ہمت بندھائی۔ اُس نے شیر حیدر کے مزید دو دشمنوں عبدل گجر اور شریف بودلہ کے ساتھ مل کر ایک اور حملہ شاہ پور پر کر دیا، جو غلام حیدر کا آبائی گاؤں تھا۔ اِس میں غلام حیدر کے مزید تین بندے مارے گئے اور بہت سی بھینسیں لوٹ کر لے گئے۔ اسی بنا پر غلام حیدر نے جوابی حملے کا منصوبہ تیار کیا، جو انتہائی کامیاب رہا۔ لیکن اُس میں غلام حیدر نے اپنے بندوں کو استعمال نہیں کیا بلکہ ایک اور آدمی کا سہارا لیا، جس کا ابھی تک کوئی نام و نشان نہیں ملا۔ اُس کا پتا صرف غلام حیدر سے چل سکتا ہے لیکن وہ تا حال فرار ہے۔ پولیس اُسے گرفتار کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اُمید کی جاتی ہے جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔ لیکن بعض اطلاعات کے مطابق وہ ایران نکل گیا ہے۔

(39)

مولوی کرامت پچھلے دو ڈھائی مہینوں سے اپنی گدھی پر گاؤں گاؤں اور بستی بستی پھرتا رہا۔ اِس سفر اور سفر میں مختلف لوگوں سے ملاقات میں مولوی کرامت کو بات چیت کرنے اور کام کرنے میں بہت تجربہ حاصل ہو گیا۔ اُس کی گدھی ایسی سواری تھی، جسے بغیر کسی خرچے کے جہاں چاہتا، لے کر نکل جاتا۔ راستے میں کسی نہ کسی کھیت سے اُس کے لیے مفت میں چارا بھی حاصل کر لیتا۔ کبھی تین تین دن واپس نہ پلٹتا، جہاں رات پڑتی سو جاتا اور لوگوں کو تعلیم کے فوائد سمجھانے اور اپنے بچوں کو سکول میں داخل کرنے کے متعلق ایسی ایسی دلیلیں پیش کرتا کہ وہ فوراً تیار ہو جاتے۔ حتیٰ کہ اب ان بچوں کی تعداد ہندو اور سکھوں کے بچوں کے نزدیک پہنچنے لگی تھی۔ مولوی کرامت نے سوچ لیا تھا، اگر اُسے کچھ عرصہ اسی طرح کام کرنے دیا جائے تو وہ یہ تعداد آیندہ سال تک اِن سب سے زیادہ کر دے گا۔ اس کام میں مولوی کرامت کو سہولت بھی بہت تھی۔ نہ کوئی ڈیوٹی کا مقررہ وقت تھا اور نہ کسی کی پابندی تھی۔ کام

کے سلسلے میں بات یہاں تک پہنچ گئی کہ جلال آباد سے دس دس میل دور سے بھی لڑکے سکول آنے کے لیے تیار ہو گئے۔

آج مولوی کرامت نے سکول میں حاضری دینا تھی۔ ایک ہفتے میں مولوی کرامت جتنے بچوں کو سکول میں داخل کرواتا تھا، ہفتے کے آخری دن اُنھیں سکول میں لا کر پکا اندراج کروا دیتا۔ اُس کے بعد وہ پڑھنا شروع کر دیتے۔ آج مولوی کرامت کے بستی جنڈوکا کے سولہ بچے ساتھ لے کر آیا تھا، جن کی عمر آٹھ سال سے لے کر بارہ سال تک تھی۔ مولوی کرامت انھیں نائب ہیڈ منشی کے حوالے کر کے، جب ہیڈ منشی کو سلام کرنے اُن کے کمرے میں پہنچا، تو وہ کمرے میں موجود نہیں تھا۔ البتہ اُس کے بابو نے مولوی کرامت کو اطلاع دی کہ اُسے تعلیم افسر تُلسی داس اپنے دفتر میں یاد فرماتے ہیں۔ مولوی کرامت اُسی گدھی پر سوار ہو کر ڈرتے ڈرتے تحصیل ایجوکیشن افسر کے دفتر پہنچا کہ نجانے حاکموں نے اُسے کیوں بلایا ہے؟ اللہ جانے وہ اُس کی خدمت سے خوش ہوئے ہیں کہ ناراض۔ اور اب نوکری برقرار رہ سکے گی کہ نہیں؟ پچھلے تین مہینے کی تنخواہ مولوی صاحب کو مل چکی تھی، جسے وہ جودھاپور میں اپنی بیوی شریفاں کے حوالے کر آیا تھا۔ بلکہ اب جلال آباد میں گھر کے لیے اپنی جگہ بھی مول لینے کی سوچ رہا تھا۔ وہ پہلا مہینہ غلام حیدر کی حویلی میں عزت سے رہ رہا تھا لیکن وہاں انتہائی خوف میں مبتلا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں اور سُرخ انگارہ آنکھوں والے گبرو جوانوں سے حویلی بھری رہتی تھی، جن کو دیکھنے ہی سے اوسان خطا ہو جاتے۔ اس کے ساتھ، ہر طرف ڈانگوں، برچھیوں اور تلواروں کا معاملہ تھا اور لڑائی بھڑائی کی باتیں، جن سے مولوی کرامت کوسوں دور بھاگتا۔ وہ سوچتا تھا، جانے کس وقت حملہ ہو جائے اور وہ اپنے ٹالے کی طرح مفت میں مارا جائے۔ اس کے علاوہ نہ کسی کو نماز روزے سے غرض تھی اور نہ اس بات سے کہ اُن کے درمیان ایک مولوی رہ رہا ہے۔ چنانچہ وہ پہلی تنخواہ ملنے کے فوراً بعد وہاں سے اُٹھ کر چار روپے کرایہ کے ایک کمرے میں اُٹھ آیا تھا اور شکر خدا کا یہ جگہ اُس نے سودھا سنگھ کے قتل سے پہلے ہی تبدیل کر لی تھی ورنہ مفت میں مارا جاتا۔ اب ایک مصیبت جو سب سے اہم تھی، مولوی کرامت اپنی بیوی شریفاں کے بغیر آج تک کہیں ایک رات بھی نہیں رہا تھا اور اب اُسے پورے تین مہینے ہو گئے تھے۔ مولوی نے سوچا تھا، اُس کی تین مہینوں کی تنخواہ اور جو قصور سے آتے ہوئے کچھ پیسے جمع ہو گئے تھے، اُن سب کو ملا کر جلال آباد کے اندر نہ سہی، شہر کے مضاف میں تو پانچ چھ مرلے کی جگہ مل ہی سکتی ہے۔ جہاں باقی روپوں کا ایک دو کمرے کا مکان بن جاتا۔ اُس کے لیے مولوی کرامت نے سوچ رکھا تھا، کچھ پیسے وہ رحمت بی بی سے لے گا۔ لیکن اب

اس کھتری افسر نے اُسے کیوں بلایا تھا؟ اگر اُس نے نوکری ختم کردی تو سارا معاملہ ہی چوپٹ ہو جائے گا۔ اُدھر راڑے والوں نے بھی کوئی نہ کوئی مولوی رکھ لیا ہوگا۔ ہاتھ سے مسجد بھی جائے گی، حالانکہ وہ کام تو اپنی بساط سے زیادہ ہی کر رہا تھا۔ اُس کے لیے اُسے دوسرے ملاؤں اور مسلمانوں سے غدار، کرسٹان اور کس کس قسم کے طعنے سننے پڑتے ہیں۔ مولوی کرامت نے سوچا، کیا ہی اچھا ہو، اگر گورنمنٹ اُسے آرام سے تنخواہ دیے جائے اور وہ کام کیے جائے۔ لیکن یہ بیچ میں جو بابو لوگ ہیں، یہ بہت چالاک ہوتے ہیں۔ بُری بُری باتیں کر کے افسروں کا دماغ خراب کر ہی دیتے ہیں اور یہ افسر بھی کتنے معصوم ہوتے ہیں، جو بابوؤں کی ایسی ویسی باتوں میں آکر غریبوں کی نوکری چھین لیتے ہیں۔ اس سے تو اچھا ہے، پہلے نوکری ہی نہ دیں۔ مولوی کرامت کسی انجانے خوف میں یہ سوچتا جاتا تھا اور چلا جاتا تھا۔

سچ بات تو یہ تھی، مولوی کرامت کو صرف اب تحصیل کے سب سے بڑے فرنگی افسر ولیم صاحب سے ہی ملنا اچھا لگتا تھا۔ کتنا نیک دل افسر ہے، جس نے بغیر سفارش کے، اُسے اتنی بڑی نوکری دے دی لیکن نجانے وہ ایک دفعہ اُسے نوکری دے کر بھول کیوں گیا تھا؟ دوبارہ کبھی بلایا ہی نہیں اور نہ کوئی حساب کتاب لیا۔ مولوی کرامت جانتا تھا، دوسرے منشی اور تعلیم کا تحصیل افسر اُس کے کام سے جلتے تھے اور کسی بھی وقت اُسے نوکری سے نکلوا سکتے تھے۔ اِسی اندیشے کے تحت اُس نے پہلے بھی ایک دو دفعہ بڑے صاحب سے ملاقات کرنے کی کوشش کی لیکن اُسے صاحب کے کمرے میں داخل ہی نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ بلکہ ایک مرتبہ جب صاحب اپنے دفتر سے نکل کر بنگلے کی طرف جا رہا تھا اور وہ صاحب کو اپنا چہرہ دکھانے کے لیے دوپہر سے دفتر کی راہ داری کے باہر کھڑا تھا۔ اُس وقت بھی نہ صاحب نے اُس پر توجہ دی تھی اور نہ ہی کسی نے اُسے آگے ہونے کے لیے رستہ دیا تھا۔ سارے بابوؤں اور پولیس والوں نے رستہ ہی روک لیا۔ پھر بھی اُسے صاحب کی نیک دلی پر پورا یقین تھا لیکن تعلیم افسر تو ایک کھتری ہی تھا، جو شکل ہی سے مسلمانوں کا دشمن نظر آتا تھا۔

یہ سب سوچتا ہوا مولوی کرامت تُلسی داس کے کمرے کے باہر پہنچا تو تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ باہر ایک بنچ پر ہی بیٹھ گیا، یہاں تک کہ اپنے آنے کا اندر پیغام بھی نہ بھیجا۔ نہ ہی کسی نے مولوی کرامت سے پوچھا، کہ وہ کس لیے آیا ہے؟ مولوی کرامت کو بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو گئی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تو ایک بابو نے بالآخر مولوی سے پوچھ ہی

لیا کہ وہ کون ہے اور کس لیے آیا ہے ؟اُس کے جواب نے مولوی کرامت نے وہ رقعہ نکال کر بابو کو تھما دیا، جو اُسے صبح سکول میں حاضری کے وقت نائب ہیڈ منشی ہری چند نے دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ خط تعلیم افسر کے دفتر سے آیا ہے اور آپ کو حاضر ہونے کو کہا ہے۔ بابو نے رقعہ دیکھ کر اپنی عینک، جو ایک میلی ڈوری سے باندھ کر گلے سے لٹکائی ہوئی تھی، اُٹھا کر آنکھوں پر لگائی اور رقعہ پڑھنے لگا۔ رقعہ پڑھ کر ایک نظر اُس نے مولوی کرامت کو دیکھا اور بولا، مولوی صاحب، کچھ دیر یہیں بیٹھو۔ وہ رقعہ لے کر تُلسی داس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ مولوی کرامت دوبارہ اُسی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس گرمی کے موسم میں صبح سے دوپہر تک مولوی کرامت کا بھوکا پیاسا بیٹھنا ایک عذاب سے کم نہ تھا۔ لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات والا معاملہ تھا۔ ابھی مولوی کرامت سوچ رہا تھا، خدا جانے کب اِس ہندو کھتری کے ہاں پیشی ہو گی کہ اُسی بابو کی آواز مولوی کرامت کے کان میں پڑی، مولوی صاحب، اندر چلو صاحب نے بلایا ہے۔ مولوی کرامت اُٹھا اور جلدی سے سورہ الناس پڑھتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ سورہ پڑھ کر دل ہی دل میں میز کی دوسری طرف بیٹھے تلسی داس کے اُوپر پھونک مار دی۔ مولوی کو دیکھتے ہی تُلسی داس ہلکے سے مسکرایا اور ایک کُرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا، آؤ مولوی کرامت بیٹھو۔

مولوی کرامت جھجکتے ہوئے کُرسی پر بیٹھ گیا اور ٹک ٹک تُلسی داس کی طرف دیکھنے لگا، لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا فقط سلام کیا۔ سلام کے جواب میں تلسی داس نے رام رام کہا اور بولا، مولوی صاحب کیسا چل رہا ہے کام؟

جی سرکار کی مہربانی سے میں تو اپنی محنت کر رہا ہوں، باقی اللہ مالک ہے، مولوی کرامت بولا، سو بچوں کو سکول میں داخل کروا چکا ہوں، صرف دو مہینوں میں۔ میں تو جی مسجدوں میں جا کر اور لوگوں کے گھر گھر جا کر بڑی محنت سے کام کر رہا ہوں۔ لوگ حجتیں بہت کرتے ہیں۔ پر مَیں بھی اُن کو حدیثیں سنا سنا کر قائل کر ہی لیتا ہوں۔

مولوی صاحب، آپ کو زیادہ مشکل تو نہیں پیش آتی اس معاملے میں؟ تُلسی داس نے مولوی کرامت کی طرف دیکھ کر اور اپنی چُندیا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مربیانہ سے انداز میں پوچھا۔

مہاراج،آپ کی دیا سے کچھ مشکل نہیں، مولوی نے داڑھی کھجاتے ہوئے جواب دیا،اگر سرکار تنخواہ دیتی ہے تو کام تو ایمانداری سے کرنا چاہیے۔ بس یہاں ابھی اکیلا ہوں۔ جودھاپور روز جایا نہیں جاتا، سوچتا ہوں کسی طرح بال بچوں کو یہاں لے ہی آؤں پھر بے فکری سے کام کروں۔

تُلسی داس نے مولوی کرامت کی بات سن کر کہا، مولوی صاحب کمشنر صاحب کو آپ کے کام کی رپورٹ کردی گئی تھی۔ وہ آپ کے کام سے بہت خوش ہیں۔ اسی خوشی میں آپ کے لیے ایک حکم فرمایا ہے، جس کے تحت تحصیل کمپلیکس میں آپ کے رہنے کے لیے ایک گھر دے دیا جائے گا، جہاں تم اپنے بیوی بچوں کو لا سکتے ہو۔ اب تم گورنمنٹ کے پکے ملازم ہو اور بے فکری سے کام کرو۔ مکان تم کو جب تک دیا جائے گا، جب تک گورنمنٹ کے ملازم رہو گے۔ اُس میں ہر سہولت موجود ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تم پر ایک ذمہ داری اور بھی بڑھ گئی ہے۔

وہ کیا سرکار؟ مولوی کرامت خوشی سے کانپتے ہوئے بولا، مہاراج آپ جو کام بھی دیں گے , میں حاضر ہوں۔ سرکار مجھ پر اتنی مہربان ہے تو میں کیسے اُن کے کہے پر عمل نہ کروں گا۔

مولوی صاحب، اب آپ تین دن سکول میں پڑھائیں گے اور تین دن جلال آباد سے باہر جاکر دوسرے گاؤں کے لوگوں کو اس کام پر اُکسائیں گے۔ اس کام کے لیے آپ مزید چار ایسے مولوی ڈھونڈیں، جن کو گورنمنٹ آپ ہی کی طرح تنخواہ دے گی، لیکن اُن کی نگرانی تم خود کرو گے اور ہمیں رپورٹ کیا کرو گے۔ اس معاملے میں تم کو اختیار ہے، جو مولوی مناسب سمجھو، انہیں گورنمنٹ میں ملازمت دلوا سکتے ہو، لیکن یہ کام جلدی ہونا چاہیے۔ ان چھ مہینوں میں ہم سکولوں کی تعداد دُگنی کر رہے ہیں۔ جس کے لیے کم از کم مسلمان بچوں کی تعداد تین سو ہو جانی چاہیے۔ اس کے بعد تُلسی داس نے اُسی بابو کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہا، میکارام، یہ مولوی صاحب وہی ہیں، جن کے لیے مکان کا بندوبست کیا گیا ہے۔ آپ اُس کی کنجیاں مولوی صاحب کو دے دیں۔ اِس کے بعد تُلسی داس نے اُٹھ کر مولوی کرامت کو ہاتھ جوڑ کر رام رام کہا۔ جس کا مطلب تھا کہ مولوی کرامت اب جا سکتا ہے۔

میکارام نے کہا، آیئے مولوی صاحب اور آگے چل دیا۔ باہر نکل کر اُس نے میز کی دراز سے کچھ چابیاں نکالیں اور ایک چوکیدار کو آواز دی، جو تیس سال کا مسلمان لڑکا ہی تھا۔ اُسے کچھ سمجھاتے ہوئے کہا، میاں دُلّے، یہ کنجیاں لے جاو اور

کونے والے سیتارام کے سامنے والا گھر مولوی صاحب کو دکھاآؤ۔ اُس کے بعد مولوی صاحب سے کہا، جائیے مولوی صاحب، یہ آپ کو گھر دکھاآتا ہے۔ پھر مسکرا کر آنکھ دباتے ہوئے دوبارہ بولا، کوئی بڑی سفارش ڈھونڈی ہے مولوی جی آپ نے۔ کبھی ہماری بھی سفارش کروادیں۔

مولوی کو اپنے اُوپر گورنمنٹ کی اتنی نوازشات کی سمجھ نہیں آرہی تھیں۔ اُسے بس اتنا پتا تھا، اُس نے کوئی بہت بڑا نیکی کا کام کر دیا ہے، جس کا خدا اُس کو یہ صلہ دے رہا ہے۔ وہ بھی کرسٹان اور ہندو بنیے کے ہاتھوں۔ مولوی کرامت نے سوچا، ایسا تو پہلے بھی ہوا ہے، خدا اپنے بندوں کو دشمنوں کے ہاتھوں سے ہی فایدہ دلواتا ہے۔ جس کی مثال موسیٰ اور فرعون کے باب میں صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ مکان اور ترقی حاصل ہونے کی اتنی بڑی خوشی مولوی صاحب کے قدموں کو اُڑائے اُڑا رہی تھی۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا، ابھی جودھا پور پہنچ کر یہ خبر شریفاں کو دے۔ لیکن جودھا پور جلال آباد سے پورے اٹھارہ کوس ہونے کی وجہ سے وہاں جانے سے قاصر تھا۔ جبکہ جلال آباد میں مولوی کرامت کا کوئی رشتے دار نہیں تھا، جس کو یہ خبر سناتا۔

کچھ دیر پیدل چلنے کے بعد ایک چوڑی سی گلی کے آخری کونے پر پہنچ کر، جہاں سے آگے یہ گلی بند ہو جاتی تھی، ایک مکان کے سامنے دُلا چپڑاسی رُک گیا اور بولا، لایے مولوی صاحب، پانچ روپے مٹھائی کے اور یہ کنجیاں لے کر دروازہ کھول لیں۔ مولوی کرامت نے ایک دفعہ گھر کو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ اِتنا اچھا اور پکا گھر تو اُس نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا لیکن پانچ روپے کا سُن کر مولوی کو غصہ آگیا۔ مولوی کرامت نے کہا، بھائی پانچ روپے کس بات کے، ؟ مجھے تو بڑے بابو صاحب نے کہا تھا کہ گھر مفت ملے گا۔
دُلے نے عورتوں کی سی طعنہ زنی کرتے ہوئے کہا، واہ مولوی صاحب بھلا اس گھر کی قیمت پانچ روپے ہے؟ یہ پانچ روپے تو مٹھائی کی قیمت ہے۔ گھر تو آپ کو مفت ہی ملا ہے، میکارام نے کہا تھا، مولوی صاحب سے مٹھائی کے پانچ روپے لیے بغیر گھر کی کنجیاں نہیں دینی۔ یہ پیسے کوئی میں نے تو نہیں رکھنے۔ آپ شکر کریں، آپ کو گھر مل رہا ہے۔ باقی بھلا کسی کو اس طرح کبھی گھر ملا ہے؟ کنجیاں تو تب ہی ملیں گی جب پانچ روپے دوگے، ورنہ اور بہت سے لوگ اس گھر کو لینے والے موجود ہیں، جو پچاس پچاس دینے کو بھی تیار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ بڑے افسر کے پاس بڑی سفارش پہنچ جائے اور وہ یہ گھر کسی دوسرے کے نام جاری کرنے کا حکم فرمادے۔ پھر آپ منہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔ وہ تو میں نے

بھی اپنے تُلسی داس صاحب سے آپ کی سفارش کی تھی، جس کی وجہ سے یہ مکان آپ کے نام الاٹ ہو گیا۔ اگر آپ کی نہیں مرضی تو واپس چلے چلتے ہیں۔ جا کر میکا رام کو کہ دوں گا، مولوی صاحب کو آپ کی شرط منظور نہیں۔

مولوی کرامت دُلے کی بات سُن کر خاموش سا ہو گیا اور سوچنے لگا، اگر مَیں نے پیسے نہ دیے تو شاید یہ گھر نہ ملے۔ کیوں کہ جب نوکری ملی تھی تب بھی پانچ روپے مٹھائی کے دیے ہی تھے پھر مَیں فایدے میں ہی رہا۔ جب مَیں وہ پانچ روپے مٹھائی کے بھول چکا ہوں تو یہ پانچ روپے بھی دے ہی دوں۔ کہیں بڑے صاحب کے سامنے میری بُرائی کر کے یہ بھی نہ لینے دیں۔ یہ سوچتے ہوئے مولوی صاحب نے اپنی ناف سے بندھی روپوں کی تھیلی کھولی اور گن کے پورے پانچ روپے کے سکے دُلے کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اتنے زیادہ پیسے دیکھ کر دُلے کی آنکھیں چمک گئیں، تیر عین نشانے پر بیٹھا تھا۔ اُس نے جلدی سے چابیاں نکال کر مولوی کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

گھر ملنے کے دوسرے دن بعد ہی مولوی کرامت جودھا پور گیا۔ پھر تیسرے دن ہی جو کچھ مال اسباب تھا، لپیٹا، شریفاں، فضل دین، رحمت بی بی اور اُس کی یتیم بیٹی کو لے کر جلال آباد کے نئے گھر میں آن داخل ہوا۔ مولوی کرامت کی صرف تین مہینوں کی محنت نے یہ رنگ نکالا تھا کہ جلال آباد کے مرکزی اسکول میں ہی مسلمان بچوں کی تعداد پندرہ سے بڑھ کر ایک سو دس ہو گئی تھی۔ جس کا صلہ مولوی صاحب کو یہ ملا کہ اُسے اسسٹنٹ کمشنر ولیم کی منظوری سے جلال آباد تحصیل کمپلیکس میں ہی ایک تین کمروں کا کوارٹر رہنے کو مل گیا۔ جس میں اور تو اور پانی کا نلکا بھی لگا ہوا تھا اور گھر بھی پورے کا پورا پکی اینٹوں سے بنا تھا اور کرایہ اُس کا صرف تین روپے ماہانہ تنخواہ سے کٹتا تھا۔ گھر کے سامنے ایک ٹاہلی کا درخت بھی تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ گھر پکا ہونے کی وجہ سے مولوی کرامت کی بیوی کو روز روز بھوسے میں گُندھی ہوئی مٹی سے اُس کی دیواروں اور چھت کو لیپنا نہیں پڑتا تھا، جو کچی اینٹوں اور مٹی گارے سے بنے گھروں میں روز روز کا سیاپا تھا۔ اس طرح کے کچے گھر بارشوں کے موسم میں مصیبت بن جاتے ہیں۔ یہ پہلا رعب تھا، جو حقیقت میں مولوی کرامت شریفاں پر ڈالنے کے لائق ہوا تھا۔ شریفاں کے ساتھ اب اُس کی نند رحمت بی بی اور رحمت بی بی کی یتیم بیٹی بھی تھی۔ اِن کے علاوہ فضل دین تو موجود ہی تھا۔ رحمت بی بی سے نہ مولوی کرامت اور نہ ہی شریفاں نے کوئی بات کی تھی لیکن یہ قصہ خموشی سے طے ہو چکا تھا کہ رحمت بی بی کی بیٹی کا فضل دین سے اب نکاح ہونا لازمی قرار پا چکا ہے، جس کا بس اشارہ ہی رحمت بی بی کے لیے کافی

تھا۔ اُس کے لیے اِس سے بڑھ کر اب کون سی بات تھی کہ جب چراغ دین قتل ہوا تو اُن ماں بیٹی کا دور دور تک کوئی پُرسان حال نہیں تھا۔ یہ مولوی کرامت ہی تھا، جس نے آخری وقت پر اُن کو سہارا دیا۔ یہاں تک کہ وہ اُنہیں جودھا پور کے اکیلے پن سے نکال کر تحصیل جلال آباد اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ لہٰذا رحمت بی بی جس قدر بھی مولوی کرامت کی شکر گزار ہوتی، وہ کم تھا۔

تحصیل کمپلیکس عین ریلوے اسٹیشن کے قریب تھا، جس میں مولوی صاحب اور اُس کی فیملی کو ولیم کی برکت سے رہنے کو اب ایک مکان بھی مل گیا تھا۔ کمروں میں اینٹوں کا فرش بھی لگا ہوا تھا۔ اب اُنہیں کہیں اور سے پانی ڈھونے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ مولوی یا اُس کی بیوی جب چاہتے وضو کر سکتے تھے، نہا سکتے تھے اور وہی پانی پی بھی سکتے تھے۔ مولوی کرامت، فضل دین اور دونوں عورتوں نے مل کر اونٹ گاڑی سے سامان اُتارا اور اُسے ترتیب سے گھر میں رکھتے گئے۔ گھر دیکھ کر شریفاں کے دیدے کھلے ہوئے تھے، جو اَب گھر کی مالکن ہونے کے ناتے ہدایات بھی دے رہی تھی کہ فلاں چیز اِدھر رکھو، فلاں چیز اُدھر رکھو۔ چیزیں کیا تھیں، تین چار پائیاں کچھ بستر ے، کھانے کے چند ایک برتن، دو لکڑی کے صندوق، جن میں سلوٹوں سے بھرے ہوئے کپڑے اور کچھ شادی کے وقت کی باقیات جمع تھیں اور بس۔ یہی کچھ دونوں گھروں کا اثاثہ تھا، جو ایک ہی گھر میں جمع ہو کر بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ اس گھر میں تین کمروں کے علاوہ اچھا خاصا صحن بھی تھا۔ موسم گرمیوں کا تھا۔ اِس لیے چار پائیاں رات کو صحن میں ہی بچھائی جاتی تھیں۔ البتہ دن کے وقت اُنہیں کمروں میں منتقل کیا جا سکتا تھا۔ گھر میں موجود ٹاہلی کے درخت نے یہ مشکل بھی دور کر دی۔ سورج کی گرمی سے بچنے کے لیے دن کو چار پائیاں ٹاہلی کے سائے میں بچھائی جا سکتی تھیں۔ صحن کچا تھا اور اُس میں گھاس پھونس اتنا اُگا تھا کہ گرد غبار بالکل نہیں تھا۔ گھاس کاٹنے کی ضرورت تھی، جو فضل دین آرام سے کر سکتا تھا۔ مولوی کرامت نے سامان اُتروا کر اونٹ گاڑی والے کو پیسے دے کر رخصت کیا۔ کچھ دیر بیٹھ کر آرام کیا اور عصر کے وقت جب گرمی کا کچھ زور تھما تو دونوں عورتوں کو گھر پر چھوڑ فضل دین کو لے کر جلال آباد کے بازار میں چلا آیا تا کہ کھانے پکانے کے لیے دال، چاول، آٹا اور گھی وغیرہ خرید لے۔ بازار جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، کوئی خاص نہیں تھا۔ فضل دین نے تو خیر کبھی نہیں، البتہ مولوی کرامت نے تو قصور کا بازار دیکھا ہی تھا۔ وہ اِس سے کہیں بڑا تھا۔ پورے جلال آباد میں ایک ہی بازار تھا۔ کوئی دو سو گز لمبی اور بارہ گز چوڑی سڑک تھی۔ جس کے دونوں طرف کچی پکی اور لکڑی کے بڑے تختوں والی چند ایک کھلی کھلی دکانیں تھیں۔ دکانوں کے بنیروں کے اُوپر

دورویہ بانس کی لکڑیاں ڈال کراُن کو رسیوں سے باندھ دیا گیااور اُوپر کٹی پھٹی ترپالیں بچھادی گئیں تاکہ بازار سے گزرنے والوں پر دھوپ نہ پڑے جو مئی، جون، جولائی میں اتنی بڑھ جاتی کہ ننگے سر والوں کی چیں بول جائے۔ ترپالیں دوکانداروں نے خود ہی اپنے خرچے سے ڈال کر بازار میں چھاؤں بنارکھی تھی۔ اِس میں دوکانداروں کی یہ حکمت بھی تھی کہ زیادہ تر سودادوکان سے باہر ہی پڑاہوتا تھا۔ ایک تواُس پر سایہ ضروری تھا۔ دوسرااُس سودے کو آکر دیکھنے یاخریدنے والادھوپ کی شدت سے بچ کرآرام سے سودے کوملاحظہ کر سکتا تھا۔ اگر گاہک کومسلسل دھوپ تنگ کر رہی ہو، تووہ جلد ہی کھسکنے کی کرتا ہےاور دوسری دوکان میں داخل ہو جاتا ہے۔ دکاندار، جس قدر زیادہ امیر ہوتا،اُس کی دکان کے اُوپر ترپال اتنی ہی اچھی ہوتی۔ مولوی کرامت نے ایک دفعہ پورے بازار کاایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک چکر لگایا۔ فضل دین کی سمجھ میں نہیں آرہا تھاکہ وہ بازار میں کس لیے آئے تھے کیونکہ نہ تو اُس نے پچھلے دو تین مہینوں سے روٹیاں اکٹھی کی تھیں، جو بیچنا ہواور نہ ہی فضل دین کے خیال کے مطابق مولوی کرامت کے پاس پیسے تھے، کہ ٹانگر یا کھجوریں خریدنی ہوں۔ وہ حسرت بھری نگاہوں سے دوکانوں کو دیکھتا جاتا۔ جہاں سے اکثر سکھ، ہندواور مُسلے کچھ نہ کچھ خریداری کر رہے تھے یا بیچ رہے تھے۔ بازار میں زیادہ تر عورتیں تھی۔ بوڑھی، جوان، سبھی قسم کی۔ اِن میں سکھ اور مسلمان عورتوں کے لباس گفتگواور چال ڈھال میں کچھ فرق نہیں تھا۔ اکثر عورتوں نے لہنگے اور گھگھرے پہنے ہوئے تھے اور اُن گھگروں کے آزار بندوں کے ساتھ اُن کے گھروں کے صندوقوں اور کمروں کی چابیاں لٹکی چھن چھن بجتی جارہی تھیں اور بازار میں اِن عورتوں کے چلنے سے ایک قسم کے ساز میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ بازار کے آخری کونے پر جا کر جہاں اب سوائے دھوپ کے آگے کوئی شے نظر نہیں تھی، مولوی کرامت واپس پلٹااور ایک کھتری کی دوکان پر رُک گیا۔ وہ ضرور کسی مسلمان کی دوکان پر رُکتا لیکن وہاں مسلمان کی دوکان توایک طرف، کسی مسلمان نے چھابڑی تک نہیں لگائی تھی۔ دکانوں کے مالک اکثر ہندو تھے۔ چھابڑیاں سکھوں نے لگارکھی تھیں۔ چھابڑیوں میں بھی زیادہ تر چبڑ، رینڈیاں، تربوز، تریں اوراِسی طرح کی سستی اشیاآنے کی تین کلو بکنے والی تھیں۔ پھل توکسی کے پاس نہیں تھا۔ البتہ سڑے ہوئے دیسی آم اور کچے پکے کیڑوں والے امرودوں کی الگ بات تھی۔ جنہیں دیکھ کر مولوی کرامت نے سوچ لیا کہ جاتے ہوئے کچھ نہ کچھ اِن اَمرودوں اور کھجوروں میں سے رحمت بی بی اور شریفاں کے لیے لے جائے گا۔ قصہ مختصراُس نے کھتری سے ایک آنے کادیسی گھی، دوآنے کی دال اوراِسی طرح کچھ دوسری چیزیں خرید کر دوروپیہ کا پوراگٹو بھر کے فضل دین کے سر

پر رکھ دیا۔ تھوڑی دُور چل کر مولوی کرامت کے دل میں خیال آیا، وہ پیچھے مڑا اور ایک آنے کا ٹانگر، امرود اور کھجوریں بھی خرید لیں۔ اُس میں سے تھوڑا سا ٹانگر مولوی کرامت نے فضل دین کو بھی دے دیا، جسے پا کر اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ گٹھڑ سر پر اُٹھائے ٹانگر چبانے لگا اور مولوی کرامت کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔۔ مولوی کرامت اب سر پر کُلّے دار پگڑی رکھے اور ہاتھ میں عصا تھامے بازار کے بیچوں بیچ بڑی طمطراق سے چل رہا تھا۔ خشک چمڑے کی جُوتی میں آواز تو پیدا نہیں ہو رہی تھی لیکن اُس کی کھدر کی سفید چادر اور کُرتے کے نیچے جوتی کا ہونا ہی اِس بات کی دلیل تھی کہ اب وہ عوام سے نکل کر اشراف میں داخل ہو رہا تھا۔ عوام میں تو اکثر کے پاس جوتی نہیں تھی یا چادر کی بجائے ڈیڑھ گز کی دھوتی ہوتی تھی اور گلے میں قمیض کے بدلے میں فقط جانگیہ ہوتا، جس کے ہاتھ بھر کے سلو کے ہوتے۔ اَصل میں مولوی کرامت کی زندگی میں یہ پہلا دن تھا، جب اُس نے بازار سے پیسوں کے ذریعے خریداری کی تھی۔ ورنہ اُسے کبھی اِس طرح کی شاہانہ کاروائی کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی سوچتا تھا، جو لوگ بازار سے خریداری کرتے ہیں، وہ یا تو ذیلدار ہوتے ہیں یا بابو لوگ۔ اُسے یہ تصور ہی نہیں تھا، ایک دن وہ خود منشی بن جائے گا اور جلال آباد کے بازار سے گھر کے لیے سودا سلف خریدا کرے گا۔ اور اب تو یہ موقع اُسے ہر روز یا جب چاہے مل جایا کرے گا۔ کیونکہ اب وہ بھی ایسی سرکار کا نوکر تھا جو بہت امیر تھی۔ سرکار اُسے اُس کی تنخواہ ہر ماہ اب ضرور ہی دے دیا کرے گی، جس میں وہ زیادہ پیسے بچا کر رکھ لیا کرے گا اور کچھ کا سودا سلف خرید لیا کرے گا۔ اِسی رو میں اُس کا دماغ کہیں کا کہیں جا نکلا۔ جامع مسجد جلال آباد کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک خیال پیدا ہوا، اگر اُسے منشی گیری کے ساتھ اِس مسجد میں امامت کا کام بھی مل جائے تو سونے پر سہاگہ ہو جائے گا۔ اِس طرح آمدنی بھی دگنی ہو جائے گی اور مسجد میں پُرانی خدمت بھی بحال ہو جائے گی۔ لیکن اِس کے لیے اُسے اِس مسجد کے پہلے امام کا کوئی بندوبست کرنا ہو گا۔ بہتر یہ ہے کہ اُسے منشی بنوا کر منڈی گرو ہر سا بھجوا دوں اور یہاں کی امامت خود لے لوں۔ مگر پہلے اچھی طرح سے یہاں کے نمازیوں کے ساتھ علیک سلیک بڑھانی ہو گی۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ دو چار مہینوں کے لیے مفت میں کچھ لیے دیے بغیر ہی لوگوں کے مُردوں کو نہلا دیا کروں یا اُن کی قبروں پر جا کر فاتح خوانی کر آیا کروں، یا کبھی صبح اور عشا کی اذان دے دی جائے۔ پھر آہستہ آہستہ لوگ خود ہی اُس کی طرف رجوع کر لیں گے۔ جب لوگ اُس پر مکمل اعتماد کر لیں تو اِس امام کو گورنمنٹ سے نوکری دلوا کر کہیں اور بھجوا دوں گا۔ اِس طرح کسی کو محسوس بھی نہ ہو گا اور مسجد بھی ہاتھ میں آجائے گی۔ اِس کے بعد فضل دین کی شادی رحمتے کی بیٹی ہاجرہ سے ہو جائے تو چراغ

دین کے نام، جو غلام حیدر نے دس ایکڑ زمین نام کروائی ہے، وہ بھی اُنہیں مل جائے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے، وہ خود رحمت بی بی سے نکاح کر لے، تو سارا معاملہ بالکل ہی سیدھا ہو جائے لیکن اُسے فوراً شریفاں کا غصے سے سُرخ ہوتا ہوا چہرا دکھنے لگا۔ اُس نے ایک جھر جھری لے کر یہ خیال جلد ہی دماغ سے جھٹک دیا اور بازار سے گزرتے ہوئے لوگوں کو سلام علیکم کہنے لگا۔ اب تھوڑی دیر میں مولوی صاحب کا گھر آنے والا تھا۔ اُس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ خدا دِلوں کے بھید کسی دوسرے پر نہیں کھولتا۔ ورنہ اگر آج اُس کے رحمتے سے شادی والے خیال کو شریفاں جان جائے تو ابھی گھر میں صفِ ماتم بچھ جائے بلکہ وہ گھر میں داخل ہی نہ ہو سکے۔

جاری ہے

قسط نمبر 22

(40)

ولیم کو جلال آباد میں آج چار سال ہو چکے تھے۔ وہ بنگلے سے نکل کر پیدل ہی کمپلیکس کی طرف چلنے لگا۔ آج اُس نے جو کپڑے پہنے تھے، اُن سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کیتھی کا عمل دخل آخر کار اُس کی ذاتی پسند و ناپسند میں شامل ہو چکا ہے۔ کنٹوپ کی جگہ کیپ نے لے لی تھی اور شرٹ پر ہڈ والے بٹنوں کی جگہ شیشے کے باریک ٹیکوں کے بٹن لگ چکے تھے۔ کوٹ بھی اب کُھلا ڈُھلا نہیں تھا، باقاعدہ سوٹ کے ساتھ فٹنس میں تھا۔ ولیم کا قد ویسے بھی لمبا تھا اور جسم کی ہڈی اکہری ہونے کی وجہ سے بہت سمارٹ بھی تھا۔ جوتے بھی ویسے ہی بارعب اور چمکدار جو کمشنروں کی شخصیت کے آئینہ ہوتے ہیں۔ اِس قدر روشن دن میں ولیم کی نیلی آنکھوں کے گھیراؤ میں سرخ و سفید چہرہ واقعی اپنی مثال آپ تھا۔ ہاتھ میں بید تو وہی پُرانی تھی لیکن آج اُس کی لچک پہلے سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ نہائت نپے تُلے قدم اُٹھاتا ہوا پُر وقار چال چلنے لگا۔ ولیم کے بنگلے سے تحصیل کمپلیکس تک سڑک کے دونوں جانب بیس کے قریب سنتری کھڑے تھے۔ جب وہ دفتر آتا یا واپس بنگلے پر جاتا، یہ سنتری خاکی وردی پہنے ہر چالیس قدم کے فاصلے پر موجود صاحب کی نگہبانی کے لیے ایستادہ ہو جاتے۔ سنتریوں کی وردی شرٹ اور لمبی نیکروں پر منحصر تھی۔ سنتری سکھ، ہندو اور مسلمان سبھی قوموں سے تھے۔ اُن کی شرٹیں اور نیکریں بھی ایک جیسی تھیں لیکن سر پر پگڑی رکھنے کے لیے سکھوں کو استثنیٰ حاصل تھا۔ وہ سرکاری ٹوپی کی بجائے نیلے رنگ کی پگڑی پہن سکتے تھے۔ سنتریوں کے علاوہ بھی تین چار افسر ولیم کے استقبال کے لیے صبح اُس کے گھر کے سامنے پہنچ جاتے تاکہ وہیں سے صاحب کو پروٹوکول کے ساتھ دفتر میں لائیں مگر ولیم اِن چیزوں کا خیال کم ہی کرتا۔ اکثر اِن سب کو نظرانداز کرتا ہوا سیدھا پیدل ہی چل پڑتا۔ جیسا کہ آج سُرخ اینٹوں کی ٹھنڈی سڑک پر چہل قدمی کرتا ہوا چل رہا تھا۔ یہ سڑک ولیم کے جلال آباد آنے کے ایک سال بعد پکی کر دی گئی تھی۔ جس کی گرد پہلے محض ریت اور بھٹے کی کیری ڈال کر بٹھائی تھی۔ اب اِس سڑک پر کمپلیکس تک دورویہ پیپلیوں کے درخت بھی لہلہا رہے تھے۔ یہ بھی ولیم کے جلال آباد تعیناتی کے بعد ہی لگے تھے۔ بلکہ ولیم نے خود لگوائے تھے۔ سردی کے وہی دن لوٹ آئے تھے، جب ولیم نے جلال آباد میں قدم رکھے تھے اور آج اُس کی تعیناتی کو چار سال ہو چکے تھے۔ اِس عرصے میں اُس نے جلال آباد تحصیل میں کئی انقلابی قدم اُٹھا

ئے۔ تعلیم کا معیار پنجاب کی تمام تحصیلوں سے آگے نکل چکا تھا۔اِسی طرح ایک نئی نہر اور دوسرے کئی چھوٹے چھوٹے رجواہے جاری کر دیے۔ جن کی وجہ سے تحصیل کے ہر گوشے میں پانی کی بہتات ہو گئی۔ گندم، چاول اور مکئی کی فصلیں کثرت سے پیدا ہونے لگیں اور لوگوں کے چہروں پر ایک قسم کی خوشحالی آنے لگی۔ ہر طرف درخت اور فصلوں کے سبز آئینے لہلہا رہے تھے۔اِس کے علاوہ سرکاری سرپرستی میں نجی سطح پر لوگوں کو چھوٹے چھوٹے کاروبار شروع کروا دیے، جن میں جلال آباد کے مضاف میں لگائے گئے شہتوتوں کے باغ بھی شامل تھے۔

اب ولیم جلال آباد سے اِس قدر مانوس ہو چکا تھا کہ اگر اُسے ساری عمر بھی یہاں رہنے کی اجازت دی جاتی تو وہ اس کے لیے بھی تیار تھا۔ سبب اِس کا یہی تھا کہ جلال آباد شہر سے لے کر اُس کے مضافات تک ولیم نے ہر جگہ کو اپنی ذاتی جمالیات کے آئینوں میں ڈھال لیا تھا۔ رہٹ، نالے، نہریں اور باغات جگہ جگہ پیدا ہو چکے تھے اور مزید کے لیے کوششیں جاری تھیں۔ دوکانوں سے لے کر مکانوں تک، ہر شے میں ایک قسم کی نفاست جھلکنے لگی، جو ولیم کی ابتدائی کوششوں کے بعد خود بخود مقامی لوگوں میں ظاہر ہو رہی تھی۔ ولیم کے یہ چار سال گویا اُس کی زندگی کے حاصل تھے، جن میں اُس نے اس طرح دل جان سے کام کیا کہ یہ علاقہ بالکل بدل گیا۔ دریا کے ساتھ بھینسیں اور بھیڑ بکریاں پالنے والوں کے لیے باقاعدہ چراگاہوں کا قیام سرکاری کھاتوں میں کر دیا گیا اور اُن علاقوں میں چرواہوں کو پوری آزادی دے دی گئی۔ اِس عرصے میں اُس کا تبادلہ کئی دفعہ ہوتے ہوتے بچا، جس کو رکوانے میں اُس نے خود بھی چیف سیکرٹری تک تعلقات قائم کر لیے۔ اِن تعلقات میں اُس کے باپ کا کافی زیادہ دخل تھا کہ سیکرٹری صاحب اُن کے ذاتی دوستوں میں سے تھے، جنھیں دیسی گھی مکھن سے لے کر بھینسوں، بیلوں اور لڑاکا مرغوں تک کا چسکا پڑ گیا تھا۔ جس کی بنا پر وہ یہاں چار سال نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اپنی مرضی سے بھرپور طریقے سے کام کیے اور جلال آباد میں برطانوی راج کے فوائد پورے طریقے سے عوام تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اُسے اس معاملے میں کافی تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ مگر وہ فائدے نچلی سطح تک لیجانے میں کامیاب ہو ہی گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا نام جلال آباد اور اُس کے مضافات کے غریب غربا تک بھی پہچان میں آ چکا تھا۔ حتیٰ کہ اُس کی شکل بھی جلال آباد کے کئی عام لوگوں نے دیکھ لی تھی۔ امن وامان کے حوالے سے سردار سودھا سنگھ اور عبدل گجر وغیرہ کے قتل کے بعد کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو ولیم کے لیے پریشانی کا باعث بنتا۔ اگرچہ غلام حیدر لاکھ کوشش کے بعد بھی گرفتار نہیں ہو سکا تھا اور نہ ہی اُس نے دوسری کاروائی کی۔ گویا اپنا بدلا لے کر روپوش ہو چکا تھا۔ البتہ اُس کے اشتہاری ہونے کے بعد

ولیم نے اُس کی زمین اُسی کی رعایا میں بانٹ دی بلکہ اُن کے لیے بھی وہی سہولتیں جاری کر دیں، جو عام تحصیل میں تھیں لیکن ولیم نے اُس کا انتقال کسی وجہ سے غلام حیدر ہی کے نام رہنے دیا۔

مولوی کرامت نے جس قدر محنت اور تندہی سے کام کیا تھا، اُس کے عوض ولیم نے ذاتی دلچسپی لے کر اُس کی مالی اور سماجی حیثیت میں اتنا اضافہ کر دیا کہ اب وہ تحصیل جلال آباد کے معززین میں شمار ہونے لگا۔ بلکہ اُس کے بیٹے فضل دین کو دسویں درجے میں انتہائی اچھے نمبروں میں پاس ہونے کے بعد ذاتی خرچ پر اور کچھ وظیفہ دے کر لاہور ایف سی کالج میں پڑھنے کے لیے بھجوا دیا۔ اب فضل دین بھی وہ فضل دین نہیں رہا تھا، جو صرف روٹیاں مانگنے کا ماہر تھا۔ سکول میں تو ویسے ہی وہ دو دو درجے ایک ایک سال میں طے کر گیا تھا۔ مولوی کرامت کے بھی اتنے پر نکل آئے کہ کئی دفعہ صاحب بہادر سے خود ملاقات نکال کر اُن لوگوں کی شکایات بھی کیں، جو اُس کے کام میں حارج ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ غضب تو یہ کہ اُن شکایات کو سنا بھی گیا تھا، جس کے بعد بیشتر لوگ بابوؤں سمیت مولوی کرامت کی چاپلوسی پر اُتر آئے تھے۔ کئی بابو اپنی سفارشیں بھی لے کر آتے، جنہیں مولوی کرامت ولیم تک پہنچانے کی جرات تو نہ کر سکتا تھا، لیکن وہ اُن سفارشی لوگوں کو کام ہونے کی اس طرح تسلی کروا دیتا جیسے یہ اُس کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔ اِن سفارشوں کے عوض مولوی صاحب نے کسی سے پیسے تو نہیں پکڑے تھے، جس کا اُس وقت رواج بھی کم تھا۔ البتہ مختلف قسم کے تحفے تحائف ضرور وصول کر لیتا، جو بظاہر سفارشی حضرات اصرار کر کے مولوی صاحب کے حوالے کر دیتے تھے۔ مولوی صاحب اُنھیں اِس لیے بھی قبول کر لیتے کہ اُنھوں نے یہ حدیث پڑھ رکھی تھی کہ ایک دوسرے کو تحفے لینے دینے سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مولوی کرامت فی الحال اِس حدیث کے ایک حصے پر عمل کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ مولوی کرامت کے جلال آباد کے اکثر زمینداروں سے اتنے خوشگوار تعلقات پیدا ہو گئے کہ وہ اُسے شادی بیاہ اور موت، غمی سے آگے بڑھ کر اپنی رشتے داریوں کے متعلق بھی مشوروں میں شریک کرنے لگے اور چھوٹے موٹے فیصلوں کا ثالث بھی قرار دے لیتے۔ مولوی کرامت کی ثالثی اِس لیے بھی پائیدار تھی کہ سب جانتے تھے، مولوی صاحب کا کمشنر جلال آباد سے ذاتی تعلق ہے۔ اِس لیے وہ صاحب بہادر سے کہ کر کسی کا بھی چوبارہ گول کر سکتا ہے۔ اِن سب باتوں سے الگ اسکول منشی ہونے کے ساتھ مولوی کرامت نے اپنے لیے جامع مسجد جلال آباد کی امامت بھی حاصل کر لی تھی کہ تین سال پہلے مسجد کے سابقہ پیش امام کو منصوبے کے مطابق ملازمت دلوا کر منڈی گروہر سا بھیج کر اور اپنی تمام ذاتی قابلیتوں کے پیش نظر مسجد کی امامت کے فرائض سنبھال لیے

تھے۔ جس سے اتنی آمدنی مزید ہو جاتی جتنی مولوی صاحب کی گورنمنٹ کی طرف سے تنخواہ تھی۔ مولوی کرامت کی خوشحالی کے ساتھ شریفاں کے اطوار بھی کافی بدل چکے تھے۔ چک راڑے میں تو کبھی کسی کی میت کے گھر پُرسہ دینے یا مُردہ عورت کو نہلانے اور کفن پہنانے کے سوا دوسرا کام نہیں کیا تھا لیکن جلال آباد میں باقاعدہ گھروں میں میلاد اور دیگر بہت سی تقریبات میں مدعو ہونے لگی، جس میں اُسے مولوی کرامت کے برابر نہ سہی، گھر کے خرچے یعنی ہانڈی روٹی کی آمدن ہو ہی جاتی۔ بلکہ اُس نے کچھ نعتیں اور آئتیں رحمت بی بی کو بھی یاد کروا دیں۔ وہ بھی شریفاں کے ساتھ گھروں میں جا کر طرح طرح کی نذر نیاز کا سبق دینے لگی تھی۔ اِس طرح پورے جلال آباد میں مولوی کرامت کے گھر کے علم اور فتووں کی دھوم مچی ہوئی تھی اور کاروبار اِتنا ترقی کر گیا تھا کہ ضلع قصور کے چک راڑے میں تو اِس کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اُدھر فضل دین کا لاہور کے کالج میں پڑھنے سے فضل دین اب بچپن میں ہی مولانا فضل دین بن چکا تھا۔ ایف سی کالج نے اُسے دھوتی کی بجائے پاجامہ پہنا دیا اور بابو بنا کر رکھ دیا۔ عربی فارسی تو اُسے پہلے ہی آتی تھی، کالج کے ماحول نے انگریزی کا اثر ڈالا تو مولانا فضل دین ایک ہی سال میں کئی باتیں انگریزی میں ہی بولنے لگا۔ چھٹی پر جلال آباد آتا تو لوگ دیکھنے کے لیے آتے اور باتوں باتوں میں ایک دوسرے کو کہتے، بھائی مولوی کا بیٹا تو کوئی بڑا انگریز بنتا جا رہا ہے۔ بعض لوگ اِس بات پر مولوی کرامت سے ناخوش بھی تھے کہ اُس نے اپنے بیٹے کا مذہب خراب کر دیا ہے۔ فضل دین کو باقاعدہ کرسٹان بنا کر مولوی کرامت نے دین کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ اسی کو بنیاد بنا کر وہ مولوی کرامت کے پیچھے نماز بھی نہیں پڑھتے تھے لیکن مولوی کے صاحب بہادر سے تعلقات کی بنا پر کھلے عام مخالفت سے بھی ڈرتے تھے۔ مولوی کو بھی اُن کی کوئی پرواہ نہیں تھی کیونکہ ایسے لوگ دیہاتوں میں تو کافی تھے لیکن شہر میں اُن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی کیونکہ مولوی کرامت کی پچھلے تین سال کی تبلیغ نے جلال آباد کو انگریز بہادر کا وفادار بنا ہی دیا تھا۔

الغرض ولیم نے مولوی کرامت کی حالت بدلنے سے لے کر فیروز پور کی تحصیل جلال آباد کو تعلیمی، معاشی، اور سماجی سطح پر اتنی کچھ ترقی دے دی کہ اُسے محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا، وہ اپنی نولکھی کوٹھی میں رہ رہا ہے یا جلال آباد کے بنگلے میں۔ کیتھی شادی کے بعد ولیم کے ساتھ جلال آباد کے بنگلے میں تھی۔ بلکہ اب تو ان کا ایک بچہ بھی تھا، جس کی عمر ڈیڑھ سال ہو چکی تھی۔ کیتھی روزانہ نہیں تو ہر دوسرے دن گھوڑے پر بیٹھ کے جلال آباد کے مضافات میں سیر کو ضرور نکلتی، جس کے دائیں بائیں بیسیوں نوکر، مامائیں اور پولیس والے اٹین شین چلتے اور بھاگتے نظر آتے۔ میم

صاحبہ نے یہاں آکر بھی عجب طرح کے پُر پرزے نکال لیے تھے۔ کچھ دن تو دیسی ملازمین کے ساتھ ملائمت سے بات کرتی رہی۔ یہ لوگ اُسے فرشتوں جیسے اور تابع فرمان لگتے تھے۔ اُس کے خیال میں اِن ہندوستانی کالوں کے اندر انتہائی سادگی اور معصومیت تھی کیونکہ اُن کا اپنا نہ کوئی تقاضا تھا اور نہ شکائت۔ یہی وہ لوگ تھے جو صرف صاحب بہادر، میم صاحبہ اور بابا لوگوں کے لیے جیتے اور اُن کی خدمت گزاری میں مرتے تھے۔ اِس لیے اُن کے ساتھ محبت اور شفقت کرنا گورے لوگوں کا فرض تھا۔ کیتھی بات بات پر اُنہیں انعامات سے نوازتی اور شاباش سے دل بڑھاتی۔ لیکن جیسے جیسے ولیم کے اختیارات کی وسعت اور اقتدار کا نشہ دیکھا، لہجے اور خیالات میں تبدیلی آتی گئی۔ حتیٰ کہ تین ہی سال کے اندر اُس نے ولیم کو بھی سرزنش کرنا شروع کر دی کہ وہ اِن دیسی لوگوں کو زیادہ رعایت دیتا ہے اور ملازموں کی غلطی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اب یہ لوگ اُسے گنوار، اُجڈ، بھکاری، کام چور، چاپلوس اور چغل خور نظر آنے لگے۔ وہ اِس بات کی سختی سے قائل ہو گئی کہ کالے ایک بدبخت نالائق اور منحوس قوم ہیں۔ اِن کے جسموں سے بدبو آتی ہے۔ نہاتے نہیں اور گوروں کے درمیان بیماریوں کا سبب بنتے ہیں۔ اِن کو پیار سے نہیں ذلّت اور رسوائی کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ کیتھی کے اپنے شغل بھی ضروریات سے آگے نکل کر تفریح میں بدلتے گئے، جن میں سے ایک اُسے اُونٹ پر سواری کرنے کا بھی شوق پیدا ہو گیا۔ اِس شوق کو پورا کرنے کے لیے کئی اونٹ خریدے گئے اور اُن کی دیکھ بھال کے لیے آٹھ آٹھ ملازم رکھ لیے۔ کیتھی ولیم کو بھی اُونٹوں پر اپنے ساتھ سیر کرنے کا اصرار کرتی، جسے پورا کرنے کے لیے اُس نے کئی دفعہ یہ سواری بھی کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب ولیم بھی اُونٹ کی سواری سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اُونٹوں کے علاوہ کیتھی کی کوششوں سے جلال آباد میں اوکاڑہ کے مقابلے کا تو خیر نہیں، لیکن ایک چھوٹا سا مویشیوں کا فارم ضرور بن گیا۔ اِس فارم کے لیے نیلی کی عمدہ بھینسیں چُن کر دُگنے تگنے مول میں خرید لی گئیں۔ اِس کے علاوہ بنگلے کے پچھواڑے اچھا خاصا باغیچہ بنا دیا۔ اِس میں دُور تک درختوں کی قطاریں ہری چھاؤں کے ساتھ لہلہانے لگیں، جن پر توریوں، کدّوؤں، اور کریلوں کی بیلیں چڑھ گئیں تھیں۔ بنگلے کے قُرب وجوار میں درختوں کی عمر ابھی چار سال ہی تھی لیکن اُن کی حفاظت اِس اچھے طریقے سے ہوئی کہ وہ اب اچھا خاصا سایہ دینے لگے تھے۔

بیلوں کے چڑھ جانے سے اور بھی اچھے لگتے، جو سردیوں کے موسم میں عجیب بہار پیدا کر دیتیں۔ کیتھی نے اپنی بیٹی کے لیے بنگلے کے صحن میں ایک نوابی قسم کا جھولا بھی بنوالیا تھا۔ جھولے میں اپنی سائرز کو لٹا کر اُسے بعض اوقات

اپنے ہاتھ سے جھولاتی۔ لیکن اکثر یہ کام ماما سر انجام دیتی اور کیتھی خود صحن میں بے شمار سفید کبوتروں کو اُڑا اُڑا کر دانہ ڈالتی اور اُن کا تماشا دیکھتی۔ اِن کبوتروں کے صرف پھڑ پھڑانے کی آواز سننے کے لیے کیتھی نے یہ کبوتر آگرہ سے منگوائے تھے۔ کیتھی کے مسلسل جلال آباد میں ہی قیام کی وجہ سے اوکاڑہ میں کیتھلک چرچ اسکول کا کام معطل پڑا تھا۔ لیکن اب ولیم کو کیتھی کے ساتھ رہنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ وہ اُسے ایک لمحے کے لیے اپنے سے دور نہیں رکھنا چاہتا تھا، نہ ہی یہ بات کیتھی کو منظور تھی کہ ولیم ڈیوٹی کے وقت کے علاوہ کسی کلب میں بھی اُس کے بغیر جائے یا دوستوں کے ساتھ گپ بازی کرے اور وہ گھر میں اکیلی بیٹھی رہے۔ ولیم سے دُور اوکاڑہ میں رہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہاں وہ دونوں اوکاڑہ میں براستہ ہیڈ سلیمان کی ہر پندرہ دن میں دو دن کے لیے چکر ضرور لگاتے، کہ یہ فاصلہ جیپ کے آگے کچھ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ اب تو راستے میں کئی مقامی لوگوں کو بھی اُن کے معمول کے سفر کا علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی عرضیاں ولیم کے رستے میں پڑنے والی چوکیوں پر جمع کرا دیتے۔ جس کا آڈر ولیم نے پولیس والوں کو بھی کر دیا تھا۔

اب کچھ دن سے ولیم کو ڈپٹی کمشنر رالف کی طرف سے دھڑ کا لگا ہوا تھا۔ اُسے ولیم کا اِتنا عرصہ ایک ہی تحصیل میں رہنا گوارا نہیں تھا اور چیف سیکرٹری بیڈن صاحب بھی بدل چکے تھے۔ رالف کو فیروز پور میں آئے ایک مہینہ ہی ہوا تھا کہ اُس نے ولیم کے بارے میں طرح طرح کے خدشات کا اظہار شروع کر دیا۔ اِدھر ولیم کو بھی پتا چل چکا تھا کہ اُس کے اب جلال آباد میں دن تھوڑے ہی رہ گئے ہیں۔ اُس نے کیتھی کو آگاہ کر دیا تھا کہ اب وہ جلال آباد سے اپنا بستر لپیٹنے کے لیے تیار ہو جائے کیونکہ پنجاب گورنمنٹ کسی وقت بھی اُسے اُٹھا کر کہیں بھی بھیج سکتی ہے اور آج وہی کچھ ہوا۔ ولیم آرام سے بیٹھ کر فائلوں کا جائزہ لینے لگا تو سب سے پہلے اُس نے جو فائل کھولی اُس میں ولیم کے ٹرانسفر آڈر پڑے تھے۔ ولیم کو مطلع کیا گیا تھا کہ اُس کے چار سالہ تجربے کے پیشِ نظر چیف سیکرٹری آفس لاہور کو اُس کی خدمات کی ضرورت ہے۔ لٰہذا وہ جتنی جلدی ہو سکے اپنا چارج تحصیل دار مالیکم کو سونپ کر لاہور چیف سیکرٹری آفس میں جوائننگ رپورٹ دے۔ ولیم نے آڈر دیکھ کر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور پھر بیل دبا کر کرم دین سے کافی کا کپ بنانے کے لیے کہا۔ آڈر اتنے اچانک اور محتاط انداز میں تیار کئے گئے تھے کہ وقت سے پہلے اُن کی ہوا بھی باہر نکلنے نہیں دی گئی تھی۔ ولیم یہ تو جانتا تھا کہ وہ یہاں سے جانے والا ہے لیکن اِتنا اچانک، اُس کے بھی گمان میں نہیں تھا۔ اس لیے اب ولیم نے کسی نئی سفارش کا بندوبست کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ ویسے بھی ذہنی طور پر اب وہ اپنے تبادلے کے

لیے تیار ہو چکا تھا، جو ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا۔ اب چونکہ ولیم کو جلال آباد کے کسی کام میں قانونی تو پر دخل اندازی کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی وہ یہاں کسی چیز کا ذمہ دار رہا تھا، اس لیے اُس نے فوراً اپنے آپ کو ہلکا پھلکا کر کے باقی تمام فائلوں کو ایک طرف کر دیا اور دل ہی دل میں رالف پر لعنت بھیج کر پچھلے چار سال میں پیش آنے والے تمام واقعات پر نظر دوڑانے لگا۔ جس میں طرح طرح کے بے شمار کردار ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں میں گھومنے لگے۔ پہلے دن فیروز پور میں ملنے والا باورچی نظام دین، اُس کے معتوب افسر، جن میں لوئیس اور وہ جو ایک دو لوگ ریٹائر ہو کر گھر بھی جا چکے تھے۔ ان کے علاوہ مدن لال ماسٹر، سردار سودھا سنگھ، غلام حیدر، رسہ گیر چوہدری، مولوی کرامت، تھانیداروں سے لے کر عوام تک اور پھر اُس کے ماتحت کام کرنے والی تحصیل انتظامیہ، سینکڑوں ہی طرح کے لوگوں سے اُسے واسطہ پڑا تھا۔ جن میں ایماندار بھی تھے، چاپلوس بھی، کام چور بھی اور کام کے ماہر مگر نکمّے بھی۔ اِنہی میں وہ بھی تھے، جو دونوں طرف مخبری کا کام دیتے تھے اور نہایت ایمانداری سے۔ وہ بھی، جنہوں نے ہمیشہ منافقت اور کام چوری سے ربط رکھا۔ یہ سب کچھ ولیم کو یاد آ رہا تھا۔ اُسے یہ بھی خبر تھی کہ آنے والا کوئی بھی افسر اس طرح جلال آباد میں کام نہیں کرے گا جس طرح اُس نے کیا ہے۔ وہ عوام کو اپنی رعایا نہیں غلام بنا کر رکھے گا، جیسے خود اُس کی بیگم کا اِن لوگوں کے ساتھ رویہ ہو گیا تھا۔ اِس خیال کے آتے ہی ولیم ہلکا سا مسکرا دیا، گویا انگریز افسر عورت بن کر مقامی لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے تھے، جس کا اُسے اس وقت قلق تو ہو رہا تھا لیکن اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ ولیم نے سوچا جلال آباد کے لوگوں کو کیا پتا، اُن کی تحصیل میں ولیم کے تبادلے کا کتنا بڑا انقلاب آ چکا ہے۔ اُس نے خود بھی دل میں جلال آباد کو اپنا گھر تسلیم کر لیا تھا اور اُس کے لیے اُسی طرح کام کیا تھا جس طرح اپنے گھر کو بنانے میں کیا جاتا ہے۔ اِسی اثنا میں ولیم نے دوبارہ بیل بجا کر نجیب شاہ کو طلب کیا۔ نجیب شاہ جیسے ہی کمرے میں آیا، ولیم نے اُسے بنگلے میں موجود تمام سامان کو بحفاظت پیک کروانے کا حکم دے دیا۔

جاری ہے

قسط نمبر 23

(41)

لاہور چیف سیکرٹری ہاؤس ولیم کے لیے نیا نہیں تھا۔ ابتدائی آٹھ نو مہینے ٹریننگ کے اور مختلف اوقات میں میٹنگ کے سلسلے میں اُس کا یہاں قیام رہا۔ اِس دوران ولیم کے ذاتی طور پر بھی بہت سے دوست نکل آئے تھے۔ اس کے علاوہ ولیم کے باپ اور دادا کو جاننے والے بھی کئی لوگ یہاں موجود تھے، جو اس خاندان کا نجی سطح پر بھی احترام کرنے والے تھے۔ اس لیے کسی قسم کی اجنبیت نہیں تھی۔ پھر بھی جو اختیار ولیم کو جلال آباد میں حاصل تھا، اُس کا یہاں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کہاں تو ایک پورے علاقے میں بے تاج بادشاہ ہونا، نوابوں کی طرح فیصلے صادر کرنا بلکہ اُس کے اختیارات تو نوابوں سے بھی بڑھ کر تھے، کہ اِن کو حکومت کی قانونی حیثیت بھی حاصل ہو جاتی تھی، اور کہاں ایک پندرہ مربع فٹ کے کمرے میں بیٹھ کر صبح سے شام تک مکھیاں مارتے رہنا اور ملازم کو بلا کر کافی یا چائے پیتے جانا۔ قہر تو یہ تھا کہ اُسے افسروں کی چھٹیوں کا گھٹیا کام دے دیا گیا، جسے وہ کراہت کی حد تک ناپسند کرتا تھا۔ اِس کے بر عکس کیتھی یہاں انتہائی خوش تھی۔ ولیم کو رہنے کے لیے مال روڈ پر جو بنگلہ ملا تھا، وہ جلال آباد والے بنگلے سے اگرچہ چھوٹا تھا لیکن اُس سے کہیں خوبصورت تھا۔ ارد گرد میں دوسرے بنگلوں میں رہنے والے افسروں کی بیگمات اور بچوں کی رونق مستزاد تھی۔ جلال آباد میں ولیم ڈیوٹی پر چلا جاتا تھا تو کیتھی کو ایک ایک گھنٹہ سال سال کا ہو جاتا لیکن یہاں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ نوکروں کی تعداد کم ہو گئی تھی مگر ایسی بھی کم نہیں کہ کمتری کا احساس پیدا ہو جاتا۔ شام کے بعد لاہور کے کلبوں اور جم خانوں میں ولیم کے ساتھ جانے میں ایک عجیب طرح کا احساسِ تفاخر جاگ اُٹھتا۔ ولیم جیسا خوبصورت اور وجیہہ شکل و صورت کا انگریز افسر وہاں کم ہی تھا۔ اس لحاظ سے کیتھی اپنی سہیلیوں کے آگے بہت زیادہ سرخرو تھی۔ کیونکہ اُن کے خاوندوں میں کوئی بھی ولیم کے پاسک نہیں تھا۔ جب دیگر انگریز بیگمیں کیتھی کے خاوند کو دیکھتیں اور جل بھن کے رہ جاتیں، تو کیتھی کا سینہ فخر سے پھول جاتا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ ولیم کے ساتھ لپٹ لپٹ جاتی۔

ایک دن ولیم نے اپنے کمرے میں اُونگھتے اُونگھتے سوچا، کیوں نہ چیف سیکرٹری سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ زیادہ سے زیادہ کوئی نیا کام مشکل سمجھ کر دے دے گا۔ ملاقات کر کے دیکھتے ہیں۔ ولیم اپنے کمرے سے اُٹھا اور چیف سیکرٹری

کے پی اے جوزف جان کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جوزف نے فوراً اُٹھ کر ہاتھ بڑھایا اور کہا، ویلکم ولیم، آج ہمارے کمرے میں کیسے؟ زہے نصیب تشریف رکھیے۔

ولیم آرام سے کرسی پر بیٹھا، اپنا ہیٹ سر سے اُتار کر جوزف کی میز پر رکھا۔ چِٹ پیک سے ایک کاغذ نکالا، اُس پر اپنا نام لکھ کر جوزف کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا، جوزف یہ چٹ اندر بھیج دو، مجھے ملاقات کرنی ہے۔

جوزف نے چٹ پکڑ کر سامنے رکھی، بیل کا بٹن دبایا اور ولیم سے پوچھا، کافی پیئیں گے یا چائے؟

جوزف، اِس دفتر میں اب میں اِسی کام کے لیے رہ گیا ہوں (اتنے میں ملازم اندر داخل ہو چکا تھا اور حکم کا منتظر تھا) بہر حال کافی ٹھیک رہے گی۔

ملازم حکم سن کر باہر نکل گیا تو جوزف بولا، چیف صاحب لاہور ڈویژن کے ڈپٹی کمشنروں سے میٹنگ کر رہے ہیں، ابھی ختم ہونے والی ہے۔ وہ باہر نکلتے ہیں تو آپ اندر چلے جایئے۔ یہ آپ کی چٹ مَیں ابھی پہنچا دیتا ہوں۔

جوزف صاحب مجھے ایک بات بتائیں؟

پوچھیں۔

جب میری ٹرانسفر کی فائل چل رہی تھی تو آپ یہیں تھے۔ کچھ ہَوا کی زبانی کہہ دیا ہوتا۔ مَیں کسی تنکے کو پکڑنے کی کوشش کرتا۔

ولیم، تم ابھی لارنس صاحب سے میٹنگ کرنے والے ہو۔ چند لمحوں بعد خبر ہو جائے گی کہ تم اُس وقت بھی کچھ نہ کر سکتے۔

جوزف، تم میں اور مجھ میں ایک فرق ہے۔ مَیں اپنی رائے سے فائل تیار کرتا ہوں اور تم آزاد رائے سے واقف نہیں۔ کبھی اِس چھ گز کے حبس زدہ کمرے سے نکل کر دیکھ، دن کتنے روشن ہیں۔

مَیں پچھلے تیرہ سال سے اِس آفس میں ہوں۔ ولیم، آپ کی طرح کچھ نوجوان اور بھی جذباتی ہو گزرے ہیں۔ مگر اُنہیں زیادہ دیر سکھانا نہیں پڑا۔ روشنی اِس کمرے میں بھی کم نہیں لیکن ابھی آپ اِس سے مانوس نہیں ہوئے۔

آپ کی آنکھوں پر اِن فائلوں کی سیاہی جم چکی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کلر بلائنڈ ہو گئے ہو؟ جو روشنی اور اندھیرے میں تمیز نہیں جانتے۔

جوزف نے ولیم کی بات میں تلخی کو محسوس کیا لیکن ظاہراً مسکرا کر بولا، ولیم، زیادہ تلخی اچھی نہیں (کافی جو چند لمحے پہلے ہی ملازم رکھ گیا تھا) کافی پیئیں۔ رنگوں کی تمیز کرنے والے ضروری نہیں حالات کی تمیز کرنا بھی جانتے ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ آج کھُلے دالانوں کی راہداریاں چھوڑ کر اس حبس زدہ کمرے میں چیف سیکرٹری صاحب کا انتظار نہ کاٹتے۔ اِتنا کہہ کر جوزف ولیم کی چٹ چیف سیکرٹری صاحب کے کمرے میں لے گیا۔ اس بھرپور طنز پر کافی ولیم کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ اُس نے کپ وہیں رکھ دیا اور غصے سے ہونٹ کاٹنے لگا، دو ٹکے کا ملازم سول سروس کی توہین کیسے کر گیا۔ لیکن ولیم بے بس تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ملاقات کیے بغیر اُٹھ کے چلا جائے۔ اُٹھنے کے لیے ارادہ باندھا ہی تھا کہ جوزف نے باہر آکر کہا، چلیے جناب، صاحب بلاتے ہیں۔ ولیم فوراً اُٹھ کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ سیکرٹری صاحب نے بیٹھے ہی بیٹھے ولیم کے سلام کا جواب دیا اور سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ولیم بغیر تکلف کے شکریہ کہہ کر کُرسی پر بیٹھ گیا۔ چیف سیکرٹری صاحب کا کمرہ ولیم پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ کمرے کی ہیبت کم تو نہیں تھی لیکن اُس میں اور ڈپٹی کمشنروں کے کمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ تمام لوازمات ویسے ہی تھے۔ بس فرق میز کی دوسری طرف بیٹھنے والے آدمی کا تھا۔ لارنس صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے بھی اتنے لمبے لگ رہے تھے جتنا ایک درمیانے قد کا آدمی کھڑا ہوا لگتا ہے۔ مونچھیں سیاہ کالی اور بڑی بڑی تھیں۔ سر سامنے سے گنجا لیکن آنکھیں اِتنی بڑی اور سُرخ جیسے ابھی دو مٹکے شراب کے پیے ہوں۔ مگر انتہائی چمکدار۔ چند لمحے پُر تکلف سلام کے بعد ولیم اور چیف سیکرٹری میں ایک باقاعدہ گفتگو شروع ہوئی۔

سر مَیں کچھ کہنا چاہتا ہوں

مَیں سننے کے لیے بیٹھا ہوں۔

مَیں چاہتا ہوں کچھ کام کروں۔

یہاں آپ کو کچھ کام نہیں دیا گیا؟

دیا گیا ہے سر۔ اُونگھنے کا کام دیا گیا ہے۔

اُسے اچھے طریقے سے کرو۔

سر، جو کام چار سال تک کیا ہے، مجھے اُس میں زیادہ تجربہ ہے۔

اِس کام میں بھی تجربہ حاصل کرو۔

مجھے اس کام میں بھی چھ ماہ ہو چُکے ہیں سر۔ اور اس درجے کے کام کے لیے اِتنا تجربہ کافی ہے.

اِس کا فیصلہ تمھارے بجائے ہم کریں گے۔ ویسے میری اطلاع کے مطابق آپ افسران کی چھٹیوں کا حساب کتاب سنبھالے ہوئے ہیں۔

سر، یہ کام میرا باورچی مجھ سے بہتر کر لیتا ہے۔

اب لارنس صاحب نے اپنی آنکھیں ولیم کی آنکھوں میں ڈالیں اور خوفناک طریقے سے گھورتے ہوئے کہا، ولیم، مَیں نہیں جانتا تھا، آپ کا باورچی آپ سے زیادہ لائق ہے۔ اگر ہے، تو یہ آپ کے لیے بہت بُرا ہے۔ اِس بعد چیف سیکرٹری صاحب اپنی کرسی سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اُسے دیکھ کر ولیم بھی کھڑا ہو گیا۔

سیکرٹری صاحب دوبارہ بولے، ولیم، آپ کو وقت دیا جا رہا ہے۔ اپنے کو باورچی سے بہتر ثابت کرو اور وقت آنے کا انتظار کرو۔ یہاں آپ کو کسی وجہ سے بلایا گیا ہے۔ یہ کہ کر لارنس صاحب کمرے سے باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ولیم نے بھانپ لیا کہ اب مزید بات کرنا اور یہاں ٹھہرنا اُس کے لیے زیادہ نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی بات کچھ ایسا انداز اختیار کر چکی تھی جس کو طول دینا ولیم کے لیے بہتر نہیں تھا۔ لہٰذا ولیم سلام کر کے سیکرٹری کے کمرے سے نکلنے سے پہلے ہی باہر نکل آیا اور سوچتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا کہ جوزف سچ کہتا تھا۔ اِس ملاقات کے بعد ولیم نے چیف سیکرٹری سے ملنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور وقت نکلتا گیا۔

ولیم کو لاہور میں ایک سال تین ماہ گزر چکے تھے۔ اِن پندرہ مہینوں میں سوائے جم خانہ جانے کے، اِدھر اُدھر کی گھٹیا اور بے کار فائلوں پر دستخط جمانے اور کلرکوں کے بیہودہ چہروں کے دیکھنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں سینکڑوں ہندوستانی چاپلوس افسر ہر وقت موقعے کی تاق میں رہتے کہ کب صاحب سے سامنا ہو اور وہ ایک

زور دار سلام داغیں۔ ایسے دیسی افسر بھی تھے، جو افسری کے آداب سے تو سرے سے ناواقف تھے لیکن اُنہیں اپنے وطن کے لوگوں اور اُس کی مٹی میں کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی۔ یہ وہ افسر تھے جو انگریز کلرکوں تک کی چاپلوسی سے بھی نہیں ہچکچاتے تھے اور چاہتے تھے، کسی طرح اپنی اولادوں کو ٹوڈی بنا کر انگلستان بھیج دیں۔ یہ نوکری ہی اِسی کو خیال کرتے تھے۔ اُن کے خیال میں ہندوستان کی بُرائیاں بیان کرنا اور یہاں کے لوگوں کے خلاف کام کرنے کا نام سرکاری نوکری تھا۔ یہ دیسی افسر انگریزوں کی طرح کھانا کھانے کی کوشش کرتے، سر پر کنٹوپ اور ہیٹ جمانا، ہاتھ میں سیر کرتے ہوئے چھڑی تھامنا، شام کو کلب جانا اور تھوڑی بہت ڈرنک کرنا یا مہنگے کتے رکھنا اپنا اعزاز سمجھتے۔ ولیم دیکھتا تھا، اِن افعال کی وجہ سے یہ لوگ بعض اوقات تماشا بن جاتے مگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آتے۔ اِن معاملات میں ہندووں اور سکھوں کی نسبت مسلمان بڑھے ہوئے تھے۔ اِنھی اعمال کی بنا پر یہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتے۔ بعض خاندان تو دیکھتے دیکھتے انگلستان میں داخل ہو چکے تھے اور وہاں مستقل قیام کا بندوبست کرنے میں مصروف تھے۔ افسر تو افسر بعض ہندوستانی کلرک بھی اس معاملے میں بہت چالاک واقع ہوئے تھے۔ وہ اپنے صاحب کو اِس طرح شیشے میں اُتارتے کہ بچارے صاحب کو خود بھی پتا نہ چلتا۔ ولیم نے اِن سے بڑھ کر یہ ہُنر کسی میں نہیں دیکھا تھا۔ اِس بارے میں جو سب سے افسوس ناک بات تھی وہ یہ، کہ اِنھی کے دم سے ولائتی افسر رشوت خوری میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ولیم اپنے اس قیام میں جو کچھ دیکھ چکا تھا، ایک طرح سے یہ بھی اُس کے تجربے میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ اِس تمام عرصے میں وہ اِن دیسی اور ولائتی افسروں سے متنفر ہو چکا تھا۔ وہ اس کوشش میں رہتا کہ دیسی افسر یا کلرک سے سامنا نہ ہو۔ اگر ہوتا بھی تو وہ انہیں سختی سے نظر انداز کر دیتا۔ ولیم کے اِس رویے کی وجہ سے وہ یہاں انتہائی مغرور اور متکبر مشہور ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہلکی پھلکی سازشوں کے ذیل میں آنے لگا۔ مگر ولیم نے اِن باتوں کی پروا بالکل ہی چھوڑ دی اور اپنی پوری توجہ بیوی بچوں پر صرف کر دی۔ اسی فارغ البالی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کئی کئی دن او کاڑہ اپنے فارم پر چلا آتا اور ذاتی کام میں دلچسپی لینے لگا۔ اس عرصے میں اُس نے وہاں ایک دو جدید اسکولوں اور پارکوں کی بنیاد بھی رکھی۔ سکول کا کام کیتھی کے سپرد تو نہ کیا جا سکا البتہ اُن کا سلسلہ ضرور شروع کر دیا اور اپنی زرعی زمینوں پر مزید باغات اور درخت لگانے کا کام کرتا رہا۔

ولیم ایک دن اپنے کمرے میں بیٹھا چھٹی ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب کام نہ ہو یا ایسا کام پیٹے ڈال دیا جائے جو طبیعت سے لگاؤ نہ رکھتا ہو تو ایک ایک لمحہ پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ ولیم کی اِس وقت یہی حالت تھی۔ اپنی شوریدہ مزاجی کے

سبب وہ کسی افسر اور کلرک کو منہ بھی نہیں لگانا چاہتا تھا۔ چنانچہ وقت گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس لیے ولیم نے آج گیارہ بجے ہی چھٹی کرنے کی ٹھانی اور بیگ اُٹھانے کے لیے اپنے پی اے کو بلوایا۔ پی اے کمرے میں داخل ہوا تو اُس کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک پرچی تھی۔ ولیم کو زبانی پوچھنے کی عادت تو نہیں تھی لیکن اِس وقت چونکہ وہ نکلنے لگا تھا، اُس نے پی اے سے اس کاغذ کے بارے میں پوچھ لیا، یہ کیا ہے؟

پی اے نے کہا، سر یہ ایک لڑکا ہے، جو پچھلے کئی دن سے یہاں چکر لگا رہا ہے اور آپ سے ملاقات کی کوشش کر رہا ہے۔ اپنا نام فضل دین بتاتا ہے لیکن ملنے کا کوئی سبب نہیں بتاتا۔ اِس لیے میں نے اُسے ملنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ آج مجھے اُس پر کچھ ترس آیا تو میں اُس کا رقعہ اندر لے آیا ہوں۔ اِس پر اُس کا نام اور حوالہ موجود ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو حاضر کر دیتا ہوں۔

ولیم نے پی اے کے ہاتھ سے کاغذ پکڑا تو اُس پر صرف اتنا درج تھا، صاحب بہادر ولیم کے دروازے کا گداگر فضل دین ولد مولوی کرامت سکنہ جلال آباد۔

ولیم نے رقعہ پڑھتے ہی حکم دیا، اُسے حاضر کرو اور خود دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

فضل دین کمرے میں داخل ہوا تو اُس نے دونوں ہاتھ باندھے ہوئے تھے اور آنکھیں بالکل نیچے تھیں۔ ولیم ایک نظر دیکھتے ہی پہچان گیا۔ انداز سارے باپ جیسے تھے۔ اُسے مولوی کرامت کی وہی پہلی ملاقات یاد آگئی، جو جودھا پور میں چراغ دین کے قتل کے وقت دورے میں ہوئی تھی۔

کیا بات ہے؟ ولیم نے پوچھا۔

سر، حضور کے اقبال سے انٹرنس پڑھ گیا ہوں، فضل دین اسی عاجزی سے کھڑے کھڑے بولا، جناب کی شکر گزاری کو حاضر ہونے کے لیے کئی دن سے کوشش کر رہا تھا۔ آج خداوند یسوع مسیح کی برکت سے باریابی ہو گئی۔ ابا جان نے بھی آپ کی جناب میں حاضری کے لیے کہا تھا۔

مولوی صاحب خیریت سے ہیں؟

جی، دو مہینے پہلے اُن کو تپ چڑھی اور وہ فوت ہو گئے۔
اوہ خدا، ولیم نے افسوس کرتے ہوئے فضل دین کی طرف دیکھا اور کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، بیٹھو۔
فضل دین نہایت آہستگی اور ادب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اُس کے بعد کچھ دیر مکمل خاموشی چھائی رہی۔

فضل دین، دس تاریخ کو اپنے سرٹیفیکیٹ لے کر آ جانا، گورنر ہاؤس میں کچھ دیسی اسسٹنٹوں کی ضرورت ہے۔ میں آپ کے بارے میں مسٹر جیس کو کہہ دیتا ہوں، جاؤ اور اُس کے لیے تیاری کرو۔ اِس کے ساتھ ہی ولیم نے دوبارہ اپنے پی اے کو طلب کر کے فضل دین کے بارے میں ہدایات دیں اور کہا، دس تاریخ کو فضل دین آئے تو میرے پاس بھیج دینا اور انٹر پر جیس سے میری بات کراؤ۔

حکم سنتے ہی پی اے نے تعمیل کی۔ اِسی اثنا میں ولیم نے فضل دین کو چلے جانے کا اشارہ کیا اور وہ باہر نکل گیا۔

پندرہ ماہ چیف سیکرٹری آفس میں بیکار گزارنے کے بعد ولیم بہت زیادہ اُکتا گیا۔ وہ چاہتا تھا، کسی طرح اِس جہنم سے نکل جائے لیکن کس طرح؟ اِس بارے اُس کی تمام کاوشیں اور اعمال ضائع ہو چکے تھے اور کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔ وہ یہ تو جانتا تھا، اُسے سزا کے طور پر بھیجا گیا ہے لیکن کتنا عرصہ؟ اِس کے متعلق اُسے پوری طرح آگاہی نہ تھی مگر یہ پتہ تھا کہ اُس کے جلال آباد میں کام کرنے کی نوعیت سے افسرانِ بالا خوش نہیں تھے۔ وہ اُس پر کھلا اعتراض تو نہیں کر سکتے تھے لیکن بار بار دبے لفظوں کے انتباہ کے باوجود اُس نے مقامی لوگوں کے بارے میں اپنی انفرادی پولیسی پر نظر ثانی نہیں کی تھی۔ جس میں معاشی سطح پر بے شک گورنمنٹ کو فائدہ پہنچا تھا لیکن ولیم کے مقامی آبادی کے ساتھ شیر و شکر اور میل ملاپ نے انگریزی وقار کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ جب تک کمشنر ہاؤس ایڈم کے قبضے میں رہا، اُس وقت تک ولیم کو فکر نہ تھی۔ وہ خود بھی ہندوستانی عوام کے لیے رحمت کا فرشتہ تھے۔ مگر اُس کے جاتے ہی حالات یکسر بدل گئے تھے۔ اب ولیم کو جلال آباد سے نکلنا ہی تھا اور انتظامیہ اُنہیں کسی دوسری جگہ بھیجنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ اُس نے لاہور آتے ہی بہت ہاتھ پاؤں مارے، اپنے باپ دادا کی خدمات کا حوالہ دیا اور کام میں اپنی مہارت کے ثبوت پیش کیے۔ مگر مسلسل ابتدائی تین مہینوں کی محنت کے باوجود اُسے لگا، وہ اپنی کارکردگی کے افسانے افسروں کی بجائے سیکرٹریٹ کی دیواروں کو سنا رہا تھا۔ اس لیے پچھلے آٹھ ماہ سے خاموش تھا اور اکثر چھٹیوں پر رہنے لگا تھا۔ لیکن اتنا ہوا اِس عرصے میں فرصت کی وجہ سے اُس نے بہت سے کام ایسے بھی کر لیے، جن میں اُس کی اپنی ترجیحات

تھیں۔ یعنی اوکاڑہ میں چرچ اسکول اور لیڈی پارک کا قیام۔ اِس کے علاوہ اپنے فارم ہاؤس کی مزید وسعت۔ اور نو لکھی کوٹھی کی مزید رینو ویشن اور باغوں کی توسیع۔

جاری ہے

قسط نمبر 24

(42)

بہت دنوں سے ولیم سوچ رہا تھا کہ سرکاری نوکری پر لعنت بھیج دے۔ صرف اوکاڑہ میں رہ کر اپنا ذاتی فارم چلائے، جس پر کیتھی کسی طرح بھی راضی نہ ہو سکتی۔ شاید وہ اُسے بھی نظر انداز کر کے فیصلہ کر بیٹھتا کہ اچانک اُس کی خوش نصیبی سے برطانیہ پر ایک آفت ٹوٹ پڑی اور وہ تھی جنگ عظیم دوم۔ ہٹلر کی حکومت نے مشرقی یورپ میں ایک وسیع اور جدید سلطنت "لونگ اسپیس" (لیبن سر وم) کے قیام کا خواب دیکھا تھا۔ اُس نے یہ خیال اپنے لوگوں پر واضح کیا تو جرمن لیڈروں نے یورپ پر جرمنی کے تسلط کیلئے جنگ کو ضروری قرار دے دیا۔ سویت یونین کی غیر جانبداری حاصل کرنے کے بعد جرمنی نے یکم ستمبر انیس سو انتالیس میں پولنڈ پر حملہ کر کے دوسری جنگ عظیم کا آغاز کر دیا۔ اِس کھلم کھلا جارحیت کو روکنے کے لیے برطانیہ اور فرانس نے ردعمل کے طور پر تین ستمبر کو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اُدھر ایک ماہ کے اندر جرمن نے سویت فوجوں کے اتحاد سے پولنڈ کو شکست دے دی۔ پولینڈ جرمنی اور سویت یونین کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا جب اِس سب کچھ سے لا تعلق ولیم پنجاب کے چیف سیکرٹری ہاؤس لاہور میں کُھڈے لائن لگا، فائلوں کے اُوپر سے مکھیاں اُڑا رہا تھا۔ وہ اِس جنگ کی خبریں تو مسلسل سُن رہا تھا لیکن ابھی جنگ کی آواز براہ راست ہندوستان نہیں پہنچی تھی۔ اِس لیے اُسے اس سب کچھ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ویسے بھی کچھ وقت تک عارضی سکون ہو چکا تھا، جو نو اپریل انیس سو چالیس تک جاری رہا اور اُس وقت ختم ہو گیا، جب جرمن فوجوں نے پھر ایک دفعہ ناروے اور ڈنمارک پر حملہ کر دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب برطانیہ کے کان پر دوبارہ جوں رینگی اور وہ اِس کھلبلی پر چونکا۔ اُدھر جنگ کا آغاز ہوا اِدھر برطانوی کالونیوں میں انگریزوں اور مقامیوں کو افسریاں پلیٹوں میں بکنے لگیں۔ اِسی ریلے میں کئی معتوبوں کی غلطیاں بھی تھوڑی بہت سرزنش کے بعد بخش دی گئیں۔ چنانچہ ولیم کی بھی سن لی گئی اور اُس کی خدمات دہلی ڈویژن کے سپرد کر دیں۔ جہاں انہیں بطور ڈپٹی کمشنر ضلع روہتک بھیج دیا۔

ولیم کا اتنی جلدی اچانک ڈپٹی کمشنر بن جانا نہایت اعزاز کا باعث تھا اور کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ کجا لاہور میں پندرہ ماہ سے مکھیاں مارنے کا کام اور کجا ایک دم پورے ضلع کا وائسرائے۔ آڈر ملنے کے بعد اُس نے فوراً کیتھی کو اطلاع

دی اور کہا، محترمہ جلدی ضلع کی میم بننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ کیتھی نے یہ سنتے ہی اوکاڑہ میں اپنی نیابت کے منصوبے شروع کرنے کے ساتھ سفر کی تیاری شروع کر دی۔ سب سے پہلے اُس نے ڈپٹی کمشنر کو ذاتی طور پر ملنے والے ملازمین کی لسٹ تیار کی۔ جس کی تعداد پینتیس کے لگ بھگ تھی۔ اِن میں خاص کر، سائیس، دھوبی، خانساماں، بھنگی، باورچی، مالی، گھسیارا، چڑی مار، قصاب، مچھیرا، ماشکی، مالشیا، حلوائی، سگ پرور، بٹیر باز، مرغ باز، اور اسی طرح کے نجانے کیا کیا الا بلا نوکروں کی پلٹنیں تھیں۔ یہ تو باقاعدہ نجی ملازم تھے۔ ورنہ تو اب پورا ضلع ملازم ہونے والا تھا اور کسی کی کیا جرات کہ اُن کی مرضی کے خلاف پر بھی مارتا۔ ولیم اِسی خوشی میں نولکھی کوٹھی پر پہنچا اور سب دوستوں کو بلا کر ایک لمبی دعوت سے سرفراز کیا۔ جانسن صاحب نے (جو ایک سال پہلے ریٹائرڈ ہو چکے تھے) اپنے تجربات کی تھکا دینے والی کہانیاں سنائیں اور ایسی ایسی نصیحتوں کی زنبیلیں کھولیں، جو اگرچہ بوسیدہ ہو چکیں تھیں، پھر بھی ولیم کو سننی پڑیں کہ یہ کچھ دیر کی کوفت اُس کے والد کے لیے طمانیت کا باعث تھی۔ جانسن کے لیے ویسے بھی یہ ایک ایسی خوشی تھی، جس کا نہ ملنا ایک طرح کی بے توقیری تھی، کہ پشت در پشت ملنے والی کمشنری اگر کسی جگہ رک جاتی تو خاندان کو بٹہ لگ جاتا۔ اِس لیے جانسن صاحب ولیم سے بھی زیادہ پُرجوش تھے اور دوستوں کو اپنے خاندان کے قصے لطف لے لے کر سنا رہے تھے۔ اگر ولیم کے ڈپٹی کمشنر بننے کی کہانی اندر سے کھولی جاتی تو کہیں جانسن صاحب کی بارآور کوششیں درمیان میں موجود تھیں۔ دعوت میں پادریوں سے لے کر ڈپٹی کمشنروں تک سب جمع تھے، جنہیں جانسن صاحب کو اپنا نام و نمود دکھانا منظور تھا۔ دعوت کے بعد ولیم بلا تاخیر افسرانہ اعزاز کے ساتھ روہتک کی طرف روانہ ہو گیا اور سیدھا ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں جا کر دم لیے۔ جو چند دن پہلے اُس کے لیے خالی کر کے، اُس میں ولیم کا ذاتی سامان لگا دیا گیا تھا۔

یہ بنگلہ ایک طرح کا گورنر ہاؤس ہی تھا۔ وہ بڑی بڑی پیلے رنگوں کی دیواریں اور دیواروں کے اندر سفید انڈے کی طرح کا اونچا سا بنگلہ، جس کے بے شمار کمرے، مہمان خانے، ڈائیننگ روم، ڈرائینگ روم اور دوسرے کمرے تھے۔ اِن کے علاوہ کئی چبوترے، سہ دریاں، بارہ دریاں اور شش دریاں سفید رنگوں میں ایک کے بعد ایک بنگلے کے کھلے صحنوں میں ہنس رہی تھیں۔ یہ سب تو ایک طرف، ولیم بنگلے میں اُترا تو اُس کا استقبال کرنے کے لیے آدھا شہر وہاں موجود تھا۔ دو ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، ضلع کی پانچوں تحصیلوں کے تحصیلدار، نائب تحصیلدار، پولیس کے افسر اور نہ جانے کس کس شعبے کے لوگ تھے۔ ان سرکاری لوگوں کے علاوہ شہر کے بڑے اور امیر لوگوں کی الگ کھیپ

سلام کرنے کے لیے پہنچی ہوئی تھی۔ ولیم نے ان سینکڑوں افراد کے مجمعے کو دیکھا، جو اُسی کی خاطر کھڑے تھے، تو چند لمحوں کے لیے اُس کے اندر رعونت نے بھرپور پھریری لی۔ لیکن اِس طرح کے معمولات وہ اپنے باپ دادا کے ساتھ دیکھ چکا تھا، اِس لیے زیادہ فرق نہ پڑا اور وہ پہلی حالت میں آگیا۔ لوگ بہت زیادہ تھے لیکن ولیم نے ترتیب میں کھڑے ہوئے آٹھ دس سے ہی ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔ اسی طرح ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر جان میکن نے بھی چند لوگوں کا تعارف کرا کے باقی کو نظر انداز کر دیا۔ وہ جان گیا تھا، صاحب اِس وقت تھکے ہوئے ہیں اور جلدی مجمع اپنے سے دور کر دینا چاہتے ہیں۔

روہتک میں کافی عرصے سے ڈپٹی کمشنر کی جگہ پر اسسٹنٹ کمشنر ہی کام کر رہا تھا۔ یہاں کسی کو اتنی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی اور کام بخوبی چل رہا تھا لیکن اچانک جنگ کی وجہ سے ہنگامی حالات پیدا ہوئے تو اس آسامی کو پُر کرنے کا خیال آگیا اور قرعہ ولیم کے نام نکل آیا۔

تعارف کے بعد ولیم نے جلد ہی سب کو رخصت کر دیا تاکہ دوسرے دن مکمل آزادی کے ساتھ اگلے اقدام کا بندوبست کیا جائے۔

دوسرے دن ولیم ڈپٹی کمشنر ہاؤس پہنچا تو عمارت کو اندازے کے مطابق نہایت پُر شکوہ پایا۔ دور تک بلند و بالا کمرے ہی کمرے اور کھلی راہداریاں۔ ولیم کا اپنا کمرہ جلال آباد والے سے دگنا تھا۔ انتظامیہ کا پروٹوکول بھی کمال تھا۔ مگر اِس کے باوجود ولیم کو یہاں کچھ خلا سا محسوس ہو رہا تھا۔ جس کی فی الحال نشان دہی تو نہیں ہو رہی تھی لیکن کچھ ایسا ضرور تھا، جسے ولیم سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ یہاں اُس کا، پی اے، ایک راجپوت رانا دھنپت رائے تھا، جو شائستہ اور صاف ستھرا پچاس سال کی عمر کے لگ بھگ کا شخص تھا۔ اُس کی مونچھیں ضرور تھیں لیکن ایسی، جس سے ولیم کو کسی قسم کی تکلیف پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ سر پر کُلّے دار پگڑی نے مونچھوں کو مزید بارعب بنا رکھا تھا۔ رائے دھنپت صاحب اردو کے ساتھ انگلش بھی اچھی طرح سمجھتا اور بولتا تھا۔ ولیم کو پہلے دن ہی اُس کی لیاقت کا اندازہ ہو گیا۔ اُس نے اُسے جتنی ہدایات دیں، اُن پر اس قدر پھرتی سے عمل کیا کہ خود ولیم بھی دنگ رہ گیا۔

ولیم نے دوسرے روز ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنرز اور تمام تحصیلداروں کا اجلاس طلب کیا اور کام کے آغاز کے بارے میں منصوبہ بندی کرنے لگا۔ اُسے ایک بات کا اطمنان تھا کہ اب اُسے بہت سے کاموں میں آزادی ہو گی۔ وہ اُن کے

بارے میں کسی کو جواب دہ نہیں ہو گا۔ وہ بے دھڑک اُن کو نبٹانے کی طرف توجہ دے گا اور جو کام اپر وول کے محتاج ہوئے، وہ آہستہ آہستہ بھی آگے بڑھتے رہے تو مضائقہ نہیں۔ ولیم نے پہلے ہی اجلاس میں اپنی گزارشات کی وضاحت کر دی اور تمام تحصیلوں کے ذمہ دار افسروں پر واضع کر دیا کہ اُسے صرف تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ اول تعلیم کے بہتر نتائج، دوم معاشی ذرائع کا پیدا کرنا اور سوم گورنمنٹ کے لیے خراج کے نظام کو مزید بہتر بنانا۔ یہ اُن کی پہلی ترجیحات ہیں۔ اِن کے علاوہ تمام کام ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضلعی گزٹ کے مطابق، جس کا مطالعہ کئی روز پہلے ولیم کر چکا تھا، روہتک میں امن وامان کے حوالے سے زیادہ خرابی نہیں تھی۔ لوگوں میں اکڑ پھکڑ کافی تھی لیکن بڑے پیمانے پر شر پسندی پھیلانے کی جرات ابھی تک پیدا نہ ہو سکی تھی، نہ ہی آگے توقع تھی۔ اس لیے ولیم نے اس معاملے پر بات کرنے کی زحمت نہیں کی اور ہدایات دے کر اجلاس ختم کر دیا۔ آفیسرز، جنہیں ابھی تک روہتک میں کسی ڈپٹی کمشنر نے ڈیل نہیں کیا تھا، کو بھی ولیم کے انداز گفتگو سے واضح ہو گیا کہ اب بڑے افسر کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ میٹنگ کے انجام پر اُنھوں نے بھی کام کرنے کے انداز میں تبدیلی لانے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد ولیم کو محسوس ہوا، وہ جو سوچ رہا تھا، اتنا آسان نہیں تھا۔ اب اور طرح کی مجبوریاں سامنے دکھائی دینے لگیں۔ اُسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ حالات میں بڑے پیمانے پر تبدیلی شروع ہو چکی ہے۔ اچانک مسلم لیگ اور کانگرس کے جلسے چل نکلے تھے، جن سے اُسے پہلے ہی بہت زیادہ کوفت ہوتی تھی۔ وہ اُن کو روکنے کا اختیار بھی نہیں رکھتا تھا۔ کئی بار دفعہ چوالیس کا نفاذ کر کے اس طرح کے جلسوں کا ناطقہ بند بھی کیا لیکن صاحبانِ جلسہ کہیں اُوپر سے احکامات حاصل کر کے لے آتے اور آزادی کی بکواس شروع کر دیتے۔ ولیم کو بعض اوقات ان سے وحشت محسوس ہوتی۔ ولیم کو اس بات پر شدید غصہ آتا کہ ان کے بڑے اصل میں انگریزوں کو نکال کر اپنی حکومت چاہتے ہیں۔ اُس کے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے آنے شروع ہو جاتے۔ وہ سوچتا، کیا یہ ہندوستانی اُسے بھی نکال دیں گے؟ حالانکہ اُن کے خاندان کو یہاں پورے ڈیڑھ سو سال ہو گئے ہیں۔ بعض اوقات ولیم دل کو دلاسا دینے کے لیے کہتا، یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ جو حکومت اتنی جدوجہد اور طاقت سے حاصل کی گئی ہے، اُسے انگریز اتنی آسانی سے اِن گنواروں کے سپرد نہیں کریں گے۔ جن کے پاس نہ تعلیم ہے اور نہ حکومت چلانے کا تجربہ ہے۔ وہ خیال کرتا، اصل میں یہ سب کچھ جنگ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ان خیالات اور اندیشوں کے باوجود ولیم اپنے تئیں کچھ نہ کچھ

کرنے میں جتارہااور کافی سارے نتائج حاصل بھی کر لیے مگر چند مہینوں میں حالات کے پیشِ نظر ولیم کو اندازہ ہو گیا کہ اُس کے جنگ کے متعلق اندازے ٹھیک نہیں تھے۔ وہ طول پکڑتی جارہی تھی۔ اِدھر اُس کے اختیارات کی کڑیاں آہستہ آہستہ ٹوٹتی جارہی تھیں۔ مقامی اور کالوں کی جراتیں بڑھ رہی تھیں اور بعض احکامات پر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ عمل کرنے پر مجبور تھا، جو ہندوستان کی آزادی اور کالوں کے وافر حقوق کے متعلق ہوتے۔ ولیم نے حالات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیا تو اُسے لگا، اُوپر کی سطح پر کہیں گڑبڑ ہو چکی ہے۔ اُس کی بھیجی ہوئی فائلیں یا تو بغیر اپروول کے واپس آرہی تھیں یا اُن میں بلاوجہ کی تاخیر ہو رہی تھی۔ کبھی بجٹ کا بہانہ کر کے، کبھی کہ دیا جاتا، حکومت کی اِس کام میں ترجیح نہیں ہے۔ پھر وہ جلد ہی بہت کچھ جان گیا اور اُسے پتا چل گیا کہ اس وقت پورے ہندوستان کی انتظامیہ اِسی طرح چل رہی ہے۔ جس میں اُس کا کام بھی عبوری سطح کا اور ہنگامی بنیادوں پر ہو گیا تھا۔ اس حالت میں اُسے ایک سال گزر گیا۔ اس دوران کام کی بڑھتی ہوئی یکسانیت نے اُس کی طبیعت کو تباہ کر دیا۔ اِن حالات میں کیتھی اُسے اِدھر اُدھر سے ہر وقت دلاسا دینے میں لگی رہتی اور پل پل کا خیال رکھتی۔ لیکن اسے کمشنری کی جتنی خوشی ہونی چاہیے تھی، وہ سب غارت ہو کے رہ گئی۔ اِس وقت کمشنری کے اختیارات اُس کے لیے ایک ایسا خواب ہو گئے تھے، جن میں مناظر تو نظر آتے ہیں لیکن خواب دیکھنے والا اُن مناظر کو نہ چھو سکتا ہے، نہ اُن سے لذت حاصل کر سکتا ہے۔ ایک تو یہ ایسی گائے کا دودھ تھا، جو جنگ کی وجہ سے ہر کس و ناکس کو پلا دیا گیا۔ دوئم، اِس شاہانہ عہدے کے ساتھ کچھ ایسی ہدایات نتھی کر دی گئیں، جو کسی طرح بھی ڈپٹی کمشنر جیسی پُر وقار ذات کے لیے جائز نہیں تھیں۔ بجائے اِس کے، کہ ڈپٹی کمشنر اپنے ضلع میں بلا شرکتِ غیرے، جیسا کہ وہ سوچ رہا تھا، حکمرانی کرے، اُسے بریگیڈیروں اور جنرلوں کی ہدایات پہنچنا شروع ہو گئیں اور سخت سے سخت حکم وصول ہونے لگے۔ مثلاً ضلع سے جتنے جوان ہو سکیں، فوج میں بھرتی کے لیے بھیجے جائیں۔ غلہ کو ذخیرہ کر کے اُس کا حساب پہنچایا جائے۔ زیادہ سے زیادہ خراج اور مالیہ وصول کیا جائے۔ ٹیکسوں میں اضافہ کر دیا جائے۔ بعض اوقات تو یہ حکم نامے کمشنر آفس سے آنے کے بجائے ڈائریکٹ ہی وصول ہونے لگے، جو ولیم کے لیے اس قدر آزار کا باعث تھے کہ اُسے اپنا یہ عہدہ ایک چپڑاسی سے بھی بد تر معلوم ہونے لگتا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر وہ کس کے ماتحت ہے؟ آیا اپنے ڈویژن آفس کی سول انتظامیہ کا، جہاں سے اصولی طور پر اُسے تنخواہ ملتی ہے یا پھر میرٹھ چھاونی کا، جہاں کے فوجیوں کی حیثیت اُس کے سامنے ایک گنوار زبان استعمال کرنے والے جانوروں کی تھی۔ ولیم کبھی کبھی خیال کرتا، اِس سے تو بہتر اُس کے وہی دن تھے، جب

وہ جلال آباد میں اسسٹنٹ کمشنر تھا اور ہیلے کا ماتحت تھا۔ اُسے ہیلے، اپنے باپ اور اُن ڈپٹی کمشنروں پر رشک آنے لگا، جو وقار کو تباہ کر دینے والی جنگ سے پہلے ریٹائر ہو کر عزت بچا چکے تھے۔ اِس کے باوجود ولیم دل کو دلاسا دینے کے لیے سوچتا کہ مصیبت کے دن تھوڑے ہی ہیں، گزر جائیں گے تو اُن کی افسری کی شان میں بھی پہلے والی چمک دمک آجائے گی۔ مگر اُسے پھر آزادی کے متوالوں کے بے ڈھنگے مطالبوں کی یاد آجاتی جو روز بروز بڑھ رہے تھے اور منظور بھی ہو رہے تھے۔

ایک طرف درج بالا بکواسیات تھیں، دوسری طرف روہتک کا ماحول ولیم کے لیے انتہائی اذیت ناک تھا۔ اُسے روہتک میں ڈیڑھ سال کے قریب گزر چکا تھا۔ یہ عرصہ اُس کی طبیعت کو اچاٹ کر دینے کے لیے ہر دن نئی بیزاری لے کر آتا اور ولیم کی نحوست میں اضافہ کر دیتا۔ یہ ضلع دہلی کے مغرب میں چالیس یا پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر ایک خشک شہر تھا، جس کے مضافات میں مٹی کے ٹیلے، عک اور ببول کی جھاڑیاں حد نظر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ شہر کے ساتھ ساتھ پختہ اینٹیں بنانے والے بھٹوں کی کثرت تھی۔ اُن کی چمنیوں سے اُٹھنے والا دھواں ہر وقت شہر پر سایے بلند کیے رکھتا۔ اُن سایوں کے بیچ اُڑتی ہوئی چیلیں چکر کاٹتی رہتیں، کبھی بلندی پر اور کبھی بالکل چھتوں کے اُوپر۔ شہر کی عمارتیں زیادہ تر پکی اینٹوں کی اور پُرانے دور کی یاد دلانے والی تھیں۔ اُن پر کام اگرچہ بہت نفاست سے کیا گیا تھا لیکن اب وہ اکثر جگہ سے خراب ہو رہا تھا۔ شہر کی قریباً ساری آبادی نہ جانے کون سی زبان بولتی تھی اور کس کلچر سے تعلق رکھتی تھی۔ راجستان سے روز کی اُٹھنے والی آندھیوں نے اُس پر مزید کام دکھایا تھا۔ آئے دن شہر کے در و دیوار گرد و غبار کی تہوں میں دب جاتے۔ مضافات میں اُڑتی ہوئی ریت اور دھول نے ہر چیز کو مٹیالا بنا دیا تھا۔ لوگوں کے چہرے بھی اسی مٹی، خشکی اور دھول کے باعث اتنے بے رونق ہو چکے تھے کہ ولیم کو جلال آباد کے لوگ اِن کے مقابلے میں نہایت خوبصورت لگنے لگے۔ کڑوا تمبا کو اِن کی مرغوب غذا تھی۔ آٹھوں پہر میں کوئی لمحہ ہوگا کہ اُن کے بوڑھے، جوان حتیٰ کہ بچے بھی اس لعنت میں گرفتار نہ ہوں۔ تمبا کو کے کثیف اور مسلسل دھویں سے اُن کی مونچھیں اور داڑھیاں بھوری، زرد اور بدبودار ہو چکی تھیں اور وہ اُسی ابکائی پیدا کر دینے والے رنگوں سے مانوس تھے۔ یہ لوگ نہایت سوکھے سڑے، لمبی مونچھوں، چھوٹی قامتوں، باریک آنکھوں اور چھوٹے چھوٹے پاؤں کے ساتھ دھوپ

اگاتی سڑکوں پر آتے جاتے نظر آتے۔ بعض دفعہ ولیم اِن کے رنگ برنگے چیتھڑوں اور ٹاکیوں سے سیے گئے بستروں کے بارے میں غور کر کے کانپ جاتا، جو اُس نے دیکھے تو نہیں تھے، لیکن اِن لوگوں کی ظاہری حالت سے ہی اُن بستروں کی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ جن میں دوپہر کی گرمی نکلنے تک پڑے سوتے یہ لوگ پیٹ کی بودار کثیف ہوائیں چھوڑتے رہتے اور اُن کو خود ہی سونگھتے رہتے۔ ولیم کو اُن کی دھوتیوں پر ہرگز اعتراض نہ ہوتا، اگر وہ اصل میں دھوتیاں ہی ہوتیں۔ وہ تو محض بے کار چیتھڑے تھے، جو ہمیشہ اُن کے گھٹنوں سے اُوپر اُٹھے رہتے۔ اُن چیتھڑوں کا ایک پلو نیچے سے کھینچ کر مزید پیچھے گانڈ کی طرف سے باندھ لیا جاتا، جو ایک کچھا سا بن کر رہ جاتا اور وہ رانگڑ اُسی کچھے میں ننگا دندناتا پھرتا۔ بعض اوقات وہ کچھا اتنا چھوٹا ہوتا کہ اُس کے سُکڑے ہوئے سیاہ چوتڑ صاف نظر آتے۔ ولیم یقیناً اُن کا لباس، عادات اور زبان بدلنے پر قادر نہ تھا لیکن وہ چاہتا تھا، کم از کم جس سے بھی اُس کی ملاقات ناگزیر ہو، وہ انسانوں کی حالت میں اُس کے پاس آئے۔ ولیم نے اپنے عملے کو ملاقات کے لیے ضروری ہدایات جاری کر دیں کہ ملاقاتی اپنے لباس میں پاجامہ اور کُرتہ کا اہتمام کرے۔ اسی طرح دیسی چمڑے کے جوتوں کی بجائے انگلش جوتے پہن کر آئے یا کم از کم جوتوں کے اندر اُس کے پاؤں سرسوں کے تیل اور مٹی میں غچ غچ نہ ہوں، نہ جوتوں کے چمڑے سے چرر چرر کی آواز پیدا ہو۔

لوگوں کی بد شکلی کے علاوہ ولیم کو روہتک کے مضافات سے بھی وحشت آنے لگی۔ کوسوں تک سبزے کی ایک پتی بھی نہیں تھی۔ نہ کوئی نہر اور پانی کا انتظام نظر آ رہا تھا۔ کچھ تھا، تو تمباکو کی سر سری فصلیں، جو اِن لوگوں کے رزق کا واحد سہارا تھیں۔ تمباکو کی اسی بہتات کی وجہ سے ہر شخص کے ہاتھ میں اپنا ایک حقہ تھا، جسے وہ ہر وقت گُڑگڑاتا رہتا۔ شہر کی منڈی معمول کے مطابق ہندووں کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمان یہاں بھی محض حقے پر گزارہ کیے ہوئے تھے۔ کلچر دونوں قوموں کا ایک ہی تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ جو مسلمان تھے، اُن میں مسلمانوں والی کوئی بات نہیں تھی، سوائے مفلسی اور غربت کے۔ جسے دور کرنا ولیم کے بس سے باہر تھا۔ یہاں اِتنے مسائل اور حکومت کی طرف سے عدم دلچسپی دیکھ کر ولیم کا دل چھوٹ چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا، جتنی جلدی ہو سکے، اُس کو دہلی کے مضافات سے نکال کر جالندھر، لاہور یا ملتان ڈویژن کے حوالے کر دیا جائے مگر جو کام کرنے کے لیے اُسے یہاں تعینات کیا گیا

تھا،اُس کا ٹارگٹ حاصل کرنا بھی ضروری تھا۔ جس کے لیے ولیم نے بہر حال اپنی سی کوشش ضرور کی اور اُس میں کامیاب بھی ہوا۔ سچ پوچھیں تو یہ ضلع اِس کام کے لیے ویسے بھی مناسب ترین تھا۔ وسطی پنجاب یا فیروز پور سے لوگوں کو برطانوی فوج میں لے جانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ وہاں لوگوں کی روٹی پوری ہو رہی تھی۔ دریاؤں کے ارد گرد بیلے، چراگاہیں اور فصلیں اُن لوگوں کی زیادہ نہ سہی، بنیادی ضروریات پوری کر رہی تھیں۔ جبکہ روہتک اور راجستان جیسے علاقوں میں بھوک اور ریت کے بگولوں کے سوا کچھ نہیں تھا، یا پھر مونچھیں تھیں کہ اُگی چلی جاتی تھیں۔ چنانچہ ولیم کی طرف سے فوج میں بھرتی کے اعلان کے ساتھ ہی ہزاروں لوگ بھاگے چلے آئے۔ جنہوں نے انگریزی وقار کو میدانِ جنگ میں مزید برقرار رکھنے کے لیے اپنی مونچھوں کے تاؤ اور زیادہ کر دیے تھے۔ ایک ایک دن میں دو دو سو لوگوں کی بھرتی ہونے لگی اور چند مہینوں میں ہزاروں لوگوں کو انگریزی ٹوپیاں پہنا کر محاذوں پر بھیجنے کے لیے ریوڑوں کے ریوڑ تیار کر لیے گئے۔ یہ اتنی بڑی اور شاندار کامیابی صرف جہلم، روہتک یا راجستان ہی سے حاصل ہوئی تھی۔ باقی تمام اضلاع میں اتنی نفری کسی بھی علاقے سے نہیں مل سکی تھی۔

اِدھر ولیم کے یہ حالات تھے، اُدھر جرمنی کی حوصلہ افزائی پر سویت یونین نے جون انیس سو چالیس میں بالٹک ریاستوں پر قبضہ کر کے اُنہیں باقاعدہ طور پر اپنے ملک کا حصہ بنا لیا۔ اٹلی، جو اتحاد (جرمنی کے حلیف ممالک) کا رُکن تھا، وہ بھی اس جنگ میں شریک ہو گیا۔ تیرہ اگست سے اکتیس اکتوبر انیس سو چالیس تک جرمنی نے انگلستان کے خلاف ہوائی جنگ شروع کی اور اُس میں شکست کھائی۔ اِس جنگ کو بیٹل آف برٹن یعنی برطانیہ کی لڑائی کہا جاتا ہے۔

مئی انیس سو بیالیس میں جب ولیم روہتک سے ہندوستانی راجپوتوں کو فوجی بھرتی کروانے میں لگا ہوا تھا، برطانوی شاہی فضائیہ نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر پہلی بار جرمنی کے اندر جنگ کرتے ہوئے ہزاروں بمبار جہازوں سے بمباری شروع کر دی اور جرمنی کے بیشتر شہری علاقوں کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا۔ انیس سو بیالیس کے اختتام اور انیس سو تینتالیس کے شروع میں اتحادی فوجوں نے شمالی افریقہ میں سلسلہ وار زبردست فوجی کامیابیاں حاصل کیں۔

افریقہ میں ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ نفری پر مشتمل مخالف فوجوں کے اتحاد نے مئی انیس سو تینتالیس میں ہتھیار ڈال دیا۔

اِدھر ولیم کا تبادلہ کانگرا کر دیا گیا، جہاں اُسے بالکل اِنہی حالات کا سامنا ہوا جیسا روہتک میں چل رہے تھے۔ یہاں ولیم نے ایک سال گزارا اور اگلے سال اُسے ریاست کپور تھلہ کے پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر متعین کر دیا۔ یہاں تک کہ اگست انیس سو پینتالیس میں برلن میں جرمنی کے ہتھیار ڈال دینے پر جنگ ختم ہو گئی۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی ہندوستان میں برطانوی حکومت کے دن گنے جا چکے تھے۔ جس کا احساس ولیم کو ایک سال پہلے ہو گیا تھا مگر ابھی شاید اُسے یقین تھا کہ یہ کام کہیں اُس کی ریٹائر منٹ کے قریب جا کر ہو سکے گا۔ اُنہی دنوں ولیم کا تبادلہ بطور ڈپٹی کمشنر گُرداسپور کر دیا گیا اور ہزار کوششوں کے باوجود اُسے منٹگمری نہیں بھیجا گیا۔ اِس بارے میں ولیم نے نہایت اہم سفارشیں بھی کروائیں۔ لیکن جب اُسے اس معاملے میں شدید ناکامی ہوئی تو وہ سوچنے لگا کہ منٹگمری میں اُس کی پوسٹنگ ایک خواب ہی ہو کر رہ جائے گی کیونکہ معاملات ہر دن مزید بگڑتے جا رہے تھے۔ ان حالات میں ولیم کی ذہنی کیفیت اتنی تبدیل ہو گئی کہ قریب کے جاننے والوں کو اُس پر شبہ ہونے لگا، کہیں پاگل نہ ہو جائے۔ بات بات پر اُلجھنا، احکام دیتے ہوئے تحمل کو چھوڑ بیٹھنا اور بعض اوقات سامنے والے کو گالی بھی دے دینا ولیم کی عادات میں شامل ہو رہا تھا۔ اِس بات کی سب سے زیادہ تشویش کیتھی کو تھی، جو سب سے زیادہ یہ عذاب جھیل رہی تھی مگر وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ اُسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ یہ سب کچھ ولیم سے مستقبل میں پیدا ہونے والے حالات کے پیشِ نظر ہو رہا ہے۔ ولیم کے ہاتھ سے اختیارات کی ڈور روز بروز نکلتی جا رہی تھی اور گورنمنٹ کی طرف سے وصول ہونے والے ہر نئے حکم پر اُس کے چڑچڑے پن میں اضافہ ہو جاتا، جو کئی دن تک برقرار رہتا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا، ہٹلر نے گورنمنٹ برطانیہ کی ہڈیوں کا تمام گودا کھینچ لیا ہے اور اب اُن کے پاس نوآبادیات میں اپنا اقتدار قائم رکھنے کی نہ طاقت ہے اور نہ ہی جواز۔ خاص کر ہندوستان کی حالت اس معاملے میں بہت مختلف تھی۔ اتنے بڑے اور وسیع خطے کو کنٹرول کرنے کے لیے اُن کے پاس وقت بھی نہیں بچا تھا اور نہ وسائل۔ کیونکہ سو سال میں اکٹھی کی گئی دولت پانچ ہی سالوں میں ٹھکانے لگ گئی تھی اور وہ اس ماشکی کی طرح خالی ہو گئے تھے، جس کی مشک

میں چھید ہو گئے ہوں، کہ گہرے کنویں سے مشک کی لمبی رسی کھینچتے کھینچتے جس کے ہاتھ شل ہو جائیں مگر مشک کا سارا پانی اس عرصے میں دوبارہ اُسی کنویں میں بہ جائے۔ ان باتوں کے علاوہ جو مشکل سب سے اہم تھی وہ یہ کہ اب ہندوستانی بھی پہلے والے نہیں رہے تھے۔ اب یہ لوگ چالاکی اور عیاری میں گوروں کے بھی کان کاٹتے تھے اور اِس چکر میں تھے، کب انگریز یہاں سے نکلیں۔ ایسے میں انہیں آزاد نہ کرنا ایسے ہی تھا، جیسے بغیر ہتھیار کے بھیڑیے کے ساتھ رات گزاری جائے۔ اس ساری صورت حال میں ولیم نہ صرف یہ کہ ہندوستانیوں سے ناخوش تھا بلکہ انگریزوں سے اور اپنے آپ سے بھی ناراض تھا۔ وہ یہ سب کچھ ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس وقت تو اُسے اور بھی غضب آتا، جب وہ کسی انگریز کو ہندوستان چھوڑنے کے متعلق گفتگو کرتے دیکھتا، یا اُسے پتا چلتا، اُس کا فلاں دوست اپنا بوریا بستر سمیٹ کر انگلستان جا رہا ہے۔ ولیم کا اُس وقت خون کھولنے لگ جاتا گویا یہ سب اُس کے خلاف سازش تھی جس میں انگریز، مسلمان، ہندو سب شامل تھے۔

جاری ہے

قسط نمبر 25

(43)

غلام حیدر اپنی روپوشی کے دن مستقل مزاجی سے گزار رہا تھا اور وطن واپسی کے لیے کسی معجزے کا منتظر تھا۔ اُسے جلال آباد سے نکلے دس سال ہو چکے تھے۔ اُس کے لیے اتنے طویل عرصہ کی روپوشی قید سے کم نہیں تھی مگر کیا کرتا؟ دوسری صورت میں تو فوراً سزائے موت تھی جبکہ غلام حیدر کو ابھی اپنی زندگی عزیز تھی۔ وہ بلاوجہ ریشمی رسہ گلے کی زینت نہیں بنانا چاہتا تھا۔ پہلے ایک دو سال اُسے جلال آباد اور لاہور بہت یاد آتے رہے۔ اُس کے بعد دل کو ٹھہراؤ آنے لگا اور وہ روپوشی کی جگہ کو گھر تصور کرنے لگا۔ اُس کی اطلاع سوائے نواب ممدوٹ کے کسی کو نہ تھی۔ حتیٰ کہ غلام حیدر کے عزیز ترین رشتہ داروں کو بھی۔ اُس نے اپنی والدہ کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا، جس کے اصرار پر وہیں شادی بھی کر لی اور کچھ نواب صاحب کا خرچہ کچھ اپنی بچی کھچی دولت کو احتیاط سے برت رہا تھا، جو پانچ کلو سونے اور ایک لاکھ چاندی کے روپوں کی شکل میں تھی۔ یہ دولت غلام حیدر نے سودھا سنگھ کے قتل سے پہلے ہی ٹھکانے لگا دی تھی۔

یہ جگہ، جہاں غلام حیدر روپوش تھا، پنجاب سے باہر کشمیر کے دور دراز کے علاقے میں تھی۔ جہاں نہ تو سواری جاتی تھی اور نہ ہی پیدل کسی میں طاقت تھی۔ یہ ایسا دشوار گزار علاقہ تھا، جس کے شمال جنوب کی خود غلام حیدر کو بھی خبر نہ تھی۔ اُس رستے کو وہ خود اکیلا بھی طے نہ کر سکتا تھا۔ اُس کا یہ گھر دریا کے کنارے چھوٹی سی بستی میں تھا، جس کے مالکانہ حقوق نواب ممدوٹ کی ماں کے پاس تھے، جو اَب نواب ممدوٹ کو منتقل ہو چکے تھے۔ وہاں کی مقامی آبادی بھی ایک طرح سے نواب ممدوٹ کی رعیت ہی تھی۔ نواب صاحب سال بعد یہاں چکر لگا جاتے تھے اور غلام حیدر کو دلاسے کے ساتھ جلال آباد، غلام حیدر کی رعیت، کیس کی نوعیت اور علاقے کی پوری صورت حال کے بارے میں آگاہ کر جاتے تھے۔ سچ پوچھیں تو اِس تنگی کے پورے عرصے غلام حیدر کی دوستی کا نواب ممدوٹ نے حق ادا کر دیا تھا۔ خرچے پانی کے علاوہ کسی چڑیا کو بھی پتا نہیں چلنے دیا کہ غلام حیدر کہاں ہے۔ اس بات کا غلام حیدر کو دل ہی دل میں احساس تھا اور وہ چاہتا تھا، کسی طرح اِس احسان کا بدلہ اُتارے مگر وہ دن بھی نواب کی کوششوں کے بغیر نہیں آسکتا تھا۔ زندگی کے دن گزرتے جا رہے تھے اور کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اِدھر عدالت نے اُس کی غیر حاضری

میں اُسے سزائے موت سنادی تھی۔ جس کی اپیل کا وقت بھی مدتیں ہوئیں گزر چکا تھا۔ اِس کے باوجود نواب ممدوٹ غلام حیدر کو مسلسل دلاسے دیے جا رہا تھا کہ وہ اُس کی معافی کی کوشش کر رہا ہے، جس کا وقت بہت قریب ہے۔ ان دلاسوں کی شدت پچھلے ایک سال سے کافی زیادہ ہو گئی تھی۔ غلام حیدر پہلے پہل تو یہی خیال کرتا رہا تھا کہ وہ کبھی جلال آباد واپس نہیں جا سکے گا۔ مگر نواب افتخار ممدوٹ نے جو کچھ صورت حال انگریزوں اور ہندوستان کی بتائی تھی، اُس سے ثابت ہوتا تھا، واقعی کچھ نہ کچھ خدا راہ نکالنے والا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ تو اُسے یقین ہونے لگتا کہ یہ انقلاب صرف اور صرف اُسی کے لیے برپا ہونے والا ہے۔ جس میں سراسر دخل اُس کی ماں کی دن رات تہجد کی دعاوں کا ہے۔ اِسی عرصہ میں غلام حیدر کے دو بیٹے بھی پیدا ہو چکے تھے۔ جن میں سے ایک کی عمر چار سال تھی اور ایک دو سال کا تھا۔ رائفل اب بھی غلام حیدر کے پاس تھی، جو اُسے مسلسل وہ دن یاد دلاتی، جس دن اُس نے سردار سودھا سنگھ کا نقشہ برباد کیا تھا۔ وہ اُس واقعے کو یاد کر کے پُر سکون سا ہو جاتا۔ حالانکہ اُسے یہ بالکل خبر نہیں تھی کہ امیر سبحانی نے اُس کی بہادری پر ایک نہایت دلچسپ کسشری تیار لی تھی۔ جسے اُس نے جلال آباد اور فیروز پور کے علاوہ دور نزدیک کی دوسری تحصیلوں کے دور دور گاؤں تک بھی پھیلا دیا تھا۔ وہ یہ قصہ لوگوں کو بڑے دلنشیں انداز میں سنا سنا کر اپنی روزی روٹی کا بھی سامان پیدا کر لیتا۔ اُس کسشری کی وجہ سے ہر گھر میں غلام حیدر کا تذکرہ ایک سورمے کی حیثیت اختیار کر گیا۔ لوگ بڑے فخر سے اُسے اپنی بیٹھکوں اور چوپالوں میں سُنتے۔ غلام حیدر پنجاب کے ان لوگوں کے لیے ایک ایسا اسطیری ہیرو بن گیا، جس کی بندوق امیر حمزہ کی تلوار کی قائم مقام بن چکی تھی۔ اِدھر غلام حیدر سب کچھ سے بے خبر اِس کوہ قاف میں نواب صاحب کی آمد کا شدت سے منتظر رہنے لگا، جسے اب آئے ہوئے دس ماہ ہو چکے تھے۔ اُس کے علاوہ اس جگہ پر کسی دوسری خبر کا پہنچنا جوئے شیر کے پہنچنے سے کم نہیں تھا اور دن تھے کہ عمر کی طرح مسلسل نکلے جا رہے تھے۔ اِس بار اُسے اس لیے بھی انتظار زیادہ تھا کہ جب سے اُس کی آزادی کا گمان یقین میں بدلا تھا، بے چینی اور اضطراب بھی شدید ہو گیا تھا اور حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ خدا نا خواستہ خبر ملتی کہ روپوشی ختم نہیں ہو سکتی تو غلام حیدر اِس جگہ سے نکل کر کہیں اور جانے کی سوچ لیتا۔ بھلے اِس میں اُس کی زندگی کو خطرہ ہی ہو جاتا۔ وہ پنجاب کا رخ ضرور کرتا، جہاں دشمن اُس کی بُو کتوں کی طرح اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی سونگھ رہے تھے۔

جناح صاحب کو نواب ولاز لاہور میں ٹھہرے دو روز ہو گئے تھے اور نواب افتخار صاحب ممدوٹ کی جرات نہیں ہو رہی تھی، وہ جناح کے ساتھ اِس مسئلے پر بات کرے۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا، اگر اب بھی جناح سے اس معاملے میں بات نہ کی، پھر یہ مسئلہ کبھی حل نہ ہو سکے گا۔ یہ ایک ایسا موقع تھا کہ اس معاملے میں تھوڑی سی بھی استقامت پیدا کرے، تو کچھ ہی دیر میں سب ٹھیک ہو سکتا تھا۔ چنانچہ آج نواب افتخار نے غلام حیدر کا معاملہ جناح صاحب کے سامنے رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ نواب نے سوچا، نتیجہ جو بھی نکلے، آج کا دن ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اِنہیں خیالوں کے ساتھ اپنی کوٹھی کے وسیع لان میں چہل قدمی میں مصروف تھا۔ دل ہی دل میں وسواس اور خدشوں کو اِدھر سے اُدھر دھکیل رہا تھا اور سوچ رہا تھا، اگر آج ابا جان زندہ ہوتے تو آسانی سے اُن کے ذریعے جناح صاحب کو کہلوا دیتا۔ صبح سفید روشنی دور تک پھیلی تھی۔ یہ ٹھنڈی روشنی اور سفید صبح کتنی حسین ہو جائے، اگر یہ مسئلہ حل ہو جائے۔

جناح صاحب کچھ ہی دیر میں ناشتہ کر کے باہر نکلنے والے تھے۔ اسی انتظار میں وہ آنے والی گھڑیوں کو دیکھ رہا تھا اور اِس معاملے پر دل ہی دل میں بدل بدل کر اُن سے مکالمہ کرتا، پھر خود ہی جناح کی طرف سے اپنی باتوں کا جواب دے کر مشق کرنے لگا۔ وہ خوب جانتا تھا، جناح کا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ اگر ایک دفعہ اُنھوں نے، نہیں، میں سر ہلا دیا تو ہر چیز گڑ بڑ ہو جائے گی۔ پھر اُنہیں قیامت تک قائل نہیں کیا جا سکے گا۔ لہٰذا بات کرنے میں کہیں جھول نہ رہ جائے اور جواز جس قدر مضبوط بنا لیا جائے، بہتر ہے۔ اِسی وجہ سے نواب صاحب آج اذان کے وقت ہی اُٹھ کر ٹہلنے لگ گئے تھے اور اب تو دن صاف نکل آیا تھا۔ چنانچہ بات کے ہر پہلو پر غور کرتے ہوئے نواب افتخار اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بنا کر تیار ہو چکا تھا اور اب بے چینی سے قائد کے باہر نکلنے کے منتظر تھا۔

یہ سردیوں کے عظیم اور مصروف دن تھے۔ ہلکی ہلکی دھوپ صحن میں پر پھیلا رہی تھی، ایسے محسوس ہو رہا تھا، دھوپ نواب کی منصوبہ بندی کو تقویت دینے میں کافی مفید ہو گی۔ سردی میں اِس طرح کی دھوپ بات کرنے کے جذبے کو بڑھاوا اور تاثیر دیتی ہے۔ نواب ولاز کے اُونچے اور لمبے چھتناروں کے رہائشی پرندے، اِس ساری کشمکش سے بے نیاز بوڑھے درختوں کی شاخوں پر اِدھر سے اُدھر پھدکتے اور پر چہلیں کرتے نظر آ رہے تھے۔ اُن کے پَروں کے بال دھوپ کی روشنی میں کبھی سنہری نظر آتے، کبھی دوسرا رنگ اختیار کر لیتے۔ کافی دیر بے چینی سے ٹہلنے کے بعد نواب صحن میں پڑی صندل کی لکڑی کی کُرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا اور دل میں منصوبے کی چولیں ہر طرح سے ٹھیک

بٹھالیں۔ اِسی طرح بیٹھے، اُنہیں دس منٹ گزر گئے۔ خدا خدا کر کے جناح صاحب باہر آتے دکھائی دیے۔ نواب نے دیکھا اُن کی صحت قدموں کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ لیکن چال میں ایسی طمطراقی موجود تھی، جس کے آگے نواب تو ایک طرف گورنر تک کی شخصیت ماند پڑ جاتی۔ سُرمئی رنگ کے انتہائی نفیس اور صاف ستھرے تھری پیس سوٹ میں دُبلا پتلا جسم پُر وقار چال کے ساتھ سامنے آرہا تھا۔ پاؤں میں سیاہ جوتے ایسے متوازن تسموں سے کَسے ہوئے، اِتنے چمکدار اور داغ دھبے سے مبرا تھے کہ اُن کی چمک میں اندھا بھی اپنا منہ دیکھ سکتا تھا۔ ایسا نہیں کہ جناح کے جوتے اور سوٹ خاص لندن سے بن کر آتے تھے، اِس لیے اُن میں اتنی نفاست تھی۔ بہت سے اُمرا اور لیڈر اپنے پہننے کا سامان خاص لندن ہی میں آڈر سے بنواتے تھے لیکن اُن میں اِس طرح کی نفاست کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی، اُن کے سامنے بڑے سے بڑا پھنے خاں بھی مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا اندازہ غیر شعوری طور پر نواب ممدوٹ کو بھی تھا۔ جناح سے اُس کا تعلق ایک عرصے سے تھا۔ وہ اُس کا لحاظ بھی رکھتے تھے۔ لیکن اِس قربت کے باوجود نواب ممدوٹ کی جرات نہیں تھی، وہ جناح سے بے تکلف ہونے کی جسارت کرتا۔ یہ جسارت تو لیاقت علی خاں وغیرہ بھی نہیں کر سکتے تھے اور جنہوں نے کی تھی، وہ برصغیر کے مسلمانوں کی نظر میں اِس طرح بے وقار ہو کر رہ گئے گویا اُن کا وجود ہی نہ ہو۔

سگار کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے وہ کھلے لان کے مرکز کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نواب کو اُن کے عینک کے شیشوں کے اندر سے پپوٹوں کی جھریاں صاف نظر آرہی تھیں جو چہرے کو اُن کی نقاہت کے باوجود پر شکوہ کر رہی تھیں۔ جناح کو آتے دیکھ کر نواب فوراً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نہایت ادب سے اُن کے استقبال کو آگے بڑھا۔ لان کافی کھلا اور بڑا تھا، اس لیے نواب کو آٹھ دس قدم آگے جانا پڑا۔ جناح کے برابر پہنچا تو ہاتھ ملانے کی بجائے واپس ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جناح نے سگار کا دھواں ہوا کی آغوش کو سونپتے ہوئے نہائت آہستگی سے گُڈ مارننگ کہا اور بغیر قدم روکے کُرسیوں کی طرف بڑھتے چلا گیا۔ چند لمحوں بعد جناح نے کُرسی پر بیٹھ کر ایک ٹانگ دوسری کے اُوپر رکھ لی۔ اِس طرح بیٹھنے سے اُن کے جوتوں کی چمک میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ دھوپ دھند اور غبار سے بے عیب تھی اور جوتے گرد سے۔ نواب افتخار ایسے ایک طرف کھڑا ہو گیا جیسے پریشانی کے آثار چہرے سے نظر آرہے ہوں۔ لیکن جناح نے نواب کے پریشان چہرے کی طرف کچھ توجہ نہیں دی۔ وہ خموشی سے سگار پیتے رہے اور چند لمحے اِسی طرح گزر گئے۔ نواب افتخار جناح کا منتظر تھا کہ کب وہ پنجاب کی صورت حال پر بات کرے اور یہ سُرخ لوہے پر ضرب

لگائے۔ پنجاب مسلم لیگ کے لیے سب سے اہم صوبہ تھا، جس میں سکھوں اور ہندوؤں کی بڑی تعداد موجود ہونے کی وجہ سے پیچ در پیچ ہزاروں مسائل تھے۔ اُن کو حل کرنے کے لیے جس آدمی کی سب سے زیادہ اہمیت جناح کی نظر میں تھی، وہ نواب ہی تھا۔ لہٰذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ مسلم لیگ کی صورت حال پر بات کرتے ہوئے پنجاب کو نظر انداز کر جائیں اور اُس میں نواب کی مشاورت سے گریز کریں۔ کافی دیر خموش بیٹھے رہنے کے بعد جناح نے آخر سکوت توڑ دیا۔

افتخار، آپ کی طرف سے ابھی تک اپنے علاقے کے بارے میں کوئی صورت حال سامنے نہیں آئی، خموشی کیوں ہے؟
سر پنجاب میں ہر طرف حالات مسلم لیگ کے حق میں ہیں، جیسا کہ سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔ لیکن مشرقی پنجاب کے کچھ علاقوں میں پوزیشن ٹھیک نظر نہیں آتی۔ اندیشہ ہے، تحصیل جلال آباد، تحصیل مکھسر اور تحصیل فیروز پور سے ہم الیکشن ہار جائیں گے، مجھے یہی پریشانی اس وقت بھی ہے۔

ایسا کس لیے ہے؟، جناح نے نہایت اطمنان اور بغیر پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا، اُن کا یہ رویہ نواب کے بنائے ہوئے منصوبے کے لیے بہتر نہیں تھا۔

فیروز پور کی انتظامیہ کانگرس کے ساتھ مل کر ہمیں شکست سے دوچار کرنا چاہتی ہے (نواب نے اب کے اپنے چہرے پر ایک کرب ناک پریشانی طاری کر لی) پورے علاقے میں غیر تحریری طور پر ہمیں جلسے کرنے سے روکا جا رہا ہے۔ عوام پر ایک خفیہ دباؤ موجود ہے۔ کانگرس کچھ سکھ سرداروں کے ساتھ مل کر غنڈہ گردی کر رہی ہے۔
مسلمانوں کو بلاجواز ڈرایا جا رہا ہے۔ یہ عوام غریب غربا بے زمین لوگوں پر مشتمل ہیں اور زیادہ تعداد بالواسطہ طور پر سکھ زمینداروں کی رعایا ہیں۔ یہ لوگ ووٹ تو مسلم لیگ کو ہی دینا چاہتے ہیں، لیکن ڈر کی وجہ سے ہو سکتا ہے، الیکشن کے دن گھروں سے ہی باہر نہ نکلیں۔ بلکہ جو لوگ سکھوں کے مزارع ہیں، اگر اُن پر دباؤ بڑھ گیا تو وہ ہمارے خلاف بھی ووٹ دے سکتے ہیں۔ اِس لحاظ سے ہم مزید مشکلات کا شکار ہو جائیں گے۔

آپ نے پہلے آگاہ نہیں کیا؟ اب جناح نے قدرے بات کو سنجیدہ لیتے ہوئے پوچھا۔ البتہ چہرے پر پریشانی کے آثار پھر بھی ظاہر نہیں ہونے دیے، مگر نواب ایک عرصے کی رفاقت کے بعد سمجھ گیا تھا کہ اُن کے اندر ہل چل ہو چکی ہے۔

سر، کچھ فائدہ نہیں تھا۔ معاملات اور بھی زیادہ خراب ہو جاتے۔ انتظامیہ جس قدر عذر اور تاویلات کی ماہر ہے، ہمارا کوئی بھی قدم اُس کے آگے غیر موثر ثابت ہو گا۔ نواب نے ایک اور ضرب لگائی۔

پھر بھی ہمیں اِس کا حل نکالنا ہے (جناح کا اطمنان گڑبڑا گیا تھا لیکن وہ بات اب بھی بے پناہ تحمل کے ساتھ کر رہے تھا) وہاں تمھاری شکست کا مطلب مسلم لیگ کی پنجاب میں شکست ہے۔ ہمارے لوگ بد دل ہو جائیں گے۔ فیروز پور میں ہر حالت اپنی پوزیشن بہتر کرو۔
جناح کا یہ جملہ ایسا تھا جو نواب افتخار کے لیے اپنی بات منوانے کی بنیاد فراہم کرتا تھا۔ لہٰذا نواب نے بغیر وقت ضائع کیے، جس کا انتظار وہ کئی مہینوں سے کر رہے تھے، اپنا مدعا سامنے رکھ دیا، سر میرے کئی آدمیوں اور ذاتی دوستوں پر فیروزپور پولیس کی طرف سے ایک عرصے سے قتل اور ڈکیتی کے مقدمات درج ہیں۔ جن کے پس پشت گورنمنٹ کی مسلم لیگ دشمنی کارفرما ہے، جو مشرقی پنجاب میں آج کل تو بہت فعال ہو چکی ہے۔ مَیں اُس کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہوں۔ مثلاً؟ جناح نے وضاحت چاہی۔

مثلاً میرا ایک دوست غلام حیدر ہے (نواب نے منصوبے کے مطابق اب کہانی شروع کی) جس نے میرے ساتھ ایچی سن کالج سے بی اے کیا ہے۔ وہ مسلم لیگ کا انتہائی سرگرم رکن ہے۔ اُس پر اُسی دن سے پورے پندرہ بندوں کے قتل کا مقدمہ درج ہے، جس دن اُس نے مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کی۔ اِس کی وجہ سے وہ پچھلے دس سال سے روپوش ہے اور اپنے علاقے میں داخل نہیں ہو سکا۔ عدالت اُس کی غیر موجودگی میں اُسے سزائے موت سنا چکی ہے۔ بچارا پتہ نہیں کہاں جان بچاتا پھر رہا ہے۔ اُس کا مال اور جائداد ضبط کی جا چکی ہے۔ پڑھا لکھا اور شریف زمیندار ہونے کے ساتھ علاقے میں اُس کی حیثیت ایک بااثر مسلم لیگ کے کارکن کی ہے۔ اُس کی شرافت اور ہر دل عزیزی کی وجہ سے ہزاروں ووٹ اُس کی جیب میں ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں، جب اِتنے اہم شخص کے ساتھ یہ سلوک کیا جا رہا ہے تو پھر اُن کی کیا حیثیت ہے؟ اُس پر بلاجواز مقدمات درج کر کے فیروزپور میں مسلم لیگ کی تحریک کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور سرور بھکاں والے کو مجھ پر سوار کرایا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے، جب تک میری گاڑی میں غلام حیدر نہیں بیٹھ جاتا اور میرے جلسوں میں شریک نہیں ہو جاتا، مجھے الیکشن نہیں لڑنا چاہیے۔ ورنہ ذلت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

کیاغلام حیدر کے علاوہ یہ جگہ کوئی اور نہیں پُر کر سکتا؟ جناح نے سگار پینا مسلسل جاری رکھا۔

اول تو ایسا کوئی آدمی وہاں موجود نہیں ہے۔ اگر ہو بھی، تو اِن حالات میں، جبکہ ہم اُن کی حفاظت کے لیے کچھ نہیں کر سکتے، کوئی اور کیونکر رسک لے سکتا ہے؟ نواب نے اب بات فیصلہ کن انداز میں جناح صاحب کے گوش گزار کرنے کی کوشش کی۔

او کے دیکھتے ہیں، جناح نے اُٹھتے ہوئے کہا، تم الیکشن کی تیاری کرو، میری تین تاریخ کو مونٹ بیٹن سے ملاقات ہے۔

اتنا کہ کر جناح صاحب دوبارہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑے اور مزید ایک لفظ بھی کہنا گوارہ نہ کیا۔

نواب افتخار جناح کے اُٹھتے ہی خود بھی جلدی سے تکریم کے لیے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اُسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ جناح کا کہنا، تم الیکشن کی تیاری کرو، کا مطلب تھا، کام اسی فیصد تک ہو چکا ہے اور واقعی وہی کچھ ہوا دو ہفتے بعد ہی جلال آباد تحصیل میں غلام حیدر کی سزا کی معافی اور اُس کی تمام جائداد کی واپسی کا حکم پہنچ گیا۔ یہ ایک ایسا معجزہ تھا، جو فی الحال کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ اِتنے زیادہ قتل کا مقدمہ، جس میں غلام حیدر کے اشتہاری ہونے کے بعد اُس کو سزائے موت ہو چکی تھی، کا آسانی سے ختم ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ بھی انگریز سرکار میں۔ بعض لوگوں نے سمجھا، یہ حکومت کی چال ہے اور اُسے روپوشی سے باہر نکالنے کا ایک ہتھکنڈہ استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے ہی غلام حیدر سامنے آئے گا، اُسے دھر لیا جائے گا۔ لیکن جب غلام حیدر واقعی دس سال بعد جلال آباد اپنی حویلی میں آیا اور پولیس نے کوئی پوچھ گچھ نہ کی تو لوگوں کو یقین آگیا کہ امیر سبحانی کی بات تو بھائی سچ ہے۔

ہوا یہ کہ جناح صاحب کو مونٹ بیٹن کے ساتھ ملاقات میں نواب افتخار کی تمام بات یاد تھی۔ اُنھوں نے اِس تشویش کا اظہار لارڈ صاحب سے کر دیا کہ گورنمنٹ پنجاب اُن کے خلاف سازش بُن رہی ہے۔ اِس بات کا لارڈ صاحب نے فوراً انکار کر دیا اور کہا اِس کا ثبوت دیں۔ جناح نے نواب افتخار کے حوالے سے غلام حیدر پر مقدمات کا ذکر کر دیا، جس کی تفصیل بعد میں اُنھوں نے خود معلوم کر لی تھی۔ مونٹ بیٹن نے غلام حیدر کی خوش بختی سے، وہیں بیٹھے جناح صاحب کی تشویش دور کرنے کے لیے گورنر صاحب کو فون کر مارا اور کسی لہر میں آکر یہ بات کر دی، غلام حیدر پر سے تمام مقدمات فوری طور پر اُٹھا لیے جائیں۔ گورنمنٹ اُس کی سزائے موت معاف کرتے ہوئے

اُسے بری کرتی ہے۔ لہٰذا غلام حیدر ولد شیر حیدر کی سزا کے متعلق فیصلے کی فائل بلاتاخیر اُنہیں دہلی روانہ کر دی جائے۔ یہ تھی ساری کہانی، جس میں مونٹ بیٹن نے محض جناح صاحب کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے اپنی طرف سے یہ چھوٹا سا کام آناً فاناً کر دیا۔

غلام حیدر جلال آباد میں کچھ ایسی دھوم دھام سے داخل ہوا کہ اُس کے سامنے جلال آباد والوں کی نظر میں نواب افتخار کی کیا اہمیت تھی۔ سفارش کا یہ قدم شاید جناح صاحب کبھی نہ اُٹھاتے لیکن اُن کی نظر میں نواب افتخار کی بھی ایک اہمیت تھی۔ شروع دن سے ہی ممدوٹ خاندان محمد علی جناح کا دست و بازو تھا۔ وہ پنجاب میں سب سے زیادہ اعتبار اُنہیں پر کرتے۔ لاہور آتے تو ممدوٹ ولاز کے سوا کہیں قیام نہ فرماتے۔ حتیٰ کہ فاطمہ جناح بھی اُن کے ہمراہ ہوتیں تو وہ بھی ممدوٹ ولاز میں ٹھہرا کرتیں۔ انیس سو چھ میں سر شاہنواز خان ممدوٹ نے پنجاب میں مسلم لیگ کی صدارت سنبھالی تھی اور مسلم لیگ کو مضبوط و فعال بنانے کے لئے انتھک کوششیں کیں اور اپنی دولت خرچ کی تھی۔ یہ اُنہی کی کاوشیں تھیں کہ قرار داد پاکستان ممدوٹ ولاز کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بنائی گئی۔ منٹو پارک کا جلسہ اور اُس کی کامیابی بھی سر شاہنواز خان ممدوٹ کے سر جاتی ہے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کو جہاں دُشواری پیش آتی، نواب ممدوٹ اپنی تجوری کی چابیاں اُن کے حوالے کر دیتے۔

جاری ہے

قسط نمبر 26

(44)

غلام حیدر کو حویلی میں آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اِس عرصے میں اُس نے تمام عزیزوں، دوستوں اور ملازموں کو اکٹھا کر کے نئے سرے سے چودھراہٹ کا کام شروع کر دیا۔ یہ چودھراہٹ پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط اور ہیبت ناک تھی۔ چودھری غلام حیدر اب شاہ پور اور جودھا پور کا مالک ہی نہیں، پندرہ آدمیوں کا قاتل بھی تھا۔ اور یہ پندرہ لوگ کوئی ایسے ویسے نہیں تھے۔ علاقے کے سرچُنویں بدمعاش اور بڑے زمیندار تھے۔ اِسی لیے اب وہ پینتیس سال کا منجھا ہوا چودھری اور طاقتور سورما بن چکا تھا۔ صرف شیر حیدر کا نادان مُنڈا نہیں رہ گیا تھا۔ دوم، سردار سودھا سنگھ جیسے سورماؤں کو چت کر کے اور انگریز سرکار میں صاف بچ نکلنے کی وجہ سے اب بڑے بڑے بدمعاش بھی اُس کا نام سُن کر نہ لرزتے اور سلام کے لیے حاضری نہ بھرتے تو کیا فائدہ تھا۔ یہی وجہ تھی، حویلی میں آکر بیٹھنے والے لوگوں کی تعداد پہلے سے دُگنی ہو گئی۔ ایک ہفتے بعد جب غلام حیدر نے محسوس کیا حویلی کا انتظام قدرے ٹھیک ہو گیا ہے، تو اُس نے ایک دعوت کا اہتمام کر دیا۔ الیکشن کا وقت قریب آ رہا تھا اور غلام حیدر کو نواب صاحب کے احسان کا پاس بھی رکھنا تھا۔ اِس لیے جلد ہی ایسے حالات پیدا کرنا چاہتا تھا، جس میں پورا فیروز پور نہ سہی، مکھسر اور جلال آباد تحصیل میں تو مسلم لیگ کا طوطی بول جائے۔ چنانچہ حویلی میں سینکڑوں لوگ مبارک سلامت کے لیے جمع ہو گئے۔ رفیق پاؤلی، جانی چھینبا، حاجی کمبو، امیر سبحانی تو خیر اُس کے اپنے آدمی تھے، جو غلام حیدر کی معافی کا سن کر دوسرے تیسرے روز ہی چلے آئے تھے۔ دعوت میں وہ لوگ بھی تھے، جن کا غلام حیدر سے دُور دُور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ وہ سب اہل و عیال سمیت حویلی میں جمع ہو گئے اور حویلی میں ایک دم گہما گہمی ہو گئی، جو پچھلے دس سال سے تقریباً بند پڑی تھی اور اُس کے صحنوں اور دیواروں سے ویرانی سیم اور تھور کی شکل میں جھڑ جھڑ کر گرتی رہی اور وارثوں کی غریب الوطنی پر نوحے پڑھتی تھی۔ نیم اور پیپل کے درخت بدلتے موسموں کو بے آبرو ہوتے دیکھتے رہے اور زرد ہواؤں کے تھپیڑوں کو سہتے رہے۔ آج اُس حویلی میں ایسے رونق پیدا ہو گئی، جیسے دنیا نئے سرے سے بسی ہو۔ حویلی سے غلام حیدر کو نکلنے کا غم کم نہیں تھا۔ وہ واپس آکر بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا لیکن رفیق پاؤلی اور دوسرے ملازم اُس سے بھی زیادہ جذباتی تھے۔ سب خوشی سے اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے آپس میں مل کر رو بھی رہے تھے۔ اُنہیں یہ دوبارہ جنم ملے

گا اور امیر سبحانی کی قصہ گوئی کی محفلیں جمیں گی، اِس طرح کا وہم بھی جی سے اُٹھ گیا تھا۔ کیونکہ غلام حیدر نے سودھا سنگھ کے قتل کے بعد اُن سے ایسے ربط توڑا تھا جیسے وہ اِس دنیا میں موجود ہی نہ ہو۔ اِدھر یہ سب ملازم، نوکر، دوست یار گورنمنٹ کے ڈر سے حویلی تو ایک طرف فیروز پور ضلع بھی چھوڑ کر دُور دُور جا بسے تھے اور خوف کے مارے غلام حیدر کا نام بھی منہ سے نہیں نکالتے تھے۔ مگر اب سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ رفیق پاوُلی لوگوں کو اِدھر اُدھر مختلف کاموں کے بارے میں حکم دیتا پھرتا تھا، تم یہ کرو، تم وہ کرو۔ گویا اُس کی نئے سرے سے اجارہ داری تسلیم کر لی گئی تھی۔ جس پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔ ہر ایک نے اپنا اپنا کام بغیر کسی کے کہے سنبھال لیا جیسے یہ طے شدہ بات تھی۔ دعوت کی اِس تقریب میں شاہ پور اور جودھا پور کی رعایا بھی جلال آباد آ گئی۔ بالکل وہی نقشہ بن گیا جو شیر حیدر کی موت کے وقت تھا۔ لیکن اُس میں اور اِس میں ایک فرق تھا کہ اِس رونق میں بھرپور جذباتی کیفیت کے ساتھ ایک بڑی فتح کی سرشاری بھی تھی۔ غلام حیدر نے ملک بہزاد اور امانت خاں کو بھی بلا لیا۔ وہ بھی لوگوں میں پھنسے بڑی بڑی ہانک رہے تھے، جس میں زیادہ تر اپنی بڑھکوں کی کہانیاں تھیں۔ سودھا سنگھ، عبدل گجر اور شریف بودلے کے قتل اور اُس کے بعد ان دس سالوں کے دوران ہونے والے تمام واقعات کے بیان کرنے میں اتنا وقت درکار تھا، جس میں غلام حیدر کی حالیہ دعوت کے برابر سو دعوتیں بھی ہوتیں تو ناکافی تھیں۔

غلام حیدر نے اپنے آنے کی خوشی میں کئی سو دیگیں گوشت اور چاولوں کی چڑھا دیں۔ اِن دیگوں کی منت اُس کی والدہ نے اُسی دن مانی تھی، جب غلام حیدر جلال آباد سے نکلا تھا۔ دیگوں کے دہانوں سے بُھنے ہوئے گوشت اور پکتے ہوئے باسمتی کے چاولوں کی بھاپ دماغوں میں چڑھ کر بھوک کی اشتہا کو مزید بڑھا رہی تھی۔ دیگوں کے نیچے جلانے کے لیے کلہاڑوں سے سوکھی لکڑیاں پھاڑی جا رہی تھیں اور آگ کے الاو مسلسل جل رہے تھے۔ غلام حیدر سب سے مل ملا کر ملک بہزاد کے پاس آ بیٹھا۔ جہاں امانت خاں بھی بیٹھا تھا۔ ملک بہزاد کافی بوڑھا لگ رہا تھا۔ دس سال کی طویل مدت نے اُس کی صحت پر جو اثرات ڈالے تھے، وہ چہرے کی بڑھتی ہوئی جُھریوں اور چھلکتی ہوئی زردی میں بہت نمایاں تھے۔ مگر باتوں میں وہی دلیری اور سیانا پن اب بھی تھا۔ غلام حیدر جانتا تھا، اگر ملک بہزاد اُس وقت اُس کا ساتھ نہ دیتا تو شاید وہ بُرے طریقے سے ذلت کا منہ دیکھتا۔ پھر اُسے نواب افتخار کا خیال آ گیا، جس کی وجہ سے وہ پورے طور پر سرخ رو ہوا تھا۔ غلام حیدر نے سوچا، حقیقت یہ ہے کہ سب کے تعاون سے ہی سودھا سنگھ کی چتا کو آگ لگی ہے۔

غلام حیدر نے ماحول کے مطابق پورا پنجابی چوہدریوں کا لباس پہنا ہوا تھا۔ کھُسا، لمبے بَر والا سیمابی کڑھائی کا لاچا، سر پر پف والی کُلّے دار پگڑی اور ہاتھ میں چھوٹا سا چاندی کا حقہ، جو غلام حیدر کو نواب افتخار کے ماموں سے تحفے میں ملا تھا۔ یہ شان و شوکت تو واقعی غلام حیدر کی ذات کو نوابوں سے کم نہیں دکھاتی تھی اور اِن سب سے بڑھ کر وہ رائفل جو اپنے کارنامے بھری دنیا کی انگریزی سرکار میں دکھا چکی تھی۔ غلام حیدر کے کاندھے پر لٹکی اُس کی چاندی جیسی نال تو ایک موت کی پری کی گردن تھی۔ غلام حیدر نے امانت خاں کی طرف دیکھ کر ملک بہزاد سے کہا، چاچا بہزاد، اصل میں تیرا یہ بھانجا اِس پورے قضیے کا سورما ہے۔ اُس دن یہ نہ ہوتا تو سکھڑے اِتنی آسانی سے قابو میں نہ آتے۔ (امانت خاں نے اپنی مونچھوں کو مزید مروڑا دیا، جو پہلے ہی کھسے کی نوک کی طرح اُوپر کو چڑھی ہوئی تھیں) مجھے اِس پر فخر ہے۔ خدا نے موقع دیا تو مَیں اس کا بدلا ضرور چکاؤں گا۔

ملک بہزاد بھتیجے کی طرف دیکھ کر بولا، غلام حیدر تمھیں پتا ہے، اِس نے پہلا بندہ کس عمر میں قتل کیا ہے؟ اُس وقت اس کی عمر صرف تیرہ سال تھی، جب چودھری الہ بخش جندے کا سے اِس نے اپنے باپ کا بدلا لیا تھا اور کیوں نہ لیتا، تربیت جو (اپنے سینے پر ہاتھ مار کر) ملک بہزاد نے کی تھی۔ آگے بھی یاد رکھ، لڑائی بھڑائی میں راہکوں اور مزارعوں سے کام نہیں لیا جاتا۔ بندہ مار کھا جاتا ہے۔

سینکڑوں آدمی اِدھر اُدھر چارپائیوں پر بیٹھے اپنی اپنی گپوں میں لگے تھے۔ اکثر امیر سبحانی سے غلام حیدر کے وائسرائے کے ساتھ گہرے تعلقات کی کہانی بڑی دلچسپی اور مزے لے کر سُن رہے تھے۔ غلام حیدر کو اُس کی یہ ڈینگیں سُنائی دے رہی تھیں لیکن وہ اُسے اِن کے ہانکنے سے روکنا نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ اب وہ چاہتا تھا، لوگوں پر اُس کی دلیری اور تعلقات کا جتنا بھی رعب پڑ جائے، اُسی قدر اچھا ہے اور وہ یہ رعب ملک بہزاد کے سامنے بھی رکھنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی ملک بہزاد کو اُس کے تعلقات کا پتہ اُس کی سزا میں معافی اور نواب صاحب کی طرف سے اِتنے بڑے تعاون کے باعث چل ہی گیا تھا۔

چاچا بہزاد، غلام حیدر نے چارپائی پر ملک بہزاد کے پہلو میں آرام سے بیٹھنے کے بعد کہا، الیکشن بہت قریب ہیں۔ نواب افتخار پنجاب مسلم لیگ کے صدر ہیں۔ وہ خود ہمارے علاقوں سے الیکشن لڑ رہے ہیں۔ نواب صاحب نے جو کچھ میرے لیے کیا ہے، اُس کا تقاضا ہے، ہم اُس کا ساتھ ووٹ دینے سے کچھ زیادہ کریں تا کہ اُس کی نمک حلالی کا پورا

حق ادا ہو جائے۔ نواب کا جو میرے اُوپر احسان چڑھ گیا ہے، وہ تو شاید عمر بھر نہ اُترے لیکن کم از کم اس علاقے میں تو اُس کے خلاف کوئی بندہ پرچی نہ ڈال سکے۔ اِس کے لیے ہمیں چاہے کسی بھی قسم کی زبردستی کرنی پڑے، مسلم لیگ کو ہر حالت میں پورے علاقے سے الیکشن جتوانا ہے۔ کانگریس اور یونینسٹ کے اُمیدواروں کو پرچیاں دینا تو ایک طرف، جلسہ تک نہیں کرنے دینا۔ اِس کے لیے جتنا خرچہ اور اسلحہ چاہیے، وہ مَیں بندوبست کرنے کو تیار ہوں لیکن نواب صاحب اور جناح صاحب کے آگے ہماری بے عزتی نہ ہو جائے۔

ملک بہزاد غلام حیدر کی بات تحمل سے سنتا رہا، پھر حقے کی نَے کو ہاتھ سے پکڑ کر اُس پر اپنی ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے بولا، چوہدری غلام حیدر، بھلا مسلم لیگ کا ساتھ ہم نہ دیں گے تو کون دے گا؟ یہ کام سودھا سنگھ کی چتا سے زیادہ او کھا تو نہیں لیکن اِس کے لیے ایک کام کرو، اگر وہ کام ہو گیا تو ہمیں زیادہ تردد کرنے کی ضرورت ہی نہیں، لوگ خود بخود مسلم لیگ کی طرف جھکتے جائیں گے۔

وہ کیا کام ہے؟ غلام حیدر نے پوچھا۔

ایک ریکاٹ لو، جس میں تمھاری دلیری کے سارے واقعے قصے کی شکل میں بھرے ہوں۔ اِس کام کے لیے امیر سبحانی بہت مناسب ہے۔ وہ ریکاٹ الیکشن سے پہلے پورے علاقے میں پہنچادو اور اپنے خرچے پر سنوادو۔ جب تیری بہادری، خدا ترسی اور بڑے گھروں تک پہنچ کے قصے لوگ سنیں گے تو وہ خود بخود ہماری طرف دوڑے چلے آئیں گے۔ کچھ تو پہلے ہی تیری بہادری کا گُڈا چڑھا ہوا ہے، رہتی سہتی کسر یہ رکاٹ نکال دے گا۔ ابھی دو مہینے الیکشن میں باقی ہیں، امیر سبحانی سے دو چار دن میں یہ کام کرا کے چار پانچ بندے ریکاٹ چلانے والے کرائے پر لے لیتے ہیں اور گاؤں گاؤں پھرا کر سنا دیتے ہیں۔ ویسے بھی لوگوں کو شغل کے لیے بہانہ چاہیے۔ وہ جب امیر سبحانی کی چٹخارے والی زبان سے یہ مزیدار قصہ سنیں گے تو تم خود بخود اُن کا سورما بن جاؤ گے۔ اُس کے بعد ہم دونوں اپنے بندوں کے ساتھ پورے علاقے کا دورہ کریں گے اور باقی کسر دورے میں نکال دیں گے۔ پھر بھی جس جگہ سے نواب کے خلاف ووٹ پڑنے کا خطرہ ہوا، وہاں پر نواب سے کہہ دینا، الیکشن والے دن وہ اپنے بندے ہمارے ساتھ کر دے، نگرانی ہم کریں گے اور وہ پرچیاں اپنے ہاتھوں سے نواب صاحب کی صندوقچی میں ڈالتے جائیں گے۔ جس نے بھی چوں چراں کی، چار متھریں چوتڑوں پر ماریں گے اور سیدھا کر دیں گے۔

بس یہ ٹھیک ہے، غلام حیدر بولا، ہم کل ہی اِس کا انتظام کر لیتے ہیں۔ پہلے ڈیڑھ مہینے میں امیر سبحانی والا ریکارڈ چلواتے ہیں۔ آخری پندرہ دنوں میں علاقے کا دورہ شروع کریں گے اور پورے علاقے میں گھوڑے دوڑا کر نقارہ بجا دیں گے۔ کوئی شخص نواب افتخار کے علاوہ کسی کو ووٹ دینے کی جرات نہ کرے۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو وہ اپنا ذمہ دار خود ہو گا۔ ہمیں نواب صاحب کے گاؤوں میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو اُس کی ملکیت سے باہر کا علاقہ ہے، وہاں نواب کو چکر لگانے کی ضرورت پیش نہیں آنی چاہیے۔ اُس کے بعد غلام حیدر ملک بہزاد کو اُٹھا کر ڈیوڑھی میں لے گیا اور جیب سے چاندی کے روپوں کی ایک بھاری تھیلی نکال کر اُس کے حوالے کر دی۔

چاچا بہزاد، یہ نواب صاحب کی طرف سے دو ہزار روپے ہیں، آپ یہ رکھ لو اور اِس میں سے کچھ امانت خاں کو دے دینا۔ مَیں اُسے روپے دیتا اچھا نہیں لگتا۔ اِس الیکشن میں سو طرح کے کام ہیں اور کئی طرح کے خرچے ہیں۔ اُن میں کام آئیں گے، مَیں نے تو نواب صاحب سے کہا تھا، اِن کی ضرورت نہیں لیکن اُس نے ضد کر کے ہمیں دے دیے ہیں۔ بہر حال اب نواب صاحب کو پتا چلنا چاہیے، اُس کے دوست حالات کا پھیر بدلنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

ملک بہزاد جان گیا تھا، غلام حیدر کو نواب نے کوئی پیسے نہیں دیے مگر اُس نے پیسوں کی تھیلی پکڑ لی کیونکہ اب اُسے بھی پیسوں کی ضرورت تھی، پھر روز روز مفت میں تو کام نہیں ہو سکتے تھے۔ اور یہ بات غلام حیدر بھی جانتا تھا، شاید اب ملک بہزاد پیسوں کے بغیر بے دلی سے چلے، اسی لیے اُس نے یہ چال چل دی تھی۔ غلام حیدر اب زمانے کا پانی پی چکا تھا اور جانتا تھا، مایا ایسا ہتھیار ہے، جو فساد کے علاوہ دلوں کی محبت میں اضافہ بھی کرتا ہے۔

غلام حیدر اور ملک بہزاد ڈیوڑھی سے نکلے تو کھانا تیار تھا۔ وہ دونوں اور میاں امانت خاں، جانی چھینبا، رفیق پاؤلی اور غلام حیدر کے وہ ساتھی، جو سودھا سنگھ کو مارتے وقت ساتھ تھے، چار پائیوں پر بیٹھ گئے۔ گرم گرم گوشت اور چاولوں کی بھری ہوئی کنالیاں اُن کے سامنے آگئیں تھیں۔ وہ کھانے کے دوران اُس واقعے کو چٹخارے لے کر چٹکلے بھی چھوڑ رہے تھے اور چاولوں کے مزے بھی۔ اِن کے علاوہ بھی حویلی کا پورا صحن آدمیوں سے بھرا کھانا کھانے اور باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

فضل دین اب چوبیس سال کا سمجھ بوجھ والا ایسا سرکاری بابو بن چکا تھا، جو مولوی کرامت کی تربیت سے ہوتا ہوا جلال آباد، وہاں سے ایف سی کالج لاہور اور اب گورنر ہاؤس لاہور میں پچھلے چھ سال سے سرکار انگریز کا نوکر تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اِتنا سیانا ہو گیا کہ مولوی کرامت سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گیا۔ آنکھوں کو گول شیشوں کی عینک چڑھ گئی تھی، جس نے شخصیت کو اور بھی سنجیدہ کر دیا۔ گورنر ہاؤس لاہور میں نوکری کے دو سال بعد ہی اُس نے لاہور میں اپنی جگہ لے کر وہاں مکان بنالیا۔ تنخواہ تو اتنی نہیں تھی کہ اُس سے گھر کا خرچ چلانے کے بعد مکان بھی خریدا جا سکتا مگر مولوی کرامت نے جلال آباد اپنی نوکری کے دوران مختلف حیلوں سے اِتنی پونجی جمع کر لی تھی جو دیر تک کام آسکتی تھی۔ ولیم کی وجہ سے فضل دین کو مولوی کرامت کی وفات کے فوری بعد نوکری ملنے سے وہ رقم محفوظ رہی اور خرچ ہونے سے بچ گئی۔ وہ رقم اور کچھ تنخواہ سے بچا کر فضل دین نے لاہور میں مکان بنالیا، جہاں اب وہ اپنی ماں شریفاں، ساس رحمت بی بی اور اپنی بیوی اور ایک دو سالہ بیٹے نواز الحق کے ساتھ رہنے لگا۔

اپنے باپ مولوی کرامت کی طرح فضل دین بھی کام اور عاجزی کا پیکر تھا۔ اِن خوبیوں کی وجہ سے تمام افسروں کا منظورِ نظر ہو گیا۔ جس نے جو بھی کام کہا، چاہے آدھی رات تک بیٹھنا پڑتا، فضل دین اُسے مکمل کر کے ہی دم لیتا۔ بلکہ بعض غیر متعلقہ کام بھی اُس کے ذمے لگا دیے جاتے تو وہ اُنہیں بھی ڈیوٹی سمجھ کر پورا کر دیتا۔ اِن سب باتوں کے علاوہ اُس نے اپنے کئی افسروں کو گھر کی بنی ہوئی دیسی گھی کی پنجیری پر لگا دیا، جو فضل دین کی ساس ایسی عمدہ بناتی کہ کسی نے کیا بنائی ہو گی۔ اُس نے ایک سائیکل بھی خرید لی، جس پر دفتر آنے جانے کے علاوہ فضل دین صبح سویرے افسروں کے گھر ناشتہ وغیرہ کا سامان بھی بازار سے خرید کر پہنچا آتا۔ جس کی فہرست اور پیسے فضل دین کو شام ہی دے دیے جاتے تھے۔ اِن کاموں سے فارغ ہو کر وہ سب سے پہلے دفتر میں داخل ہوتا۔ بعض اوقات تو چپڑاسی کے گیٹ کھولنے سے پہلے ہی باہر تھڑے پر بیٹھا ہوتا۔ فضل دین کی بیوی زینت ایسی ہشیار تھی کہ وہ فضل دین کا کھانا نماز پڑھ کے سورج نکلنے سے پہلے ہی تیار کر دیتی۔ فضل دین، جسے بچپن میں مولوی کرامت کی ڈانٹ نے سانجرے اُٹھنے کا خوگر بنا دیا تھا، جب تک نماز پڑھ کر فارغ ہوتا، کھانا تیار ہوتا۔ وہ کھانا کھاتا، سائیکل اُٹھاتا اور اپنے افسر کی دی ہوئی فہرست کے مطابق بازار سے سودا سلف خریدتا اور افسر کے گھر والوں کے اُٹھنے سے پہلے یہ سامان پہنچا دیتا۔ پھر وہیں

سے اپنے دفتر آجاتا۔ دوپہر کا کھانا وہ سویرے گھر ہی سے لیے آتا اور شام یا رات کو گھر پر ہی جا کر کھاتا۔ آفس کے مسلمان افسروں اور کلرکوں کو ظہر اور عصر کی نماز بھی پڑھا دیتا۔

اِس لیے گورنر ہاؤس میں رفتہ رفتہ مولوی فضل دین کے نام سے معروف ہو گیا۔ آفس کے اکثر لوگ اُس کی اِس وجہ سے بھی عزت کرتے تھے کہ جتنی آیتیں اور سورتیں اُسے یاد تھیں، کسی دوسرے کو اُن کا عشرِ عشیر بھی یاد نہیں تھا۔ اُس نے نماز کی قرات کے دوران لمبی لمبی سورتیں پڑھ کر سب کو مرعوب کر دیا تھا۔ کئی دفعہ دفتر میں کام کرنے والے بابوؤں اور افسروں کے باپ دادا کے جنازے بھی پڑھا دیے۔ اُن کو گویا یہ ایک مفت کی سہولت مل گئی تھی کہ ایک تو مولوی ڈھونڈنا نہیں پڑتا تھا، دوسرا عام مولویوں سے فضل دین کا علم کہیں زیادہ تھا۔ بعض اوقات کئی لوگ خوش ہو کر اُسے کپڑے اور روپے پیسے بھی دے دیتے بلکہ رفتہ رفتہ اُس سے نکاح بھی پڑھوانے لگے۔ کئی دفتر والوں کو فضل دین کے علم کا پتا چلا تو اُنھوں نے اُس سے اپنے بچوں کو قرآن پڑھانے کا بھی کام لینا شروع کر دیا۔ اِس عمل میں فضل دین کو مزید آمدنی ہونے لگی۔ آمدنی کے اضافے نے فضل دین کے اندر ایک اور طرح کا جذبہ پیدا کر دیا۔ وہ سوچنے لگا، کسی طرح خود نہیں تو اپنے بیٹے کو ضرور افسر بنائے۔ کیونکہ افسروں کے ٹھاٹھ بابوؤں سے کہیں زیادہ تھے۔ چنانچہ فضل دین اِس کھوج میں لگ گیا کہ لوگ افسر کیسے بنتے ہیں اور چپکے چپکے ہر ایک سے معلومات لینے لگا۔ کسی نے فضل دین کو کچھ بتایا، کسی نے کچھ۔ پہلے پہل اُس کے ذہن میں یہ بات تھی، افسر صرف انگریز ہی بن سکتا ہے۔ لیکن جب آہستہ آہستہ اُسے پتا چلا، بہت سے مسلمان بھی افسر ہیں تو فضل دین نے اُس کی خبر لینا ضروری سمجھی۔ وہ بہت سے افسروں کے بچوں کو قرآن پڑھا رہا تھا، جس کی وجہ اُن کے والدین کے متعلق بہت سی معلومات اُس کے پاس جمع ہو رہی تھیں۔ اِن معلومات میں ایک بات اُس کی سمجھ میں آگئی کہ افسر بننے کے لیے انگریزی میں بولنا اور امیر بچوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ضروری ہے۔ اِس سلسلے میں انگلستان بھی جانا پڑتا ہے، جس کے لیے بہت زیادہ پیسے چاہییں۔ اِس سب کے پیشِ نظر فضل دین نے بیٹے کے لیے میدان ہموار کرنا شروع کر دیا اور روپے پیسے کو کنجوسی کی حد تک احتیاط سے برتنے لگا۔ دفتر سے ملنے والی تنخواہ ساری کی ساری بچانے کے چکر میں فضل دین نے نماز، جنازے، نکاح، ختم درود اور افسر کالونیوں میں قرآن پڑھا کر پیسے کمانے کی کاوشیں مزید تیز کر دیں۔ اِس سلسلے میں فضل دین کے گھر باہر سے ختم درود کا کھانا بھی آنے لگا اور ہانڈی کے پیسے مزید بچنے لگے۔ یہ سب کچھ اول تو فضل دین نے اپنے بیٹے کے لیے کیا تھا مگر آہستہ آہستہ اُس کی یہ عادت اپنے بچپن کی افتاد کو غالب کر گئی اور وہ بابو سے زیادہ

دوبارہ مولوی بن گیا۔ لیکن دفتر کے کام میں کوتاہی پھر بھی کبھی نہ کرتا۔ البتہ اِتنا ہوا کہ جو دین کے کام وہ دفتر میں بغیر پیسوں کے کرتا تھا، اب پیسوں سے شروع کر دیے، جس میں اُسے کافی زیادہ ترقی ہوئی اور آمدنی میں کئی گنا اضافہ۔

جاری ہے

قسط نمبر 27

(46)

الیکشن میں دو ہفتے باقی تھے۔ کمپین کے لیے جلسے اور جلوس زوروں پر تھے۔ اِن جلسوں میں کانگرس اور یونینسٹ پارٹی کے اُمیدوار بھی کہیں کہیں تقریریں کرتے اور ووٹ مانگتے نظر آرہے تھے۔ لیکن اُن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ غلام حیدر کے بندے اِس طرح سارے علاقے میں پھیل چکے تھے کہ اُن بچاروں کو جلسہ کرنے کی جگہ بھی نہیں ملتی تھی۔ جانی چھینبا اور امانت خاں نے بہت جگہ پر ڈانگ سوٹا چلا کر اُنہیں منتشر ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا، وہ بِدک گئے اور اِن کے سامنے آنے سے گریز کرنے لگے۔ خوش قسمتی سے اُسی طرح کا ایک ہجوم کانگرس پارٹی کا غلام حیدر کے ہجوم سے راستے میں ٹکرا گیا۔ یہ جگہ منڈی گروہرسا سے روہی کی طرف دس میل پر تھی۔ کانگرس کے اُمیدوار بھی وہاں چھوٹے چھوٹے گاؤں سے کہیں ووٹ مانگنے نکلے تھے۔ غلام حیدر نے اپنے بندوں کو حکم دیا، اِن کی ذرا اچھے طریقے سے دھلائی کر دو۔ اِنہیں جرات کیسے ہوئی، یہاں آکر ووٹ مانگنے کی۔ غلام حیدر کا حکم سننا تھا کہ جتنا بھی اس کا گروہ تھا، سب کانگرسی لیڈروں پر ٹوٹ پڑا۔ یہ جگہ ایسی تھی، جہاں ریت کی وجہ سے اُن کی سواریاں زیادہ تر اونٹوں کی تھی۔ کانگرسی تعداد میں پچاس یا ساٹھ ہوں گے۔ اِدھر پورے تین سو کا مجمع، اور سب کے ہاتھوں میں گنڈاسے اور ڈانگیں تھی۔ پل کی پل میں تڑاتڑ ڈنڈے برسنے لگے۔ کسی کے سر پر، کسی کی ٹانگ پر اور کسی کے بازو پر۔ منٹوں میں ہنگامہ مچ گیا اور رونا دھونا، چیخ چگاڑا شروع ہو گیا۔ کچھ نے اُونٹوں کو ڈنڈے مارنے شروع کر دیے، جس کی وجہ سے وہ اپنے سواروں کو بھی نیچے پھینک پھینک کر دوڑنے لگے۔ جس کا جدھر منہ آیا، نکل گیا اور لمحوں میں کانگرسی گروہ آفت کا شکار ہو کر بکھر گیا۔ اِسی ہنگامے میں کانگرسی لیڈر سری واستر جی کی جیپ بھی وہیں رہ گئی، جس کے ٹائروں سے ہوا نکال کر اُس کی پٹرول والی ٹینکی میں ریت ڈال دی۔ اِسی طرح ایک دفعہ غلام حیدر نے یونینسٹ پارٹی کے امیدوار سرور بہکاں والے کی مکھسر تحصیل کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے چھترول کر دی۔ اِس دوران ڈیوٹی پر موجود تین چار پولیس والوں نے دخل اندازی کی، تو اُن کے چوتڑوں پر بھی دو دو ڈنڈے لگوا دیے۔

اِنہی واقعات کا نتیجہ تھا کہ وہاں مخالفین سہم گئے۔ ووٹ مانگنا تو ایک طرف، اُنہوں نے غلام حیدر کے اثر رسوخ والے

علاقوں میں آنا ہی چھوڑ دیا۔ دوسری طرف غلام حیدر اور ملک بہزاد دونوں اپنے دو تین سو بندوں کے ساتھ گھوڑوں پر اور نواب افتخار ممدوٹ کی جیپ پر گاؤں گاؤں دوڑتے پھرتے تھے۔ جن کے ہاتھوں میں مسلم لیگ کے جھنڈے، ڈنڈے، برچھیاں اور بندوقیں بھی تھیں۔ بنگلہ فاضلکا، جلال آباد، سری مکھسر، لکھو کے، گرو ہرسا، ابوہر، خیپانوالی حتیٰ کہ فرید کوٹ تک کے علاقے کو اِس طرح روند ڈالا کہ ہر سمت مسلم لیگ کا پھریرا لہرانے لگا۔ ایک بڑا کام تو منصوبے کے مطابق پہلے ہی امیر سبحانی کے ریکارڈ نے کر دیا تھا، جو اب چھوٹی چھوٹی ڈھاریوں پر بھی بج رہا تھا۔

لوگ غلام حیدر کی جرات اور بہادری کے اِس قدر قائل ہو چکے تھے کہ وہ فیروزپور کے مسلمانوں کا بلا شرکت غیرے ہیرو بن گیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے، قہر خدا کا، انگریز بہادر کے دور میں کوئی کتے کو مار دے تو موت کی سزا پائے۔ غلام حیدر نے تو پورے پندرہ بندے بیچ دوپہر مارے تھے۔ اِس طرح کے سورمے گھر گھر تھوڑے پیدا ہوتے ہیں؟ دوسرا غضب یہ کہ وائسرائے کی بیٹی تک تعلقات تھے۔ ورنہ اِس طرح اسلحہ لے کر کھلے عام کوئی پھر سکتا ہے؟ وہی خونی بندوق اب بھی اُس کے پاس ہے اور کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ غلام حیدر کی جیپ جہاں بھی رکتی لوگ دیکھنے کے لیے دور دور سے دوڑے چلے آتے اور منٹوں میں سینکڑوں کا مجمع لگ جاتا۔ اِدھر لوگ اکٹھے ہوتے اُدھر دس پندرہ منٹ امیر سبحانی کا ریکارڈ بجتا۔ اُس کے بعد ملک بہزاد سامنے آتا اور غلام حیدر کی دلیری اور نواب ممدوٹ کی مسلمانوں کے لیے دی گئی اُن قربانیوں کا واویلا مچاتا، جن کے بارے میں فیروزپور کے قریباً تمام لوگ بے خبر تھے۔ مگر وہ ملک بہزاد کی باتوں کا اعتبار کر رہے تھے۔ آٹھ دس منٹ نپٹانے کے بعد ملک بہزاد ایک طرف ہو جاتا اور غلام حیدر لاچا باندھے، ریفل کاندھے پر ڈالے جیپ کے بونٹ پر کھڑا ہوتا، دو چار نعرے مسلم لیگ، قائداعظم اور نواب افتخار ممدوٹ کے حق میں لگواتا پھر تقریر کرنے لگتا۔

میرے فیروزپوری مسلمان بھائیو، جان لو مَیں وہ ہوں جس کی بندوق کی گولی
کی آواز نزدیک اور دور والے سب جانتے ہیں اور کافروں کے سینے اس کے
سیسے کی تپش خوب محسوس کرتے ہیں۔ یاد رکھو، یہ ہندو بنیے، جو تمھاری اگلی پچھلی
سب نسلوں کو بیاج کے عوض رہن رکھ چکے ہیں اور یہ گورے، جن کے جوتوں کی پالش
تمھارے پسینوں کے عرق سے تیار ہوتی ہے۔ یہ سب تمھارے ازلی دشمن ہیں۔

ان کی حکومت میں نہ تمھارا ایمان سلامت ہے، نہ تمھارے بال بچے۔ یہ سکھ، ہندو اور فرنگی کبھی تمھاری روزی روٹی کی حالت ٹھیک نہیں ہونے دیں گے۔ تم یاد رکھو اسی صورت بچ سکتے ہو، اگر ان کو اپنے سے دور کر دو گے۔ اور ان سے نجات حاصل کر لو گے۔ نجات کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ اپنی مسلم لیگ کو ووٹ دو، جس کا فیروز پور میں بڑا رکن اپنا نواب افتخار ہے۔ یہ اپنا بھائی بھی ہے اور اپنا وڈا بھی۔ یاد رکھو ٹُٹیاں باہواں گل نوں۔ ہم پھر بھی مسلمان ہیں۔ یہ سرور بہکاں والا غدار اور انگریز کا پٹھو ہے۔ وہ چاہتا ہے، انگریز ہندوستان میں رہے اور تمھاری آنے والی نسلیں بھی ان فرنگیوں کی غلامی کرتی رہیں اور بنیوں کو بیاج دیتی رہیں اور سکھڑوں کی زمینوں میں ہل چلاتی رہیں۔ اِس لیے مسلم لیگ کو ووٹ پاؤ اور سب سے جان چھڑاؤ

(47)

نصف مارچ گزر چکا تھا اور بہار کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ ولیم کو اوکاڑہ چھٹی پر آئے تین دن ہو چکے تھے۔ کل اُسے گُڑ گاؤں جانا تھا۔ ذہن میں سینکڑوں خدشات اور آنے والے دنوں کی بدلتی صورت نے اُس کی طبیعت میں اتنی بیزاری بھر دی کہ اُسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ خاص کر چیف سیکرٹری آفس سے وصول ہونے والے خط نے ولیم کے اعصاب کو بالکل معطل کر دیا۔ اُسے خوب علم تھا، اُس کے ہاتھ کٹ چکے ہیں۔ ملٹری سے لے کر سول انتظامیہ تک ہر شعبے میں کالے لوگ سُرنگیں بنا کر نہ صرف داخل ہو چکے تھے۔ بلکہ نوے فیصد نظام اُنھی کے قلم دانوں میں چلا گیا تھا۔ اِس وقت جب تمام بیوروکریسی ایک ایک کر کے رخصت ہو چکی تھی، اُس کا اپنی سیٹ پر ٹکے رہنا بھی خوش قسمتی تھی مگر کہاں تک؟ آخر اُسے بھی خط آ گیا کہ جون تک اپنا بوریا باندھ لو۔ ولیم اِسی پیچ و تاب میں غلطاں ہزاروں وسوسوں میں ڈوبا تھا۔

اب جبکہ ہزار کوشش کے باوجود وہ اپنی پوسٹنگ منٹگمری کروانے میں ناکام رہا تو اُسے انتہائی تکلیف ہو رہی تھی۔ اُس نے چیف سیکرٹری صاحب سے لاکھ طرح سے گزارش کی، کچھ دن کے لیے ہی سہی، اُس کو منٹگمری بھیج دے لیکن یہ درخواست اِس بے رحمی سے رد کر دی گئی کہ ولیم ٹوٹ کر رہ گیا۔ اُس کی بجائے وہاں ایک سکھ ڈپٹی کمشنر کو تعینات کر

دیا گیا، جو انتہائی نامعقول بات تھی۔ اگر اُس جگہ ولیم کی پوسٹنگ کر دی جاتی تو چیف سیکرٹری کا کیا بگڑ جاتا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے یا کم از کم بہار کے دن ہی وہاں کاٹ لیتا۔ مگر بد قسمتی سے یہ نہ ہو سکا اور اب اُسے محسوس ہو رہا تھا، اُس کی یہ حسرت ہی رہ گئی۔ حتیٰ کہ انگریزوں کا ہندوستان سے انخلا مکمل ہو جائے گا۔ جس کا عمل پچھلے ایک سال سے خاموشی سے جاری تھا۔ اُس کے ہاتھ سے گُڑ گاؤں بھی نکلنے والا تھا۔ شاید اِسی لیے دو دن بعد اُسے گورنر ہاؤس میٹنگ پر بلایا گیا تھا۔

ولیم کیتھی کے ساتھ ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھا اپنے ہی خیالوں میں گم سلائس پر جیم لگا رہا تھا۔ کیتھی اُسے بار بار اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ٹھوہکا دے کر چونکانے کی کوشش کرتی مگر وہ ایک دو باتیں کرنے کے بعد پھر خاموش ہو کر واپس اپنی سوچوں میں گم ہو جاتا، جو پچھلے کئی مہینوں سے اُس پر غلبہ کیے ہوئے تھیں۔ پہلے پہل تو ولیم کسی طرح اُن سوچوں کو نظر انداز کرتا رہا لیکن اب اُن میں شدید طریقے سے اُلجھ گیا تھا۔ حالات روز بہ روز ولیم کے ہاتھ سے نکلتے جا رہے تھے اور اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے؟ اُسے کبھی عزت و آبرو کو تباہ کر دینے والی جنگ کے متعلق سوچنے پر کوفت ہوتی، جس نے پانچ سال میں ہر شے راکھ کر ڈالی تھی، کبھی ہندوستانیوں کی بے وفائی اور احسان فراموشی پر غصہ آتا، جنہیں تعلیم دینے سے لے کر اور عقل سکھا کر جدید دور میں داخل کرنے تک صرف انگریز ہی کا کردار تھا۔ ورنہ یہ گنوار کے گنوار ہی رہتے۔ کل تک اُجڈ اور جاہل آج بم دھماکے کر رہے تھے، جلسے جلوس نکال کر ایجی ٹیشن پھیلا رہے تھے اور انڈیا چھوڑ دو کے نعرے بلند کرتے تھے۔ جہاں ولیم ایک طرف ہندوستانیوں پر بھرا بیٹھا تھا، وہیں اپنی برٹش ایمپائر کے کرتا دھرتاؤں پر سخت غصہ میں تھا، جو آئے دن اختیارات ہندوستانیوں کو سونپتے رہے، اپنے ہاتھ کاٹتے رہے اور آج اُسی کے نتیجے میں ہندوستان کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو تھے۔ ولیم سوچتا کہ چلو یہ برداشت کیا جا سکتا تھا، دیسی لوگوں کو حکومت میں حصہ دے دیا جائے اور اُن کو انگریزوں کے برابر مراعات بھی مل جائیں، جن پر اُسے پہلے دن سے ہی کوئی اعتراض نہیں تھا، مگر یہ کیا کہ مکمل طور پر اپنے گلے ہی کاٹ لیے گئے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ برف پیدا کرنے والی زمینوں اور بغیر سورج کے نکلنے والے دنوں کے ملک میں چلے جائیں۔

ولیم کو اِس طرح فکر مند دیکھ کر کیتھی اُٹھی اور اُس کی پشت پر آکر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر خموشی سے چپ کھڑی رہنے کے بعد جب ولیم نے اُس کی طرف پھر بھی دھیان نہ دیا تو بولی، ولیم ڈارلنگ میں جانتی ہوں، تم کئی دنوں سے پریشانی

میں مبتلا ہو۔ تمھارے اختیارات سمٹتے جا رہے ہیں اور برٹش گورنمنٹ اپنے بادبان لپیٹ رہی ہے۔ مگر اب کیا کیا جا سکتا ہے؟

ولیم نے گردن گھما کر کیتھی کی طرف دیکھا اور نصف کھایا ہوا سلائس وہیں رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا، کیتھی شاید وہ دن قریب آ رہے ہیں، جن کے لیے میں نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ دراصل مجھے اِس بارے میں سوچنے سے ہی وحشت ہوتی تھی لیکن اب اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد ولیم چند ثانیے خموش رہ کر دوبارہ بولا، کیتھی تمھیں پتہ ہے؟ مَیں ولیم اپنے خاندان میں سب سے زیادہ بدقسمت انسان ہوں۔ میرا پر دادا، میرا دادا اور میرا باپ بڑے خوش قسمت تھے۔ بڑے ذی اقتدار تھے اور نہایت معزز تھے۔ نہ اُنھیں وقت نے دھوکا دیا، نہ اُنھوں نے وہ کرب محسوس کیا جو میرے حصے میں آیا ہے۔ وہ سب اِسی ہندوستان کی مٹی میں اپنی مرضی سے رہے، اپنی مرضی سے یہیں دفن ہوئے۔ لیکن مَیں، جسے اُن سب سے زیادہ ہندوستان سے محبت ہے۔ اُن سب سے زیادہ مَیں اِس مٹی میں اپنی روح محسوس کرتا ہوں اور اُن سب سے زیادہ میری خواہش اِسی سرزمین پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کی ہے، میرے ہی ہاتھ سے وقت سرکتا جا رہا ہے۔ اِس زمین کی مٹی میرے رنگ اور نسل کو اپنے سے علیحدہ کر کے مجھے باہر پھینکنے کی کوشش میں ہے۔ مجھے آئے دن ایسے احکامات وصول ہوتے ہیں، جو ہر اگلے لمحے ہندوستان سے میرا فاصلہ بڑھا رہے ہیں۔ میرا باپ ایک سال پہلے اور میری ماں ڈیڑھ سال پہلے بغیر کچھ تکلیف اُٹھائے مر گئے اور یہیں دفن بھی ہو گئے مگر مجھے کہا جا رہا ہے کہ اپنا وجود یہاں سے سمیٹنا شروع کر دوں، یہ ہماری سرزمین نہیں ہے۔ آخر یہ کیا حماقت ہے؟ کیا یہ لوگ نہیں سوچتے، اگر مَیں اِس زمین کا نہیں ہوں تو مجھے جو لوگ یہاں سے دھکیل دینا چاہتے ہیں، کیا وہ ایرانی تورانی اپنی قبروں کی مٹی وسط ایشیا سے اُٹھا کر لائے تھے؟ مگر میری بات کوئی سنتا ہی نہیں۔ گویا مَیں ایسی صورتوں سے مخاطب ہوں، جو خواب میں نظر آتی ہیں اور ہاتھ لگانے پر غیب ہو جاتی ہیں۔ ہر آنے والے دن مجھے اگلے بدقسمت لمحے کی خبر دی جا رہی ہے۔ میرے تمام دوست یہاں سے جا چکے ہیں اور باقی جا رہے ہیں۔ جو جا چکے ہیں، اُن کے واپس آنے کا اِمکان نہیں۔ جو نہیں گئے، اُن کا ٹھہرے رہنے کا ارادہ نہیں۔ وہ جانے کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ سفید لوگ اِس طرح حالات سے سمجھوتہ کر رہے ہیں، جیسے اُن کے اندر رُکنے کی طاقت بالکل نہیں رہی۔ رہی تمھاری بات، تو مجھے تمھارے معاملے میں ایسا ڈر کھائے جا رہا ہے، جس کا ظاہر ہو جانا ہمارے جگر کے ٹکڑے کر دے گا۔ تمھاری کیفیت اُس بچے کی ہے، جو اپنے معمولی زخم کا خون بھی دیکھ لے تو چیخنا شروع کر دے۔

اِس لیے مَیں تمھیں اُن سوچوں میں شریک نہیں کرتا، جن کا حزن زندگی کی خوشیاں لپیٹ دینے کے لیے کا ہے اور اُس کا اندمال نہیں۔

کیتھی ولیم کے سامنے کُرسی پر دوبارہ بیٹھ گئی اور بولی، ولیم تم یہ بات جان جاؤ، مَیں ایک عرصے سے تمھارے خیالات میں خموش شرکت کر چکی ہوں۔ میں جانتی ہوں، تم ہندوستان چھوڑنا نہیں چاہتے۔ مگر یہ بھی سچ ہے، یہ سب کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تو کیا ہوا، ہم لندن میں جا کر اپنے آپ کو نئے سرے سے منظّم کر لیں گے۔ کمشنری نہ سہی کوئی کاروبار، اور اگر یہ بھی نہ ہوا، تو ہمارے پاس اِتنے پیسے ہیں کہ آرام سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

کیتھی کی بات سُن کر ولیم اِنتہائی غصے سے میز پوش کو جھٹکتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا، کیتھی بس یہی بات مجھے پریشان کر رہی ہے اور اُس کی واحد وجہ تم ہو۔ مَیں جن تسلیوں سے بچتا ہوں، تم بار بار مجھے وہی دیتی ہو۔ مَیں تمھاری نصیحتوں سے ڈرتا ہوں اور تمھارے مشوروں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا، جن کے بارے میں مجھے ایسے ہی وضاحت ہے، جیسے تمھارے خدوخال سے واقف ہوں۔ کیا تم نے کبھی دیکھا، مَیں نے روپے پیسے کو اہمیت دی ہو یا حساب کی جمع تفریق میں دلچسپی لی ہو؟ مَیں وہ ہوں جس کی دلچسپیاں جاننے اور سمجھنے کے لیے تمھیں وقت دینا چاہیے، جو بہت کم رہ گیا ہے۔ حالات قدموں کے نیچے سے کھسکتے جا رہے ہیں اور تم بار بار لندن میں کاروبار کھولنے کی بات کرتی ہو۔ کیا مَیں وہاں برف کی آڑھت کر لوں یا ملاح گیری اپنا لوں؟ میرے پاس اپنے باپ دادا کی ڈیڑھ سو سال کی کمائی موجود ہے۔ وہ اُس وقت سے کماتے آ رہے ہیں جب ایسٹ انڈیا کمپنی پیدا ہوئی تھی۔ کمپنی مر گئی مگر ہمارا منافع ابھی تک آ رہا ہے اور اِس سب کچھ کا میں اکیلا وارث ہوں۔ اِدھر تم سمجھتی ہو، مَیں اپنے روزگار سے پریشان ہوں۔

کیتھی نے ولیم کو اتنا غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ولیم کے اِس انداز کو دیکھ کر گھبرا گئی اور ایک دم سہم کر چپ ہو گئی پھر کچھ دیر اِسی خموشی میں گزر گئی۔ شاید انتظار کر رہی تھی کہ ولیم مزید کچھ بولے مگر اُس نے اپنی بات مکمل کر لی تھی۔ اُدھر وہ کچھ اور کہنے سے ڈر رہی تھی اور پریشان تھی کہ ولیم اِتنا چڑچڑا کیوں ہو گیا ہے۔ کافی دیر اِسی طرح بیٹھے گزر گئی، تو ہمت کر کے دوبارہ بولی، ولیم آخر تم کیا چاہتے ہو؟ مَیں نے کئی بار تم سے پوچھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کون سی پریشانی ہے جس کی وجہ سے تم آج اِس قدر بلبلا اُٹھے ہو؟ مَیں تمھاری بیوی ہوں۔ اگر مَیں نہیں سنوں گی اور تم کو

تسلی نہیں دوں گی، تو وہ دوسرا کون ہے جس کے سامنے تم اپنے سوالات رکھو گے؟ میں جاننا چاہتی ہوں، تم مسلسل کیا سوچ رہے ہو؟

ولیم نے محسوس کر لیا تھا کہ اُس کا لہجہ کچھ زیادہ تلخ ہو گیا ہے۔ لیکن وہ کب تک کیتھی کے بے کار، فرسودہ اور تھکا دینے والے سوالات کو برداشت کرتا۔ ولیم نے فیصلہ کیا، آج وہ اپنا مدعا کیتھی کے سامنے رکھ ہی دے۔ اُس نے نہایت تحمل سے اپنی بات کا آغاز کر دیا۔ کیونکہ اِس کے بعد جو شور بلند ہونا تھا، اُس کی تلخی سینے کو کاٹ دینے والی تھی۔ اِس لیے ولیم نے سوچا، جس قیامت کو گزرنا ہے، وہ جلدی گزر جائے۔ ولیم تھوڑا سا آگے بڑھا، کیتھی کا ہاتھ پکڑا اور اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا، کیتھی کیا تم جانتی ہو، مَیں تم سے اپنی بات چوروں کی طرح چھپا رہا ہوں؟ تم میری جس تکلیف کو سننے کا روز تقاضا کرتی ہو، جب مَیں نے اُسے تم پر ظاہر کر دیا تو وہ تکلیف تمھاری بن جائے گی اور تم اُس کے درد سے چیخ اُٹھو گی۔
کیتھی نے ولیم کا ہاتھ مضبوطی سے دباتے ہوئے کہا، ولیم تم بیان کرو۔

کیتھی، ولیم دوٹوک بولنے لگا، مجھے پورے ہندوستان سے کوئی لینا دینا نہیں۔ مجھے کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ بس اِس وقت جس جگہ تم اور مَیں کھڑے ہیں، مجھے اِسی سے مطلب ہے۔ یہ جگہ، یہ خطہ، یہ نولکھی کوٹھی، یہ نہریں، یہ باغات اور نہروں کی کچی پکی روشیں، کھیتوں میں اُگتے ہوئے آلو، مکئی، گندم، گنا اور برسن کے ٹھنڈے ٹھنڈے لمس، اِن باغات اور نہروں کے مضاف میں رہنے والے لوگ، اُن کے معصوم، سادہ اور عزت و آبرو بخشنے والے چہرے، یہ ہے میری زندگی۔ مَیں نے تمھیں پہلے کہا ہے، مجھے نہ کسی اور زمین سے غرض ہے، نہ میں نے کبھی دہلی، لکھنؤ، یا کلکتے کو پسند کیا۔ حتیٰ کہ آگرے کا تاج محل اِس نولکھی کوٹھی کے عوض حقارت سے ٹھکرا دوں۔ مجھے پورے پنجاب سے بھی کچھ مطلب نہیں۔ بس یہ میرا گھر میری سلطنت ہے۔ مَیں اپنی اِس سلطنت کو نہ لندن کے عوض بیچ سکتا ہوں اور نہ میں اِس کے مقابلے میں اپنے دوسرے محبوب کا گناہ معاف کر سکتا ہوں۔ کیتھی مَیں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ کبھی نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ لندن کی مٹی مجھے نہیں جانتی، نہ اُس کی سرد ہواؤں سے مجھے رغبت ہے۔ مَیں یہاں پیدا ہوا ہوں، یہیں مروں گا۔ اِس کے بعد ولیم نے کیتھی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور دوبارہ بولا، یہ ہے میری

تکلیف اور المیہ لیکن دیکھو اب مجھے نہ سمجھانے کی کوشش کرنا، نہ نصیحتوں کی انجیل پڑھانا اور نہ ہی مجھے میرے اور اپنے بچوں کے واسطے دینا۔ یہ بچے جو مَیں نے اور آپ نے مل کر پیدا کیے ہیں۔

ولیم کی بات اتنی دو ٹوک اور فیصلہ کن تھی، کیتھی سوچتی رہ گئی کہ یہ کیا بن گیا ہے؟ واقعی ولیم نے ایسا نقصان دینے والا فیصلہ سنایا تھا، جس کی تلافی نہ ہو سکنے والی تھی۔ وہ یہ تو جانتی تھی، ولیم برطانیہ کے مقابلے میں ہندوستان کو پسند کرتا ہے اور لندن نہیں جانا چاہتا۔ لیکن وہ یہ بھی خیال کرتی تھی کہ ولیم کو بہر حال سب برطانیوں کی طرح یہاں سے نکلنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ وہ اکیلا تو کسی صورت یہاں رک نہیں سکتا۔ اِسی زعم میں یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ وطن واپس جانے کے دن قریب آرہے ہیں۔ اس سلسلے میں کئی قسم کی تیاریاں کر رہی تھی اور طرح طرح کے منصوبے عمل میں لا رہی تھی، جس کا ولیم کو بھی پتا تھا۔ اب اُسے یاد آیا، وہ جب بھی ولیم سے اپنی تیاری کا ذکر کرتی، ولیم نہ صرف اُسے ٹال جاتا بلکہ بعض دفعہ جھنجھلاہٹ کا بھی شکار ہو جاتا تھا۔ پھر بات سنے بغیر یا تو اُٹھ جاتا یا بات بدل دیتا تھا۔ تو گویا وہ ایک ایسے سول سروس کے افسر کو اپنا چکی تھی، جو اپنی سر زمین واقعی بدل چکا تھا۔ اب وہ ایک قوم کے ہوتے ہوئے دو الگ الگ خطوں کے باشندے تھے۔ کیتھی نے سوچا، کیا یہ اِتنا آسان ہے؟ وہ اپنے جگر کی طاقت جمع کرتے ہوئے ولیم کی طرف بڑھی اور دوبارہ بولی، ولیم کیا تم جانتے ہو، قدرت کے فیصلے طاقت سے نہیں بدلے جا سکتے۔ جب طوفان کی لہریں بادبانوں سے بلند ہو جائیں، اُس وقت کمپاس بیکار ہو جاتے ہیں۔ خود کو اُس وقت تک لہروں کی مرضی پر چھوڑ دینا پڑتا ہے، جب تک چاند اور ہوائیں پُر سکون ہو جائیں۔ تمھیں معلوم ہے، یہاں ایک سال بعد ایک بیراتک تمھارا ہم جنس نہیں رہے گا اور یہ لوگ، جن کو اب تم اپنا کہہ رہے ہو، یہ تمھارے چہرے کی سُرخ جھریوں پر ہنسیں گے اور تمھاری شکل کو بندروں سے تشبیہ دیں گے۔

مجھے اس کی پروا نہیں، ولیم نے کہا، مَیں اِن اصطبل کے گھوڑوں پر سیر کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں، کسی انگریز بیرے سے مل کر بات چیت کرنے کو۔ یہ اصطبل، جس کو میرے باپ نے میرے لیے، اِس کوٹھی کے پچھواڑے بنایا ہے۔

کیتھی نے ولیم کے جواب میں چبھتے ہوئے لہجے میں کہا، ولیم تمھیں یقین ہے، یہ اصطبل جو اِس کوٹھی کے پچھواڑے میں ہے، جس میں موجود گھوڑوں کی نعل بندی اپنی نگرانی میں کرواتے ہو، تمھارے پاس رہے گا؟

شاید نہ رہے، مگر میں برطانیہ جانے کے لیے تیار نہیں ہوں، نہ اِس وقت تم سے زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ تمھارے پاس وقت کم ہے، اپنا فیصلہ سنا سکتی ہو۔

ولیم، اگر تم اپنی حماقت پر قائم رہے، تو مَیں اپنے بچوں کو اِس جلاد دینے والی زمین سے نکال کر لے جاؤں گی۔ اِس تلخ جملے کے بعد کیتھی اُٹھ گئی۔ جبکہ ولیم وہیں بیٹھا رہا، ایسے لگا جیسے کوئی جواری سب کچھ ہار جانے کے بعد پُرسکون ہو گیا ہو۔

جاری ہے

قسط نمبر 28

(48)

دھوپ اور گرمی کی وجہ سے پورا فیروز پور جہنم کی دیگ ہو گیا تھا۔ ہر چیز کر راکھ ہو رہی تھی۔ اگر کسی نے گرمی اور دھوپ کے بارے میں اندازہ لگانے میں غلطی کی ہو اور اُسے یقین نہ آرہا ہو کہ گرمی کا دوسرا نام وہ ذلت ہے، جس کے بعد سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب ہو جاتی ہیں، تو اُسے لا کر فیروز پور کے جیٹھ ہاڑ میں ڈبو دینا چاہیے۔ لیکن اب کے معاملہ دوسرا تھا۔ لوگ اِس عقل سوز گرمی اور دھوپ کو بھول کر کسی اور دھیان میں لگے ہوئے تھے۔ ایک خاموشی، دبی دبی خاموشی، جس میں حواس باختہ کر دینے والا خوف اور بجھا بجھا ڈر تمام لوگوں پر چھایا ہوا تھا۔ پوری آبادی میں نہائت خموشی اور لاشعوری تقسیم کا عمل جاری تھا۔ لوگ دیکھتے ہی دیکھتے دو حصوں میں بٹنے لگے تھے۔ آپس کی اِس لاشعوری تقسیم میں اُن کی زبانوں پر ہر وقت ست سری اکال یا اللہ اکبر کی تکرار پہلے سے کئی گنا ہو گئی۔ وہ نہیں جانتے تھے، بغیر وقفے کے اِن مذہبی نعروں سے کیا حاصل کر رہے ہیں، لیکن اپنے کلمہ گو بھائی کو دیکھ کر ہر فرد نے اُن نعروں کو ادا کرنا اور اُن کا جواب دینا اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔ گویا دونوں گروہوں نے اپنے اپنے دیوتا میدان میں لا کھڑے کیے، جو ایک عرصہ تک غیر متحرک رہے تھے اور اب اُن کی طاقت کا مظاہرہ کسی وقت بھی ہو سکتا تھا۔ مگر ایک بات ابھی تک نہ جانے کیوں راز میں تھی کہ اِس میدان کو تیار کرنے والے ظاہراً نظر نہ آرہے تھے۔ آخر وہ سب سے بڑا دیوتا کہاں تھا؟ جو دونوں بڑی طاقتوں کو خموشی سے بھڑا دینا چاہتا تھا لیکن اُس کی آگ کو وقت سے پہلے بالکل خموش رکھ رہا تھا۔ نہ اُس کی لکڑیاں دکھائی دیتی تھیں اور نہ اُس کے بندوبست میں لگے ہوئے چہروں کی کچھ خبر تھی۔ بس ہر ایک چیز اِس طرح اپنے ہی آپ منظّم اور اپنی اپنی صفوں میں درست ہو رہی تھی، جیسے پانی کا بہاؤ سوکھے ہوئے پاٹ میں پڑے تنکوں کو اِدھر اور اُدھر دونوں کنارے کے حوالے کرتا ہوا، آپ اکیلا سمندر کی جانب چلا جائے۔

اگرچہ یہ قضیہ سارے ہندوستان میں ایک ہی طرح سے چل رہا تھا لیکن تحصیل جلال آباد، تحصیل مکھسر اور خاص فیروز پور میں معاملات اِس طرح پُر اسرار تھے کہ اِس بارے میں کوئی بھی دماغ کوشش کے باوجود اِن حالات کا پتا چلانے میں ناکام تھا۔ ہر شے میں نحوست اور بے وقعتی اور بدنیتی یوں دبے قدموں چلی آئی تھی کہ اُس کے متعلق کوئی دعوہ نہیں کر سکتا تھا کہ اُس نے بدلتے ہوئے آسمان اور زمین کا مشاہدہ کر لیا ہے۔ ہاں ایک بات جو سب جانتے

تھے اور ہر فرد اُس کے بارے میں وثوق سے اپنی آنکھ کا اعتبار پیدا کر سکتا تھا، وہ یہاں کے لوہاروں کی تپتی ہوئی بھٹیاں تھیں، جن میں اِتنا ایندھن جھونکا جا چکا تھا کہ اب سرکنڈوں کے تنکوں تک کی نوبت آگئی تھی۔ لوہاروں کی دوکانیں، جن کی چھتیں، کھپریل، ٹوٹے پھوٹے بانسوں اور سخت جنتر کے سستے آنکڑوں سے بنی تھیں، بھٹی سے اُٹھنے والے دھویں اور آگ کی لپکوں نے، جو اُن کی واحد خوراک تھیں، پورے پورے علاقوں کو جلا دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ یہی وہ جگہیں تھیں، جن کا مالک کوئی سکھ لوہار تھا اور کوئی مسلمان۔ مگر لوہے کو سُرخ کرنے کی مہارت دونوں میں ایک ہی جیسی تھی۔ دونوں کے پاس آرہن، چھینی، ہتھوڑا اور چمٹا بھی ایک ہی طرح سے کام کرتا تھا۔ لوہے پر اُن دونوں کی ضربوں کی دھمک بھی ایک جیسی پڑتی تھی۔ حتیٰ کہ دونوں کے لوہا کوٹتے ہوئے بغلوں کا پسینہ اور پسینے کی بدبو سے ایک ہی طرح سے کراہت پید ہوتی تھی۔ اِس کے باوجود دونوں میں ایک ایسا ناقابل بیان فرق موجود تھا، جس کی وضاحت وہ خود بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اُس فرق سے وہ اِتنے وفادار تھے، جیسے اُس کے ساتھ زندگی کا لمس بندھا ہوتا ہے۔ اِن لوہاروں کو کئی دنوں سے تلواریں، چھویاں، برچھیاں اور سنگینیں بنانے سے ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں ملی تھی اور بھٹیوں کی چھتیں، جن پر پہلے ہی دھوپ، گرمی، دھویں اور اُڑتے ہوئے بگولوں سے گرد اور مٹی کی دبیز تہیں چڑھی ہوئی تھیں، آگ کے تپاؤ میں کٹھالی کی طرح پک کر سیاہ اور چکی تھیں۔ یہ اچانک نہیں ہوا تھا۔ نہ یہ سب تیاری سات سمندر پار اُن سفید لوگوں کے لیے تھی، جنھوں نے لال قلعہ سے لے کر جلیانوالا باغ تک، دونوں جگہ اپنے نقشے درست کیے تھے۔ نہ اُن لوگوں کے لیے، جو دیسی ہونے کے باوجود اُن کے درمیان نہ تھے، نہ اُن کی طرح کھاتے پیتے تھے اور نہ ہی اُن کی طرح بولتے تھے۔ یہ سب کچھ وہ اپنے لیے ہی کر رہے تھے۔ بلکہ یہ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ تیاری تھی بھی کہ نہیں۔ ہاں کچھ ہی دنوں بعد اتنی سمجھ اور آنے لگی تھی کہ یہ خموش نحوست اُس وقت شروع ہوئی، جب کسی نے اُسی ملک میں ایک مزید ملک بنانے کا نعرہ لگایا تھا۔ یہ ملک کیا تھا؟ کہاں بننا تھا؟ اور اس میں کن لوگوں نے رہنا تھا؟ یہ ابھی طے نہیں ہوا تھا، مگر یہ طے تھا کہ اِس کی بنیادوں میں گاڑھے اور پتلے، سبھی قسم کے خون کا گارا اور کٹے ہوئے سروں کی اینٹیں استعمال ہونا تھیں، جس میں تیز دھار لوہے کا بہت زیادہ کام تھا۔ اور یہ بھی طے تھا کہ جس کے پاس جتنا زیادہ اور جتنا تیز لوہا ہوگا، وہی اپنی عمارت بلند تعمیر کرے گا۔ اس میں ست سری اکال اور اللہ اکبر کو بھی کردار ادا کرنا تھا۔ لیکن اُن کا عمل دخل صرف لوہے کے استعمال کے وقت تھا۔

چھ سات مہینے تو یہی حالت رہی لیکن اب کچھ دنوں سے اِس منحوس اور اُکتا دینے والی خموشی کا سکوت ٹوٹنے لگا تھا۔ سان پر چڑھی ہوئی برچھیاں ڈانگوں پر چڑھنے لگیں۔ اَن کہی ٹولیاں ترتیب پانے لگیں اور اَن سُنی کہانیاں سُنی جانے لگیں۔ پُرامن گاؤں میں راتوں کو پہرے جمنے لگے۔ جوانوں نے مونچھوں کو تاؤ دینے شروع کر دیے لیکن کیوں؟ یہ ابھی بھی کسی کو پتا نہیں تھا۔ بس کہانیاں تھیں، کہ فلاں سکھڑے نے فلاں مسلے کو برچھی مار دی یا فلاں مُسلے نے فلاں سکھ کو تلوار سے کاٹ کر اُس کی انتڑیاں نکال دیں۔ مگر یہ سب دیکھا کسی نے نہیں تھا، سُن ضرور رہے تھے۔ یہ کہاں ہو رہا تھا؟ یہ بھی کسی کو معلوم نہیں تھا۔ ہاں اِتنا اور ہوا، چوہدریوں نے اپنے مزارعے بدل لیے اور مزارعوں نے چوہدری۔ مسلمان مسلمانوں کے ہاں چلے گئے اور سکھ سکھوں کے ہاں۔ پُرانے محلے داروں نے اپنے محلے اور گلیاں تک بدل لیں۔ گھروں کے پُرسکون آنگنوں میں سونے والے کوٹھوں جا چڑھے اور ساری ساری رات جاگ کر پہرے داریوں میں لگ گئے۔ ڈھاریوں میں مال کی رکھوالی کرنے والے مال مویشی ہی گاؤں لے آئے۔ مزید دن گزرے تو سونے والے اچانک ڈر کر ہڑبڑا اُٹھتے اور اُٹھ اُٹھ کر بھاگنے لگے۔ پھر خبر ملتی کہ کچھ بھی نہ تھا۔ پھر کچھ دنوں بعد کچھ ہونے بھی لگا۔ واہریں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ کبھی دائیں طرف سے بلوے کی خبر آتی، کبھی بائیں طرف سے۔ تھوڑی دیر میں واویلا اُٹھتا کہ سکھوں نے حملہ کر دیا۔ لوگ اللہ اکبر اور یا علی کے نعرے مارتے اپنی ڈانگیں اور برچھیاں لے کر چند لمحوں میں جمع ہو جاتے۔ وہ برچھیاں، جو اُنھوں نے رات اپنے سرہانوں کے ساتھ رکھی تھیں۔ لیکن پتا چلتا، خبر جھوٹی تھی۔ دو ہفتے بعد یہ کھیل بھی ختم ہوا اور خبریں سچی ہونے لگیں۔ اِس لیے کہ نیا ملک بننے میں اب کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی، بلکہ وہ بن چکا تھا۔ لیکن وہاں نہیں، جہاں فیروز پور تھا۔ بلکہ ستلج کے اُس پار منٹگمری کی طرف۔ اچانک اُنھیں پتا چلا، یہ اُن کا وطن نہیں ہے۔ کیوں نہیں ہے؟ اِس کا ابھی جواب نہیں تھا۔ وہ یہاں سے نکل کر کس مکان، کس دیہات یا کس شہر میں جائیں گے؟ یہ سب نہ اُنھیں پوچھنے کی طاقت تھی اور نہ ہی اُنھیں کسی ایسے شخص کا پتا تھا، جو یہ سب کچھ اُن بتا سکتا ہو۔ ڈھاریاں، بستیاں، قصبے اور فیروز پور کے چھوٹے چھوٹے شہروں کی آبادیاں، جن کی تعداد کم سے کم چار یا پانچ ہزار تھی، سب کے سب لوہے کے ہتھیاروں سے بھر گئے۔

پھر وہ دن جلد آ گئے، جب لال آندھیوں، جھکڑوں، بگولوں کے اُٹھتے ہوئے طوفانوں اور خشک زمینوں سے دھوپ کے اُڑتے ہوئے غباروں کے ساتھ دکن کی طرف سے سیاہ بادلوں کے پرے چڑھ آئے۔ یہ عذاب اکیلا نہ تھا بلکہ دوسری طرف سے کرپانوں، گنڈاسوں، تلواروں اور چھویوں کے مینہ برسنے لگے۔ بیٹھے بیٹھے جانے کس غیب سے اشارہ ملا

کہ لوہے کی تیز دھاریں ریشمی جسموں کی رگیں کاٹنے لگیں۔ واہگرو کی جے، ست سری اکال اور اللہ اکبر کا آوازہ بلند چوراہوں، راہوں، نہر کی پٹڑیوں اور ہر اُس جگہ پر گونجنے لگا، جہاں کوئی بے دست و پا نظر آیا۔ انگریزی نظام کی تمام کڑیاں ایک ہی ہلے میں کٹ کر گر گئیں۔ پولیس معطل اور نظام ثقہ کا سکہ رائج ہو گیا۔

ہو سکتا تھا جلال آباد اور مکھسر میں حالات ویسے ہی مست چال چلتے رہتے اور کسی کو باور نہ ہوتا، کیا ہو رہا ہے۔ اُن کی تلواروں، کرپانوں اور برچھیوں کو پڑے پڑے ساون کے پانی سے زنگ لگنا شروع ہو جاتا کہ ہریانہ، لدھیانہ اور دہلی سے لُٹے پٹے قافلے نمودار ہونے لگے۔۔ گڈے ہی گڈے، چھکڑے ہی
چھکڑے، انسان، گدھے، بیل، بکریاں، اُونٹ، گائیں اور بھینسیں اور چیتھڑوں میں لپٹے، ننگے، سفید لٹھوں میں، ننگے پاؤں، ننگے سر، پگڑیاں باندھے، پیدل، سوار، گدھوں پر، گھوڑوں پر، بیمار ایک دوسرے کے کاندھوں پر، کفن کی ٹاکیوں میں لپٹے مُردے، ہزاروں انسانوں، لاکھوں انسانوں کے قافلے اور قافلوں کے تعاقب میں بھی قافلے۔ ڈانگوں والے، برچھیوں والے، داڑھیوں والے، مڑا سے مارے ہوئے، ننگے سر، اسوار، گھوڑوں پر۔ گویا انسانوں کی کھمبیاں نکل آئیں تھیں، جن کی نہ کوئی پکار تھی، نہ پُرسش تھی اور نہ احساس تھا۔ بس نعرے تھے، بلوے تھے اور خون کے لمبے سلسلے، ہزاروں سال لمبے۔

غلام حیدر کو تشویش تو پہلے ہی بہت تھی لیکن جھنڈو والا کی خبر نے اُسے تڑپا کر رکھ دیا۔ ہوا یہ، آج صبح جب حویلی کے بیرونی صحن میں آیا تو اُسے ایک اجنبی نظر آیا، جسے اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ غلام حیدر چارپائی پر بیٹھ چکا تو اُس نے اُٹھ کر سلام کیا۔ غلام حیدر نے دیکھا، وہ لنگڑا کے چل رہا تھا۔ بہر حال اُس کے سلام کا جواب دیا اور پوچھا، وہ کون ہے؟

رفیق پاؤلی نے اُس شخص کے بولنے سے پہلے ہی کہا، چودھری غلام حیدر، یہ رشید عُرف چھدو ہے۔ جھنڈو والا سے آیا ہے۔ کہتا ہے، وہ بہت اہم خبر لایا ہے، جسے سوائے تمھارے کسی کو نہیں بتانا چاہتا۔

غلام حیدر نے کہا، چارپائی دور اُس کونے میں رکھ دو۔

جب غلام حیدر چھدو کو لے کر اکیلا بیٹھ گیا تو اُس نے جلدی سے بولنا شروع کر دیا، چودھری صاحب، میں خاص سودھا سنگھ کا ملازم تھا۔ اُس کے قتل کے بعد بھی اُسی کا نمک کھا رہا ہوں لیکن اِس وقت ایسی مجبوری آپڑی ہے کہ تیری طرف آنا ضروری ہو گیا تھا۔ آخر مسلمان ہوں۔ اپنے آپ کو روک نہیں سکا۔ بات یہ ہے کہ جودھا پور کے مسلمان اِس وقت بہت خطرے میں ہیں۔ آج شام سے پہلے اُن سب کو سردار سودھا سنگھ کے بھتیجے سردار شمشیر سنگھ نے قتل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اور اِس کے لیے پوری تیاری ہو چکی ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے، اپنے بندوں کو اسلحہ دے کر بھیج، تا کہ اُن کو نکال لائیں۔ خدانخواستہ دیر ہو گئی تو سب کچھ تلپٹ ہو جائے گا۔ چھدو کی بات سُن کر غلام حیدر سُن ہو گیا۔ اُس کے دماغ میں جو خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی، آخر وہی کچھ ہوا تھا۔ سوچتے سوچتے اُس کا ذہن نچڑ کے رہ گیا، مگر سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ غلام حیدر کی رعایا تو ایک طرف، خود وہ نہیں جانتا تھا کہ حالات اِتنی تیزی سے بدلیں گے۔ پورے علاقے میں، جہاں اُس کی چند ہی دن پہلے ہیبت تھی اور اُس کا نام سُن کر سکھوں کو پسینے چھوٹ جاتے تھے، وہیں ہر شے اُس کے اثر سے اچانک اس طرح نکل گئی، جیسے وہ ابھی پیدا ہی نہ ہوا ہو۔ کہاں تو ایک سال پہلے آدھے فیروز پور میں اُس نے الیکشن میں وہ کردار ادا کیا تھا، جس کی توقع نواب افتخار بھی نہیں کر رہا تھا۔ کانگرس اور یونینسٹ کو ووٹ ہی نہیں پڑنے دیے۔ اب اُسے اپنے اور اپنے بندوں کے جان و مال کے بھی لالے پڑ گئے تھے۔ آخر اُس نے ایک فیصلہ کر لیا پھر مطمئن ہو کر وہیں آگیا، جہاں بہت سے آدمی جمع تھے۔

بادل اِتنے کالے اور گہرے تھے کہ اُن کے نہ برسنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہوا بالکل بند تھی، جس کی وجہ سے حبس صبح کے وقت ہی اتنا بڑھ گیا تھا کہ محسوس ہونے لگا، ابھی بارش ہو جائے گی۔ یہ بارش ہو جاتی تو ساون کی پہلی بارش تھی۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ غلام حیدر کے بندے حقہ پینے میں مصروف تھے۔ اُسے پاس آتے دیکھ کر سب اُٹھنے لگے تو غلام حیدر نے اشارے سے سب کو بیٹھ جانے کے لیے کہا، پھر رفیق پاؤلی سے مخاطب ہوا، چاچا رفیق، جلدی سے ہمارے تمام بندوں کو جمع کر لو اور جو باہر نکلے ہوئے ہیں، اُن کو بھی بلا لو۔

رفیق پاؤلی نے غلام حیدر کو اِتنا گھبرائے ہوئے دیکھا تو وہ خود بھی پریشان ہو گیا۔ بولا، غلام حیدر خیر ہے، اتنی پریشانی کس لیے ہے؟ آدمی تو سارے ہی اِدھر ہیں۔

ہاں خیر ہی ہے، غلام حیدر نے تحمل سے جواب دیتے ہوئے کہا، تم سب میری ایک بات غور سے سُن لو۔ اب کوئی بندہ میرے پوچھے بغیر کہیں نہیں جائے گا۔ ایک بات طے ہے کہ فساد ہونے والا ہے۔ اِتنا بڑا فساد، جس کے آگے چراغ دین اور سودھا سنگھ کے قتل کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ سب کچھ تلپٹ ہونے والا ہے۔ اِس فساد میں کون کہاں جائے گا، اِس کی کسی کو خبر نہیں۔ اِس لیے کوشش کرو، ایک دوسرے سے الگ نہ ہو۔ کچھ دن پہلے میں نے جو محسوس کیا تھا۔ اُس کے پیشِ نظر اسلحہ تو ضرورت سے زیادہ جمع کر لیا تھا، لیکن اب سکھوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔ اِس لیے مزید بندوبست کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے لگ رہا ہے، جتنا کچھ احتیاطاً کیا گیا تھا، وہ اِس بند کے آگے تنکوں کا گھونسلا ہے۔ یہ بھی اچھی طرح سے جان لو کہ اب ہمیں بھی ستلج پار چلنا ہو گا۔

اور یہ گھر؟ جانی چھینبا بولا،

یہ گھر، زندگی رہی تو واپس آجائیں گے، غلام حیدر نے جانی کی بات کاٹتے ہوئے کہا، لیکن اِس وقت یہ حالات نہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہم لٹتے ہوؤں کا تماشا دیکھتے رہیں۔ پھر خود بھی زنخوں کے ہاتھوں مر جائیں۔ مَیں نے دس دن پہلے فرید کوٹ کے نواب صاحب سے دس رپفلیں اور گولیاں منگوالی تھیں۔ اُنھیں ملا کے اب ہمارے پاس چودہ رائفلیں اور چار سو کارتوس موجود ہیں۔ اِس کے علاوہ میری پکی رائفل بھی ہے، جس کی مرے پاس پچاس گولیاں باقی ہیں۔ چاچا رفیق، سب بندوں سے کہہ دو، جن کے پاس کچھ نہیں ہے، وہ کچھ نہ کچھ ضرور اپنی بغل میں دبا لیں۔ ہماری عورتوں کے پاس بھی چھُری کانٹا موجود ہونا چاہیے۔

یہ بات کہہ کر غلام حیدر کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا، جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر رفیق پاؤلی سے کہا، چاچا رفیق، تم ایسا کرو، جانی اور الطاف کو لے کر بیس مزید بندوں کے ساتھ بمع اسلحہ جودھا پور چلے جاؤ اور جودھا پور والوں کو اپنی نگرانی میں جلال آباد لے آؤ۔ اِس وقت وہ سب سے زیادہ خطرے میں ہیں۔ دو بندے شاہ پور بھیج کر اُن کو خبر کر دو کہ جتنی جلدی ہو سکے، اپنا سامان باندھ کر بنگلہ فاضلکا کی طرف روانہ ہو جائیں اور وہیں بیٹھ کر ہمارا انتظار کریں۔ جب تک ہم نہ آجائیں، آگے نہیں بڑھنا۔ وہاں سے اکٹھے ہیڈ پار کریں گے۔ یہ کام جلدی کرو، دیر اب نقصان کی طرف لے جائے گی۔

یہ حکم دے کر غلام حیدر جلدی سے واپس اندرونی صحن کی طرف چلا گیا۔ اِدھر رفیق پاؤلی نے ہوا کی تیزی سے اُس کی بات پر عمل شروع کر دیا۔ امیر سبحانی اور شیدے کو شاہ پور کی طرف بھیج کر آپ دس بجے سے پہلے ہی جودھا پور روانہ ہو گیا۔ رفیق پاؤلی کا جودھا پور کی طرف روانہ ہونا تھا کہ بادلوں نے گرجتے ہوئے برسنا شروع کر دیا۔ بارش ایسی شدید تھی کہ خدا کی پناہ۔ سیر سیر بھر کے تریڑے گرنے لگے۔ مگر رفیق پاؤلی نے اپنا سفر جاری رکھا کیونکہ معاملہ اب واقعی ہاتھ سے جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا، بارشوں کی وجہ سے دیر کی گئی تو خون کی بارشیں شروع ہو جائیں گی۔ حالات کے مطابق یہاں سے اب جتنی جلدی ہو سکے، نکلنا ضروری ہو گیا تھا تاکہ اکٹھے سفر کیا جائے اور بغیر جانی اور مالی نقصان کے ستلج پار کر لیا جائے۔

اِدھر تو غلام حیدر یہ فیصلے کر رہا تھا، اُدھر جھنڈو والا میں الگ اپنے فیصلے ہو رہے تھے کہ جودھا پور والوں سے کیا سلوک کیا جائے؟ سردار سودھا سنگھ کا بیٹا موہن سنگھ ابھی چھوٹا تھا۔ اِس لیے فیصلہ کرنے کا حق سردار سودھا سنگھ کے بھتیجے سردار شمشیر سنگھ کو دے دیا گیا۔ اُس نے کافی دنوں کی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ پورے جودھا پور میں کسی مرد کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ عورتوں کو آپس میں بانٹ لیا جائے اور بچوں کو نوکر بنا کر اُن سے بیگار لی جایا کرے، کہ اِن مُسلوں کی یہی سزا ہے۔ دوسری طرف جودھا پور میں یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ موت نے اُن پر نازل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اُنھوں نے بھی فی بندے کے حساب سے جو چیز لوہے کی ہاتھ آئی، اُسے سنبھال لیا۔ تمام عورتوں اور بچوں کو غلام حیدر کے جودھا پور والے مکان میں جمع کر دیا۔ اپنا اپنا سامان گٹھڑیوں میں باندھ کر ضروری چیزیں لے لیں اور باقی اندر رکھ کر مکانوں کو تالے لگا دیے کہ جب ٹھنڈ ٹھنڈار ہو گا تو اپنے گھروں میں دوبارہ آبسیں گے۔ عورتوں نے یہ سوچ کر گھروں کے جندروں کی چابیاں اپنے گھگھروں کے ازار بندوں سے باندھ لیں۔ بھلا ایسے بھی کبھی ہوا، کسی کو کوئی زبردستی اپنے گھروں سے نکال دے۔ آخر یہ دنگا فساد ایک دن تو ختم ہونا ہی تھا، جو نہ جانے کس شطونگڑے نے شروع کیا تھا اور بیٹھے بٹھائے گھروں سے بے گھر کر دیا۔ رحمت علی نے سب لوگوں کو حوصلہ دیا اور کہا، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اب ہم مل کر ہی مریں گے اور مل کر جیئں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے سکھڑے زبردستی گاؤں کو آگ لگائیں؟ وہ اچھی طرح جانتے ہیں، یہ گاؤں اُسی غلام حیدر کا ہے جس کی بندوق سے سکھڑے اِس طرح بھاگتے ہیں جس طرح شیطان اعوذ باللہ سے۔

جودھاپور میں کل مل ملا کے پچاسی مرد تھے، جنہوں نے اپنی جانوں پر کھیل جانے کے لیے پوری تیاری کر لی اور غلام حیدر کے مکان کو مورچہ بنا کر آنے والی آفت کا انتظار کرنے لگے۔ اِدھر ساون بھی اپنی جولانی پر تھا۔ سہ پہر چار بجے بادلوں کے کالے سایوں کے ساتھ موت کے زرد سائے بھی جودھاپور پر منڈلانے لگے۔ شمشیر سنگھ دو سو بندے لے کر، جو کرپانوں، چھویوں اور گنڈاسوں سے لیس تھے، جودھاپور کی طرف روانہ ہو گیا۔ اِس دفعہ اُس نے صرف کرپانوں پر بھروسا کرنے کی بجائے رائفلیں بھی ساتھ لے لیں، جن کی تعداد پانچ تھی۔ سردار سودھا سنگھ کے قتل کے بعد وہ صرف ڈانگ سوٹے پر بھروسا نہیں کر سکتے تھے۔ شمشیر سنگھ جانتا تھا، حالات جتنے بھی سکھوں کے حق میں ہوں، مُسلے بہر حال ایسے بچھو تھے جو کسی نئے طریقے سے بھی ڈنک مار سکتے تھے۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ غلام حیدر نے اُن کے لیے کوئی انتظام نہ کیا ہو۔ شام چار بجے شمشیر سنگھ کے جتھے نے جودھاپور پہنچ کر پورے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ اِدھر رحمت علی نے پہلے ہی اُن کے انتظام کے لیے سب کچھ سمیٹ کر غلام حیدر کے مکان پر جمع کر لیا تھا اور لڑنے کے لیے ہر طرح سے تیار وہاں بیٹھے تھے۔ عورتیں اِس کے لیے ہر گز تیار نہیں تھیں۔ وہ کسی بھی طرح سے نہیں چاہتی تھیں، فساد ہو۔ اُن کے سننے میں ایسی بُری بُری خبریں پہنچتی تھیں، جن کو برتنے کا اُن میں یارا نہیں تھا۔ اُن عورتوں میں سے کچھ مسلسل نماز میں تھیں،۔ کچھ دعا اور درود کے ورد میں مصروف ایک انہونے خوف میں مبتلا تھیں۔ اُنہیں مرنے سے زیادہ اِس بات سے دہشت ہو رہی تھی کہ خدانخواستہ اُن پر حملہ ہو گیا اور مرد لڑتے لڑتے مارے گئے تو وہ لمبی داڑھیوں اور بدبودار بغلوں والے ناپاک سکھڑوں کے ہاتھ آجائیں گی۔ وہ جو اُن سے سلوک کریں گے، اُس کا تصور ہی کپکپا دینے والا تھا۔ تمام بچے سہمے ہوئے اپنی ماؤں اور بہنوں کے ساتھ لپٹے ہوئے تھے۔ منہ اندھیرا ہو رہا تھا۔ اِس عالم میں جوں جوں سکھوں کے حملے کی خبریں ملتیں، دہلا دینے والے ہول پڑتے اور شام کے سائے بھوتوں کی طرح جودھاپور میں چلتے پھرتے نظر آتے۔ اچانک بادل زور سے گرجنے لگے۔ ہوا کا زور بڑھا تو عورتوں نے چاروں قل اور آیہ کرسی کی تلاوتیں شروع کر دیں۔ پانچ بجے شام گھوڑوں کی ٹاپوں اور پیدل سکھوں کے قدموں کی دڑ دڑ شروع ہوئی تو عورتوں کے وظیفوں اور دعاؤں کی گنگناہٹ اتنی تیز ہو گئی، جیسے شہد کی مکھیوں کے چھتے بکھر رہے ہوں۔ رحمت علی کی ہدایات پر مردوں نے دو رائفلوں کے ساتھ پوری طرح حملے کا جواب دینے کے لیے اپنے نشانے سیدھے کر لیے۔ وہ یہ تو جانتے تھے، اِتنے سکھوں کی یلغار کے سامنے مٹھی بھر لوگوں کا کیا بنے

گا۔ مگر شاید یہی دن تھا، جب سب کے ایمان کا یقین ایک جیسا ہو گیا تھا، اور وہ مولا علی کو دل میں اور باآواز بلند بھی پکار رہے تھے۔

شمشیر سنگھ اور اُس کا جتھا جودھا پور میں داخل ہوا تو وہ حیران رہ گئے۔ سارے گاؤں میں کوئی فرد بھی اُنہیں کسی گلی میں چلتا پھرتا نظر نہ آیا۔ گویا کوئی دیو پھر گیا ہو۔ مکانوں کو تالے لگے ہوئے تھے۔ بادلوں کے سیاہ پھریروں میں صرف درختوں کی شاخیں اور پتے تھے، جو لہرا لہرا کر اپنے ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ اِس ویرانی میں اُن کا ہلنا بھی گاؤں کی وحشت میں اضافہ کر رہا تھا۔ چند منٹوں کے لیے تو شمشیر سنگھ پریشان ہو گیا۔ لیکن جلد ہی اُسے پتا چل گیا کہ مُسلوں نے غلام حیدر کے بڑے احاطے میں پناہ لے رکھی ہے۔ گاؤں چھوٹا ہونے کی وجہ سے اُنہیں ڈھونڈنے میں زیادہ تگ و دو نہ کرنا پڑی۔ اُس نے سوچا، یہ اور بھی اچھا ہے، سارے ایک ہی جگہ پر قابو آ گئے ہیں۔ اُسی وقت اُس نے مکان پر حملے کا حکم دے دیا۔ اِس سے پہلے کہ شمشیر سنگھ کا جتھا حملہ آور ہوتا، رحمت علی نے فیصلہ کیا کہ سکھوں پر گولی چلا دی جائے۔ رحمت علی اور جودھا پور کے مرد مکان کی چھت پر ہونے کی وجہ سے کچھ دیر کے لیے اُن کی دسترس سے باہر تھے۔ بلکہ جب تک گولیاں ختم نہ ہو جاتیں سکھوں کا مکان میں داخل ہونا مشکل تھا۔ چنانچہ اِدھر شمشیر سنگھ کے لوگ حویلی کی طرف بڑھے، اُدھر ایک دم کوٹھے کے اُوپر تنی بندوقوں سے تین فائر نکل کر سیدھے سکھوں کے ہجوم میں گھس گئے۔ فائر کارتوسوں سے کیے گئے تھے، اِس لیے چھرّے اِس طرح زور سے بکھرے، جیسے مینہ کے چھینٹے برس پڑے ہوں۔ بادل زور سے برس اور گرج رہے تھے۔ اِس قدر تیز بارش میں حملہ آوروں کا دھیان پہلے ہی بٹا ہوا تھا کہ اِن فائروں سے وہ اور زیادہ بوکھلا گئے۔ لیکن اب وہ بھاگنے کے لیے نہیں آئے تھے۔ اُن کے دو بندے گر گئے جس کی وجہ سے غصہ دو چند ہو گیا اور وہ اندھا دُھند مکان کے دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔ کچھ نے چھت کی طرف گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ بہت سے سکھوں نے مل کر حویلی کے بڑے دروازے کو دھکا دیا تو وہ منٹوں میں زمین بوس ہو گیا۔ اُس کے ساتھ ہی تمام سکھڑے مکان کے صحن میں بھر گئے، جن پر کوٹھے کی چھت سے ایک اور فائروں کی بوچھاڑ پڑی۔ اِس بوچھاڑ سے کئی سکھ مزید زخمی ہو کر گر پڑے۔ لیکن وہ مسلسل واہگرو اور ست سری اکال کے نعرے لگاتے ہوئے اور تلواریں، برچھیاں لہراتے ہوئے آگے ہی چلے آ رہے تھے اور کوٹھے پر بھی فائر کرتے جاتے۔ اِس فائرنگ سے حمید اکمبو، دلاور عرف دُلا اور شرفو اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن سوائے اِس کے، کوئی رستہ نہیں تھا کہ لڑ مریں۔ چنانچہ وہ بھی چھت پر بیٹھے فائر پر فائر کرنے لگے۔ اِس مسلسل فائرنگ اور

بارش کی وجہ سے شمشیر سنگھ کا جتھا کچھ دیر کے لیے کمروں کے دروازوں کی طرف بڑھنے سے رُک گیا، جہاں عورتیں چھُریاں اور داتی تھامے اور خالی ہاتھ، بچے ماؤں کے پہلوؤں سے چمٹے سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ باہر کے شور شرابے اور مار دھاڑ میں ڈر اتنا غالب آگیا کہ کچھ عورتیں دعاؤں کو چھوڑ کر رونا شروع ہو گئیں۔ اِسی باہر کے پٹاخوں اور نعروں کی اُونچی آوازوں سے گھبرا کر بچے مسلسل رو رہے تھے۔ رحمت علی نے محسوس کیا کہ سکھ کچھ ہی دیر میں کمروں کے دروازے توڑ کر اندر داخل ہو جائیں گے اور سب کچھ برباد ہو جائے گا، تو اُس نے، جن لوگوں کے پاس رائفلیں تھیں، اُنہیں کہا کہ وہ چھت پر ہی رہیں اور سکھوں پر اُس وقت تک فائر کرتے جائیں جب تک کارتوس موجود ہیں یا جب تک ہم زندہ ہیں۔ باقی سب نیچے چھلانگیں مار کر دالان میں جمع سکھوں پر حملہ کر دو۔ ویسے بھی کئی سکھ صحن میں کھڑے ہوئے نیم کے بڑے درخت پر چڑھ چکے تھے۔ جس کی شاخیں مکانوں کی چھتوں سے بھی بلند تھیں۔ یہ سکھ یہاں سے چڑھ کر کوٹھوں پر بیٹھے لوگوں پر فائرنگ کرنے لگے۔ جس کی وجہ سے بندوں کا نقصان بڑھ گیا۔ اِن حالات کے پیشِ نظر آمنے سامنے سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ رحمت علی کی بات سُن کر سب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، نیچے چھلانگیں مار دیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دوبدو لڑائی شروع ہو گئی۔ چھویاں، ڈانگیں، کرپانیں اور برچھیاں اِس طرح برسنے لگیں جیسے ساون کی بارش برس رہی تھی اور پانی کے ساتھ خون کے پرنالے بھی بہنا شروع ہو گئے۔ سکھ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ اِس لیے نقصان مسلمانوں کا زیادہ ہو رہا تھا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ سکھ مکمل طور پر محفوظ تھے۔ اگر دو بندے مسلمانوں کے گرتے تو ایک سکھوں کا بھی گر جاتا۔ کچھ ہی دیر میں لڑائی نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ بس غلام حیدر کے مکان کا تین کنال کھلا صحن تھا، بارش کا شور تھا، خون اور پانی کے تریڑے تھے۔ یا پھر یا علی مدد اور واہگرو کے نعروں کی گونج تھی۔ جن میں بچوں اور عورتوں کے رونے کی آواز دب کر رہ گئی تھی۔ جودھا پور والے اِس بے جگری سے لڑ رہے تھے کہ شمشیر سنگھ حیران رہ گیا۔ مکان چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا۔ مرنے والے اور لڑنے والوں کے پاس اب نہ تو قائدِ اعظم تھا، نہ نواب افتخار اور نہ ہی گاندھی اور نہرو موجود تھے۔ وہ سب لیڈر اپنے گھروں میں محفوظ، اِس بات سے بھی بے خبر تھے کہ ہندوستان کے صوبے پنجاب کے ضلع فیروز پور کی تحصیل جلال آباد کے تھانے مکھسر کے ایک گاؤں جودھا پور میں اِس وقت خون اور پانی کی جنگ ہو رہی ہے۔ اُنہیں نہیں پتا تھا کہ اُس کے نتیجے میں، جو مارے جا رہے ہیں، اُن کا مقدمہ کس عدالت میں چلایا جا سکتا ہے؟ یا اگر وہ جانور ہیں اور اُن کا خون بہا نہیں تو یہ اُنہیں پہلے کیوں نہ بتایا گیا۔ جہاں تک یاد پڑتا

ہے، اُن کے کانوں نے تو کسی آزادی وغیرہ کا نام سنا تھا۔ اُن بڑے لیڈروں نے تو جودھاپور، شاہ پور اور جھنڈووالا کے نام بھی نہیں سُنے تھے، جو ہوائی جہازوں کے ذریعے سرحدیں پار کر رہے تھے، بمع سازوسامان اور اہل وعیال۔ ان بڑے بڑوں کو تو چھوڑیے، خود اِن جودھاپور اور جھنڈووالا کے لڑ کر مرنے والوں کو بھی نہیں پتا تھا، وہ کیوں لڑ اور مر رہے ہیں؟ کیونکہ اِس لڑائی میں نہ گاندھی شامل تھا اور نہ محمد علی جناح، لیکن لڑائی جاری تھی اور لاشیں گر رہی تھیں، بارش ہو رہی تھی۔

اِسی دوران رفیق پاؤلی گاؤں میں اپنے بندوں کے ساتھ داخل ہو گیا اور جودھاپور پر اِتنے سارے حملہ آور سکھوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ جلد ہی ساری صوت حال کو سمجھ گیا تھا اور جی میں اِس بات پر خدا کا شکر کیا کہ غلام حیدر کے سامنے سرخ رو ہونے کے لیے عین موقعے پر پہنچ گیا تھا۔ رفیق پاؤلی نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنے بندوں کو سکھوں پر فائر کھولنے کا کہہ دیا۔ جس کے بعد ایک دم یا علی کے نعروں کے ساتھ سکھوں پر پانچ مزید رائفلوں سے گولیاں برسنا شروع ہو گئیں۔ شمشیر سنگھ اور اُس کے ساتھی اِس اچانک حملے سے گھبرا گئے۔ مگر جلد ہی اُس نے اپنے بندوں کو قابو میں کر کے رفیق پاؤلی پر بھی حملے کے لیے آگے کر دیا۔ رفیق پاؤلی کے آنے سے جودھاپوریوں کے حوصلے کئی گنا بڑھ گئے۔ اُس کی وجہ سے مکان کے اندر اور باہر، دونوں جگہ گھمسان کا رن پڑ گیا۔ رفیق پاؤلی اور اُس کے بندے کھلی جگہ پر تھے۔ اِس لیے اندر کی لڑائی سے باہر کی لڑائی زیادہ تیز ہو گئی۔ اُدھر اندر والے بھی کئی لوگ بھاگ کر باہر آنے لگے۔ اُنھیں محسوس ہوا، غلام حیدر اپنے بندوں کے ساتھ مدد کو آگیا ہے۔ اِس افراتفری میں یہ ہوا کہ چند ہی لمحوں میں حویلی کا صحن سکھوں سے خالی ہو گیا اور باہر لڑائی کا زور پیدا ہو گیا۔ اب چھت پر بیٹھے ہوئے بندوق والوں کو کُھل کر فائر کرنے کا موقع مل گیا۔ لیکن کارتوس کم ہو گئے تھے۔ مگر اُس کا اندازہ خدا کا شکر ہے، شمشیر سنگھ کو نہیں تھا۔ باہر چونکہ لڑائی کا زور بہت بڑھ گیا تھا اور سب کا رخ رفیق پاؤلی اور اُس کے بندوں کی طرف تھا، اِس لیے شمشیر سنگھ کی گولیوں اور کرپانوں کا تماشا بھی اُدھر ہی ہونے لگا۔ اُدھر جودھاپور والے، جو حویلی کے اندر لڑ رہے تھے، وہ بھی باہر نکل آئے۔ عورتیں اور بچے پھر کچھ دیر کے لیے محفوظ ہو گئے۔ لڑائی کا یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ جس میں ابھی تک کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کتنے مسلمان مر گئے ہیں اور کتنے سکھ؟ البتہ اِتنا ہوا کہ رفیق پاؤلی کے آنے کی وجہ سے جودھاپور والوں کے حوصلے اور قوت میں اضافہ ہو گیا۔ اِس لیے وہ پہلے سے زیادہ بہادری سے لڑنے لگے۔ اُن کے اِس طرح لڑنے سے سکھوں کے حوصلے اُٹھ سے گئے۔ وہ جس عظیم فتح کا گمان لے

کے جھنڈووالا سے آئے تھے، اُس پر کچھ اوس پڑتی نظر آرہی تھی۔ نقصان ہر چند مسلمانوں کا ہی زیادہ تھا لیکن شمشیر سنگھ اور اُس کے متروں کو حملہ کرنے سے پہلے یہ توقع نہیں تھی کہ معاملہ اتنی مزاحمت اختیار کر جائے گا۔ اِدھر نہ جانے کہاں سے کاہنا سیوئے نے تاک کر ایک گولی ماری کہ سیدھی آکر رفیق پاؤلی کے دل پر لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اِس گولی کا لگنا تھا، مسلمانوں نے نعرہ بازی بلند کر دی۔ اُنہوں نے محسوس کیا کہ مر تو جانا ہے، کیوں نہ زیادہ سے زیادہ سکھوں کو لے کر مریں۔ یہ سوچ کر مسلمان اِس طرح سکھوں پر ٹوٹ پڑے جیسے سروں پر بارش کے تریڑے گر رہے تھے۔ اِس گھمسان کی وجہ سے لاشوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی اور بیسیوں بندے ادھر اُدھر بکھر گئے۔ گویا پانی پت کی لڑائی جاری ہو۔ بارش کے پانی کا زور، کیچڑ اور اُس میں زخمی ہو کر گرنے والوں کا خون، زخمیوں کی چیخیں اور ڈانگوں کے کھڑاک نے وہ ہنگامہ برپا کیا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ شمشیر سنگھ کو یہ دیکھ کر اپنی فتح کے آثار قریب نظر آنے لگے۔ وہ مزید زور زور سے ست سری اکال کے نعرے دہرانے لگا۔ اِس کی وجہ سے اپنے آپ سے بے خبر ہو گیا اور آگے پیچھے کی ہوش نہ رہی۔ اُسی وقت چھت پر سے ایک گولی شمشیر سنگھ کے ماتھے پر آکر لگی اور وہ گھوڑے سے سیدھا زمین آپڑا۔ یہ دیکھ سکھوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ اُنہوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں نے اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی یلغار بڑھا دی اور بھاگتے ہوؤں کو مارنے لگے۔ یہی وہ وقت تھا، جب سکھوں نے جیتی ہوئی لڑائی کو شکست سمجھ لیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا گاؤں اُن سے خالی ہو گیا۔ البتہ جاتے ہوئے اُنہوں نے شمشیر سنگھ کی لاش ضرور اُٹھا لی۔ باقی جو سکھ مر گئے تھے، اُن کو وہیں چھوڑ دیا۔ جس کی وجہ سے جودھا پور والوں میں مزید خوشی دوڑ گئی اور وہ اُن کا تعاقب کرتے ہوئے ایک دو ایکڑ تک پیچھے بھاگے، پھر لوٹ آئے۔ لڑائی قریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہی تھی۔ اِس لیے شام کے سائے برستے ہوئے بادلوں کے ساتھ مل کر گہرا اندھیرا کرنے لگے۔ لاشوں کا حساب شروع کیا تو جودھا پور کے چالیس بندے مر چکے تھے اور سولہ سکھ بھی وہیں ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ زخمیوں کی تعداد الگ تھی۔ اِس کے علاوہ رفیق پاؤلی اور اُس کے ساتھ آئے بیس میں سے پانچ بندے مزید مارے جا چکے تھے۔

بارش ابھی ہلکی ہلکی جاری تھی۔ کچی زمین ہونے کی وجہ سے کیچڑ، پانی اور کھوبے نے چلنے پھرنے میں مشکل پیدا کر دی۔ رفیق پاولی مارا جا چکا تھا، اِس لیے حالات کی ڈور جانی چھینبے اور رحمت علی نے سنبھال لی۔ شام کی اذان کا وقت ہو گیا تھا۔ جانی نے سب زندہ لوگوں، بچوں اور عورتوں کو اکٹھا کیا اور اُنہیں کہا، جو کچھ اُٹھا سکتے ہو، اُٹھا لو اور جلدی یہاں سے نکلنے کی کرو۔ رحمت علی نے کچھ بندوں کو لے کر ایک گڑھا کھدوانا شروع کر دیا تاکہ لاشوں کو جلدی سے

دفن کر دیا جائے۔ اب یہ طے تھا کہ اتنی جلدی یا کم از کم رات کے وقت سکھ دوبارہ حملہ نہیں کریں گے۔ مگر یہ ضرور تھا کہ اگلے دن وہ دوبارہ نئی طاقت سے چڑھ آئیں گے۔ اِس لیے رات ہی جودھاپور چھوڑ دینا ضروری تھا۔ عورتیں اپنے مرنے والوں پر رونے اور بین کرنے کے ساتھ سفر کی تیاری میں مصروف ہو گئیں۔ وہ کبھی اپنے کپڑے سنبھالتیں اور کبھی بھائیوں، باپوں اور خاوندوں کے اُوپر گر گر کے دوہتھڑ پیٹتیں اور بین کرتیں، جنہیں چند لمحوں بعد وہ خود چھوڑ جانے والی تھیں۔ اُنہیں رہ رہ کر اِن لاشوں کی تنہائی اور بے کسی کچوکے لگا رہی تھی۔ جن پر اب نہ وہ اگربتی سلگا سکتی تھیں اور نہ اُن کی قبروں پر بیٹھ کے ماتم کر سکتی تھیں۔ اِسی عالم میں جو کپڑا لتا، اُن کے ہاتھ میں آیا، اُس کی گٹھڑی باندھ لی۔ گڑھا تیار ہو گیا تو جودھاپور کے مولوی نے، جو خوش قسمتی سے بچ گیا تھا، جلدی سے اور مختصر ترین جنازہ پڑھا اور لاشوں کو دفنانے کا کہہ دیا۔ سکھوں کی لاشیں، جن سے اب وحشت ہو رہی تھی، اُنہیں ویسے ہی پڑا رہنے دیا۔ اِس دوران بارش بالکل رُک چکی تھی۔ گویا بارش ایک ایسا رجز تھی، جو اُس وقت تک جاری رہا، جب تک لاشیں گرتی رہیں۔

رات دس بجے کے قریب یہ بدنصیب قافلہ، جس کے آدھے مرد پل بھر میں لاشوں میں تبدیل ہو کر گڑھے میں جا چکے تھے، جلال آباد کی طرف چھکڑوں پر اور پیدل روانہ ہو گیا۔ عورتیں اور بچے خوش قسمتی سے بچ گئے تھے۔ قافلے کے ساتھ رفیق پاؤلی، حمید اکمبوہ سمیت پانچ لاشیں، آٹھ زخمی، بین کرتی ہوئی عورتیں اور روتے ہوئے بچے تھے، جو رات کے اندھیرے میں اپنے گھروں کو چھوڑتے ہوئے، اُن پر حسرت بھری نظر بھی نہ مار سکے اور اپنے گھروں کی دہلیزوں کو ڈر کے مارے پلٹ کر دیکھ بھی نہ سکے۔ بوڑھی عورتیں، بچے اور زخمی زیادہ تر چھکڑوں پر لادے گئے، جب کہ جوان عورتیں اور مرد پیدل چل دیے۔ بارش اِتنی شدید ہوئی تھی کہ ہر طرف جل تھل عام ہو گیا۔ سڑکیں پانی اور کیچڑ میں بدل جانے سے چھکڑوں اور گڈوں کا چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ چنانچہ اُن کو جتنا زیادہ ہلکا رکھا جا سکتا تھا، چھکڑوں میں جُتتے ہوئے بیلوں کے لیے اتنا ہی بہتر تھا۔ یہ قافلہ رات بھر کراہتا ہوا چلتا رہا، جس کے پیچھے پیچھے ڈر بھی دوڑا چلا آ رہا تھا، اس لیے وہ پل بھر کو کہیں آرام کرنے کے لیے ٹھہر بھی نہ سکا اور دن نکلنے تک جلال آباد پہنچ گیا۔

قافلہ جس وقت جلال آباد پہنچا، صبح کے چھ بج رہے تھے۔ غلام حیدر فکر مندی سے اُن کے انتظار میں اِدھر اُدھر حویلی میں ٹہل رہا تھا۔ جیسے ہی اُس نے اِس لُٹے پُٹے قافلے کو دیکھا اور رفیق پاؤلی کی لاش پر نظر پڑی تو دل ایک جھٹکے کے ساتھ دہل گیا اور دم سینے میں اٹک سا گیا۔ غلام حیدر نے تمام لوگوں کی دلجوئی کی خاطر قافلے کو جلدی سے حویلی کے احاطے میں اُتارا اور عورتوں اور بچوں کو اندرونی صحن میں بھیج دیا۔ جہاں غلام حیدر کی ماں اور بیوی موجود نہیں تھیں۔ اُنہیں غلام حیدر نے دس پندرہ دن پہلے ہی پاکپتن بھیج دیا تھا، جس کے بارے میں یقین تھا کہ وہ پاکستان میں شامل ہو جائے گا۔ اِس لیے اُنہیں دلاسا دینے کے لیے حویلی میں کوئی نہیں تھا۔ یہ عورتیں، جو اپنے تازہ مُردوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے جودھا پور کے گڑھے میں چھوڑ آئی تھیں۔ یہ عورتیں، جنہیں لاشوں پر آرام سے بیٹھ کر رونا نصیب نہیں ہوا تھا اور نہ اُن کی قبروں اور چارپائیوں کے پایوں کو پکڑ کر بین کر سکیں تھیں۔ یہ سب غلام حیدر کی حویلی کے اندرونی صحن میں اِس طرح داخل ہو رہی تھیں، جیسے صحرائے سینا سے نکل آئی ہوں اور اب آرام سے بیٹھ کر اپنے نقصان کا تخمینہ لگا سکیں۔ رفیق پاؤلی، حمیدہ کمبوہ، دلاور، الہ داد اور شریف جلاہے کی لاشیں حویلی کے دالان میں پڑی غلام حیدر کے ساتھ وفاداری کا اعلان کر رہی تھیں۔ جبکہ وہاں کھڑے ہوئے تمام لوگ اُن کو ایسے دیکھ رہے تھے، جیسے خراج تحسین پیش کر رہے ہوں۔ باقی اِدھر اُدھر بیٹھ کر اُن کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ غلام حیدر جانتا تھا، اب وہ اِن کا نہ تو بدلا لے سکے گا اور نہ مداوا کر سکے گا۔ سوائے اِس کے کہ وہ اِن بچے کھچے اور اُجڑے پُجڑے لوگوں کو لے کر جتنی جلدی ہو سکے، ستلج پار کر جائے۔

ایک طرف تو غلام حیدر کے یہ مزارع اور رعایا تھی، جو اُس پر اپنا حق سمجھتے ہوئے یہاں آگئے تھے یا لائے گئے تھے۔ اِن کے علاوہ ارد گرد کے ہزاروں لوگ بھی حویلی کے آس پاس جمع ہو رہے تھے، جنہیں یا تو سکھوں کا ڈر تھا، یا اُن کے پاس سفر کرنے کے لیے ضرورت کا تنکا تک نہ تھا۔ غلام حیدر کے پاس اِن لوگوں کا جمع ہو جانا اُنہیں گویا اپنی حفاظت کا یقین دلاتا تھا۔ لوگ اتنے جمع ہو گئے تھے جن کا حویلی کے صحن میں پورا آنا مشکل ہو گیا۔ اِس لیے اُنہوں نے حویلی کے باہر ہی اپنے آسن جما لیے تھے۔ غلام حیدر جانتا تھا، ایک دو دن تک تو یہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن زیادہ دیر تک وہ اِن لوگوں کی حفاظت نہیں کر سکے گا۔ اُس کا ڈر سکھوں پر ایک حد تک رہ سکتا تھا۔ اُس کے بعد معاملہ بگڑ جاتا۔ کیونکہ اطلاعیں ملنے لگی تھیں کہ دریا پار سے سکھوں کے کئی قافلے لُٹ پُٹ کر جلال آباد آرہے ہیں، جو شمالی اور جنوبی پنجاب کے مسلمانوں کے جہاد کی نظر ہو گئے ہیں۔ اب اُن کی آبادی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی، جنہیں دیکھ کر جلال آباد

اور مضافات کے عام اور شریف سکھوں کے بھڑک اُٹھنے کا بھی اندیشہ تھا۔ وہ کسی وقت بھی غلام حیدر کے ڈر کو نظر انداز کر سکتے تھے۔ جب غلام حیدر کو جانی چھینبا جودھا پور میں ہونیوالی لڑائی کا تمام ماجرا سنا چکا تو اُس نے ایک ٹھنڈی آہ کھینچی۔ جس کا مطلب غالباً یہ تھا کہ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ اِسی لیے اُٹھتے ہوئے بات فوراً کسی اور طرف پھیر دی اور بولا، جان محمد ایسا کرو، جلدی سے چاچے رفیق اور دوسرے شہیدوں کی لاشوں کا بندوبست کر کے انہیں دفناؤ، بادل پھر چڑھ آئے ہیں اور نہ جانے کب برسنا شروع ہو جائیں۔ اِس کے علاوہ ہمارے گودام میں جتنا غلہ ہے، اُس کے دروازے اِن اجنبی دیس میں جانے والے مسافروں پر کھول دو۔ بچارے جتنے دن یہاں ہیں، پیٹ بھر کر کھا لیں، پھر خدا جانے اِنہیں کبھی کھانا نصیب ہو، یا نہ ہو۔ اور جہاں یہ جا رہے ہیں، وہاں کوئی اِن کا پُرسان حال ہو گا بھی کہ نہیں۔ بادل پھر گرجنے لگے تھے اور اُن کی سیاہی کل سے بھی زیادہ گھمبیر ہو گئی تھی۔

جودھا پور کی لڑائی کو چار دن گزر چکے تھے۔ عورتوں کے بین رک تو گئے تھے لیکن اُنہیں رہ رہ کر اپنے مُردوں کی یاد آتی تو وہ پھر رونا شروع کر دیتیں۔ پھر یہ درد جلد ہی تھم جاتا اور چُپ کر جاتیں۔ یہ قافلہ اِرد گرد کے بیس پچیس گاؤں کا تھا، جس کی تعداد کم از کم چھ ہزار ہو چکی تھی اور اِس کا نقیب غلام حیدر تھا۔ غلام حیدر کی جیپ (جو نواب افتخار نے اُسے الیکشن جیتنے کے بعد تحفے کے طور پر دی تھی)، کے ارد گرد تیس پینتیس گھڑ سوار بندوقوں اور برچھیوں سے لیس چل رہے تھے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ بارش تھمنے کو نہیں آتی تھی۔ کچی سڑکیں کیچڑ سے اِس قدر بھر گئیں کہ دو قدم چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ بعض جگہ تو دُور تک گھٹنوں گھٹنوں پانی کے تالاب لگ گئے اور پیدل والوں کے لیے، جو قافلے کا ستر فی صد تھے، مصیبت ہو گیا۔ اُن کا حساب، کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا، والا تھا۔ لیکن غلام حیدر کسی کو بھی پیچھے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اِدھر سکھ بارش کی طرح، نہ جانے آسمان سے برس رہے تھے کہ زمین سے اُگ رہے تھے۔ اُن سکھوں میں سے بیشتر کی حالت بھی انتہائی ابتر تھی۔ اُن کے لُٹے پُٹے اور بے دست و پا چھوٹے چھوٹے گروہ جب غلام حیدر کے قافلے کے قریب سے گزرتے تو دونوں اطراف کی آنکھیں ایک دوسرے کی کسمپرسی پر شرمندگی سے جھک جاتی اور وہ بغیر ست سری اکال، یا واہگرو کا نعرہ مارے گزر جاتے۔ غلام حیدر جانتا تھا، یہ وہی لوگ ہیں، جن کی حالت جودھا پور والوں سے کم نہیں تھی۔ اب بارش اور تیز ہوا نے اتنا زور پکڑ لیا تھا کہ اگست

کا مہینہ پوہ ماگھ سے آگے نکل گیا۔ اُس پر ستم یہ کہ نہر بنگلہ کے کنارے فسادیوں نے توڑ کر پانی سڑکوں اور کھیتوں پر بہا دیا۔ جس کی وجہ سے اِنہیں مجبوراً نہر کی پٹڑی پر چلنا پڑا۔ چلتے چلتے ایک جگہ سے قافلہ گزرا تو دیکھ کر حیران رہ گئے، نہر بنگلہ، جسے ولیم کے نہری عملے نے بنایا تھا، کی پٹڑی پر چار کلومیٹر تک لاش کے ساتھ لاش جوڑ کر اِس طرح رکھی ہوئی تھیں کہ ایک مرد کی لاش، اُس کے بعد عورت کی لاش پھر مرد کی لاش تھی۔ کسی کا گلا کٹا تھا، کسی کے جسم کا کوئی اور عضو کٹا تھا، خون اور مٹی میں لتھڑی ہوئی اِن کئی ہزار لاشوں کا سلسلہ دور تک اِسی طرح پھیلا ہوا تھا۔ خُدا جانے، آنے والے دنوں میں اِن کا بندوبست کون کرنے والا تھا۔ اُن کو دیکھ کر قافلے کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ سوچنے لگے، اگر غلام حیدر ساتھ نہ ہوتا، تو اُن کی بھی یہی حالت ہوتی۔ یہ سب لاشیں مسلمانوں کی تھیں، جن کے اُوپر پاؤں رکھ کر اور اُن کو روند کر اِس قافلے نے چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا۔ کیونکہ کھیتوں میں اور سڑکوں پر پانی اور کیچڑ نے چلنے کی سکت بالکل ختم کر دی تھی۔ لاشیں ایک دن پہلے کی تازہ ہی تھیں۔ بارش اُن گمنام شہیدوں پر برس برس کر اپنی رحمتیں نچھاور کر رہی تھی۔ اِن مشکلوں کے باوجود قافلہ روز کے دس کلومیٹر طے کر رہا تھا۔ رستے میں کئی کئی شر نارتھیوں اور مقامی سکھوں کے لوٹ مار والے جتھوں سے ٹاکرا بھی ہو رہا تھا۔ لیکن غلام حیدر کے حفاظتی دستوں کو دیکھ کر اِدھر اُدھر ہو جاتا۔ البتہ دہلی، ہریانہ اور مشرقی پنجاب کے بالائی علاقوں سے آنے والے مہاجرین کو لوٹنے سے اُنہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ لوگ اِن کے ہاتھوں سے اِس طرح لٹ لٹ کر خالی ہو رہے تھے جیسے ببول کی شاخیں اُونٹ کے منہ میں آکر پتوں سے صاف ہو جاتی ہیں اور مسلمان اِس طرح کٹ رہے تھے، جیسے دھان کی فصلیں جالندھر کی درانتیوں سے کٹتی ہیں۔ بہر حال غلام حیدر کا قافلہ گپھا یا اور لکھے کی سے ہوتا ہوا پانچ دن میں فاضلکا بنگلہ پہنچ گیا۔ قافلہ ہیڈ سلیمانکی کی بجائے لکھے کی سے ہی دریا پار کر کے وسطی پنجاب میں داخل ہو سکتا تھا۔ لیکن مون سُون کی بارشوں کی وجہ سے، جو پچھلے کئی دن سے ایک پل سکون نہیں لینے دے رہی تھی، دریا کا پاٹ بڑھ کر ایک کلومیٹر ہو گیا تھا اور گہرائی بھی معمول سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ بہت سے لوگوں نے، چاہے وہ سکھوں میں سے تھے یا مسلمانوں میں، براہ راست دریا کو پار کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن اُن کی لاشیں ہی کناروں پر آئیں اور کئیوں کی تو لاشیں بھی نہیں ملیں۔ اِس لیے اُدھر کا راستہ مکمل بند ہو چکا تھا اور سلیمان کی ہیڈ سے پار کرنا ناگزیر تھا۔ بنگلہ میں ایک رات گزارنے کے بعد، جہاں شاہ پور والے اُن کا انتظار کر رہے تھے، سب مل کر ہیڈ سلیمانکی کو روانہ ہو گئے اور شام کے وقت ہیڈ پر پہنچ گئے۔ سلیمانکی ہیڈ پہنچ کر غلام حیدر حیران رہ

گیا۔ دُور تک لوگ ہی لوگ تھے۔ جدھر نظر جاتی سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ غلام حیدر اتنے سارے لوگوں کو ہیڈ کے مضافات میں بیٹھے دیکھ کر پریشان ہو گیا اور یہاں پر رکے رہنے کا سبب معلوم کرنے لگا۔ کافی دیر تک تحقیق کرنے سے اُس پر جلد ہی کھل گیا کہ معاملہ کیا ہے؟ کئی لوگ پندرہ دن سے بیٹھے تھے۔ اِن میں سے وہ بھی تھے، جن پر رات کے وقت لوٹ مار کرنے والے کئی کئی بار شب خون مار چکے تھے، قتل کر چکے تھے، اسباب لوٹ کر لے جا چکے تھے اور عورتوں تک کو اُٹھا کر لے گئے تھے۔ بلکہ ایسے بھی تھے، جو ڈیڑھ دو دو سو میل سے بالکل مع اسباب سلامت آگئے تھے، مگر یہاں پر اُن کو لوٹ لیا گیا تھا۔ اِس کا سبب گورکھا فوج تھی، جو ہیڈ پر دونوں طرف کے لوگوں کو عبور کرانے پر متعین تھی۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ انتہائی بے رحمی کا سلوک کرتے ہوئے، اُن کو پچھلے پندرہ بیس دنوں سے ہیڈ پر ہی روکے بیٹھی تھی۔ جبکہ ہندوؤں اور سکھوں کو برابر ہیڈ کراس کرا رہی تھی۔ اُس کی کچھ وجہ تو یہ تھی کہ ہیڈ کا پُل نہائت تنگ اور کافی لمبا تھا اور اُس کے دونوں سروں پر لاکھوں لوگ گزرنے کے لیے بیٹھے تھے، جن کے پاس مال مویشی، گڈے، چھکڑے اور دوسرا بے بہا مال اسباب بھی تھا۔ جبکہ وقت بہت کم تھا لیکن زیادہ دخل بدنیتی کا تھا۔ گورکھا فورس پاکستان مخالف تھی۔ اِس لیے اُن کا مسلمانوں کے ساتھ متعصب ہو جانا فطری تھا۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کو مسلسل روکے کھڑی تھی اور دوسری طرف سے اپنے ہم مذہبوں کو بارڈر عبور کرا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمان کئی دنوں سے یہاں بیٹھے بیماری سے مر رہے تھے، بھوک سے مر رہے تھے، بارشوں سے مر رہے تھے، اور رہے سہے بدمعاشوں کی لوٹ مار، قتل و غارت اور شب خون سے مر رہے تھے۔ غلام حیدر نے پورے دو دن تک تمام چیزوں کا جائزہ لیا، چل پھر کر لوگوں کے حالات معلوم کیے، پھر دل ہی دل میں ایک فیصلہ کرنے لگا۔

بڑی سوچ بچار کے بعد اُس نے ڈیوٹی پر موجود میجر صاحب سے ملاقات کی کوششیں شروع کر دیں۔ مگر ہزار کوشش کے باوجود یہ ملاقات ممکن نہ ہو سکی۔ غلام حیدر جلال آباد کے علاقے میں کتنا ہی معروف سورما رہا ہو، اب اُس کی حیثیت یہاں پر ایک عام آدمی ہی کی تھی۔ بالکل اُن بے شمار لوگوں کی طرح، جن کی اوقات اِس وقت گورکھا فورس کے سامنے بارش میں بھیگے ہوئے، خارش زدہ کتے کی تھی۔ ایسا کتا، جس کو کراہت، اور بیماری کے ڈر سے گھر کی دہلیز کے باہر سے ہی دھتکار دیا جاتا ہے۔ غلام حیدر میجر سے ملنے کے لیے اور اپنے مسائل بتانے کے لیے آگے تک چلا گیا اور فورس کے بار بار منع کرنے پر ضد کرنے لگا تو دو تین سپاہیوں نے غلام حیدر کو گالیوں کے ساتھ دو چار دھولیں جما دیں، جنہیں ہزاروں لوگوں نے دیکھا۔ اُن لوگوں نے بھی، جنہیں امیر سبحانی کے ریکارڈا بھی تک یاد تھے۔ اُن

سب لوگوں نے اُن گالیوں کو سنا، جو غلام حیدر کے ماں باپ کو دی گئی تھیں اور اُن دھولوں کو دیکھا، جو غلام حیدر کو پڑی تھیں۔ خود امیر سبحانی نے دیکھا، جس نے یہ ریکارڈ بھرے تھے اور اب وہ ریکارڈ اِس طرح یاد تھے، جیسے اپنے ہاتھوں کی پانچ انگلیاں۔ اِس حبس پیدا کر دینے والی اور سانس روک دینے والی بے عزتی کی وجہ سے غلام حیدر کا جی چاہا، وہ اِسی وقت دریا میں چھلانگ لگا دے۔ مگر غلام حیدر نے دریا میں چھلانگ نہیں لگائی، ایک سخت فیصلہ کر لیا۔ وہ تھا گورکھا فورس سے بھڑ جانے کا۔

غلام حیدر نے واپس اپنے قافلے میں آکر سب دوستوں کو جمع کیا۔ جوش اور جذبات سے بھری ہوئی رُندھا دینے والی آواز میں بولنے لگا، بھائیو، مَیں تمھارا بھائی غلام حیدر ولد شیر حیدر، جس کی ماں ابھی اُس پر رونے والی موجود ہے۔ جس کا ایک بیٹا اور بیوی اُس پر بین کرنے والی ابھی بیٹھی ہے۔ یاد رکھنا، میں نے کبھی تمھارا ساتھ نہیں چھوڑا۔ نہ میں نے پیٹھ دکھائی اور تمھیں حقیر جانا۔ میں نہ تو قائدِ اعظم ہوں، جو اِس وقت دہلی میں بیٹھا ہے اور نہ نواب افتخار، جو لاہور نواب ولاز میں ہے۔ میں غلام حیدر ہوں، جس نے ہجرت کی۔ بارشوں میں تمھارے ساتھ، بیماری میں تمھارے ساتھ اور فساد میں تمھارے ساتھ۔ جسے رفیق پاؤلی کا دُکھ ہے، حمید اکمبوہ کا دکھ ہے، چراغ دین کا دُکھ ہے اور اُن جودھا پور کے چالیس شہیدوں کا دکھ ہے، جو گڑھوں میں دفن ہو گئے۔ مَیں غلام حیدر ولد شیر حیدر، جس کی ذِلت آج تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ یہ ذلت مجھ غلام حیدر کی ہوئی، جسے جھنڈو والا جانتا ہے، میگھا پور جانتا ہے، پورا فیروز پور جانتا ہے۔ یہ ذلت میری نہیں، تم سب کی ہے۔ میں نہیں چاہتا، لوگ مجھ پر ہنسیں اور مزے لے کر میری رسوائی کی کہانیاں اپنی اولادوں کو سنائیں۔ میں امیر سبحانی کی زبان کو جھوٹا نہیں کر سکتا اور ذلت سے جی نہیں سکتا۔ تم میں سے جو میرے ساتھ جانا چاہتا ہے، آجائے۔ میں آج فیصلہ کرنے والا ہوں، اپنے اور اِن حرامزادوں کے درمیان، جنھوں نے بزدلوں کی طرح مجھے ذلیل کیا ہے۔ مَیں اُن کے ساتھ دو ہاتھ کرنے کے لیے جا رہا ہوں۔ جس نے میرا ساتھ دینا ہے، آجائے۔ ورنہ میں اکیلا ہی اِس آگ سے گزرنے کے لیے تیار ہوں۔ زندہ رہا تو تمھارے ساتھ ہیڈ پار کروں گا، مارا گیا تو راستہ ضرور کھول جاؤں گا۔ یہ کہہ کر غلام حیدر نے اپنی جیپ پر پاؤں رکھ دیا۔ اُسے دیکھتے ہی جانی چھینبا، شادھا تیلی، شوکا ماچھی اور چھ مزید جوان غلام حیدر کے ساتھ چل پڑے۔ اِن سب کے پاس رائفلیں تھیں۔

غلام حیدر کو ڈھولیں مارنے کے بعد گورکھا فورس کے جوان مزید اکڑ میں آ گئے تھے۔ ہیڈ پر زیادہ سے زیادہ پچاس سپاہی اور چھ آٹھ افسر موجود تھے لیکن اسلحہ کافی تعداد میں تھا۔ سکھ، ہندو، اور دوسری قومیں۔ اُن کے گدھے، گھوڑے اور دیگر مال مویشی ہیڈ کو عبور کر کے اِدھر آ رہے تھے۔ جس کی وجہ سے ہجوم حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ غلام حیدر اور اُس کے بندے جیسے ہی آگے بڑھ کر فورس کے سپاہیوں کے قریب ہوئے، اُنہوں نے جھٹ خطرے کو بھانپتے ہوئے رائفلیں تان لیں اور فوراً پیچھے ہٹ جانے کو کہا۔ یہ وقت سہ پہر کا تھا اور بارش کچھ دیر کے لیے رُکی ہوئی تھی۔ لیکن ہوا اور دریا کے پانی کا شور بہت تھا۔ جوانوں نے جیسے ہی رائفلیں سیدھی کر کے رُکنے کو کہا، غلام حیدر نے عاقبت سے بے نیاز ہو کر فائر کھول دیا۔ اُس کے ساتھ اُس کے بندوں نے بھی۔ دوسری طرف سے بھی گولیاں برسنی شروع ہو گئیں اور پُل پر بھگدڑ مچ گئی۔ پہلے ہی ہلے میں کئی سپاہی فائر لگنے سے گر گئے۔ غلام حیدر نے شوکے تیلی کو بھی گرتے دیکھ لیا تھا۔ گولی اُس کے سینے پر آ کر لگی تھی۔ گولیاں اتنی شدت سے برسنے لگیں کہ کسی کو یہ خیال نہ رہا، کس کو لگتی ہے اور کس کو نہیں۔ گولیوں کے ڈر سے کئی لوگ دریا میں کود کر پانی کو پیارے ہو گئے۔ غلام حیدر کا ڈرائیور جیپ کو جھٹ پٹ میں ہیڈ پر لے گیا، جہاں میجر صاحب موجود تھے۔ وہ اپنے کیبن میں بیٹھے تھے۔ لیکن کیبن زیادہ مضبوط نہ تھا۔ محض گھاس پھونس کا ایک جھونپڑا ہی تھا۔ گولیاں اب نہایت نزدیک سے اور دُوبدُو چل رہی تھیں۔ جن کے تڑاکوں میں اتنی شدت آ گئی کہ دُور دُور تک مجمعے چھٹ گئے اور پُل چند ہی لمحوں میں اِس طرح صاف ہو گیا، جیسے جھاڑو پھر گیا ہو۔ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک کوئی فرد نظر نہ آتا تھا۔ دھکم پیل میں زیادہ تعداد تو دریا میں ہی جا پڑی تھی۔ جس کی گہرائی کم از کم اِس پُل پر سے سو فٹ تھی۔ غلام حیدر عین پُل کے اُوپر پہنچ چکا تھا اور مسلسل گولیاں چلا رہا تھا۔ میجر صاحب کے کیبن کو گولیوں کے دھماکوں سے آگ لگ کر، گھاس پھونس کو اِس طرح جلا رہی تھی، جیسے چتا سے الاؤ اُٹھ رہے ہوں۔ یہ حالت دیکھ کر میجر کیبن سے باہر کی طرف بھاگ اُٹھا۔ اِنہی اوقات میں غلام حیدر نے تاک کر اُس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی، جن میں سے دو گولیاں اُس کے سر میں جا لگیں اور وہ وہیں لڑھک گیے۔ گورکھا سپاہیوں نے اپنے افسر کو یوں ڈھیر ہوتے دیکھا، تو وہ بوکھلا گئے۔ اِسی بوکھلاہٹ میں اُنہوں نے اندھا دھند فائرنگ برسا دی۔ اس دوطرفہ شدید فائرنگ میں دونوں طرف کے لڑنے والے اور دوسرے لوگ بیروں کی طرح گرنے لگے۔ چند ہی لمحوں میں غلام حیدر بھی گولیوں کی بارش میں اپنے ساتھیوں سمیت، وہیں ہیڈ کے پل پر خون میں لت پت ہو گیا اور بارش کی رم جھم میں پکی سڑک پر منہ کے بل گر

پڑا لیکن ابھی جانی چھینبا بچا ہوا تھا۔ وہ اُس سنگِ میل کے پیچھے بیٹھا تھا، جس پر لکھا تھا، دہلی چار سو اٹھارہ کلو میٹر۔ وہ سنگ میل کی آڑ لے کر مسلسل کارتوس چلا رہا تھا، جس کی وجہ سے بچی کھچی گورکھا فورس اِدھر اُدھر بھاگ گئی اور چوکی بالکل خالی ہو گئی، جو میجر صاحب کے مرنے کی وجہ سے پہلے ہی تتر بتر ہو چکی تھی۔ اِسی بھاگم دوڑ میں جانی چھینبے کو بھی گولی لگ گئی۔ گولی اُس کی پسلیوں میں نجانے کدھر سے کچھ لمحے پہلے آکر لگی تھی، لیکن اُس نے زخمی حالت میں ہی سنگ میل کی آڑ سے باہر آکر مسلمان قافلوں کو پکارنا شروع کر دیا۔ لوگ، جو موت جیسی حالت میں زندگی اور اُس ہیڈ سے اُکتائے بیٹھے تھے، وہ غلام حیدر کے غم کو بھول کر دریا کی طرح ہیڈ کی طرف بڑھے اور لمبے لوہے کے پُل پر چڑھ گئے۔ یہ پُل، جواب بالکل خالی پڑا تھا۔ اُنھیں اِس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ جس نے پُل خالی کرایا ہے، وہ کون ہے؟ اور اُس کی لاش کو اُٹھانا ضروری ہے کہ نہیں۔ غلام حیدر کی رعایا کے لوگ اور عورتیں اپنی اپنی لاشوں کے گرد اکٹھا ہو کر رونے پیٹنے لگیں مگر پھر اُنھوں نے بھی جلد ہی لاشوں کو اُٹھا کر چھکڑوں پر رکھ لیا اور دریا پار کرنے والوں کے ساتھ مل گئے۔ جبکہ جیپ اُس جگہ پر تنہا کھڑی رہ گئی، جس کی ہر چیز سلامت ہونے کے باوجود اُسے کوئی دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اور وہ نہیں جانتی تھی کہ اب اُس کا مالک کون ہے؟ جانی چھینبے کے لگا ہوا زخم تو جان لیوا نہیں تھا لیکن اُس کا خون اِتنا بہہ گیا کہ وہ بھی چند لمحوں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جاملا۔

اب ہجوم اتنا زیادہ اور بے قابو ہو چکا تھا، اگر کوئی فورس آ بھی جاتی تو وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُن خانہ خرابوں اور بھوکوں کے سیلاب نے جب پُل کے دوسری طرف جا کر ہندوؤں اور سکھوں کی تھوڑی سی جمیعت کو دیکھا تو اُن پر بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ پھر تو نہ کسی کی ہدایت اُنھیں بچا سکی اور نہ قرآن ورسول کے واعظ کسی کام آئے۔ اس معاملے میں سب سے پیش پیش وہ ملا لوگ تھے، جو دہلی، ہریانہ، روہتک، گڑگاؤں اور حصار سے دھکے کھاتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ وہ اُس وقت تک بیٹھے اور لُٹتے رہے جب تک غلام حیدر نہ آ پہنچا اور اب جو اُنھیں موقع ملا تو مُلّا نے جہاد کے فتوے شروع کر دیے اور روہتکی مجاہد بن گئے۔

الغرض مسلمان پُل پار کرتے رہے اور مجاہد بنتے رہے۔ جبکہ جلال آباد، شاہ پور اور جودھا پور والے سب کو یہیں چھوڑ کر اپنی لاشوں کے ساتھ منڈی ہیرا سنگھ کی طرف بڑھ گئے۔ امیر سبحانی، جو غلام حیدر کے ملازموں میں واحد آدمی بچا تھا، وہ غلام حیدر کی لاش اُس کے وارثوں کے حوالے کرنے کے لیے پاکپتن جانا چاہتا تھا۔ جہاں غلام حیدر کی ماں، بیوی اور اُس کا بیٹا انتظار میں بیٹھے تھے لیکن لاش خراب ہونے کے ڈر سے اُس نے غلام حیدر اور دوسرے

ساتھیوں کی لاشیں وہیں ہیڈ پار کر کے دفن کر دیں اور خود منڈی ہیرا سنگھ کی طرف بڑھ گیا تاکہ بذریعہ ریل پاکپتن چلا جائے۔ ہیڈ عبور کرنے کے بعد مہاجرین، جن میں اب نہ غلام حیدر تھا اور نہ رفیق پاوَلی تھا، اِدھر اُدھر پناہ کے لیے بکھرنے لگے۔ ان سب مہاجرین کو اب آپ ہی آپ ایک سکون سا آگیا تھا۔ گویا وہ اپنی قسمت پر اعتماد کر کے مطمئن ہو گئے ہوں۔ یہ ہزاروں خاندان، جنھیں شاید اب نہ کسی چھت کی ضرورت تھی، نہ پہننے کو کپڑا چاہیے تھا، نہ یہ کسی سواری کے محتاج تھے۔ ان گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ چلنے والے لاکھوں زندگی اور موت کے درمیان، انسانوں اور جانوروں کے درمیان کی مخلوق کو بس کھانے کو روٹی کی ضرورت تھی۔ جو اِن کی عزت کے بدلے میں، جان کے بدلے میں یا کسی بھی چیز کے بدلے میں مل جاتی تو یہ جی سکتے تھے۔ مگر کیا کیا جائے کہ ان لاکھوں خاندانوں میں بارش، بھوک اور مسلسل سفر کے دوران ہیضے اور گردن توڑ بخار کی بیماریاں پھوٹ پڑیں۔ یہ بیماریاں اتنی شدت سے پھوٹیں کہ جو کسی طرح کرپانوں کے لوہے سے بچ کر آگئے تھے، وہ اِس قدرتی بوجھ تلے دب کر مرنے لگے اور یہ کیفیت صرف مسلمانوں کی طرف ہی نہ تھی بلکہ،

دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔

امیر سبحانی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اکیلے ہی چلتا جا رہا تھا۔ اُس کی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی اور نہ دور نزدیک کوئی رشتہ دار تھا، نہ پُرسانِ حال۔ اُس کو یہ جلدی تھی کہ کسی طرح پاکپتن پہنچ جائے اور غلام حیدر کی ماں سے اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی کا اسباب لے لے۔ وہ یہ اسباب غلام حیدر کی ماں کو غلام حیدر کی موت کی خبر دے کر نیاز، درود اور قل ساتے کے کھانے سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ غلام حیدر کی شہادت کی خبر سن کر اُس کی ماں اور بیوی بچوں کو جو صدمہ پہنچنا تھا، اُس کا اندازہ بھی اُس کو تھا، لیکن اُسے یہ بات بھی پوری طرح عیاں تھی کہ غلام حیدر کے ایصالِ ثواب کی نیازیں شروع ہونگی تو کم از کم سوا مہینہ تک جاری رہیں گی۔ اُس کے بعد خدا اور اسباب پیدا کر دے گا۔ اس کے علاوہ علاوہ امیر سبحانی نہ کسی پٹواری کو جانتا تھا اور نہ اس کا ربط ضبط کسی تحصیل دار یا قانون گو کے ساتھ تھا، جو اُس کو مہاجر تسلیم کر کے اُس کے نام چار ایکڑ زمین ہی لگا دے۔ اُسے تو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ جس غیر ملک میں وہ آیا ہے، اِس میں اِس طرح کے محکمے بھی موجود ہیں؟ سکھوں اور ہندووں کو مارنے اور اُن کے مال پر قبضہ کرنے کی اُس میں ہمت نہیں تھی، جو اس علاقے میں ویسے ہی مر رہے تھے اور لٹ رہے تھے، جیسے ستلج کی دوسری

طرف وہ مسلمانوں کو مرتا اور لٹتا دیکھ آیا تھا۔ گرتا پڑتا اپنے ایک بچے کو ہیضے سے مرنے کی وجہ سے رستے میں دفن کر کے بالآخر دو دن بعد امیر سبحانی منڈی ہیرا سنگھ پہنچ گیا، جہاں سے گاڑی پر بیٹھ کر وہ پاکپتن جا سکتا تھا۔

اسٹیشن پر ہزار ہا بچے، مرد، خواتین، بوڑھے، جوان، ناتوان اور ہٹے کٹے خیموں میں، بغیر خیموں کے، ادھر اُدھر گویا بکھرے پڑے تھے۔ ان میں مقامی لوگ پھر پھر کر ہندوؤں اور سکھوں کو ڈھونڈتے پھرتے اور اُن کا مال اسباب چھینتے پھرتے تھے۔ امیر سبحانی اپنے بیوی اور بچوں کے ساتھ بیٹھا پاکپتن جانے والی گاڑی کے انتظار میں تھا، جس کے ٹائم ٹیبل کا اب کسی کو نہیں پتا تھا، نہ ہی کسی کو اُس کے دیر سے آنے کی شکایت رہ گئی تھی۔ بادل ابھی بھی گھرے چھائے ہوئے تھے اور بارش رہ رہ کر برس رہی تھی۔ منڈی ہیرا سنگھ کا اسٹیشن بالکل ویسا ہی چھوٹا سا تھا، جیسے قصبوں کے اسٹیشن ہوا کرتے ہیں۔ ایک ٹکٹ لینے دینے والوں کا کمرہ تھا، جس میں دو تین افراد کا عملہ۔ اِس کے علاوہ اسٹیشن پر سرخ اینٹوں کا فرش، جو ریل کی پٹڑی سے اِتنا ہی اُونچا تھا، جتنی اُونچی ریل کی آخری سیڑھی تھی۔ دونوں جانب کے فرش کے درمیان ایک بڑا سا نالہ بن جاتا تھا، جس میں ایک تو ریل چلتی تھی اور دوسرا بارش کا پانی، جو اُن دنوں شدت سے برس رہا تھا۔ منڈی ہیرا سنگھ کا یہ قصبہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بس ڈھائی تین سو گھر تھے اور وہ بھی بکھرے ہوئے۔ یہاں درخت بھی زیادہ نہیں تھے۔ ہاں مگر جگہ جگہ بیریوں کے پیڑ نظر آجاتے تھے۔ الغرض منڈی ہیرا سنگھ ایک پُر سکون جگہ تھی۔ مگر جب سے تقسیم اور فسادات کا عمل شروع ہوا تو یہاں مشرقی اور وسطی پنجاب کے ہزاروں خاندانوں کا جھمگٹا سا ہو گیا تھا۔ اُدھر سے اِدھر آنے والوں کا اور اِدھر سے اُدھر جانے والواں کا۔ امیر سبحانی صبح دس بجے کے قریب پہنچا تھا۔ اب اُسے یہاں بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا، کاش وہ ہیڈ سے سیدھا پاکپتن ہی کا رخ کر لیتا تو کل تک پہنچ ہی جاتا۔ اب نہ جانے کب گاڑی آئے اور وہ اس جگہ کے عذاب سے نکلے۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے اسٹیشن پر ایک گاڑی براستہ قصور فیروز پور جانے والی کھڑی تھی، جو نجانے کیوں اتنی دیر سے وہاں موجود تھی۔ یہ ساری کی ساری گاڑی ہندوؤں اور سکھوں سے بھری ہوئی تھی۔ نہ صرف اندر سے پُر تھی بلکہ اس کی چھت پر بھی کھچا کھچ انسان تھے۔

عصر کے وقت امیر سبحانی نے اچانک ایک آدمی کو دیکھا، جو اردو اور عجیب غریب لہجے میں اسٹیشن پر کھڑے مسلمان مہاجروں اور مقامیوں کے ساتھ کچھ خطاب کر رہا تھا۔ امیر سبحانی کو یاد آیا، جب وہ غلام حیدر کے ساتھ نواب افتخار

ممدوٹ کے لیے ووٹ مانگنے نکلا تھا، تو وہ بھی اسی طرح کے خطاب کرتے تھے۔ لیکن وہ تو پنجابی زبان میں صاف سمجھ آنے والا خطاب ہوتا تھا اور یہ تو کوئی فوجیوں والے لہجے کا تھا۔ وہ اُن سب لوگوں کو کہ رہا تھا، بھائیو، میرا نام محمد زمان خان ہے۔ ہم دہلی سے نکلے تھے، تو ستر افراد کا قبیلہ تھے لیکن ہمارا سارا خاندان ان کافروں اور مشرکوں نے راستے میں ہی مار دیا اور سارا سامان لوٹ لیا۔ اب میں اُن ستر افراد میں اکیلا بچا ہوں۔ میری مائیں، بہنیں اور بچے اُنھوں نے یا تو مار دیے ہیں یا اپنے گھروں میں لے گئے ہیں۔ مسلمانو! یہ مجھ اکیلے کے ساتھ نہیں ہوا۔ ہندوستان سے ہر آنے والے کی یہی کہانی ہے۔ یہ کہہ کر زمان خان رونے لگا لیکن اِس گریہ وزاری کے درمیان بھی اُس نے اپنی کہانی اُسی درد ناک لہجے میں جاری رکھی۔ جسے سن کر تمام مجمع بھی رونے لگا۔ اُن سننے والوں میں سے بعض کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں، چھاتیوں کے بال اکڑ گئے اور گنڈاسوں اور تلواروں پر ہاتھ سخت ہو گئے۔ زمان خان نے مجمع کی یہ حالت دیکھی تو سُرخ لوہے پر ایک اور ضرب لگائی، بھائیو، اِن بے غیرتوں نے، جو ہمارے ساتھ کیا، وہ تو الگ بات ہے لیکن مجھے ایک اور اندیشہ ہے کہ یہ لوگ، جو اِس گاڑی میں بیٹھے ہندوستان جا رہے ہیں اور تم انہیں دامادوں کی طرح بڑی عزت سے وہاں بھیج رہے ہو۔ یہ جاتے ہی اُن شر نا رتھیوں کے ساتھ مل جائیں گے اور تمھارے دوسرے مسلمان بھائیوں کا صفایا کر دیں گے۔

زمان کی آواز اتنی پُر اثر، مدلل اور رُندھا دینے والی تھی کہ تمام لوگوں کو غضب آگیا۔ کیا مہاجر اور کیا مقامی، سب ایک دم اُس ریل پر گرہجوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ امیر سبحانی کے دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں نے گاڑی پر ہلہ بول دیا۔ اُن سب نے زمان خان کی ہدایات پر پہلے تمام ریل کے دروازے بند کر دیے اور چھتوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو نیچے اتار کر اُن سب کو نیزوں اور تلواروں کی لڑی میں پرو دیا۔ اُس کے بعد لوگ ریل کا ایک دروازہ کھول لیتے، اُس میں موجود تمام سواریوں کو تہہ تیغ کر دیتے، پھر اگلے ڈبے کو کھول لیتے۔ اِس قتل و غارت میں ریل کی پٹڑی کا نالہ خون سے بہنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ماؤں کی گود میں موجود بچوں سے لے کر بڑوں تک، سب ایک گھنٹے کے اندر تلواروں کا رزق ہو گئے۔ اس عرصے میں سب لوگ اس قدر سہم گئے کہ کسی بچے تک کے رونے کی خبر نہیں آئی۔ اپنے پرائے سب قاتلوں کے سامنے بلی بن گئے۔ امیر سبحانی سارا منظر بیٹھا دیکھتا رہا۔ اُس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ کسی کو روک لیتا۔ ابھی غارت گری رُکی ہی تھی کہ جانے کہاں سے میونسپل کمیٹی کے ٹرک آگئے۔ اُنھوں نے چند ساعتوں میں وہ لاشیں اُٹھا کر، پتا نہیں کہاں لے جا پھینکیں۔ البتہ اسٹیشن سے اُٹھا کر لے گئے۔ اِس کے بعد خدا کی قدرت، پھر وہی

بارش شروع ہو گئی، جس نے اسٹیشن کو دھو کر ایسے صاف کر دیا جیسے، یہاں کچھ ہوا ہی نہیں۔ گویا قدرت بھی اِن سب کے ساتھ ساتھ اپنا فرض ادا کر رہی تھی۔ رات امیر سبحانی نے وہیں گزاری اور اگلے دن حویلی لکھا روانہ ہو گیا۔ یہاں سے اُس نے ارادہ کیا کہ پیدل ہی پاکپتن چلا جائے گا۔

جاری ہے

قسط نمبر 29

(49)

تقسیم کے بعد فضل دین کا کام کافی بڑھ گیا تھا۔ اُس کی ڈیوٹی لاہور ریوینیو بورڈ میں ایک تحصیل دار کے ساتھ لگ چکی تھی، جس کا کام مہاجرین کی آباد کاری کے لیے، اُن کی جائدادوں کا جائزہ لینا اور مشرقی پنجاب یا انڈیا کے کسی بھی علاقے سے آنے والوں کی ملکیت کے گوشواروں کی جانچ پڑتال اور اُن کی پاکستان میں الاٹمنٹوں کا بندوبست کرنا تھا۔ یہ بات ٹھیک تھی کہ اکیلے فضل دین یا تحصیل دار گلزار محمد کا کام نہیں تھا۔ بلکہ اِس کام پر بہت سے سرکاری منشی کلرک اور افسر لگے ہوئے تھے اور پچھلے کئی مہینوں سے کیمپوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو آباد کر چکے تھے۔ لیکن فضل دین نے اِس کام میں دن رات ایک کر دیا تھا۔ اُس کے ذمے دو ڈیوٹیاں تھیں۔ ایک تو کیمپوں میں جا کر لوگوں کی حقیقی جائدادوں کے بارے میں اُن کے پڑوسیوں اور رشتہ داروں سے پوچھ گچھ کر کے صحیح ریکارڈ دستیاب کرنا اور دوسرا جعلی کاغذات کو اصل کاغذات سے الگ کر کے بالکل صحیح صورت حال تحصیلدار تک پہنچانا۔ پھر تحصیل دار گلزار محمد کے حکم سے حتمی فیصلہ کے تحت کسی کی جائداد کی الاٹمنٹ کے کاغذات تیار کرنا تھے۔ پہلے دو چار ہفتے یہ کام انتہائی ایمانداری اور تندہی سے جاری رہا لیکن اِس کام میں محنت بڑی پڑتی تھی اور وقت کا بھی بہت زیاں ہوتا تھا۔ اِس لیے اُس کو مختصر کر دیا گیا اور لوگوں کو جان پہچان، رشوت اور اثر رسوخ کے ذریعے ہی ڈیل کیا جانے لگا۔ پھر اُوپر سے بہت سی سفارشات شامل ہونے لگیں۔ بلکہ فضل دین نے بعض جگہ، جب اُس کے بھیجے ہوئے کاغذات کے بالکل برعکس فائلوں میں درج جائداد اور الائمنٹ کے گوشوارے دیکھے، تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟۔ اِس سلسلے میں ایک ہی خاندان کے کئی کئی کیس تیار کر کے اُن کو مختلف جگہوں پر الاٹمنٹ کر دی جاتی یا لاہوریوں اور مقامی لوگوں کی اولادوں کو مہاجر قرار دے کر اُن کی ملکیتوں کے جعلی کاغذات تیار کر کے اُن کے نام کھاتے کھول دیے جاتے۔ شروع شروع میں فضل دین کو یہ کام بہت عجیب لگا، لیکن جب گلزار محمد نے فضل دین کو سمجھایا اور بتایا کہ یہ سب اُن کو خدا دے رہا ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں، کسی کو جائداد یا زمینوں کے ملکیتی حقوق دینے والے؟ ہم تو صرف درمیان میں ایک وسیلہ ہیں۔ اِسی بہانے ہمیں بھی خدا نواز رہا ہے اور سچ پوچھو تو خدا نے مہاجرین پر عذاب نازل کیا ہے۔ ورنہ اُس کے حکم کے بغیر تو پتہً بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ مولوی ہوتے ہوئے تمھیں تو ان باتوں

کا مجھ سے بھی زیادہ پتا ہے۔ چنانچہ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے، اُس پر فرمانبرداری سے عمل کرتے رہو۔ ورنہ کسی بھی وقت نوکری ہی سے فارغ کر دیے جاؤ گے۔ اِس طرح فضل دین کو تحصیل دار کی یہ بات سمجھ میں آگئی۔ پھر تو اُس کے ہاں بھی چند دنوں میں اللہ کا اتنا فضل ہو گیا کہ اُسے اپنے مکان میں یہ فضل رکھنے کی بھی جگہ نہ بچی۔ مولوی فضل دین نے بھی اپنے، اپنی بیوی، ماں اور ساس کے نام کئی کئی الاٹمنٹوں کے کاغذات تیار کر کے، مال روڈ پر ایک دوکان، ماڈل ٹاون میں ایک کوٹھی، ریگل چوک میں ایک مکان، ایک آٹے کی مِل شاہ عالمی میں الاٹ کرالی۔ اِس کے علاوہ سو ایکڑ زمین بھی ٹھوکر کے قریب ہی جی ٹی روڈ کے ساتھ رکھوالی۔ تحصیل دار نے تو فضل دین کو اور بھی کہا تھا۔ لیکن اُس نے اتنے کو کافی سمجھا حالانکہ وہ جانتا تھا، تحصیل دار گلزار محمد اور دوسرے افسر کیا کچھ رہے تھے۔ اِن سب افسروں اور سیاستدانوں نے اپنے اور اپنے رشتے داروں کو چار پانچ نسلوں تک معاشی فکر سے آزاد کر دیا تھا۔ فضل دین کے اِس عمل سے ایک اور بھی فائدہ ہوا کہ اُس کے ایک خواب کی تکمیل ہوتی نظر آرہی تھی۔ اُسے اپنے بیٹے نواز الحق اور بیٹیوں کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ نواز الحق ابھی چھوٹا تھا لیکن مولوی فضل دین نے سوچا، یہ جائداد اُس کے لیے ایک قسم کا محفوظ بنک اکاوٴنٹ ہے۔ ہر چند فضل دین چاہتا تھا، ستلج کے کنارے پر بھی دو ڈھائی ہزار ایکڑ زمین الاٹ کروالے۔ جہاں سے اُس کا اصلی وطن جلال آباد پڑتا تھا، لیکن وہاں ایک خرابی پیدا ہو گئی کہ اُسے زیادہ تر فوج کے کنٹرول میں دے دیا گیا۔ لٰہذا فیصلہ دوسرے ہاتھوں میں چلے جانے سے فضل دین کی یہ تمنا بر نہ آئی۔ البتہ اُس کی جنم بھومی ضلع قصور کے چک راڑے کے پاس اُس نے کافی ساری زمین اپنے بیٹے کے کاغذات تیار کرا کے اُس کے نام کروالی جو اتنی زیادہ تھی کہ جب وہ چک راڑے میں روٹیاں مانگا کرتا تھا، اُس وقت اُس گاؤں کے لوگوں کی ساری زمین ملا کے بھی اتنی نہیں بنتی تھی۔ فضل دین نے سوچا، خدا کتنا مہربان اور کارساز ہے، اُسے بیٹھے بیٹھائے اتنا امیر بنا دیا۔ فضل دین نے پچھلی پوری زندگی پر نظر ڈالی کہ اُس نے کون سا اچھا کام کیا ہے، جس کی بنا پر خدا نے خوش ہو کر اتنی دولت نواز دی ہے۔ جب اُسے اپنی ذات سے ایسا کوئی کارنامہ برآمد نہ ہوا تو فضل دین نے خیال کیا، لازمی اُس کے والد مولوی کرامت کے ہاتھوں ضرور کوئی نیکی ایسی سرزد ہوئی ہے جس کا اُسے یہ صلہ ملا ہے۔

تقسیم کے بعد آباد کاری کا یہ سلسلہ تقریباً دو سال تک چلتا رہا اور اُسے کام سے ہٹ کر کان کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملی۔ فضل دین نے دن رات ایک کر دیے۔ اِس عرصے میں اُس کے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات بھی پیدا

ہو گئے۔ ہر شہر اور قصبے میں واقف کار نکل آئے۔ جن لوگوں کو آباد کرنے میں مولوی فضل دین کا ہاتھ تھا۔ وہ ویسے بھی اُس کے معتقد بن گئے تھے۔ لیکن فضل دین کی ذات میں ایک طرح کی انکساری پھر بھی رہی۔ شاید یہ وجہ تھی کہ فضل دین کو ابھی اپنی دولت کا احساس نہیں تھا۔ اس بات کو لوگ مولوی صاحب کی فروتنی اور عاجزی سمجھ کر اُس کی ذات کے اور بھی قائل ہوتے گئے۔ جب تقسیم کے پندھرویں سال وہ خانہ کعبہ سے حج کر کے لوٹے تو اُن کا دل اور بھی ملائم ہو گیا۔ اب وہ کافی تھک چکے تھے اور سارا سارا دن دفتر میں کام نہیں کر سکتے تھے۔ ویسے بھی اُس کے ساتھ کے کئی لوگوں نے اپنے کاروبار شروع کر دیے تھے۔ کیونکہ تقسیم کے فوراً بعد خدا نے اُن کو جتنا کچھ دے دیا تھا، اُس کے بعد نوکری کی تنخواہ اُونٹ کے منہ میں زیرے سے زیادہ نہیں تھا اور فضل دین نے واقعی دیکھا تھا، اُن لوگوں نے کاروبار اور تقسیم کے وقت کی جائدادوں سے مزید اتنا کما لیا تھا جس کا کوئی حساب نہیں تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اُنھوں نے بھی نوکری چھوڑ دی اور ریگل چوک والے مکان میں اُٹھ آئے۔ یہ مکان پندرہ مرلے کی ایک عمدہ حویلی تھی۔ جس میں آسائش کا ہر سامان موجود تھا۔ باقی کے مکان اور جائدادیں ٹھیکے اور کرایہ پر چڑھا دیں۔ ویسے بھی اب اُسے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی کے لیے وقت درکار تھا، جو دفتر کی مصروفیات سے نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ نواز لحق کو اُس نے کسی طریقے سے ایچی سن کالج میں داخل کرا دیا تھا، جو بہت اچھی کارکردگی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ان سب باتوں کے علاوہ مولوی فضل دین اب حاجی مولانا فضل دین خان کہلوانے لگے۔ داڑھی بھی اچھی اور نفیس طریقے سے مزید بڑھالی تھی، تعویذ تاگا تو پہلے بھی کر لیتے تھے۔ لیکن مکہ سے آنے کے بعد باقاعدہ مرید بنانا شروع کر دیے۔ پیسوں اور رپوں کی اللہ کے فضل سے کمی نہیں تھی۔ اِس لیے کسی سے کچھ نذر نیاز نہیں لیتے تھے۔ زبردستی کوئی دے دیتا تو رکھ لیتے اور اُس کے عوض سرکاری کلرکوں یا افسروں سے اُس مرید کا کام کروا دیتے۔ بلکہ یہ نیاز بھی تھوڑی بہت خود رکھ کر، تاکہ مرید کا دل نہ ٹوٹے، باقی اُنھی سرکاری افسروں کو دے دیتے کہ اُنھیں خود اُس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ محکمہ مال والے چونکہ سب لوگ مولانا حاجی فضل دین سے واقف تھے۔ اُس کی عزت کرتے تھے اور اِن پر اُن کو اعتماد بھی بہت زیادہ تھا۔ اِس لیے آہستہ آہستہ سب لوگوں کو پتا چلتا گیا، اگر کسی نے لاہور کے محکمہ مال سے کام نکلوانا ہے، تو وہ حاجی صاحب سے رابطہ کر کے، اُن کا مرید ہو جائے۔ اِس دور میں اُن کی عزت بہت زیادہ بڑھ گئی اور زبردستی کی پیش کی ہوئیں نیازیں اتنی زیادہ ہو گئیں کہ اُن کا بڑا حصہ سرکاری افسروں اور کلرکوں کو بانٹ کر بھی ایک کثیر رقم فضل دین کو بچ جاتی۔ جس سے وہ مسجدوں، مدرسوں اور کئی خیراتی اداروں کو

بھی دے دیتا۔ پھر بھی اُس کے گھر کے تمام اخراجات اُسی آمدن سے پورے ہونے لگے اور جائداد کی کمائی پوری کی پوری بچنے لگی۔ مولوی صاحب پر اللہ کے اِسی فضل کی وجہ سے اُن کی بیٹیوں کے بڑے بڑے گھروں سے رشتے آگئے، جو امیر کبیر خاندانی ہونے کے ساتھ شریف، ایماندار اور پابند شرع وصوم وصلواۃ بھی تھے۔ اِن خاندانوں میں رشتے داریوں کی وجہ سے حاجی مولانا فضل دین کا خاندان ایک دم بہت وسیع ہو گیا اور وہ اُن سب لوگوں کے درمیان نہایت معزز اور پُر وقار بزرگ کی حیثیت اختیار کر گئے۔ حتیٰ کہ انیس سو اسی کی ایک صبح اکسٹھ برس کی عمر میں مولانا حاجی فضل دین دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ اِس عرصے میں اُن کا بیٹا نواز الحق سول سروس میں آچکا تھا۔ بلکہ تحصیل دار کے عہدے پر کام بھی کر رہا تھا۔ جنازے میں ہزاروں ہی لوگوں نے شرکت کی۔ حتیٰ کہ جنازگاہ میں کھڑے ہونے کو بھی جگہ نہ ملی۔ جنازے میں زیادہ تر اُس کے بیٹے نواز الحق صاحب کے جاننے والے تھے۔ یا اُس کی بیٹیوں کے خاندانوں کے جاننے والے اور کولیگ یا ماتحت تھے۔

(50)

ولیم کو امید تو نہیں تھی کہ پاکستانی گورنمنٹ سول سروس میں اُس کی خدمات قبول کر لے گی مگر اُس نے سوچا درخواست دینے میں کیا حرج ہے؟ اگر گورنمنٹ اُس کی درخواست قبول کر کے اُسے ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر برقرار رکھتے ہوئے وسطی پنجاب میں نوکری دے دیتی ہے، تو ہر چیز ٹھیک ہو سکتی ہے۔ وہ کیتھی اور بچوں کو واپس بلا لے گا۔ پھر دونوں مل کر بیٹے اور بیٹی کے ساتھ نئے سرے سے زندگی کا آغاز کریں گے اور اپنے اُوپر باتیں بنانے والوں کو آنکھیں دکھانے کے قابل ہو جائے گا۔ جنہوں نے انگلستان جا کر پب چلا لیے، دوکانیں کھول کر بنیا گیری کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ٹیکسیاں تک چلانی شروع کر دیں۔

درخواست دینے کے بعد ولیم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہا تھا۔ اُس نے اُن نوابوں سے لے کر دیسی افسروں تک سب کو اپنی سفارش کے لیے رابطہ کر لیا، جن کو ولیم نے یا اُس کے باپ نے کسی طرح کا کچھ فائدہ پہنچایا تھا۔ اُنھوں نے ولیم کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ ہر حالت میں اُسے پاکستان کی سول سروس میں جگہ دلوائیں گے۔ چنانچہ کسی قسم کی فکر نہ کرے۔ اُن افسروں میں کئی ولیم کی کوٹھی پر بلا ناغہ آنے جانے بھی لگے تھے۔ اِس دوران منہ سے مانگ کر ولیم کی کئی قیمتی چیزیں ہتھیا لیں۔ ان لوگوں کے وعدوں کی وجہ سے ولیم کئی دنوں تک یہی سوچتا رہا، اُس کی درخواست

پر غور کیا جا رہا ہے، جیسا کہ چیف سیکرٹری آفس میں کام کرنے والے ایک کمشنر نے اُسے بتایا تھا۔ چنانچہ وہ اِس سلسلے میں خیالی پلاؤ پکاتا رہا۔ دراصل ولیم نے گورنمنٹ پاکستان کو درخواست اِسی خیال کے پیشِ نظر گزاری تھی کہ وہ کچھ دنوں تک کسی امید کو قائم رکھ سکے تاکہ اُسے ایک دم بے دست و پا ہونے کا دھچکا نہ لگے۔ پھر اگر درخواست رد بھی ہوتی، تو اتنے دنوں میں وہ اپنی طبیعت بحال کر چکا ہو گا اور زیادہ دکھ نہیں ہو گا۔ پھر اُسے ذہن کے کسی گوشے میں اُمید بندھ جاتی۔ کیونکہ درخواست دینے کے ساتھ ہی اُس نے حکومت پر یہ واضح کر دیا تھا، وہ خود کو پاکستان کا شہری تصور کرتا ہے۔ لہٰذا جس طرح وکٹوریہ دور کے مقامی لوگوں کی نوکریاں آزادی کے بعد بحال ہیں، ویسے ہی اُسے بھی برقرار رکھا جائے۔ اُس کا انگلستان جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ درخواست ولیم نے چیف سیکرٹری پنجاب کو دی تھی۔ جسے پنجاب کی بیوروکریسی کی قسمت کے فیصلے کرنے کا مکمل اختیار تھا۔ چیف سیکرٹری نے بالآخر اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے ولیم کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور یہ فیصلہ ولیم کے چیف سیکرٹری کے حضور درخواست دینے کے تین ماہ بعد ہوا۔

یہ نومبر کی ایک شام تھی۔ جس نے آغاز نومبر کی شاموں کے سکوت میں کبھی دل کے اُداس اور خموش گیتوں کو محسوس کیا ہو۔ وہ خوب سمجھ سکتا ہے، اِس وقت ولیم کی کیا کیفیت تھی۔ ہلکی ہلکی سردی میں خوش گوار موسم، اُداس اور ٹھہری ہوئی کیفیتوں کی کہانی سنا رہا تھا اور شام کے دُھندلکے میں سارے دن کے تھکے ہارے پرندے ڈاریں باندھ باندھ کر اوکاڑہ کے جنوب میں واقع پپلی پہاڑ کے جنگلوں کی طرف جا رہے تھے۔ ولیم نے جب کیتھی اور بچوں کو رخصت کیا تھا، اُس وقت جذبات کا اِتنا بہاؤ تھا، کہ زیادہ پروا نہیں کی تھی۔ لیکن اب جبکہ اُسے بچوں کے ساتھ انگلستان گئے چھ ماہ ہو چکے تھے تو ولیم کو اُداس کر دینے والے باغوں میں گھرے سبزوں کے موسم رہ رہ کر کیتھی اور بچوں کی یاد دلا رہے تھے۔ ولیم نے کبھی نہیں سوچا تھا، اوکاڑہ کے علاوہ اُس کا گھر کہیں اور بھی ہے۔ نہ ہی آج اُس کے دماغ میں اوکاڑہ کے لیے اجنبیت پیدا ہوئی تھی۔ بلکہ اُس کے خیال میں اُسے اُن انگریزوں پر تاسف تھا، جو اپنے گھروں کو چھوڑ کر دور انگلستان کی غیر زمین پر جا بسے تھے۔ جہاں کی اب نہ تو مٹی اُنہیں پہچانتی تھی اور نہ موسم اُن کے اپنے رہے تھے۔ لیکن اِتنا ضرور تھا کہ اب وہ اپنے انگریز دوستوں اور بیوی بچوں کے بغیر ایسا خلا محسوس کر رہا تھا، جو کسی کے دل میں اپنوں کے بچھڑ جانے سے محسوس ہوتا ہے، جب وہ کہیں پردیس میں چلے جائیں۔ ولیم نے سوچا، اگر وہ یہاں ہوتے تو کس قدر لطف سے زندگی بسر کرتے، یہاں نہ پیسوں کی کمی ہوتی، نہ انہیں کمانے کی فکر ہوتی۔ وہ دن

رات باغوں میں گھومتے، رنگا رنگ کے پھلوں کا رس پیتے، نہروں کے کناروں پر بھاگتے اور چہلیں کرتے۔ کاش کیتھی کو سمجھ آجاتی اور وہ یہاں سے نہ جاتی۔ مگر اب وہ کیا کر سکتا تھا، سوائے اِس کے کہ جلدی سے اُس کے حق میں فیصلہ آجائے۔ ولیم ہاتھ میں چھڑی تھامے اور کنٹوپ سر پر جمائے اِنہی سوچوں میں گُم ساکت کھڑے درختوں کی خوشبوئیں لیتا اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ مزارع اپنے کام میں مگن ولیم کی گنگناہٹ سن رہے تھے۔ یہی مزارع، جو اِس تنہائی میں ولیم کو بہت عزیز تھے۔ اِس طرح، جیسے اب وہ اُس کی زندگی کا حصہ ہوں۔ وہ اُن سے حساب کتاب میں بھی سختی نہیں کرتا تھا اور کئی ایسی باتیں نظر انداز کر جاتا، جو اُس کی ذات کو معاشی نقصان سے دوچار کر سکتی تھیں۔ اسی اُداس حالت میں اپنے کھیتوں، درختوں اور پرندوں کی اُڑانوں کو دیکھتے ہوئے ٹہل رہا تھا کہ اُس کے منشی نے آکر اُس کے ہاتھ میں ایک لیٹر دے دیا اور کہا اُن کے نام یہ خط پنجاب سیکریٹریٹ سے آیا ہے۔ ولیم نے خط لے کر اُسے کھولا کہ اپنی قسمت کے فیصلے کو پڑھ سکے، جو لکھا تو انگریزی میں تھی۔ لیکن اُس پر دستخط دیسی حکمران کے تھے۔ خط پڑھتے ہی ولیم ساکت کھڑا رہ گیا۔ چیف سیکرٹری کی طرف سے ولیم کو دوٹوک لکھا گیا تھا کہ فی الحال آپ پاکستان کے شہری نہیں ہیں۔ اِس لیے آپ کو بطور ڈپٹی کمشنر خدمات سونپنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اِس کے لیے سر دست غور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اول آپ کو چاہیے تھا، پاکستان کی شہریت حاصل کرنے کے لیے گورنمنٹ کو درخواست دیتے۔ آپ کو خود یہ فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں کہ آپ نے انگلستان کے بجائے پاکستان میں رہنے کو ترجیح دی ہے اور یہاں کی شہریت اختیار کر چکے ہیں۔ یہ اختیار صرف گورنمنٹ آف پاکستان کا ہے۔ لہٰذا اِس بارے میں آپ متعلقہ محکمے کو درخواست دیں۔ یہ فیصلہ ہمارا امیگریشن ڈیپارٹمنٹ کرے گا۔ دوئم یہ کہ جب آپ یہاں کے شہری ثابت نہیں ہوتے تو ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر برقرار رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ولیم خط پڑھ کر کچھ دیر کے لیے پریشان کھڑا رہا۔ خط کا پورا انداز واضح، دوٹوک اور برٹش بیوروکریسی کی عین بہ عین نقل تھا۔ گویا چیف سیکریٹری نے اُنہی کا تیر اُس کی طرف پلٹا دیا تھا۔ ولیم کی نظر میں ایک دم اپنی افسری کے کئی واقعات یاد آنے لگے۔ جس میں وہ بھی دیسی لوگوں کی درخواستوں پر کچھ اِسی قسم کے دوٹوک احکامات صادر کرتا تھا اور دوبارہ نظرثانی کرنے کی زحمت بھی نہیں کرتا تھا۔ اب اُسے محسوس ہوا دوٹوک فیصلے دینے میں درخواست گزار کا کلیجہ کیسے پھٹتا ہے۔ ولیم خط پڑھتے ہی، جس کا اُسے اِس طرح کا اندازہ ہی نہیں تھا، سٹپٹا گیا اور اُن سب لوگوں کے بارے میں سوچنے لگا، جنھوں نے اُسے لمبے لمبے وعدے دیے تھے۔ اور اُن کے عوض ولیم سے کئی قسم کا مال بھی

لوٹ لے گئے تھے۔ اُسے یقین تھا، یہ لوگ اُس کو ایڈجسٹ کرا دیں گے۔ مگر چیف سیکرٹری پنجاب کے اِس جواب سے ظاہر تھا کہ یا تو کسی نے اُس سے کہنے کی زحمت نہیں کی۔ اگر کسی نے کہا بھی تھا، تو اُس کے خلاف۔ وہ یہی کچھ کافی دیر کھڑا سوچتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔ ولیم کو اِس وقت درخواست کے رد ہونے کا غم نہیں تھا۔ بلکہ اُس سبکی کا غصہ تھا، جو اِس طرح کی توہین میں اُس پر نازل ہوئی تھی۔ ولیم نے سب مزارعوں کو وہیں پر چھوڑا اور جلدی سے کوٹھی میں داخل ہو کر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ بیڈ پر لیٹ کر گزرے موسموں کی یادوں میں کھو گیا اور ہر واقعے کے یاد آنے کے بعد موجودہ حکمرانوں پر لعنت کرتا، جن کے پاس اکڑ تو آ گئی تھی لیکن انتظامی معاملات سے مکمل طور پر کٹے ہوئے تھے۔ وہ بیڈ پر لیٹ کر ایک نئی کوشش کے متعلق سوچنے لگا، جس کی فکر چیف سیکرٹری نے اُس کے پیٹے ڈال دی تھی۔ اُس کے بعد کافی دن اِسی غور و فکر میں گزار دیے کہ آیا وہ اپنی شہریت کی درخواست پاکستان ایمیگریشن ڈیپارٹمنٹ کو دے یا نہ دے۔۔ اگر درخواست دینے کے بعد بھی یہی حشر ہوا تو اُس کو اِس فارم، کوٹھی اور تمام جائداد سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ ولیم نے سوچا، وہ کسی وکیل سے رجوع کرے۔ مگر پھر اِس خیال سے کانپ کر رہ گیا کہ یہ وکیل لوگ بھی تو دیسی ہیں۔ اگر اُن کے جی میں کچھ لالچ پیدا ہوا تو معاملہ، جو کل خراب ہونا ہے، وہ آج ہی ہو جائے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے، حالات کو جوں کا توں پڑا رہنے دیا جائے اور اِس بات کا کسی سے بھی ذکر نہ کیا جائے اور کمشنری پر لعنت بھیج کر پوری توجہ اپنی جائداد، فارم اور کھیتوں پر دی جائے۔ کیونکہ فی الحال تو کسی کو اُس کی جائداد اور رقبے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اُس کے تمام کاغذات اُس کے پاس بھی تھے۔ اگر کبھی کسی کو خیال آ بھی گیا تو اُس وقت تک وہ اپنی زندگی کو پورا کر چکا ہو گا۔ اس لیے اپنی اِس فرصت کو غنیمت جان کر مزے سے فارم کی اور زمینوں کی نگرانی کرے۔

جاری ہے

قسط نمبر 30

(51)

یہ انیس سو چھہتّر کے دسمبر کا آغاز تھا اور ملک کو وجود میں آئے اٹھائیس سال ہو گئے تھے۔اِس عرصے میں ولیم مقامی لوگوں میں اِس طرح گھل مل گیا کہ رنگ اور آنکھوں کے سوا اُس میں ولائتیوں کی کوئی حرکت نہ رہی۔ اردو پہلے بھی روانی سے بول لیتا تھا، اب پنجابی میں بھی خاصا ہاتھ صاف کر لیتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مرغے لڑانے، کبڈی کروانے اور قصے کہانیاں سننے کا شوق حد سے آگے نکل گیا۔ آئے دن نولکھی کوٹھی پر محفلیں جمنے لگیں۔ ولیم کے جاننے والے عشا کے بعد جمع ہو جاتے۔ کوئی نہ کوئی کہانی کہتا، جس میں رات کے گیارہ بج جاتے۔ محفل کے بعد ولیم کی طرف سے سب کو کبھی کھانا کھلایا جاتا اور کبھی صرف چائے پلائی جاتی۔ سب جانتے تھے، اُس کے پاس پیسے بہت زیادہ ہیں۔اِس لیے وہ اُس کا احترام بھی ویسے ہی کرتے۔ مگر یہ سب لوگ غریب غربا اور مزارع قسم کے تھے۔ بیوروکریسی اور اُمرا کو ولیم نے بالکل نظر انداز کر دیا۔ بلکہ اُن کو اب ولیم کے بارے میں پتا بھی نہیں تھا کہ ایسا کوئی انگریز بھی یہاں موجود ہے۔اِس معاملے میں اشرافیہ تو ایک طرف، مدت ہوئی، اُس کے اپنے بیوی بچوں نے بھی اُسے بالکل بھلا دیا تھا۔ پہلے پہل اُنھوں نے دو تین چکر لگائے اور ولیم کو بھی سرسری انگلستان جانے کا مشورہ دیا لیکن جب ولیم نے سختی سے اِس بات کو رد کر دیا تو وہ بھی آہستہ آہستہ اُسے بھولنے لگے اور اب نوبت یہاں تک آگئی کہ ولیم کے خطوں کا جواب بھی نہیں دیتے تھے۔ ایک آدھ بار جواب دیا بھی، تو وہ ایک دو سطر میں ایسا سرسری تھا، جسے خط کے نام پر مذاق کہہ لینا چاہیے۔ اُس کے بعد مکمل خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ اُنھوں نے گھر بدل لیا تھا تو اُس کا پتا بھی نہیں بتایا اور پچھلے چھ سال سے ولیم کے کسی خط کا جواب بھی نہ دیا، نہ ٹیلی فون ہی کیا۔ بہت سے پرانے دوستوں کی وساطت سے ولیم نے اُن کا پتا بھی کرایا مگر کچھ خبر نہ ملی۔ ویسے بھی دوستوں نے اِس بارے میں زیادہ کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ولیم نے اُنھیں زیادہ تنگ کیا۔ کیونکہ اب یہ بھی اُن کے بغیر اِس طرح رہنے کا عادی ہو چکا تھا، جیسے اُس کا کوئی رشتے دار تھا ہی نہیں۔ ایسی بات نہیں تھی کہ اُسے اپنے رشتوں کا احساس نہیں تھا۔ شروع شروع میں جب اُس کے بیوی بچے گئے، تو وہ کئی سال مضطرب رہا اور بہت دفعہ، جب بھی اُنھیں ضرورت پڑی، ولیم نے اپنی بچی کھچی پونجی سے رقم بھیجنے میں تامل نہ کیا اور رشتوں کا درد رکھے رکھا۔ مگر اب اُس کے ہاتھ سے سارے رشتے ہی

نکل چکے تھے، تو وہ کیا کرتا۔ مچلز والے ابھی موجود تھے، جن کے ساتھ سلام دعا چل رہی تھی۔ لیکن وہ بھی لندن اور اوکاڑہ کے درمیان معلق رہتے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ اِس آنے جانے میں اُنہوں نے اپنے رئیسانہ ٹھاٹھ کو برقرار رکھا اور ولیم سے بہت زیادہ مختلف ہو چکے تھے۔ یا کہہ لیں کہ ولیم ہی اُن سے مختلف ہو گیا تھا۔ اِس لیے اُن کے اندر بھی اب دبی دبی سرد مہری موجود تھی، جسے ولیم نے بہت دیر پہلے بھانپ لیا تھا۔ مگر وہ شاید اُن میں گزری نشانیوں کے ریزے تلاش کرنے کے لیے تعلق کو ٹوٹنے نہیں دے رہا تھا اور برابر وہاں پھیرا لگایا کرتا۔ بلکہ اُس وقت بھی، جب وہ لندن میں موجود ہوتے۔

زمانے کے گزرتے ماہ سال میں ولیم کو اِس پورے نقصان پر تاسف تو ہوا لیکن وہ اُس کو قبول کر چکا تھا۔ چنانچہ ایک عرصے سے اُس نے بھی اُنہیں یاد کرنا چھوڑ دیا۔ اگر یاد آتے بھی تو طبیعت کو جلد کسی اور طرف مائل کر کے مصروف ہو جاتا۔ زیادہ تر انگریزی ناولیں اور انگریزی شاعری کی کتابیں پڑھنے میں لگا رہتا، جو سینکڑوں کے حساب سے اُس کی کوٹھی میں موجود تھیں۔ اُن کے خریدنے میں اُس نے ایک خطیر رقم خرچ کی تھی۔ کتاب خوانی کے علاوہ قصہ سننے کی لت اُسے شدت سے لگ چکی تھی، جس کے لیے وہ عصر سے ہی تیاری کرنا شروع کر دیتا۔

اکثر ہاتھ میں چھڑی تھامے سر پر ہیٹ رکھے پیدل ہی نکل پڑتا اور اِدھر اُدھر پھرتا رہتا۔ زیادہ تر کمپنی باغ اوکاڑہ میں، جو اُسی کی تجویز پر بنا تھا۔ کبھی دس کلومیٹر طے کر کے نہری کوٹھی چلا جاتا یا کسی اور جگہ۔ مگر زیادہ تر اُس کا سفر لمبا نہیں ہوتا تھا۔ اِسی طرح دیسی لوگوں کے ساتھ چلتے چلتے بات چیت کر لیتا۔ کبھی، ٹانگے پر ہوتا تو ایک آدھ سواری بھی ساتھ بٹھا لیتا۔ کافی عرصہ پہلے زمین پر سے اُس کا قبضہ اُٹھ گیا تھا۔ جب وہ باقاعدہ آہستہ آہستہ کر کے چند ہی سالوں میں ریٹائرڈ یا حاضر سروس فوجی افسروں کے نام الاٹ ہو گئی۔ اِس لیے جو پیسہ ہاتھ میں تھا، وہ رفتہ رفتہ کنارے لگنے لگا۔ ولیم کو اب اُس کی زیادہ پروا بھی نہیں تھی۔ کیونکہ کوٹھی ابھی تک اُس کے پاس تھی اور آٹھ دس سال تک مزید ساتھ دینے والا پیسہ بھی تھا۔ اِس لیے بھی اُسے کوئی فکر نہیں تھی کہ دیسی لوگوں کی طرح اُس کے دس دس بچے نہیں تھے۔ اُس نے رینالہ، اوکاڑہ، گوگیرہ اور اُن کے مضافات میں اِس طرح اپنے آپ کو گم کر لیا، جیسے یہ سب علاقے اُس کی ملکیت ہوں۔ حالانکہ اب تمام زمینیں اور فارم ملٹری نے اپنے قبضے میں لے لیے تھے، جو تقسیم سے پہلے گوروں کی ملکیت تھے۔ ولیم نے کئی طرح سے اثر رسوخ اختیار کر کے نولکھی کوٹھی پر اپنا قبضہ برقرار ہی رکھا

اور کچھ روپے سالانہ کے حساب سے اُس کا کرایہ ادا کرتا رہا۔ جب اُس کی زمینوں پر قبضہ ہوا تھا تو وقتی طور پر ولیم انگلستان چلا گیا تھا لیکن کچھ ہی مہینوں بعد واپس آگیا تھا اور نولکھی کوٹھی میں بطور کرایہ دار براجمان رہا۔ ویسے بھی یہ کوٹھی ایک جرنیل کے نام لیز پر تھی، جس میں اُسے رہنا تو نہیں تھا کیونکہ نہ تو یہ کوٹھی کسی بڑے شہر میں تھی اور نہ ہی اوکاڑہ شہر کے درمیان میں تھی۔ اوکاڑہ کے شمال مشرق میں نہر کے دوسری طرف تین کلومیٹر باہر تھی، جس میں کسی مقامی کو رہنے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ ولیم اِس کا کرایہ بھی زیادہ دینے کو تیار تھا اور پچھلے کئی سال سے دیتا بھی رہا تھا۔ اِس لیے اُس کا یہ مسکن برقرار رہا۔

کچھ دنوں سے اُس کی طبیعت میں ایک بے چینی پھر داخل ہو رہی تھی۔ وہ کون سی بات تھی، جس کے باعث یہ کیفیت تھی۔ اس بارے میں ابھی وہ خود بھی لاعلم تھا۔ ایک شام اِسی طرح سب جمع تھے اور میاں محبوب علی خاص لاہور سے داستان کہنے کے لیے آئے ہوئے تھے، جو پہلے بھی کئی دفعہ آچکے تھے۔ کوٹھی کے دالان میں ولیم کی کرسی کے سامنے پہلے آٹھ دس کرسیاں اور اُس کے آگے تین تین چار پائیاں دو طرفہ لگی ہوئی تھیں، جن کے درمیان چھ فٹ کی کھلی جگہ تھی۔ ولیم کی کرسی سے آخری چار پائی تک کم از کم دس قدم کا فاصلہ تھا۔ اِس طرح کہ داستان گو موقع کے مطابق بیچ میں چہل قدمی کر سکے۔ جیسا کہ اکثر پنجابی داستان گو مجمعے کے بیچ چل پھر کر اور اداکاری کر کے کہانی سناتے ہوئے، بیچ میں کہیں کہیں لوک بولیوں، دوہڑوں اور ماہیوں کے ٹانکے لگاتے جاتے ہیں۔ اِس سے کہانی کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ ولیم کے ہاں اکثر کہانی کہنے والے پنجابی ہوتے تھے۔ اِس لیے اُس نے کوٹھی کے دالان میں بیٹھنے کی شکل اسی صورت میں ڈھال رکھی تھی۔ میاں محبوب علی دراصل نواب مظفر علی قزلباش کا ذاتی داستان گو تھا، جو ولیم کے اُن دِنوں کا دوست تھا، جب وہ ڈپٹی کمشنر تھا۔ اِسی دوستی کو وہ آج تک نبھائے چلا آرہا تھا۔ یہ سردیوں کی رات تھی اور آٹھ بج چکے تھے۔ محبوب علی داستان شروع کرنے ہی والے تھے کہ چوہدری شفیع محمد بھی آن بیٹھا، جس کے ساتھ ستر سال کا ایک بڈھا تھا۔ شفیع محمد کی ستگھرہ موڑ پر دو مربعے زمین تھی اور ولیم کے ساتھ اچھی خاصی دوستی بھی تھی۔ ولیم جب بھی سیر کو نکلتا، اکثر چوہدری شفیع محمد کے پاس جا بیٹھتا۔ اِس طرح شفیع محمد بھی اُس کے حاضر باشوں میں تھا اور یہ رشتہ برابری کی سطح پر ہی قائم تھا۔ آج شفیع محمد کے ساتھ یہ بڈھا البتہ نیا تھا۔ اُس کے سر پر سفید پگڑی تھی اور سفید ہی کھدر کا دُھوتی اور کُرتہ تھا۔ پاؤں میں چمڑے کے دیسی جوتے تھے، جس کو خریدے ہوئے غالباً کئی سال گزر چکے تھے۔

سلام دعا کے بعد سب بیٹھ گئے تو چوہدری شفیع نے ولیم سے مخاطب ہو کر کہا، صاحب بہادر، یہ امیر سبحانی ہے۔ آج ہی حویلی لکھا سے آیا ہے۔ میں کل وہاں اپنی بہن کے ہاں گیا تھا۔ وہیں اپنے بہنوئی کے ہاں میری اِس سے ملاقات ہوئی۔ بہت عمدہ داستان کہتا ہے۔ جب میں نے اِس سے وہاں داستان سنی تو اِس کا شیدائی ہو گیا اور منت کی کہ میرے ساتھ ایک دو دن اوکاڑہ چل۔ امیر سبحانی اُجاڑے سے پہلے فیروز پور کی تحصیل جلال آباد میں رہتا تھا۔ اِس لحاظ سے میں نے سوچا، اِسے آپ سے ملانا اچھا رہے گا۔ کیونکہ آپ بھی کافی عرصہ جلال آباد میں رہے ہیں اور اُسے یاد بھی کرتے ہیں۔ یہ آپ کا ہم وطن بھی ہے اور داستان تو یہ ایسی کہتا ہے کہ ساری رات گزر جائے گی۔ مگر آپ کا جی چاہے گا، سنتے جائیں۔

شفیع محمد تعارف کرا چکا تو ولیم نے ایک نظر بھر کر امیر سبحانی کی طرف دیکھا، گویا وہ آئینہ ہو، جس میں ولیم اپنے ماضی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ دل ہی دل میں ولیم نے پوری کائنات کی خاموشی سمیٹ کر اپنے اندر بھر لی اور چند لمحے اُسی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ لوگوں نے اُسے حقہ پیش کیا اور بیٹھنے کے لیے سامنے کی ایک کرسی خالی کر دی۔ اتنے میں ولیم اپنی سابقہ حالت میں لوٹ چکا تھا۔ اُس نے پورے مجمعے کی طرف دیکھا اور کہا، کوئی بات نہیں۔ چلو آج ہم امیر سبحانی سے سن لیتے ہیں۔ محبوب علی تو ایک دو دن ابھی یہاں ہی ہیں۔ کیوں امیر سبحانی ہمیں سناؤ گے؟

جیسی آپ کی رائے، (اور سوالیہ انداز میں چوہدری شفیع کی طرف دیکھا)

اُس نے کہا، بھائی امیر آپ کو لایا کس لیے ہوں؟ یہ صاحب ہمارے لیے بڑا لاڈلا ہے۔ آج اِسے ایسی داستان سناؤ کہ خوش ہو جائے۔

چوہدری صاحب کوشش کرتا ہوں۔ اِس کے بعد امیر سبحانی نے حقے کے دو چار لمبے لمبے تیز کش لیے، پھر اُٹھ کے چار پائیوں اور کرسیوں کے درمیان والی راہداری میں کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ بھر کا کڑھا ہوا رومال گلابی رنگ کا، جیب سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا، جو داستان گوؤں کی تسکین کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ امیر سبحانی نے رومال کے چاروں کونے اکٹھے کر کے مٹھی میں دبا لیے اور ولیم کی طرف منہ کر کے بولا، صاحب اجازت ہے تو عرض کروں؟ پھر داستان شروع کر دی اور ہلکے ہلکے قدموں سے آگے پیچھے چلنے بھی لگا۔

اول حمد خداوند باری، دوم پاک رسول
تیجا نام علی کا جاپوں، جس کی دوجگ دھوم
چوتھی پاک رسول کی بیٹی پانچواں حسن حسین
اِن کے بعد ہیں بارہ ہادی سید کُل کونین
غازی پاک عباس بہادر، لے کر اُس کا نام
قصہ ایک دلاور کا مَیں تم کو سناؤں تمام

امیر سبحانی تمہید کے بعد اصلی داستان کی طرف اس طرح پلٹا کہ اچانک ولیم سمیت پورا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا اور کہانی سننے کے ساتھ ساتھ امیر سبحانی کی حرکات وسکنات کو بھی غور سے دیکھنے لگا۔

آنکھوں دیکھا حال ہے، نہیں سُنی گنی یہ بات
سب سچ کہانی بیلیوں، شاہد رب کی ذات
اک شہر جلال آباد تھا، اُس مشرق کے پنجاب
جسے چھوڑا وِچ فساد میں، سنو مرے احباب
اُس شہر جلال آباد میں، تھا ایک جوان دلیر
بیٹا حیدر شیر کا تھا، دھرتی کا وہ شیر
نام غلام حیدر اُس کا، جانے سب سنسار
ہوا شہید وہ سورما، پَر دیے گورکھے مار

اِس کے بعد جیسے ہی امیر سبحانی نے داستان کا قد غلام حیدر کے ذکر کے ساتھ آگے بڑھایا اور قصے کی رمزیں کُھلنا شروع ہوئیں، ولیم کی آنکھیں کُھلنے لگیں۔ امیر سبحانی کی آواز میں ایسی تمکنت اور داستان کہنے میں ایسی دلآویزی تھی کہ سب مجمعے کے سروں پر گویا پرندے بیٹھے ہوں۔ مجال ہے، کسی کا دھیان ادھر اُدھر بھٹک جائے۔ ولیم کا معاملہ کچھ

آگے کا تھا۔ جیسے جیسے داستان آگے بڑھ رہی تھی، اُس کی یاد داشت کے دریچوں کے پٹ ایک ایک کر کے وا ہوتے جا رہے تھے۔ اُسے یوں لگ رہا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر جلال آباد کا اسسٹنٹ کمشنر بن چکا ہے۔ امیر سبحانی چار پائیوں کے درمیان کی راہداری میں ایک ہاتھ میں جریب پکڑے، کبھی آگے اور کبھی پیچھے چلتا اور غلام حیدر کا قصہ نظم کی شکل میں بیچ بیچ نثر کے ٹوٹے جما کر یوں اُٹھاتا، جیسے آئتوں کے درمیان تفسیر کی وضاحتیں ہوں۔ اِس طرح کہانی میں ایک تو تاثیر بڑھ جاتی تھی، دوسرا سمجھنے میں آسانی رہتی۔ کہانی کے اِس انداز سے یوں تو سارا مجمع ہی کہانی سننے کی بجائے دیکھ رہا تھا۔ مگر ولیم تو گویا پچھلے زمانے میں پہنچ گیا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ یہ قصہ ختم ہو۔ اُس کے لیے چالیس سال بعد یہ ایک ایسا منظر تھا، جو اگر نہ آتا تو شاید ولیم کی زندگی میں ایک ایسا خلا رہ جاتا، جو نہ تو کبھی پُر ہوتا اور نہ ہی ولیم کو پتا چلتا، وہ کون سا خلا ہے؟ داستان آگے بڑھتی گئی۔ سب سنتے گئے اور ولیم اُس کے ایک ایک منظر میں کھوتا گیا۔ حتیٰ کہ رات گیارہ بجے امیر سبحانی نے داستان دوسرے دن عشا کے وقت تک روک دی۔ اِس کے بعد سب مہمانوں کو کھانا پیش کیا گیا۔ کھانا کھا کر سب رخصت ہو گئے اور امیر سبحانی چوہدری شفیع کے ساتھ ٹانگے پر بیٹھ کر چلا گیا۔

لوگ تو داستان سن کر چلے گئے مگر ولیم کی رات سو سال کی ہو گئی۔ امیر سبحانی نے داستان شروع نہیں کی تھی، ولیم کی زندگی کا افسانہ چھیڑ دیا تھا۔ اگرچہ اس میں اُس کا اپنا ذکر تین چار دفعہ ہی آیا تھا۔ وہ بھی غلام حیدر کے ضمن میں مبالغے کے ساتھ۔ مگر یہ مبالغہ بھی ولیم کو اچھا لگا۔ بلکہ عین سچ لگا اور وہ چاہ رہا تھا، یہ کہانی کبھی ختم نہ ہو۔ اِنہی سوچوں میں ولیم کی ساری رات نکل گئی اور اُس کی آنکھیں گویا یاقوت ہو گئیں۔ کبھی اُٹھ کے ٹہلنے لگتا، کبھی بستر پر جا پڑتا۔ حتیٰ کہ فجر کی اذان نے صبح کی سواری کا نقارہ بجا دیا۔ رات بھر ولیم کے دماغ میں جودھا پور، جھنڈو والا، غلام حیدر اور جلال آباد کے مضافات کا وہ علاقہ پھرتا رہا، جہاں اُس نے اُن دنوں دورہ کیا تھا۔ وہ رہ رہ کر اُنہی مضافات میں چلا جاتا اور تڑپ تڑپ کے رہ جاتا۔ کہانی ابھی تک وہاں تک پہنچی تھی، جب غلام حیدر فیروز پور میں شیخ مبارک کے پاس ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کے بندوبست میں گیا تھا۔ لیکن وہ دلچسپ اِتنی تھی کہ ولیم کو اپنے ساتھ غلام حیدر کے کردار سے بھی شدید دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین ہو گیا کہ آخر اُس کے ساتھ کیا بنی؟ دن چڑھا تو اُس نے بادامی رنگ کی بید پکڑی اور سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ یہ سیر اُن زمینوں اور باغوں کی تھی، جو اب اُس کی ملکیت میں نہیں تھیں۔ اُس

کی عمر اتنی لمبی سیر کے قابل نہیں رہ گئی تھی۔ پھر بھی وہ جوانوں سے کہیں زیادہ پھرتیلا اور پیدل چلنے والا تھا۔ وہ دوبارہ شام ہونے اور کہانی کے شروع ہونے کے انتظار میں کُڑھنے لگا اور خدا خدا کر کے پھر عشا کا وقت ہو گیا اور ولیم کی کوٹھی میں داستان کے پالان لگ گئے۔

یہ محفل دس دن برپا رہی۔ امیر سبحانی نے اِس طرح اُس میں رنگ بھرا کہ محبوب علی بھی اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ ہر آدمی عش عش کر اُٹھا اور سب نے اُسے کچھ نہ کچھ ضرور دیا۔ ولیم نے دس ہزار روپے کے ساتھ کئی تحفے بھی دیے۔ اتنی بڑی رقم امیر سبحانی نے کبھی ایک دم نہیں دیکھی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ولیم کے لیے تشکر کے آنسو آ گئے۔ اب چونکہ ہر شخص پر کھل گیا تھا کہ جلال آباد کا اُس وقت کا اسسٹنٹ کمشنر ولیم تھا، اور یہ کہ اُس نے غلام حیدر کے ساتھ زیادہ سخت رویہ اختیار بھی نہیں کیا تھا۔ اِس کے علاوہ یہ اِس داستان میں ایک بڑے متحرک کردار کی شکل میں سامنے رہا ہے اور سکھوں کی بانسری بجانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اِس لیے وہ سب ولیم کی محبت میں اور زیادہ مانوس ہو گئے۔ لیکن ولیم کہانی سننے کے بعد مزید اُداس رہنے لگا۔ اُسے وہ بھولی ہوئی تمام شامیں اور اُن شاموں میں جلنے والے قمقمے یاد آنے لگے، جو کسی بھی طرح سے خوش گوار تھے۔ اِس منظر میں اُسے پھر کیتھی اور بچوں کی یادیں ستانے لگیں، جو اگرچہ اب بچے نہ رہے تھے لیکن ولیم نے اُنہیں جس قد و قامت میں چھوڑا تھا، وہ اُسے اُسی قامت میں دِکھنے لگے اور مسلسل تڑپانے لگے۔ مگر اب اُن کا کوئی پتا نہیں تھا۔ ولیم نے سوچا، اگر ایک بار اُسے خط آ جائے تو وہ اُن سے ملنے کے لیے لندن ضرور جائے گا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا اور خط لکھنے لگا۔

بیڈ روم کی تمام چیزیں بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ بلکہ کئی چیزیں تو استعمال کے قابل بھی نہیں رہی تھیں اور اُس نے نئی چیزیں نہ خریدنے کی قسم کھالی تھی۔ کوٹھی بھی ولیم کی طرح بوسیدہ ہو چکی تھی۔ پھر بھی کوئی چیز اِس تنہائی میں دل کو سکون اور اطمنان بخشنے والی تھی، تو وہ یہی کوٹھی تھی، جو اُس کی اپنی تھی۔ ولیم نے کیتھی اور بچوں کو تسلی سے بیٹھ کر دوبارہ خط لکھا اور خود جا کر اوکاڑہ کچہری بازار کے تار گھر سے تار کیا۔ لیکن اُس کا کبھی جواب نہ آیا اور دن مزید گزرتے گئے۔ ولیم آہستہ آہستہ اپنی زندگی میں واپس آنے کی کوشش کرنے لگا۔ شاید امیر سبحانی سے کہانی سننے کے بعد وہ جلد بوڑھا ہونے لگا تھا۔ اُس نے سوچا، کاش اُس کی امیر سبحانی سے ملاقات ہی نہ ہوتی اور وہ اتنا جلدی بوڑھا نہ

ہوتا۔ یہ اُداسی کی حالت ولیم پر کئی مہینوں تک جاری رہی۔ سردیاں گزر گئیں، بہار نکل گئی، گرمیاں چلی گئیں، پھر سردیاں آگئیں۔ اِن بدلتے مہ وسال کے فاصلوں سے اُس کے زخم بھرنے لگے اور دو سال بعد اُس کی حالت پھر معمول پر آگئی۔ لیکن اب اُس کی شاہ خرچیاں ختم ہو گئی تھیں۔ کیونکہ جمع پونجی قریب قریب ٹھکانے لگ چکی تھی اور اُس کی زندگی کے شب و روز ارد گرد کے علاقوں میں گھومتے ہوئے، اُفق کی طرف جلدی سے سمٹتے جا رہے تھے۔

جاری ہے

قسط نمبر 31

(52)

نواز الحق مولانا فضل دین کی امیدوں پر اس طرح پورا اُتر رہا تھا کہ اِتنی توقع اُسے بھی نہیں تھی۔ لڑکا ایسا ذہین اور لائق نکلا کہ باپ دادا کے بھی کان کاٹنے لگا۔ بڑے بڑے جاگیر داروں، فوجیوں اور افسروں کے بیٹے اُس نے دوست بنا لیے۔ اُنہی کی صحبت میں دن رات گزارنے سے اُسے وہ تمام معلومات اور طریقے حاصل ہو گئے تھے، جو سول سروس کا زینہ تھے اور خاندان کی کایا کلپ کر دینے کے لیے نتیجہ خیز ثابت ہو سکتے تھے۔ اِس کے علاوہ
انگلش، عربی، فارسی، تاریخ، غرض ہر شعبے میں کچھ نہ کچھ سُدھ بدھ حاصل کر لی تھی۔ لباس اور بات چیت میں بھی اِتنی نفاست پیدا کر لی کہ موقع کی مناسبت سے تمام جگہ اپنے آپ کو فِٹ کر لیتا۔ عربی اور اور فارسی کی لیاقت نے اُس کے اندر شعر سے لُطف لینے کا مادہ بھی پیدا کر دیا۔ لیکن یہ مادہ تھوڑا بہت شعر کو سُن کر، یا پڑھ کر یاد کر لینے کی حد تک تھا۔ شعر کی فنی جمالیات کو سمجھنے یا خود کسی مشق میں پڑنے کی اہلیت نہیں تھی۔ یہ بات بھی اُس کو کسی نے سمجھا دی تھی کہ پاکستان میں سول سروس کی نوکری حاصل کرنے کے لیے بندے کو تین چیزوں میں خاص طور پر توجہ دینی چاہیے۔ ایک اُسے تھوڑا بہت اقبال کی شاعری اور اُس کی زندگی کے نیک نیک حالات ازبر ہوں۔ دوسرا انگریزی بول چال کی مہارت حاصل ہو اور تیسری اہم بات یہ کہ اپنے باس کی چاپلوسی کرنے کی تربیت میں نُقص نہ ہو۔ اگر اِن میں انسان طاق ہو تو نوکری ملنے کے بعد اُس کی ترقی میں خدا بھی رکاوٹ کھڑی نہیں کر سکتا۔ بندہ اِس طرح بائیس سکیل کے زینے طے کرتا ہے، جیسے گہری نیند سوئے ہوئے پر صبح آجاتی ہے۔ نواز لحق نے اِن تینوں مضامین میں اپنی استعداد کو اِتنا بڑھایا کہ ایک تو اقبال کا ستر فی صد کلام اُسے یاد ہو گیا، دوم وہ انگریزی کو ایسے چاٹنے لگا کہ بعض اوقات اُس پر انگریز ہونے کا شبہ ہوتا۔ وہ تو غنیمت تھی رنگ زیادہ صاف نہ تھا۔ سوم افسر کی بات سے اتفاق کرنے کا ملکہ حاصل ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ نواز لحق پنجاب سول سروس کا امتحان پاس کر کے ڈائریکٹ نائب تحصیل دار بھرتی ہو گیا۔ لیکن اس پر وہ مطمئن ہو کر بیٹھ نہیں گیا۔ بلکہ مزید ترقی کے لیے کوشاں رہا۔ جس میں اُس نے مولانا فضل دین کی جمع کی گئی بے شمار دولت کا بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ لاہور میں کوئی افسر ہو گا، جس کے ساتھ اُس نے تعلقات قائم نہیں کیے اور اُسے تحفے تحائف نہیں بھیجے۔ وہ اِس معاملے میں اپنے افسران کا اِس قدر وفادار تھا کہ اُن

کی بیویوں تک سے ذاتی مراسم قائم کر لیے۔ کوئی نواز لحق صاحب کی بڑی بہن بن گئی اور کوئی خالہ ہو گئی۔ کوئی اُس کے دوست کی والدہ تھی۔ اِس لحاظ سے نواز صاحب کی بھی والدہ بن گئی۔ اِن رشتوں کے بن جانے کی وجہ سے نواز کو عید بقر عید اور سالگرہوں پر تحفے بھی دینے ہوتے تھے اور وہ دل کھول کر دیتا۔ خاص کر اُسے یہ پتا چل گیا تھا کہ عورت ذات سونے کی بڑی لالچی ہوتی ہے۔ اِس لیے وہ جو بھی تحفہ دیتا، سونے ہی کا ہوتا۔ کیونکہ سونے کے بغیر چاہے ہزاروں تحفے ہوں، لوگ بھول جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ایسی دھات ہے، جس کا تحفہ ایک تو لینے والے کو احسان مند کر دیتا ہے اور دوسرا عمر بھر نہ لینے والے کو بھولتا ہے اور نہ دینے والے کو۔ اِس کے علاوہ جب ضرورت ہوتی، سودا سلف بھی خود بخود گھر بھجوا دیتا۔ اِن اطاعت شعاریوں سے یہ ہوا کہ کسی افسر کی جرات نہ ہوتی تھی، وہ نواز لحق کی اے، سی آر میں، اُس کے کردار اور کام کی پاکدامنی کی گواہی نہ ثبت کرے۔ اپنے باس کے گھر روزانہ جا کر اُن کی ضروریات کی خبر لے کر اُنھیں پورا کرنا تو نواز صاحب نے اپنے اُوپر لازم کر لیا تھا۔ یہ فرض شناسی اِس حد تک تھی کہ ایک دن جب کمشنر صاحب کو ہلکا سا نزلہ ہو گیا تو نواز صاحب کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ آپ اُس کی تیمارداری میں اِس طرح مگن ہوئے کہ تین دن تک اپنے گھر نہیں آئے۔ وہیں اُن کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں رہنے لگے۔ اگرچہ صاحب نے بہت کہا، کوئی بات نہیں نواز صاحب، آپ گھر چلے جائیں، مَیں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ لیکن یہ نہیں مانے، کہ جانے کب ضرورت پڑ جائے، پھر خدا نخواستہ آنے میں دیر ہو گئی تو آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اِسی فرض شناسی کی وجہ سے اُس کے دفتر والے نواز صاحب کا مذاق بھی اُڑاتے۔ ایک دن میٹنگ کے دوران جب کئی ماتحت بھی بیٹھے تھے، صاحب کا چھوٹا بیٹا ساتھ والی کرسی پر بیٹھا کھیل رہا تھا۔ اُس نے وہیں بیٹھے پیشاب کر دیا۔ نواز صاحب نے اپنے ہاتھوں سے اُس کو غسل خانے میں لے جا کر پانی سے صاف کیا اور اُس کا پیشاب دھویا، جس کی وجہ سے اُس کا مذاق اُڑایا گیا۔ لیکن اُنھوں نے اِن احمقوں کی ذرا پروا نہیں کی اور سب نے دیکھا، انھی خدمت گزاریوں کی وجہ سے وہ صرف دو سال میں ہی تحصیل دار ہو گیا۔ جبکہ ساتھ والے، جو ذرا خدمت گزاری میں کم تھے، ابھی تک اُنھی بوسیدہ میزوں پر بیٹھے مکھیاں مار رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اُنھیں یہ کلیہ بھی کسی نے سمجھا دیا تھا کہ ریٹائرڈ افسر مردہ گھوڑے سے زیادہ اہم نہیں ہوتا۔ اِس لیے جتنی جلدی ہو سکے، اُس پر مٹی ڈال دینی چاہیے۔ کیونکہ جو وقت کو ضائع کرتا ہے، وقت اُسے ضائع کر دیتا ہے۔ ریٹائرڈ افسر کی بات ماننا یا اُسے ملنا وقت ضائع کرنے کے مترادف

ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نواز صاحب نے کبھی پلٹ کر بھی ایسے لوگوں کی طرف نہیں دیکھا تھا، جو سرکاری نوکری سے فارغ ہو چکے تھے۔

اُن کے تحصیل دار بننے کے کچھ عرصے بعد ملک میں فوج کی حکومت آگئی۔ نواز صاحب اُن دنوں خوش قسمتی سے ضلع راولپنڈی کے محکمہ مال میں تھے۔ یہ حکومت ہر لحاظ سے شرعی کہی جاسکتی تھی۔ تمام سزائیں شرعی ہوگئی تھیں۔ لباس شرعی ہوگیا۔ ٹوپیاں، تسبیاں، لوٹے اور چٹائیوں کی قیمتیں شریعت کے مطابق بڑھ گئیں۔ شلواریں گھٹنوں سے اُوپر۔ حتیٰ کہ سر کے بال اور ڈارھیاں شرعیت کے مطابق ڈھل گئیں۔ گاؤں گاؤں میں مولویوں کے وظائف مقرر کر دیے گئے اور اُنہیں خطبے لکھے لکھائے آنے لگے تاکہ کسی بھی مولوی کو دماغ پر زور دینے کی زحمت نہ پڑے۔ ہزاروں چوہڑے بطور جلاد بھرتی کیے گئے، پھر بھی کوڑے مارنے والے کم پڑ جاتے تھے۔ عوام کا نماز روزے کی طرف اِتنا رجحان ہو گیا کہ سر زمین جنت نشان ہو گئی۔ ہر طرف امن و امان کی فضا قائم ہو گئی۔ تبلیغی مرکزوں میں، جہاں کبھی ویرانی ہو نکتی تھی، اب کھوے سے کھوا چھلنے لگا۔ عدل انصاف کا اِس قدر بول بالا ہوا کہ جرم کے شبے کی بنا پر بھی سزائے موت دی جانے لگی۔ اور اِس معاملے میں اتنی احتیاط تھی کہ چاہے مجرم وزیر اعظم ہی کیوں نہ ہو، تختے پر چڑھا دیا جاتا۔ دراصل عدالتوں نے پتا چلا لیا تھا کہ سوائے فوجی اور ایک خاص مکتبہ فکر کے مولوی کے، باقی لوگ کافر اور غدار ہیں۔ تمام بدعتی مذاہب اور مسالک کا قلع قمع کرنے کی ٹھان لی گئی اور صحابہ کے سچے پیروکاروں اور خفیہ اداروں کو اجتماعی طور پر پورے اختیار دے دیے گئے کہ وہ آسانی سے نشاۃ اسلامیہ کے دشمنوں کی سرکوبی کر سکیں۔ یہی وہ دن تھے، جب نواز لحق صاحب پر صحیح دین کی سمجھ اور فوجی حکومت کی برکتوں کے پے بہ پے انکشافات ہوئے۔ اُنہوں نے نہ صرف خود، بلکہ لوگوں کی بھی اِس امر کی طرف توجہ دلانی شروع کر دی کہ امیر المومنین جنرل صاحب اللہ کے ولی اور مجدد دین ہیں۔ اُن کے حکم کی سرتابی خدا سے بغاوت کے مترادف ہے اور یہ کہ جمہوریت مغرب کا پراپیگنڈہ ہے۔ اسلام ایسی کسی حکومت کو جائز قرار نہیں دیتا جس کی بنیاد غیر مذہبوں نے رکھی ہو۔ اُنہوں نے علی الاعلان یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ رافضی اور خانقاہی نظام، دین میں فساد کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ اُنہیں بالکل ختم کر دینا چاہیے۔ اِس عرصے میں نواز صاحب نے اپنی ڈاڑھی مزید بڑھالی اور رضا کارانہ طور پر دفتر میں کام کرنے والوں کو نماز پڑھانے کے ساتھ دین کی صحیح سمجھ بوجھ دینا بھی شروع کر دی۔ جس کی اُس وقت اُن لوگوں کو سخت ضرورت تھی۔ جو آدمی نماز پڑھنے نہ آتا، اُسے دفتری قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کا نام دے کر

وارننگ لیٹر جاری کرنے کا اہتمام بھی ہونے لگا۔ اِس میں بھی نواز صاحب سب سے زیادہ پیش پیش تھے۔ اِس کے ساتھ ہی فوجیوں سے مراسم اور لاہور کی نہایت شریف فیملی، جس پر جنرل صاحب کی برکات بے پایاں تھیں، کے درِ دولت پر دن رات حاضری کو اپنا ایمان اور کعبہ کی زیارت کے مترادف جان لیا۔ اور اُن نامرادوں کے نام اور کوائف دینے لگا، جو سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر فوج یا اسلام کے خلاف بات کرتے پائے جاتے تھے۔ نواز صاحب میں اِن سب خوبیوں اور اسلام کے سچے عاشق ہونے کی وجہ سے، یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ حساس اداروں کی نظر سے اُس کی وفاداری اُوجھل رہ جاتی۔ بالآخر اُس کا نام اُن افراد کی فہرست میں شامل ہو گیا، جنہیں بلا شبہ غیر مشروطی طور پر حکومت کے وفاداروں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اُسی شریف فیملی کی غلام گردشوں میں پھرتے نواز صاحب نے اپنی ترقی کے ایک اور زینے کی راہ دیکھ لی۔ بالآخر پنجاب کی وزارتِ خزانہ کی سفارش سے اُنیس سو بیاسی میں اُس کی اسسٹنٹ کمشنری کے آڈر جاری ہو گئے۔ اُنہیں پورے سرکاری پروٹوکول کے ساتھ جھنگ شہر کی افسری کا پروانہ دے دیا گیا، جہاں دیگر کاموں کے ساتھ بعض مسالک اور اُن کے عقائد کے خلاف کام کرنے والوں کے لیے آسانیاں فراہم کرنا تھیں۔

(53)

اُنیس سو تراسی کا آدھا اکتوبر گزر چکا تھا۔ پنجاب میں اکتوبر کا مہینہ موسم کی کیفیت کو اِس قدر معمول پر لے آتا ہے کہ اُس وقت گرمی گرمی نہیں رہتی اور سردی ابھی تک نومبر کے پردوں میں چھپی ہوتی ہے۔ اُس وقت نہ تو گرمی تھی ہے اور نہ سردی۔ اِس ٹھہرے ہوئے موسم میں اُداس کر دینے والی ایسی خموش کیفیت تھی، جس کو بیان کرنے کی قدرت نہیں۔ یہ موسم بہار کا نہیں ہوتا۔ لیکن اُس سے کہیں زیادہ طبیعت کو راس آنے والا ہوتا ہے۔ بہار ہر چیز میں ایک قسم کا ہلکا سا شور، تحرک اور چہچہاہٹ پیدا کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ خوشبوئیں بھی بولتی ہیں۔ اِس کے برعکس اکتوبر کے درمیان سے لے کر نومبر کے ابتدائی دس دنوں میں ہر شے خموش، چپ اور ٹھہری ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جس میں پوری فضا پر اُداس کر دینے والے غمگیں سائے چھا جاتے ہیں۔ موسم کی اِن چپ چاپ سفیدیوں میں انسان بھی افسردہ ہو جاتا ہے۔ ماضی کی گونج عام حالات کی نسبت زیادہ سنائی دیتی ہے اور آج کل یہی کیفیت ولیم کی تھی۔ وہ اوکاڑہ کے مضافات اور نہری کوٹھی کے جامنوں، پھولوں اور گوگیرہ کی بستیوں میں اکیلا گھومتے پھرنے کے ساتھ

ماضی کے ورقوں کو پرتالتا جاتا اور اُن میں لکھے افسانوں کی سطریں بغور پڑھتا، مکرر پڑھتا، سہ بار پڑھتا، بار بار پڑھتا۔ روپے اُس کے پاس کم ہوتے جا رہے تھے۔ بلکہ اِس تیزی سے کم ہو رہے تھے، جیسے عمر کی منزلیں سمٹتی جا رہی تھیں۔ یوں بھی اُس کی عمر بہتر سال ہو چکی تھی لیکن کمر ابھی تک جھکی نہیں تھی، جیسا کہ عام اور مقامی ہندوستانیوں کے بوڑھے ہونے پر جھک جاتی ہیں۔ پاکستان کی بیوروکریسی سے اب اُسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ سیاسی حالات کیا ہیں، ؟لوگوں کے رویے کتنے بدل چکے ہیں یا بیرونی دنیا میں کیا ہو رہا ہے ؟ برطانیہ امریکہ یا دوسرے مغربی ممالک کی کیا صورت ہے ؟ ولیم اِس سب کچھ سے اس طرح بیگانہ ہو چکا تھا، جیسے اِن چیزوں کا وجود اساطیری دنیا میں ہو۔ جہاں صرف کہانیاں جا سکتی تھیں۔ البتہ اوکاڑہ کے کیتھلک چرچ میں اتوار کے اتوار اُس کی حاضری اب لازمی ہو گئی تھی۔ یہ چرچ اُس کے دادا نے اپنے خرچے سے بنوایا تھا۔ جہاں یہ چرچ موجود تھا، اُس کے سامنے والے بازار کا نام بھی چرچ بازار رکھ دیا گیا تھا، جو ابھی تک اُسی نام سے تھا۔ یہ بازار جنوب کی طرف سے ریلوے پھاٹک نمبر دو سے لے کر سرور سوڈا چوک کو کراس کرتا ہوا شمال میں کمپنی باغ کے جنوب مشرقی کونے تک چلا جاتا تھا۔ ولیم اِس چرچ میں عبادت سے زیادہ اُن لوگوں کی پُرسش کے لیے جاتا، جن کے لیے خداوند خدا چرچ کی لال اینٹوں میں پھنسا ہوا ایک بے بس صلیب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ جو دنیا میں تو اِن کالے عیسائیوں کے کچھ کام نہیں آسکتا تھا۔ اگر کوئی آخرت تھی، تو وہاں ان کالوں کے لیے دودھ کی سفید نہروں اور میوہ کے باغوں کی دستیابی کا ذمہ دار تھا۔

آج وہ اسی اداس کر دینے والی فضا میں اتنا بوجھل ہو چکا تھا، جس میں دل کو سنبھال لینا ایرے غیرے کا کام نہیں تھا۔ ولیم کمرے سے نکل کر کوٹھی کے صحن میں آیا اور سامنے والی اُسی بنچ پر بیٹھ گیا، جس کو اس صحن میں لگے اب ساٹھ برس گزر چکے تھے۔ یہ کرسی ولیم کے دن رات بیٹھنے سے اِتنی چمکدار ہو گئی تھی کہ پالش کا گمان ہوتا۔ پرندے اِدھر اُدھر اڑے جاتے تھے، اگر کوئی چہچہا بھی رہا تھا، تو اُس کی چونچ ہلتی نظر آتی تھی مگر آواز سنائی نہ دیتی۔ سامنے کا پیپل بھی بالکل خموش اور حیرانی کی حالت میں تھا، جیسے ولیم کی تنہائی پر نوحہ کناں ہو۔ اُسے آنے والے لمحوں کا پتا چل چکا تھا۔ کبھی ایک آدھ چڑیا اُس کے پاس سے اُڑ کر نکل جاتی، پھر دور تک کھیتوں میں، کبھی ایک جگہ پر، کبھی دوسری جگہ پھدکتی ہوئی بیٹھتی۔ پھر اُسی طرح نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ ولیم کو جب کافی دیر اِسی حالت میں گزر گئی تو وہ اُٹھ کر دوبارہ کوٹھی میں چلا گیا اور اپنے بیڈ روم میں جا کر پُرانے سامان کو ٹٹولنے لگا، جو اَب زیادہ نہیں رہ گیا تھا۔ چند چیزیں تھیں، جو کیتھی کے ہاتھوں سے یا تحفہ دینے سے بچ گئی تھیں۔ یہ چیزیں بازار میں قیمت تو نہیں رکھتی تھیں لیکن ولیم

کے لیے بہت زیادہ اہم تھیں۔ اِن میں ولیم کے دوستوں کی کچھ تصویریں، ولیم کے بچوں کی تصویریں، اُس کے ذاتی کاغذات، ملازمت کے دنوں کی فوٹو گراف، قلم، پینٹنگز، ایشلے کی شاعری کے کچھ مسودات، بے شمار کتابیں اور اِسی طرح کی یادگاریں تھیں۔ چیزوں کو دیکھتے ہوئے ولیم کے ہاتھ میں ایک ایسا کاغذ لگا، جو اُس کی اپنی ہینڈ رائیٹنگ میں تھا۔ وہ ایشلے کی ایک نظم تھی، جو اُسے بہت پسند تھی۔ ولیم نے اپنے ہاتھ سے اُسے لکھ لیا تھا۔ نظم دیکھ کر ولیم کو ایشلے کی شدت سے یاد آنے لگی، جس کے مرنے کی اطلاع اُسے دس سال پہلے مل چکی تھی۔ وہ اُس کے مرنے کی خبر سُن کر اُس وقت بھی بہت افسردہ ہوا تھا اور بہت دنوں تک اپنے حواس میں نہ رہا تھا۔ جب کاغذات سے وہ نظم سامنے آئی تو ولیم کی آنکھوں میں پھر آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ وہ نظم لے کر اُسی بیڈ پر لیٹ گیا اور اُسے اپنے سینے پر رکھ کر آہستہ آہستہ نظم کو پڑھنے لگا اور گزری ہوئی ساعتیں یاد کر کے رونے لگا۔

نظم

کیا تم ایسی دھوپ دیکھنا چاہو گے

جو چمکتی ہے جلاتی نہیں

نہ اس کی روشنی میں آنکھیں چندھیاتی ہیں

نہ سفید عورتیں عرق آلود ہوتی ہیں

وہ دھوپ نومبر کی خاموش وادی میں ہے

نومبر کی دھوپ کو دیکھ سکتے ہو

نرم لباس کی طرح محسوس کر سکتے ہو

اُس میں تلخی نہیں

موت کے نزدیک لے جانے والی اُداسی ہے

اُداسی کو تم چھو نہیں سکتے

نہ فریب دے سکتے ہو

نہ اس سے بھاگ سکتے ہو

یہ ہجوم میں تنہا کر دیتی ہے

کیا پچھلے برس کا نومبر اُداس نہیں تھا؟

نومبر ہمیشہ اُداس ہوتا ہے

رُکا ہوا، مطمئن اور بے نیاز

اِس کی وادی میں صبح ہوتی ہے، دوپہر، سہ پہر

پھر شام آجاتی ہے

مگر دھوپ کا مزاج نہیں بدلتا

آسمان کی طرح پُر وقار بزرگی والا

زندگی نومبر کی طرح نہیں

زندگی بدلتی ہے، متواتر بدلتی ہے

وہ تجھے نومبر میں نہیں رہنے دے گی

دھوپ غبار آلود ہو جائے گی

صاف نظر آنے والی چیزیں دُھندلا جائیں گی

پھر سیاہ ہو جائیں گی

پھر اندھیرا اکھا جائے گا

اُس وقت، جب میں نہیں ہوں گا

دوست کوشش کرنا، نومبر نہ گزرے

مگر یہ وہ کوشش ہے جس کا حاصل خسارا ہے

ولیم بار بار نظم پڑھتا رہا اور پرانے بیڈ کے بوسیدہ مگر صاف بستر پر لیٹا آنسوؤں کی بارش روکنے کی کوشش کرتا رہا۔

اسی حالت میں وہ سو گیا۔

جاری ہے

قسط نمبر 32

(54)

اوکاڑہ تحصیل میں نئے اسسٹنٹ کمشنر کے آتے ہی کمپلیکس میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ یہ شہر منٹگمری کی سب سے بڑی تحصیل تھی، جو ایک طرف ہیڈ سلیمان کی تک پھیلی تھی، تو دوسری طرف اِس کا رقبہ قادر آباد تک تھا۔ جبکہ شمال میں دریائے راوی تک چلی جاتی تھی۔ جتنا زیادہ اِس کا رقبہ تھا، اُسی قدر آبادی اور زرعی لحاظ سے پنجاب کی تمام تحصیلوں کی نسبت خوشحال بھی تھا۔ ہر طرف بہتی نہریں اور چلتے پانیوں میں لہلہاتی فصلیں بہار آباد کا منظر پیش کرتی تھیں۔ شہر کی حالت بھی اس کے مضافات کی طرح اپنی مثال آپ تھی۔ پورا شہر ایک منصوبہ بندی کے تحت تشکیل دیا گیا تھا۔ ایسا نہیں کہ جس نے جہاں چاہا اپنا جھونپڑا کھڑا کر لیا بلکہ بڑی اور کھلی سڑکیں بچھا کر اُن کے درمیان ترتیب کے ساتھ بلاک بنائے گئے تھے۔ شہر کے درمیان ایک بڑا گول چوک تھا۔ جس کے چاروں طرف پیپلیوں کے درخت لگا کر سائے کا انتظام کیا گیا۔ اِسی طرح پورے شہر میں بھی سڑکوں کے دونوں جانب ہزاروں
درخت، پیپل، برگد، نیم، شیشم اور جامنوں کے لگائے تھے۔ اِن کے علاوہ کمپنی باغ، پہلوانوں کا باغ، سائیں گھوڑے شاہ کا تکیہ، اور تلج ہائی سکول کے باغات بھی اپنی مثال آپ تھے۔ اِن باغات اور پارکوں کے علاوہ شہر کے
درمیان، شمال اور مضافات میں بہنے والی نہریں اور نہروں کے کناروں پر بے شمار درختوں نے اِس کے حسن کو مزید دوچند کر دیا تھا۔ شہر کی سڑکوں پر اِتنا سایہ تھا کہ اُن میں سے ایک سڑک کا نام ہی ٹھنڈی سڑک رکھ دیا گیا۔ اِسی طرح تحصیل کمپلیکس بھی درختوں کی چھاؤں میں ایسے ڈھانپا جا چکا تھا کہ دھوپ کا نام و نشان نہیں تھا۔ بلکہ لوگوں کو سردی میں بہت تنگی ہوتی تھی۔ سردیوں کے دنوں میں آنے والے سائلین کو دھوپ میں بیٹھنے کو جگہ نہ ملتی۔ اگرچہ اِس شہر کی بہت سی چیزیں پاکستان بننے کے بعد برباد ہو چکی تھیں اور شہر کی آب و تاب ویسی نہ رہی تھی، جیسی برٹش دور میں تھی۔ پھر بھی ہاتھی لٹے گا بھی تو کہاں تک۔ کالج، کئی سکول، ہاسپیٹلز، ڈاکخانے، تار گھر، بلدیہ کمیٹی، پریس کلب، ہوٹلز اور دیگر سرکاری اور غیر سرکاری بہت سے دفتر اب بھی انگریزی دور کی طرح فعال تھے۔ البتہ
نہروں، سڑکوں اور پارکوں کے بہت سے درخت کٹ چکے تھے۔ اس کے باوجود بڑے پیمانے پر اب بھی موجود تھے۔ شہر کی اِنہی خوبیوں کی بنا پر کئی افسروں کی بڑی حد تک خواہش رہتی کہ اُس کا تبادلہ اِس شہر میں ہو جائے اور اب

یہ قرعہ مسٹر نواز الحق کے نام نکل آیا تھا۔

نواز الحق صاحب پینتیس سال کا ایک نوجوان، پتلے خد و خال کا اسسٹنٹ کمشنر تھا، جو اول اول نائب تحصیل دار بھرتی ہوا لیکن بہت جلد تحصیل دار، پھر وہاں سے اسسٹنٹ کمشنر بن گیا۔ جس کی شاید خود تو خواہش اوکاڑہ میں تعیناتی کی نہیں تھی لیکن یہ اُن افسروں میں تھا، جنہیں جہاں بھیج دیا جائے، وہ اپنی نوکری کو بلند زینوں تک لے جانے کے لیے وقت کو سمیٹ لیتے ہیں۔ ملک کے ننانوے فی صد افسروں کی یہی کیفیت تھی۔ اُنہیں اِس سے کوئی غرض نہیں ہوتی، کہاں جا کر کیا کام کرنا ضروری ہیں؟ یا فلاں علاقے میں کون سے کام ترجیحاتی بنیادوں پر کرنے چاہییں؟ یا کام کرنا بھی چاہیے کہ نہیں؟ وہ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ یہاں کون سے ذرائع ہو سکتے ہیں، جن کو استعمال کرنے سے اُس کی اپنی ترقی ہو۔ نواز الحق صاحب ویسے بھی اب ان کاموں کے سلسلے میں ایک مکمل افسر تھے۔ یہی نہیں، چلنے اور بیٹھنے اُٹھنے میں طمطراق افسروں کا ہی تھا بلکہ اُن سے بھی قدم بھر آگے تھے۔ مشکل ہی سے کسی کے ساتھ سلام کو ہاتھ آگے بڑھاتے۔

جو لوگ پہلے ہی باخبر تھے کہ مسٹر نواز الحق تحصیل میں نئے اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے آ رہے ہیں، وہ اُسی دن سے مٹھائی کے ڈبے اور مختلف تحائف کے ساتھ اُن کے گھر پہنچ گئے تھے۔ اُن کا مقصد صرف تحائف دینا یا اپنی اے سی آر بہتر لکھوانا ہی نہیں تھا، بلکہ اُنھوں نے صاحب پر یہ بات پوری طرح واضح کر دی تھی کہ اُنہیں صرف اور صرف صاحب کی عزت اور ترقی عزیز ہے، جس کے لیے وہ خود اپنا مستقبل قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اِس مختصر سی ملاقات میں فرداً فرداً صاحب کو اِس بات سے آگاہ کرنا بھی نہیں بھولے تھے کہ فلاں شخص بڑا مغرور ہے، آپ کو سلام بھی نہیں کرنے آئے گا، فلاں چغل خور ہے، اُسے کبھی اپنے راز نہ بتاییے گا۔ کیونکہ وہ بڑے افسروں کا مخبر ہے۔ فلاں شخص کو تو نزدیک بھی نہ آنے دیجیے، وہ بالکل بھی بھروسے کے قابل نہیں۔ آپ کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ بھی کر سکتا ہے۔ اُس کو منہ لگانے کی ضرورت ہی نہیں۔ بلکہ ہو سکے، تو آپ اُسے دور دراز کے قصبے میں پھینک دیں۔ کام کرنے کے لیے ہم آپ کے پاس موجود ہیں۔ اِس کے علاوہ اُنھوں نے اسسٹنٹ کمشنر کو اِس بات سے بھی باخبر کرنا ضروری سمجھا کہ فلاں فلاں جگہ کی الاٹمنٹ ابھی ہونا باقی ہے۔ آپ وہ اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور سسرال والوں کے لیے آسانی سے الاٹ کروا سکتے ہیں۔ اور جو زمین نہر کے ساتھ چک تمبو یا کلیانہ اسٹیٹ میں پڑی ہے، اُسے آپ کو اپنے نام کروانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ آپ تحصیل کے مالک ہیں، اِس لیے ویسے بھی یہ آپ کا اپنا حق بنتا ہے۔

اب وہ اپنی کرسی پر بیٹھے تو نئی تقرریوں اور تبدیلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور نواز الحق صاحب نے واقعی اُن تمام خیر خواہوں کے تحائف اور وعدوں کا پاس رکھتے ہوئے اُن کو اپنے ارد گرد اکٹھا کر کے ایک حصار قائم کر لیا۔ اُن میں سب سے پیش پیش مولوی حبیب اللہ صاحب تھے، جو اُن کے بقول نواز الحق صاحب کے خاندان کے پرانے معتقد تھے۔ اُنھوں نے صاحب کو یہ تک بتا دیا تھا کہ نواز صاحب کے دادا مولانا کرامت علی خان سے اُن کے باپ اور نواز صاحب کے باپ محکمہ مال کے کارمدار مولانا جناب فضل دین خاں سے خود اُن کے قریبی مراسم رہے ہیں۔ بلکہ وہ اُن کے ہاتھ پر بیعت بھی رہا ہے۔ اِس طرح اُس کے خاندان کی پشتوں سے اُن کے اوپر نوازشات رہی ہیں اور یہ کہ حبیب اللہ کا خاندان ہمیشہ سے نواز صاحب کے خاندان کا نمک خوار رہا ہے اور اُن کی صاحب بہادری کا اول دن سے ہی گواہ اور قصیدہ خواں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نواز صاحب نے سب سے پہلے مولوی حبیب اللہ کو اپنا پی اے بنا کر، خاص اُنہی لوگوں کی لسٹ تیار کروائی۔ جنھوں نے اُسے تقرری کی خبر سنتے ہی پل پل کی خبریں دیں اور بُرے بھلے سے خبردار کیا۔ یہ تمام لوگ ویسے بھی اپنے کام میں ماہر، پڑھے لکھے اور تجربہ کار تھے اور تحصیل کے کام کو چلانے میں اُس کے لیے مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ تمام لوگوں کو اُن کی خواہش کے مطابق متعلقہ جگہوں پر تعنیات کرنے کے بعد مولوی حبیب اللہ کو سب کام سونپ دیے۔ یہ انتخاب اُن کی ذہانت کی سراسر دلیل تھا۔ مولوی حبیب اللہ ایک تو باریش اور صوم وصلوات کے پابند تھے۔ حج بھی تین تین کیے تھے اور شریعت کی حدود قیود میں رہتے ہوئے ہر کام انجام دینے کے ماہر بھی تھے۔ مجال ہے، اُن کی فائل پر کوئی اعتراض کرے یا انگلی رکھے۔ ہر چند ہر ایک بکواس کرتا تھا کہ مولوی صاحب پرلے درجے کے بے ایمان اور چاپلوس شخص ہیں۔ لیکن نواز صاحب کو اُن میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی تھی۔ بلکہ وہ اِن کاموں سے ہٹ کر نواز صاحب کے خاندان کی دیرینہ شان و شوکت کا بھی گواہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سب اُس کے کام اور تجربے سے حسد کرتے تھے۔ اور یہ بات اُسی وقت مولوی حبیب اللہ نے نواز صاحب کو بتا دی تھی۔ اگر اُن میں ایسی ویسی کوئی بات ہوتی تو پہلے آنے والے اسسٹنٹ کمشنروں میں کوئی تو اُس کے خلاف لکھتا۔ اِس کے برعکس ہر ایک نے اُس کی اے سی آر کو مثالی قرار دیا تھا اور وہ ایک تیسرے درجے کے کلرک سے اتنی جلدی پندھرویں سکیل میں آ گیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ ان مولوی صاحب کے ہوتے ہوئے نواز صاحب کے پروٹوکول میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ نہیں کہ ہرا یرا غیرا منہ اُٹھائے اُن کے کمرے میں جب چاہے، گھسا چلا آئے۔ حبیب اللہ نے عوام تو ایک طرف، تمام تحصیل افسروں کو بھی اس بات کا پابند بنا دیا تھا کہ وہ جب تک کمشنر

صاحب سے ایک یا دو دن پہلے وقت نہ لیں، اُس وقت تک ملاقات نہیں ہو سکتی۔ رہا سائل، تو اُس کو صاحب سے ملنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اُسے جو کام ہے، اُس کے لیے وہ اپنے متعلقہ افسر سے رجوع کرے۔ اسسٹنٹ کمشنر اسسٹنٹ کمشنر ہوتا ہے۔ وہ کوئی پٹواری تھوڑا ہوتا ہے، جو وارابندیوں کا رجسٹر کھول کے بیٹھ جائے۔ اِن معاملات سے یہ ہوا کہ ایک تو نواز صاحب سے کام کا بوجھ کم ہو گیا۔ دوسرا اُسے اپنے نجی کام اور سیر و شکار کا وقت بھی مل گیا اور دفتر قریب قریب مولوی حبیب اللہ نے سنبھال لیا۔ لیکن ایسا نہیں کہ وہ کام اپنی مرضی سے انجام دینے لگا تھا۔ فائلوں پر دستخط لیتے وقت صاحب کو ہر فائل کے متعلق پوری بریفنگ دیتا کہ کوئی بات صاحب سے پوشیدہ نہ رہے۔ اِس طرح چار پانچ مہینے میں ہر کام اپنے آپ ہی سیدھا ہو گیا اور کسی کو شکایت کی گنجائش نہ مل سکی۔ یہ اُس کی انتظامی صلاحیتوں کی دلیل تھی۔ اِس کے علاوہ اوکاڑہ تحصیل کے تمام بڑے زمین داروں اور قوم قبیلے کے معتبروں، جو سیاست میں بھی مقام رکھتے تھے، اُن سب سے مولوی حبیب اللہ نے صاحب کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ یہی وہ لوگ تھے، جو کسی بھی افسر کی مزید ترقی میں باوقار سیڑھی کا کام دے سکتے تھے۔ مولوی صاحب نے اِن تمام زمینداروں سے اُن کی حیثیت کے مطابق صاحب کی دوستی کروادی تھی۔ بعض زمینداروں کو ناجائز طور پر بہت کچھ دینا پڑا لیکن یہ ایسا سودا تھا، جس میں گھاٹا کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ خرچ تو عوام کا ہوتا ہے اور فائدہ افسر اور سیاستدان کا۔ اِس لیے نواز صاحب نے جو کچھ بھی اُن کو دیا تھا، وہ احسان کے ساتھ ساتھ نقصان کے بغیر تھا۔

اوکاڑہ تحصیل کمپلیکس لائلپور روڈ پر واقع تھا، جس کے ارد گرد سرکاری افسروں کے مکانات، کلرکوں کے کوارٹر اور ججوں کی چھوٹے لان والی کوٹھیاں تھیں۔ اسسٹنٹ کمشنر کی کوٹھی بھی کافی اچھی تھی لیکن ججز کی کوٹھیاں اُن سے بہر حال بہتر تھیں۔ یہ تمام عمارتیں انگریزی دور کی اور نہایت آرام دہ تھیں۔ جن کے ارد گرد برگد، پیپل، شیشم اور دوسری قسم کے بے شمار درخت اِس طرح سایہ کیے رہتے کہ گرمی کے دنوں میں دھوپ کی ایک رمق بھی اُن پر نہیں پڑتی تھی۔ ڈسٹرکٹ کمپلیکس کے عین سامنے ستلج ہائی سکول اور اُس کے ساتھ ہی ایک وسیع و عریض تھان کے سلسلے سے بندھا ہوا اصطبل تھا، جو انگریزی دور کی طرح آباد تو نہ تھا، لیکن ابھی بھی اُس میں کئی عمدہ نسل کے گھوڑے اور خچر موجود تھے، جو افسروں کے بھی کام آتے۔ یہ اِس لیے بھی خالی ہو چلا تھا کہ ڈپٹی کمشنر اور اسسٹنٹ کمشنرز، جو گھوڑوں کے شوقین ہوتے، وہ اصطبل کے عملے سے مل ملا کر کسی اچھے سے گھوڑے کو ناکارہ لکھوا کر سستے داموں

مول لے لیتے۔ اِسی طرح گوگیرہ میں موجوداوکاڑہ مویشی فارم میں عمدہ قسم کی گائیں اور بھینسیں بھی انتہائی سستی ہتھیا نے لگے تھے، جوانگریزی دور میں انگریز ڈپٹی کمشنر بھی آسانی سے حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ نہروں پر جگہ جگہ ڈاک بنگلوں کو ناکارہ سمجھ کر موسموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ شائد اُن کی ضلعی یا تحصیل انتظامیہ کو ضرورت نہیں تھی، کیونکہ نہری افسروں کو شہروں سے باہر نکل کر رہنا گوارا نہیں تھا۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب کی کوٹھی بھی ٹھنڈی سڑک پر آفیسر کالونی میں سب سے نمایاں تھی َجہاں اب زیادہ تر بڑے زمینداروں کا آنا جانا تھا۔ اُنہی کے ساتھ وہ اکثر سیر کو نکل جاتے۔ اِن سیاستدانوں میں نواز صاحب کے ایک دوست شمس الحق گیلانی تھے۔ یہ شاہ صاحب حجرہ شاہ مقیم کے ایک رئیس خاندان کے فرد تھے۔ یہ وہ خاندان تھا، جس کا ملک کی سیاست میں بڑا اہم کردار تھااور علاقے میں اُن کی طاقت کا لوہاسب مانتے تھے۔ بڑی زمینداری کے علاوہ اِن کے لاکھوں مرید پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے، جو پیر صاحب کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار رہتے۔ نواز صاحب اِن کی بہت عزت کرتے تھے اور اُنھوں نے ہدایت کی تھی کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں، شمس صاحب کا کوئی بھی پیغام آئے تو اُنہیں ضرور خبر دار کیا جائے۔ ویسے بھی اِن نزاکتوں کو مولوی حبیب اللہ خوب سمجھتا تھا۔ بلکہ اِن چیزوں کے بارے میں اُسے نواز صاحب سے بھی زیادہ درک تھا۔

آج نواز صاحب اپنے دفتر میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ حبیب اللہ نے اطلاع دی، شمس صاحب تشریف لائے ہیں۔ نواز صاحب نے اُنہیں فوراً اندر بلایا اور دفتر سے منسلک ملاقات کے کمرے میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی گپ شپ کے بعد شمس الحق گیلانی نے اپنے مطلب کی طرف آتے ہوئے بات کا آغاز کیا، نواز صاحب آپ ہمارے لیے ایک کام کر دیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔

شاہ صاحب اگرمَیں آپ کے کسی کام آنے کا ہوا تو یہ میری خوش نصیبی کی بات ہے۔ آپ ہی تو ہماری دنیا اور آخرت ہیں۔ کام بتایے؟

شمس صاحب نے اپنا سگریٹ ایش ٹرے کے کونے میں پھنسایا اور دیوار پر لگی سامنے قائدِ اعظم کی تصویر پر نظریں جماتے ہوئے بولے، نواز صاحب، پاکستان میں حکومت یا تو فوج کی ہے یا سرکاری افسروں کی۔ اِس لیے کام تو آپ کر سکتے ہیں، پھر یہ کوئی ناجائز کام بھی نہیں ہے۔

شمس صاحب آپ بجھارتیں کیوں بجھواتے ہیں۔ میری دسترس سے باہر بھی ہوا تو آپ کی خاطر کر کے ہی دم لیں گے۔ چاہے مجھے چیف سیکرٹری صاحب کے پاؤں پکڑنے پڑے۔

کمشنر صاحب، آپ کے اِس بڑی نہر کے دوسری طرف ایک نولکھی کوٹھی خالی پڑی ہے، جس کے ساتھ کچھ زمین بھی ہے۔ اِس اسٹیٹ کی اکثر زمین تو فوجیوں کو الاٹ ہو چکی ہے۔ لیکن کوٹھی ابھی تک کسی کو الاٹ نہیں ہوئی۔ آپ کسی طرح سے اُسے میرے نام کروا دیں۔ جو خرچہ ہوا، مَیں دینے کو تیار ہوں۔

نواز الحق کچھ دیر خموش بیٹھا سوچتا رہا پھر بولا، پیر صاحب، اُس کوٹھی میں ایسی کون سی بات ہے؟ بہر حال وہ خالی ہے تو آپ فکر نہ کریں، مَیں اُسے آپ کے نام کروا دیتا ہوں۔ مَیں نے کوئی زیادہ اُس کے متعلق تحقیق تو نہیں کی لیکن سنا ہے، بہت بڑی کوٹھی ہے۔ میرا خیال ہے، اب کافی پُرانی ہو چکی ہے۔ شاید آپ کے لیے بے کار ہو۔

نواز صاحب، وہاں ایک بڈھا انگریز رہتا ہے۔ یہ کوٹھی اُسی کے باپ دادا نے وکٹوریہ دور میں بنوائی تھی، شمس الحق نے وضاحت کی، یہ واپس نہیں گیا۔ آج بھی اپنے آپ کو کمشنر سمجھتا ہے۔

آپ کہیں گے تو اُسے اُٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں اور آپ وہاں اپنا بندوبست کر لیں۔ مگر آپ لاہور کو چھوڑ کر وہاں اتنی پرانی کوٹھی میں کیوں رہیں گے؟

شمس الحق نے دوبارہ سگریٹ سُلگایا اور بولا، نواز صاحب، آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ہمیں سیاست کرنی ہوتی ہے۔ وہ رہنے کے لیے تھوڑی الاٹ کروانی ہے؟ وہاں ہمارے مال مویشی ہوں گے یا کچھ نوکر رہیں گے۔ کبھی کبھی ہم بھی وہاں آجایا کریں گے۔ اِس طرح علاقے میں وجود برقرار رہتا ہے۔ پھر اِن پرانی کوٹھیوں اور بنگلوں کی اپنی ایک دہشت اور اہمیت ہوتی ہے۔ آپ اِن باتوں کو چھوڑیں، ہمارا کام کریں بس۔

نواز الحق نے گرم جوشی سے اِس کام کی حامی بھرتے ہوئے انٹر کام پر حبیب اللہ کو طلب کیا۔ جب وہ کمرے میں کاغذ قلم لے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا، تو نواز صاحب نے بڑی محبت سے کہا، مولوی صاحب ستگھرہ روڈ پر ایک نولکھی کوٹھی ہے۔ آپ ذرا اُس کی تمام معلومات جمع کیجیے۔ وہ ہم نے پیر صاحب کے نام الاٹ کروانی ہے۔ شائد اِس میں ہماری آخرت کا ہی کچھ بھلا ہو جائے۔

سر، میں ابھی تمام ریکارڈ منگوالیتا ہوں (پیر شمس الحق صاحب کی طرف منہ کر کے حبیب اللہ انتہائی چاپلوسی سے) پیر صاحب، ویسے وہ کوٹھی آپ ہی کے لائق ہے۔ وہاں ایک بُڈھے انگریز کی وجہ سے نحوست پھیلی ہوئی ہے۔ پتا نہیں ابھی تک یہاں کیا کرتا پھر رہا ہے؟ (ہنستے ہوئے) بھلا بندہ پوچھے، تم نے یہاں سے امب لینے ہیں، جو ابھی تک اٹکے ہوئے ہو؟ اور پورے علاقے میں اپنے ناپاک قدموں سے مٹی پلید کرتے پھرتے ہو۔ سر، مجھے اُدھر ایک دو دفعہ جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ مَیں نے وہاں جب تک رہا، نماز بھی نہیں پڑھی کہ نجانے کس جگہ اُس نے پیشاب کیا ہو۔ آپ جتنی جلدی ہو سکے، وہ کوٹھی اُس منحوس بڈھے سے خالی کروالیں۔ ہمارے شاہ صاحب کے قدم لگنے سے وہاں مٹی تو پاک ہو گی۔

حبیب اللہ کی بات سن کر دونوں ہنس پڑے۔ پھر نواز صاحب بولے، مولوی صاحب، آپ جس قدر جلد یہ کام مکمل کریں گے، ہم آپ کی خواہش اِتنی ہی جلدی پوری کر دیں گے۔ آپ ایک ہفتے کے اندر اِس کیس کی فائل تیار کر کے مجھ تک پہنچاؤ۔ ریوینیو بورڈ سے یہ فائل مَیں خود نکلوالوں گا۔ بس آپ اس پر کام کریں۔

نواز صاحب کی بات سن کر مولوی حبیب اللہ باہر نکل گیا۔ پھر وہ دونوں باتیں کرنے لگے اور یہ ملاقات اتنی لمبی ہو گئی کہ ایک بجے کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ اِس عرصے میں جتنے لوگوں سے نواز صاحب کی ملاقات کا وقت مقرر تھا، اُنہیں مولوی حبیب اللہ یہ کہ کر ٹالتا گیا کہ آج صاحب کی اندر بہت اہم میٹنگ چل رہی ہے۔ اِس لیے باہر انتظار کریں بلکہ بہتر یہ ہے کہ کل آجائیں۔

ایک بجے کا کھانا اسسٹنٹ کمشنر مسٹر نواز الحق کے ساتھ کھانے کے بعد سید شمس الحق گیلانی صاحب رخصت ہونے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کمشنر صاحب اُنہیں گاڑی تک باہر چھوڑنے آئے۔ گاڑی چلنے لگی تو نواز صاحب نے ہنستے ہوئے پیر صاحب سے کہا، سر اِس خادم کا بھی خیال رکھا کریں۔ آخر کب تک اسسٹنٹ کمشنری کرتا پھروں گا۔ آپ کی سلطنت میں کم از کم مجھے ڈپٹی کمشنر تو ہونا ہی چاہیے، ایک دفعہ بس ایک درجہ اور اُوپر لے جایے۔ پھر دیکھیے نوکر کس طرح اپنے شاہ صاحب کی خدمت کرتا ہے۔

شمس الحق نواز صاحب کی اِس بات پر مسکرا دیا۔ اُسے خوب علم تھا، اسسٹنٹ کمشنر نوازالحق نے اِس کام کے عوض اپنی ترقی کی سفارش کا معاوضہ طلب کیا ہے۔ شاہ صاحب کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اُس نے جواب میں کہا، نواز صاحب، آپ فکر نہ کریں والدین کو اپنی اولاد کی ضروریات کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔ بس اولاد فرمانبردار ہونی چاہیے۔ اِس کے بعد گیلانی صاحب کی گاڑی آہستہ سے آگے بڑھ گئی۔

جاری ہے

قسط نمبر 33

(۵۵)

دسمبر کا آغاز ہو چکا تھا۔ جاڑے نے دُھند اور کُہر کے پر پھیلا کر ہر شے اپنے حصار میں لے لی۔ خاص کر نہروں کے درمیانی خطے میں یہ کُہر اتنا زیادہ تھا کہ کبھی تمام دن نکل جاتا، مگر سورج کو ایک لمحے کے لیے بھی منہ دکھانے کو راستہ نہ ملتا۔ بس دُھند کے غبار تھے، جو اُتر رہے تھے اور چڑھ رہے تھے اور انسانوں کی آنکھیں گویا سائبیریا میں جا پہنچیں تھیں، جو سفید سایوں کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ ولیم ایسی حالت میں زیادہ سے زیادہ یہ کرتا کہ کمرے سے نکل کر کچھ دیر کے لیے کوٹھی کے صحن میں آجاتا، جو ایک ایکڑ تک پھیلا ہوا تھا۔ کبھی آموں کے باغ کا بھی ایک آدھ چکر لگا لیتا۔ یہ باغ اُسے اِتنی دھند میں نظر تو نہیں آتا لیکن محسوس ضرور ہوتا تھا۔ اِس کے علاوہ اُس کی آمد و رفت ہر جگہ بند ہو چکی تھی۔ آج دُھند تو موجود تھی لیکن اُس میں اتنی شدت نہیں تھی اور یہ پورے پندرہ دن بعد ہوا تھا۔ ولیم نے کمرے سے نکل کر دیکھا، سورج سر پر آچکا تھا اور مدھم دھوپ ٹھنڈی گھاس کو ہلکے ہلکے تھپتھپا رہی تھی۔ لیکن گھاس ابھی گیلی تھی۔ ولیم اپنی کرسی صحن میں لگا کر بیٹھ گیا اور اُس اندھی دھوپ کو غنیمت جان کر سینکنے لگا۔ کچھ عرصے سے اُس کے ہاتھ میں بید کی بجائے عصا آچکا تھا۔ اُس نے وہ عصا ایک طرف بینچ کے ساتھ لگا دیا۔ سر پر اُون کی ٹوپی جو اَب کافی میلی ہو چکی تھی، کے اُوپر چوڑے کناروں کا ہیٹ اچھی طرح سے جما لیا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کر ولیم نے، جہاں تک نظر جا سکتی تھی، اِس دُھندلائے ہوئے منظر کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کی نظر پہلے سے کہیں زیادہ کمزور تھی اور عینک کے شیشے بھی اِتنے پرانے ہو گئے تھے کہ اُن کو صاف کر کر کے گھسا دیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے واضح اور صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھر بھی اُسے بہت ساری چیزیں ویسی ہی نظر آ رہی تھی، جیسی اُس کے بچپن میں تھیں۔ کچھ بھی تو نہ بدلا تھا، وہی آموں کے باغ، وہی کوٹھی، وہی نہریں اور وہی دور تک آلو، مکئی اور کماد کے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ کوٹھی کے صحن کے ایک کنارے پر کھڑا پیپل کا درخت بھی ویسا ہی تر و تازہ تھا، آلوؤں کی فصلیں اور بیلیں سخت دُھند سے بہت حد تک سڑ گئی تھیں۔ مگر یہ واقعہ بھی ہر سال اُسی طرح سے ہوتا تھا۔ اگر پورے منظر میں کوئی شے بدلی تھی تو وہ خود ولیم تھا۔ وہ مسلسل اور مزید تیزی سے بدل رہا تھا۔ نہ صرف یہ کہ بدل رہا تھا، بلکہ جیسے جیسے وقت آگے بڑھ رہا تھا، وہ اپنی ذات سے بے نیاز بھی ہوتا جا رہا۔ حتیٰ کہ مقامی لوگوں کے ساتھ بات چیت اور قصہ خوانی کی محفلیں بھی ایک عرصہ ہوا چھوڑ دیں تھیں۔ اِس حالت میں تمام نوکر بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے

تھے۔ شاید اُنھوں نے اندازہ لگا لیا تھا، ولیم کی نقد پونجی اب اِس قابل نہیں رہ گئی کہ اُس پر مزید بوجھ ڈالا جائے۔ کیونکہ ذرائع آمدن تو کبھی کے ختم ہو چکے تھے۔ جب ذرائع نہ رہیں، تو دولت کے کنویں بھی ساتھ نہیں دیتے۔ یہی وجہ تھی، اُس کوٹھی کے صحن میں بڑی بڑی گھاس اور کمروں میں چیزیں گرد سے اٹی جا رہی تھیں، جن کو صاف کرنے والا شاید اب کبھی نہیں آنا تھا۔ اِن چیزوں کے علاوہ ولیم نے بولنا اور بات کرنا بھی کم کر دیا۔ پچھلے چھ مہینے سے مسلسل خاموشی نے اُسے اپنی ذات میں اِتنا داخل کر دیا کہ سب کی پروا کرنا چھوڑ دی۔ حتیٰ کہ اپنے جسم کی خارجی ہیئت کو بھی نظر انداز کر دیا۔ کئی کئی دن کپڑے نہ بدلتا۔ کئی کپڑے تو اب پانچ پانچ سال پُرانے ہو گئے تھے۔ یہ پرانے کپڑے پہلے دھوبی کے ہاں سے باقاعدہ دُھل کے آتے تھے مگر اب یہ تکلف بھی جاتا رہا تھا اور وہی میلے کچیلے کپڑے پہن کر ادھر اُدھر پھرتا رہتا۔ کبھی تو سارا سارا دن باہر ہی گزار دیتا اور آدھی رات کے وقت جا کر کوٹھی میں داخل ہوتا۔

اوکاڑہ شہر میں، رینالہ شہر اور اسی طرح دوسرے چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں پھرتا رہتا۔ ولیم کی اِس آوارہ گردی سے اِن علاقوں کا قریب قریب ہر شخص جان گیا تھا کہ یہ کون ہے۔ اِسی آوارگی میں ولیم کے کئی دوست بھی بن چکے تھے، جو اُسے چائے پلا دیتے، اگر رات رہنے کی کہیں ضرورت ہوتی، تو وہ چارپائی اور کھانے کا بندوبست بھی کر دیتے۔ اگر دور نکل جاتا تو وہ کئی دن کوٹھی پر واپس نہ آتا۔ مگر یہ باتیں گرمیوں کی تھیں۔ سردیوں میں عمر کے اِس حصے میں وہ یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے پچھلے ایک مہینے سے کلیانہ اسٹیٹ اور شہر سے باہر نہ نکلا کیونکہ بڑھاپا، نزلے، بخار اور دوسری چھوٹی موٹی بیماریوں کے ذریعے اپنے اثرات بھی دکھانے لگا تھا۔ پچھلی سردیوں کی بات ہے نمونیے سے مرتے مرتے بچا تھا۔ ناشتا اور کھانا اکثر اوقات ولیم کے ایک پُرانے نوکر کے ہاں سے پک کر آ جاتا، جو اَب اُس کا نوکر تو نہ رہا تھا لیکن مروت کا پُرانا رشتہ ابھی بھی قائم تھا اور ولیم کی کوٹھی کے پچھواڑے ہی میں رہتا تھا۔ اُس نے کر کرا کے اپنی تین ایکڑ زمین بنا لی تھی اور کچھ زمین بریگیڈئیر صاحب کے منشی سے راہکی پر لے کر کاشت کرتا تھا۔ وہ اُس میں سبزیاں وغیرہ اُگاتا، پھر اُنھیں شہر میں بیچ کر گھر کا گزارہ چلا رہا تھا۔

ولیم کُرسی پر کافی دیر اُسی طرح بیٹھا، اِس نکمّی دھوپ میں اپنے آپ کو ٹھٹھراتا رہا کیونکہ مسلسل کمروں میں بند رہنے سے اُسے آج گھبراہٹ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر دو چار قدم تک چہل قدمی بھی کر لیتا۔ ولیم کو اس حالت میں دو گھنٹے ہو گئے۔ حتیٰ کہ سورج پھر دُھند کی دبیز تہوں میں دب گیا اور اندھیر سا چھا گیا۔ اب ولیم اُٹھ کر کوٹھی کے

پچھواڑے فارم کی طرف چلا گیا، جو کبھی اُس کا اپنا تھا۔ اب اُس کا مالک ایک ریٹائرڈ بریگیڈیئر تھا، جو خود تو وہاں نہ رہتا تھا۔ لیکن اُس کے مزارعوں کے گھر موجود تھے۔ اُن کے ولیم کے ساتھ اچھے مراسم بھی تھے، جن میں اُس کا وہی پُرانا ملازم بھی تھا۔ ولیم کو دیکھ کر ایک لڑکا بھاگ کر آگے بڑھا اور لکڑیاں اکٹھی کر کے آگ جلانے لگا۔ دوسرے آدمی نے ایک چار پائی اُٹھا کر اُس آگ کے پاس رکھ دی۔ جب آگ کا الاؤ روشن ہو گیا تو ولیم چار پائی پر بیٹھ گیا اور جلتی ہوئی آگ سے ہاتھ تاپنے لگا۔ چند لمحوں بعد وہی آدمی چائے اور روٹی اور روکھا سوکھا سالن، جو آلوؤں کی بُھجیا پر مشتمل تھا، لے کر آ گیا۔ ولیم نے عین پنجابیوں کی طرح چار پائی پر چوکڑی مار کر کھانا شروع کر دیا۔ اِس طرح کھانا کھلانے یا چائے پلانے میں اب مقامی لوگوں کے اندر لالچ کا کوئی مادہ نہیں تھا اور نہ کوئی احسان کا جذبہ کارفرما تھا۔ بلکہ یہ ایسی خدمت تھی، جس کا معاوضہ صرف شکریے پر ختم ہو جاتا، جو ولیم نے کبھی زبانی نہیں کیا تھا۔ شاید دل میں اُس کی گواہی موجود ہو۔ بعض اوقات ولیم کے لیے کئی گھروں سے اکٹھا چائے اور کھانا آجاتا، جسے وہ کبھی واپس نہ کرتا اور اُس وقت کے لیے ذخیرہ کر رکھتا جب کہیں سے نہ آتا۔ کیونکہ اِس طرح کے مواقع اکثر پیش آجاتے تھے۔ جب ہفتہ ہفتہ کسی کے گھر سے کچھ نہ آتا۔ کھانا کھا کر اور چائے پی کر ولیم بہت دیر تک وہیں بیٹھا آگ تاپتا رہا۔ اُسے یہ آگ اِتنا سکون دے رہی تھی، جیسے ولیم کی زندگی کی آخری اور پہلی خواہش یہی تھی، جو پوری ہو گئی تھی۔ پاس تین چار آدمی اور بھی بیٹھے آگ جلاتے رہے اور تاپتے رہے۔ اِس دوران وہ بہت سی باتیں فصلوں کے متعلق، اپنے کام کے متعلق، اپنی رشتہ داریوں کے متعلق، کچھ جگ بیتی غرض بہت کچھ کہتے رہے، جنہیں ولیم سنتا تو رہا لیکن بولا ایک لفظ بھی نہیں۔ ولیم کو اِن بے معنی اور معصوم باتوں کے سننے کی عادت سی ہو گئی تھی، جن کا نہ اُسے کچھ فائدہ تھا اور نہ نقصان۔ ہاں اِن باتوں کے ذریعے سے اُن لوگوں کے گھریلو جھگڑے، شادی، غمی اور معاشی حالات سے بخوبی واقف ہو گیا تھا۔ ولیم کو اِسی حالت میں رات کے دس بج گئے اور وہ اُٹھ کر کوٹھی میں چلا گیا۔

اگلے دن ولیم ابھی اپنے بستر میں ہی تھا کہ باہر سے کچھ شور شرابے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں بالکل قریب کوٹھی کے صحن سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ولیم حیران تھا کہ یہ کیا ہے؟ رات جب وہ بستر پر گیا تھا، تو کوٹھی کے صحن کے سب دروازوں کو اُس نے اپنے ہاتھوں سے تالے لگائے تھے۔ پھر صبح سویرے صحن میں یہ کیا ہڑبونگ مچ رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے اپنی چھڑی پکڑی، سر پر اُونی ٹوپی جمائی اور بغیر چادر اوڑھے صحن میں آگیا۔ دیکھا تو کئی آدمی ایک ٹریکٹر ٹرالی سے نیچے اُتر کر صحن میں گھوم رہے تھے۔ ارد گرد سے کوٹھی کا جائزہ لے رہے تھے اور شور شرابہ

کر رہے تھے۔ پولیس کی ایک گاڑی میں چھ سات سپاہی بھی آئے تھے۔ ان کے علاوہ ایک دو کاریں تھیں لیکن اب تمام لوگ گاڑیوں سے باہر نکل کر صحن میں آگئے تھے۔ ولیم نزدیک پہنچا تو ایک شخص آہستہ رفتار سے آگے ہو کر اُس کی طرف بڑھا اور ایک فائل ولیم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا، ولیم صاحب، میں یہاں کا علاقہ مجسٹریٹ ہوں، آپ اِن کاغذات پر دستخط کر دیں کہ یہ کوٹھی آپ ابھی خالی کر رہے ہیں۔ گورنمنٹ پنجاب نے یہ کوٹھی جناب سید شمس الحق گیلانی کے نام الاٹ کر دی ہے۔ آپ اپنا جو کچھ سامان اُٹھا کر لے جانا چاہتے ہیں، اُس کی اجازت ہے۔

اُس شخص کے یہ الفاظ سن کر ولیم کے اوسان گویا بالکل جاتے رہے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ جیسے کسی نے سر پر ایک زور دار ضرب لگائی ہو۔ اگرچہ اِن پہلے جملوں کے بعد بھی اُس نے ولیم کو دو چار باتیں کیں لیکن وہ اُس نے بالکل نہیں سنیں، بس مجسٹریٹ کے ہونٹ ہلتے دکھائی دے رہے تھے۔ ولیم پر یہ سکتہ کچھ ہی لمحوں تک جاری رہا۔ وہ فوراً اُس کیفیت میں داخل ہو گیا، جہاں ہر چیز نہ چاہتے ہوئے بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔

ولیم کے اوسان جب پہلے جھٹکے سے بحال ہوئے تو اُس نے مجسٹریٹ کی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا، کیا ایسا ہو سکتا ہے مجھے کچھ دِنوں کی مہلت دے دی جائے۔؟

سوری ولیم، وہ دوبارہ بولا، میری معلومات کے مطابق آپ کو تین بار اِس کے متعلق اطلاع دی جا چکی ہے۔ اِس لیے اب وقت نہیں۔

ولیم بخوبی سمجھ رہا تھا، یہ سراسر جھوٹ ہے۔ اُسے اس معاملے میں مکمل بے خبر رکھا گیا تھا۔ اگر اس وقت مجسٹریٹ تین مرتبہ کے نوٹس کی بات کر رہا تھا تو کاغذات میں یہ خانہ پُری ضرور کر لی گئی ہو گی۔ اِس لیے اب اُس سے مزید تکرار بھی فضول تھی۔ اِدھر سردی اور کُہر کے ساتھ ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ جس کی وجہ سے ولیم کا اِس حالت میں گرم چادر کے بغیر کھڑے رہنا خود کشی کے مترادف تھا۔ اُس نے جلدی سے ایک اور سوال کیا، میرا بہت سا سامان اِس وقت یہاں موجود ہے، جسے میں ابھی اُٹھانے سے قاصر ہوں۔ آپ اگر آج کا دن رُک جائیں یا فی الحال میرا سامان ان سردیوں تک یہیں پڑا رہنے دیں یا مجھے ایک بار شمس الحق سے ملاقات کر لینے دیں، پھر آپ جو کارروائی چاہیں، کریں۔

سردی کی شدت، ولیم کا بڑھاپا اور سب سے بڑھ کر بُردباری سے پیش کی گئی زبانی درخواست نے مجسٹریٹ کو انتہائی متاثر کیا۔ اُسے توقع تھی، ولیم اِس حکم کو سنتے ہی آپے سے باہر ہو جائے گا۔ چیخ و پکار کے ساتھ واویلا شروع کر دے گا اور دیواروں سے لپٹ جائے گا۔ اُنھیں گالیاں دے گا۔ پنجاب حکومت، بیوروکریسی، سیاست دان اور پاکستانی عوام کو بُرا بھلا کہے گا۔ جس کی وجہ سے وہاں دیر تک بدمزگی پیدا ہو گی۔ نتیجے میں اُسے زبردستی اُٹھا کر باہر پھینکنا پڑے گا۔ لیکن جب یہ سب کچھ نہ ہوا تو مجسٹریٹ نے سب لوگوں کو حکم دیا، وہ کچھ دیر کے لیے باہر چلے جائیں۔ سب نکل کر سڑک پر کھڑے ہو گئے تو مجسٹریٹ ولیم کو کاندھے سے پکڑ کر کوٹھی کے دالان کی طرف لے گیا۔ وہاں انتہائی بوسیدہ کرسیوں میں سے ایک پر ولیم کو بیٹھنے کے لیے کہا اور دوسری پر خود بیٹھ گیا۔ پھر کچھ لمحے خموشی سے گزر گئے۔ اِس کے بعد مجسٹریٹ بولا، ولیم صاحب ایک بات طے ہے، اب کوٹھی آپ کو چھوڑنا پڑے گی۔ اِس بارے میں دو رائے نہیں رہیں۔ رہا آپ کو وقت دینے کا معاملہ، وہ مَیں اپنی طرف سے آپ کی شرافت کی وجہ سے دو دن کا دے سکتا ہوں۔ اُس کے بعد مَیں بے بس ہوں۔ میرا مشورہ یہ ہے، اپنے سامان کو اُٹھا کر کسی دوسری جگہ ٹھکانے لگانے کی کوشش کریں۔ کوٹھی نہ آپ سے اب بچ سکے گی، نہ آپ اِس میں وقت ضائع کریں۔ ابھی آپ ٹھنڈے دل سے اپنے گرم بستر میں جائیں، کچھ دیر لیٹ کر یہ سوچیں، آپ کو کہاں منتقل ہونا ہے اور سامان کہاں رکھنا ہے؟ مَیں جا رہا ہوں اور جمعہ کے روز بارہ بجے آؤں گا۔ اِتنا کہہ کر مجسٹریٹ اُٹھ کھڑا ہوا اور جیسے ہی چلا، ولیم کی آواز سنائی دی، مسٹر سنیے۔

جی، مجسٹریٹ نے ولیم کی طرف دیکھ کر کہا۔

آپ دیکھ رہے ہیں، مَیں اتنا بوڑھا ہو گیا ہوں کہ اِس لکڑی کے بغیر چلنے میں میرے گھٹنے درد کرتے ہیں۔ کاندھے پر چادر پھیلانے کے لیے ہاتھ اُٹھاؤں تو بازوؤں کے سِرے کانپ اُٹھتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مَیں اس ملک میں اِتنا اجنبی ہوں کہ میری پُرسش کو اِس وقت ایک چیونٹی تک نہیں آئے گی۔ پھر آپ یہ پولیس کس لیے لائے تھے؟

مجسٹریٹ ولیم کے اِس چبھتے ہوئے سوال پر لرز کے رہ گیا۔ بڈھے نے کتنی کڑواہٹ کے ساتھ اُس کی توہین کی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا، وہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ وہ تھوڑا سا آگے بڑھا اور ولیم کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، ولیم آپ بہت معقول آدمی ہو۔ سول سروس میں رہے ہو۔ اگر میں آپ کے اس سوال کا جواب نہ بھی دوں تو مجھے معاف

کرنا۔ یہ کہہ مجسٹریٹ جلدی سے باہر نکل گیا۔ اُس کے بعد تمام گاڑیاں اور لوگ رخصت ہونے لگے۔ سب کے بعد ٹریکٹر سٹارٹ ہوا، جس کی آواز نے دور تک ولیم کا پیچھا کیا۔ آج پہلی بار اُس نے محسوس کیا، کٹریکٹر کی آواز انتہائی کرخت اور شور پیدا کرنے والی ہے۔ وہ حیران تھا، اِس سے پہلے اُسے اس مشینری کی آواز اتنی بیہودہ کیوں نہیں لگی؟

جاری ہے

قسط نمبر 34

(56)

اُس دن مَیں سکول سے بھاگ کر کمپنی باغ میں آگیا۔ یہ صرف میری بات نہیں تھی، جو لڑکا بھی سکول یا کالج سے بھاگتا، وہ یہیں آتا۔ اِس کی کئی وجوہات تھیں۔ اول یہ جگہ بالکل کالج اور اسکول کے سامنے پڑتی تھی۔ درخت اِتنے زیادہ اور گھنے تھے کہ اُن کی اوٹ سے آسمان کو دیکھنا کسی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اِن درختوں کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی ریل گاڑی کی پٹڑی تھی، جس پر صبح سے شام تک ایک ریل کچھوے کی چال چلتی رہتی اور بچوں اور بڑوں کو جھولے دیتی رہتی۔ اس کا ٹکٹ بہت ہی معمولی تھا، جو غریب سے غریب آدمی بھی برداشت کر سکتا تھا۔ ریل کا انجن کوئلوں سے چلتا تھا۔ یہ کوئلے اُس دور میں بہت سستے تھے۔ پارک انگریزی دور میں انگریز فیملی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اِس لیے اِس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں، جو کسی بھی یورپین پارک میں ہو سکتی ہیں۔ درخت روشیں، جھولے، خوبصورت پرندے اور جانور، غرض ہر چیز میں ایک ترتیب اور حسن تھا۔ بہت سے والدین اپنے سکول کے بھگوڑے بچوں کو یہیں سے آن پکڑتے۔

اُس دن صبح کے ساڑھے نو بجے تھے اور مئی شروع ہو چکا تھا۔ ایک مہینہ پہلے گزرنے والی بہار نے اِتنا سبزہ پھیلا دیا تھا کہ آنکھوں میں سوائے سبزی کے کسی شے کا سامنا نہیں تھا۔ مَیں کمپنی باغ میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ کبھی ٹکٹ لے کر اُسی ریل پر چڑھ جاتا، جو پارک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر کاٹتی ہوئی نکل جاتی، پھر دس منٹ بعد وہیں آن کھڑی ہوتی۔ کبھی ریل کے ساتھ ساتھ اِدھر سے اُدھر بھاگتا جاتا، کبھی کسی درخت پر چڑھ جاتا، وہاں سے پھر اُتر کر ریل پر چڑھ جاتا۔ اِسی طرح میں اِس ریل پر بیٹھا اِدھر اُدھر کے نظاروں میں گم جا رہا تھا، اچانک ریل ایک جگہ رُک گئی۔ یہ جگہ ریل کے رُکنے کی نہیں تھی، اِس لیے مجھے حیرانی ہوئی۔ نیچے اُترا تو میری نظر ایک مجمعے پر پڑی، جو ایک بہت پُرانے پیپل کے درخت کے نیچے دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ لوگ آرے اور کلہاڑوں سے پیپل کے ارد گرد گڑھا کھود کر اُس کے تنے کو کاٹنے کے درپے تھے، جبکہ ایک بوڑھا انگریز اُس گڑھے میں بیٹھا، اُن کے کام میں رکاوٹ ڈال رہا تھا۔ دو آدمی اُسے کھینچ کر باہر نکالنے کی کوشش میں تھے لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ دوسرے لوگ اِس کھینچا تانی کے عمل سے ارد گرد کھڑے محظوظ ہو رہے تھے۔ وہ نہ تو بڈھے کی طرف داری کر

رہے تھے، نہ اُن دو آدمیوں کو روک رہے تھے، جو بوڑھے کو بے دردی سے باہر کھینچنے میں لگے تھے اور اُسے پنجابی میں سخت سست سنا بھی رہے تھے۔ لیکن اُس نے مضبوطی سے پیپل کی جڑوں کو پکڑا ہوا تھا اور کوشش کے باوجود اُن سے باہر نہیں نکل رہا تھا۔ اِس عمل میں اُس بوڑھے انگریز کا ہیٹ پاس ہی گیلی مٹی میں مُرا تُڑا پڑا تھا۔ ہیٹ کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اُس پر کئی لوگوں کے پاؤں آئے ہیں اور اِس قابل نہیں رہا کہ دوبارہ سر پر رکھ لیا جاتا۔ بوڑھے کی رنگت بہت زیادہ سُرخ اور سفید تھی۔ لیکن یہ وہ سرخی نہیں تھی، جو خون اور جوان صحت کی نشانی ہوتی ہے۔ بلکہ یہ رنگت نسل اور قوم کا پتہ دینے والی تھی۔ رنگت اِس قدر سُرخ ہو چکی تھی، جو عمر کی زیادتی کی وجہ سے دیکھنے والوں کے لیے کراہت پیدا کر دیتی ہے اور سفید بوڑھوں کے چہرے بندر کی پشت کے رنگ سے مشابہ ہو جاتے ہیں۔ قد ایک تو ویسے بھی لمبا تھا، اُس پر لاغرپن نے اُس کی قامت کو مزید ہوا دی تھی، جس کی وجہ سے وہ ضرورت سے زیادہ لمبا نظر آ رہا تھا۔ پاؤں میں جوتے چمڑے کے تھے لیکن وہ اتنے بوسیدہ اور مٹی میں لتھڑ چکے تھے کہ اُن کا اصلی رنگ کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ عینک کی حالت بھی اُس کے جوتوں سے زیادہ اچھی نہیں تھی۔ عینک کی کمانیوں پر ٹاکیاں تو نہیں لپٹی تھیں لیکن اُن کمانیوں کا رنگ اِس طرح پھٹ گیا تھا کہ اُس سے عینک کی عمر کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ بوڑھا اِس زور آزمائی میں بہت زیادہ تھک چکا تھا اور قریب تھا بیہوش ہو جائے۔ لوگ اُس کی بے بسی سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ہنس بھی رہے تھے۔ بوڑھا خود بھی پیپل کاٹنے والوں کو ہانپتے ہوئے، انگریزی میں گالیاں دے رہا تھا۔ یہ لڑائی شاید کافی دیر سے جاری تھی، اس لیے کلہاڑوں والے آدمی اب اُس پر سختی کرنے پر اُتر آئے تھے۔ مَیں جب سے وہاں کھڑا تھا، اُس کے ابتدائی لمحوں میں خود بھی لطف لیتا رہا لیکن جب مجھ پر اصل حقیقت کا انکشاف ہوا کہ بوڑھا اصل میں اُنہیں پیپل کے کاٹنے سے مانع ہو رہا ہے اور سب لوگوں میں دراصل یہی ایک انسان ہے، تو میری دلی ہمدردیاں اُس کے ساتھ ہو گئیں۔ لیکن مَیں اِس معاملے میں اُس کی مدد کرنے سے بالکل قاصر تھا۔ مجھے اِس سارے قضیے میں بوڑھے سے صرف ایک ہی گلہ تھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ ممکن تھا، وہ لوگ اُس بڈھے کو کھینچ کر کسی دوسرے درخت سے باندھ کر اپنا کام کر لیتے کہ اُسی لمحے کمپنی باغ کا انچارج آگیا۔ اُس نے آتے ہی اُن آدمیوں کو اشارے سے پیچھے ہٹایا اور خود اُس کے پاس بیٹھ کر کہنے لگا، لیجیے ولیم صاحب، اب باہر آجایے، یہ پیپل نہیں کٹے گا۔ پھر اُن لوگوں کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے، جناب آپ اپنا معاہدہ کینسل سمجھیں۔ مَیں آپ کا بیانہ واپس کرتا ہوں۔ ہم اِس بارے میں دوبارہ کمیٹی بنائیں گے۔ اگر یہ درخت کاٹنے کا فیصلہ ہوا تو سب سے پہلے آپ ہی کو ترجیح دی جائے گی۔ اب

قریب تھا، وہ انچارج کے ساتھ بھی اُلجھ پڑتے کہ تماشا دیکھنے والے سب لوگوں نے بھی اَنچارج اور اُس بوڑھے انگریز کی حمایت شروع کردی۔ جب معاملہ طے پا گیا اور یہ بھی طے ہو گیا کہ اِس کھودے گئے گڑھے کی مزدوری بھی ادا کر دی جائے گی اور درخت نہیں کٹے گا، تو مجھے ایک گونا خوشی ہوئی۔ اِس کے بعد میں جلد ہی وہاں سے چلا آیا۔ البتہ میرے دماغ میں ایک ہلچل شروع ہو گئی کہ بوڑھا انگریز، جسے کمپنی باغ کا انچارج ولیم کے نام سے پکار رہا تھا، یہ آخر کون ہے؟ یہاں کیا کرتا پھرتا ہے؟ اِس کا اِن درختوں سے کیا تعلق ہے؟ اِس سے بڑھ کر یہ کہ پارک کا انچارج اِسے کیسے جانتا ہے؟ مَیں اِن سب سوالوں کے جواب چاہتا تھا، مگر میری ہزار جستجو کے بعد وہ بوڑھا اُس پارک میں دوبارہ دکھائی نہیں دیا۔ حالانکہ مَیں اب کمپنی باغ میں بلا ناغہ اِسی لیے چکر لگانے لگا تھا۔ جب کافی دنوں کی کوشش کے باوجود وہ نظر نہ آیا تو مَیں نے بھی اُسے بھلا دیا۔ البتہ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ پیپل کے گرد کھودا جانے والا گڑھا اب پُر ہو چکا تھا اور پیپل کی شاخیں مزے سے ہلکورے لے رہیں تھیں اور پتے کھڑ کھڑا رہے تھے۔

دن گزرتے رہے اور مَیں یہ تمام واقعہ فراموش کر گیا۔ اِس واقعے کے تین مہینے بعد میں اپنے دوست اور سکول فیلو احمد شہزاد کے ساتھ، جسے اُس کا اَبا بھی لالہ کہتا تھا، بڑی نہر کا بجلی گھر دیکھنے کے لیے رینالہ چلا گیا۔ جیسا کہ بہت دفعہ پہلے بتایا جا چکا ہے، رینالہ اوکاڑہ کے مضاف میں ہی کئی نہروں کے دامن میں ایک بہت دلفریب اور خوبصورت جگہ ہے۔ جہاں مچلز فروٹ فارم اور انگریزوں کے کئی بنگلے تھے۔ یہاں کی نہریں، باغات، بنگلے، بڑے بڑے اور گھنے درخت چھوٹے سے اساطیری شہر کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ اِس جگہ جا کر واقعی ایسے لگتا ہے کہ انسان وکٹورین دور کے بھوت بنگلوں میں آ گیا ہے۔ ہم دونوں وہاں دیر تک سیر سپاٹا کرتے رہے اور نہر کے کناروں پر بیٹھ کر کنول کے پھولوں کے درمیان کُنڈیاں پھینک پھینک کر مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش میں لگے رہے۔ جب دو تین گھنٹوں کی مشقت کے بعد مچھلی کی بجائے ایک مینڈک کُنڈی میں پھنسا تو ہمیں بہت کوفت ہوئی۔ ہم نے اپنی کُنڈیاں وہیں پھینکیں اور نہروں کے دونوں پل پار کر کے دوسرے کنارے پر آ گئے۔ اِس جگہ ستگھرہ روڈ کے عین کنارے پر ایک دیسی آئس کریم بنانے والی چھوٹی سی فیکٹری سے دو آئس کریم خرید کر (جو اُس وقت نہائت عمدہ خالص دودھ کی بنتی تھیں اور سستی اتنی کہ ایک روپے کی دو آ جاتی تھیں) وہیں ساتھ والے بڑے برگد کے سائے میں بیٹھ کر کھانے لگے، جس کے نیچے سے ٹھنڈے پانی کی چھوٹی سی ندی گزرتی تھی، جو چھاؤں کو مزید ٹھنڈا کر رہی تھی اور اِس اگست کے مہینے میں برگد کا سایہ شجر طوبیٰ کی مانند تھا۔ اِس ساری جگہ کا نام نہری کوٹھی سے موسوم تھا۔

نہری کوٹھی اصل میں پانچ چھ چھوٹی کوٹھیوں کا مجموعہ تھا۔ جن کی حیثیت نولکھی کوٹھی کے سامنے تو کچھ نہیں تھی۔ لیکن موجودہ زمانے کی تمام عمارتوں کے اعتبار سے ابھی بھی جاہ وجلال کی آئینہ دار تھیں۔ یہی وہ جگہ تھی، جو رینالہ شہر کے بالکل ساتھ اور دونوں بڑی نہروں کے کنارے پر واقع تھی۔ اِس کے دوسری طرف مچلز کے وسیع باغات اور فیکٹری ابھی تک اپنے عروج پر تھیں۔ اِن کوٹھیوں کے ارد گرد جامن کے آٹھ نو سو درخت اِس علاقے کو جنت کا منظر بنا رہے تھے۔ البتہ کوٹھیاں مکمل ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ اِن میں مسلّی، چوہڑے اور نہائت غریب لوگ آباد تھے۔ واپڈا نے اِن کی بجلی کے کنکشن بھی کاٹ دیے تھے کہ نہ یہ لوگ بل دینے کے قابل تھے اور نہ ہی اُنہیں بجلی کی خاص ضرورت تھی۔ مختصر یہ کہ ہم بیٹھے وہاں ندی کے پانی میں پاؤں ڈالے آئس کریم کھا رہے تھے کہ اچانک مجھے وہی انگریز بڈھا نظر آیا۔ بوسیدہ سی ہاف بازو کی شرٹ کے ساتھ ڈھیلا ڈھالا سا پاجامہ پہنے۔ سر پر وہی ہیٹ تھا، جو غالباً اُس دن کے واقعے کے بعد دھو لیا گیا تھا۔ ہاتھ میں عام سی چھڑی تھی۔ عینک بھی نئی نئی لگ رہی تھی۔ یہ چلتا ہوا مجھے اِس دن سے بھی زیادہ لمبا تڑنگا لگا۔ بڈھے کو دیکھ کر میری پُرانی خواہش جاگ اُٹھی۔ مَیں اُٹھ کر فوراً اُس کی طرف بھاگا اور کچھ ہی قدموں پر اُسے جا لیا۔

اسلام علیکم بابا جی، مَیں نے پیچھے سے ہی اُسے بالکل اُجڈوں کی طرح سلام داغ دیا۔ میرے اِس طرح اچانک اُس کے پیچھے بھاگنے سے شہزاد لالہ کو حیرانی ہوئی۔ اِس سے پہلے کہ وہ میرے اِس عمل کی مجھ سے وضاحت طلب کرتا، مَیں بوڑھے ولیم کے سامنے جا چکا تھا۔ بوڑھا میرے سلام کے ایک دم کے حملے سے تھوڑا سا ٹھٹھک کر رُک گیا، پھر چند لمحے میری طرف دیکھ کر وعلیکم سلام کہا۔ ولیم کا یہ جواب اتنا ملائمت بھرا اور شائستہ تھا کہ مجھے اُس سے مزید بات کرنے کی جرات ہوئی لیکن وہ سلام کا جواب دے کر رُکا نہیں، مسلسل اُن کوٹھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ مگر یہ رفتار اتنی سست تھی کہ مَیں آسانی سے اُس کا پیچھا کر سکتا تھا۔ میرا دوست، جو ابھی تک وہیں بیٹھا تھا، میری اِس حرکت پر زیادہ دیر غیر جانب دار نہ رہ سکا، اُٹھ کر ہمارے تعاقب میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا آ گیا۔

بابا جی، آپ کہاں رہتے ہیں؟

شاید اُسے یہ توقع نہیں تھی، مَیں اُس سے مزید سوال کروں گا۔ لٰہذا اُس نے میرے اِس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور چلتا رہا، لیکن مَیں خموش نہیں ہوا اور کہا، اُس دن آپ نے کمپنی باغ کا ایک پیپل کٹنے سے بچا کر بہت اچھا کیا۔ اتنا خوبصورت درخت پتا نہیں، وہ کیوں کاٹنا چاہ رہے تھے؟

میرے اِس جملے پر وہ ایک دم چلتے چلتے رُک گیا، پھر بھرپور نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اِس لمحے مَیں نے دیکھا، اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھنے کے بعد بولا، بیٹا وہاں اُس کوٹھی میں آؤ، جس کے صحن میں برگد کھڑا ہے، وہاں بیٹھتے ہیں۔ چند ثانیوں بعد ہم اُس ٹوٹے پھوٹے مکان میں پہنچ چکے تھے، جس کے صحن میں برگد اور جامنوں کے پتوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ پتے اِتنے زیادہ بکھرے ہوئے تھے کہ فرش کی زمین اُس میں بالکل چھُپ گئی تھی اور یہ پتے تہ بہ تہ چڑھے ہوئے تھے۔ ایسے لگتا تھا، یہاں صدیوں سے کسی نے جھاڑو نہیں دیا، نہ اِس کوٹھی کی دیکھ بھال ہوئی ہے۔ کوٹھی قریب ایک کنال کے رقبے پر بنی تھی۔ اُس کی عمارت تو سات آٹھ مرلوں ہی میں تھی لیکن صحن کو ملا کر ایک کنال بن ہی گیا تھا۔ تمام عمارت انتہائی نفاست اور کاریگری کا عمدہ نمونہ تھی۔ اینٹوں پر پلستر نہیں تھا لیکن کسی بھی پلستر شدہ عمارت سے بہتر تھی۔ سُرخ رنگ کی یہ اینٹیں ٹیپ کے ساتھ نہایت سیدھے جوڑوں میں درست کونوں کے ساتھ معماروں کی فنّی دسترس پر گواہ تھیں۔ کمروں کی چھتیں سب کی بیس فٹ اُونچی تھیں، لیکن درمیان میں ایک بڑا کمرا نظر آ رہا تھا، جو غالباً ڈرائنگ روم رہا ہو گا، اُس کی چھت دوسرے کمروں کی چھتوں سے بھی چار فٹ مزید بلند تھی۔ دروازے اور کھڑکیاں بھی سب کے سب ٹاہلی کی سیاہ لکڑی کے تھے لیکن اُن کے تختے بعض بالکل ٹوٹ چکے تھے اور جو نہیں ٹوٹے تھے، وہ اتنے بدحال ہو چکے تھے کہ کسی بھی وقت اپنی چوگاٹھوں سے الگ ہو سکتے تھے، مگر تھے ابھی تک وہ بھی اپنے شاندار ماضی کی گواہی ثبت کرنے والے۔ صحن میں ایک قینچی نما لکڑی کی کرسی اور ایک بوسیدہ سی میز پڑی تھی، جس کا رنگ قریب قریب مٹی کے رنگ سے مل گیا تھا۔ بوڑھا ولیم کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بہت زیادہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ مجھے خواہش پیدا ہوئی، اندر جا کر کمروں کا جائزہ لوں لیکن فی الحال اِس عمل سے یہ سوچ کر باز آ گیا کہ نجانے کیا سمجھے۔ چنانچہ ہم دونوں مَیں اور شہزاد اُسی تھڑے پر بیٹھ گئے، جو برگد کے تنے کے ارد گرد بنا تھا اور تنے کو اپنے گھیرے میں لیے تھا۔ جس کا قطر کم از کم دس فٹ تھا۔ اُس کی جڑیں کئی کئی فٹ تک، کوٹھی کی چھت تک پھیلی ہوئی تھیں اور ڈر تھا، جڑیں چھت کو پھاڑ کر نیچے نہ اُتر جائیں۔ بوڑھا کچھ دیر آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ گرمی بہت شدید تھی لیکن ہوا نہروں کے اُوپر سے گزرتے ہوئے پانی کا لمس لے کر

کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی اور اِس انتہائی گھنے برگد کی سیاہی مائل سبز شاخوں سے ٹکرا کر مزید ٹھنڈی ہو کر ولیم اور ہمیں چھو رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے ہم تینوں ایک پُر کیف اور سرور آور فضا میں گم ہوئے کچھ دیر چُپ بیٹھے رہے۔ ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ شاخوں کے لرزنے سے پرندوں کا چہچہانا بڑھ گیا تھا۔ ہوا اور پرندوں کے سوا وہاں ہر طرح کی چپ تھی۔ مجھے محسوس ہوا، بوڑھا ولیم دراصل آرام کرنے کے چکر میں ہے اور ہم خواہ مخواہ اُس کو تنگ کرنے کے لیے آ گئے ہیں۔ لالہ شہزاد بھی اس کیفیت سے اُکتانے لگا تھا۔ اِس حالت کو دیکھ کر مَیں نے لالے کو کَن اَکھیوں سے اُٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ قریب تھا کہ ہم اُٹھ کر چل دیتے، اُسی لمحے وہ دوبارہ بولا، دوست کیا کرتے ہو؟

ہم پڑھتے ہیں۔

ہاں پڑھنا اچھی بات ہے لیکن پڑھ کر کلرک نہ بننا، کوئی ہنر سیکھ لینا۔

ہم افسر بنیں گے۔

مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن پاکستانی افسروں سے میری مراد کلرک ہے۔ اِس خطے کے لوگ آئندہ تین سو سال تک افسر نہیں بن سکیں گے۔

مجھے بوڑھے کی اِن فلسفیانہ باتوں کی کوئی سمجھ نہ آئی۔ مَیں تو کسی اور چکر میں تھا کہ اُس کے آگے پیچھے کا پتا چلاؤں۔ مگر یہ تو کچھ دوسری طرح کی باتیں کر رہا تھا۔

چائے پکا لیتے ہو؟

جی ہاں مَیں پکا لیتا ہوں، اب کہ شہزاد لالہ نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

وہ بوڑھے میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

دوست، وہ سامنے کچن میں دودھ پڑا ہے۔ چینی اور چائے بھی موجود ہے، اپنے اور میرے لیے چائے بنا لو۔

بوڑھے کی اِس پیشکش کے بعد شہزاد بھاگ کر اندر چلا گیا اور میں وہیں بیٹھا رہا۔

یہ لڑکا آپ کا دوست ہے یا بھائی؟

دوست ہے، میں نے مختصر جواب دیا۔

آاہ، کبھی یہاں مَیں اور ایشلے اِسی جگہ دوستی کے مزے لیا کرتے تھے۔ بوڑھے نے لمبی آہ کھینچتے ہوئے کہا۔

مَیں بوڑھے کی بات، جس میں قیامت کا درد چھُپا تھا، کو کسی وجہ سے جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے ایک اور سوال کیا، آپ مجھے انگریز لگ رہے ہیں۔ کیا آپ برطانیہ واپس نہیں گئے؟

نہیں،

ولیم کا جواب مختصر تھا۔ شاید وہ میرے سوالوں کے جواب دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ زیادہ بولنے سے غالباً اُسے تکلیف ہو رہی تھی۔ اِس لیے اختصار سے کام لے رہا تھا۔

آپ یہیں رہتے ہیں؟

یقیناً اب یہیں رہتا ہوں۔

پہلے کہیں اور رہتے تھے؟

دو سال پہلے اوکاڑہ کی نولکھی کوٹھی میری تھی۔

واہ، وہ آپ کی تھی؟ تو آپ نے اتنی اچھی کوٹھی بیچ کیوں دی؟

بہت سی چیزیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتیں۔ تم حالت نزع میں پڑے انسان کو نہیں کہہ سکتے کہ وہ مرنے سے انکار کر دے۔

ولیم کے اِس جواب پر میں خاموش ہو گیا اور سوچنے لگا، اگر نولکھی کوٹھی اِس بوڑھے کی تھی، پھر تو اِس کے پاس بہت پیسے ہوں گے۔ اِتنی بڑی کوٹھی کم سے کم پر بھی ایک کروڑ سے کم نہ بکی ہو گی۔ مگر یہ اتنی بُری جگہ پر کیوں رہ رہا ہے؟

آپ یہاں اِس خراب کوٹھی میں کیوں رہ رہے ہیں؟ کوئی اچھا سا مکان خرید لیتے۔

مجھے یہی جگہ اچھی لگتی ہے۔

یہ تو کوئی بھوت بنگلہ ہے، مَیں نے نہایت سادگی سے بولنا شروع کیا، آپ کو یہ پُرانی اور ٹوٹی پھوٹی جگہ کیوں اچھی لگتی ہے؟ نہ یہاں بجلی نظر آتی ہے، نہ رہنے کے لیے کسی دوسری سہولت کا نام و نشان ہے۔ یہاں تو رات کو اکیلا بندہ ڈر بھی جاتا ہو گا۔

یہاں میرا دوست ایشلے رہتا تھا، وہ شاعر بھی تھا۔ اگر اُس کا بھوت یہاں ہوتا، تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ لیکن بد قسمتی سے مجھے اُس کا بھوت کبھی نظر نہیں آیا۔ اب مَیں یہاں اکیلا ہوں۔

وہ آپ کا دوست کہاں ہے۔

وہ بیس سال پہلے مر چکا ہے۔ لندن میں۔ مَیں نے اُسے سمجھایا تھا، وہ اُدھر نہ جائے لیکن وہ چلا گیا، اور تین مہینے بعد اُس کے مرنے کی خبر آئی۔ (کچھ دیر کی خاموشی کے بعد) وہ اِسی گھر میں رہتا تھا۔ (پھر کچھ دیر رک کر غالباً اُسی بیڈ پر سوتا تھا، جہاں اب مَیں سوتا ہوں۔

بابا جی، آپ کے بیوی بچے نہیں ہیں؟

بوڑھا ولیم، جو آنکھیں مسلسل بند کیے کُرسی پر لیٹنے کی صورت بیٹھا ہوا تھا اور اُس کا ہیٹ جھک اُس کی آنکھوں پر آ گیا تھا، میرے اِس سوال پر اپنی سکون کی حالت سے تھوڑا سا اضطراب میں آیا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں، ہیٹ آنکھوں سے ہٹا کر تھوڑا سا پیچھے کیا اور میری طرف دیکھ کر بولا، بچے کیتھی کے تھے، وہ اُنہیں لے کر چلی گئی، اب مَیں نہیں جانتا، وہ کہاں ہیں۔ مجھے لگتا ہے، کیتھی بھی مر چکی ہے لیکن بچوں کو زندہ رہنا چاہیے۔

آپ واپس کیوں نہیں گئے؟

کہاں؟

برطانیہ

اِس قسم کے سوالوں سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ برطانیہ سے میں واقف نہیں ہوں۔ مَیں اِسی علاقے میں پیدا ہوا تھا۔ آپ سے اور آپ کے باپ سے پہلے مَیں اِس جگہ کو جانتا ہوں۔ شاید آپ کا دادا بھی یہاں کا نہیں ہو گا۔ یہ جگہ اُس نے دیکھی بھی نہیں ہو گی۔ جب مَیں اِن سب سے یہاں کا پُرانا رہنے والا ہوں، تو یہاں سے کیوں جاؤں۔

اب مَیں نے اُس سے سوال کرنا بند کر دیا۔ کیوں کہ میری ذہنی استعداد یہیں ختم ہو گئی تھی۔ اتنے میں احمد شہزاد تین کپ چائے لے کر آ گیا اور ہم تینوں چائے پینے لگے۔ ولیم نے چائے کا گھونٹ بھر کر مسکراتے ہوئے شہزاد لالے سے کہا، تم نے بہت اچھی چائے بنائی، مَیں تسلیم کرتا ہوں، مجھ سے ایسی چائے نہیں بن سکتی۔

چائے واقعی بہت اچھی تھی۔ چائے پینے کے بعد میری پھر خواہش جاگی کہ کمرں کا جائزہ لوں۔ مَیں نے ولیم سے کہا، بابا جی، میں اِن کمروں کو اندر سے دیکھ سکتا ہوں؟
تمھاری خواہش جائز ہے لیکن مایوسی ہو گی۔
وہ کیوں؟

اِسلیے میرا دوست تھا، تمھارا نہیں۔ اُس وقت جب ہم اِن کمروں میں کھیلتے تھے، اُس کی عمر میرے برابر تھی۔ تب ہم آپ سے بہت چھوٹے تھے۔ اِس وقت جتنے آپ ہیں، بہر حال دیکھ لو۔

مَیں اُٹھ کر اندر داخل ہوا تو واقعی مایوس کن حالت تھی۔ سب کمرے بالکل خالی تھے۔ نہ کوئی الماری، نہ فرنیچر، نہ پُرانے وقتوں کی کوئی اور نشانی۔ سوائے ایک چار پائی اور تین چار کرسیوں کے، سب کمروں میں ایک تھکا دینے والا خالی پن تھا۔ سب کا فرش اُکھڑ کر اُن کی اینٹیں تھور اور سیم زدہ ہو رہی تھیں۔ یہ سیم شاید نہروں کے قریب ہونے کی وجہ سے تھی۔ ڈارائنگ روم سمیت اُن کی تعداد پانچ تھی اور ایک باتھ روم، جس میں پانی کے لیے لوہے کا ایک ٹب اور ایک لوٹا بھی موجود تھا۔ مجھے کمروں کی اِس قدر ویرانی دیکھ کر وحشت ہوئی اور مَیں بھاگ کر باہر آگیا۔

بابا جی، آپ کا کوئی سامان نہیں ہے؟ باہر آکر مَیں بے چینی سے بولا۔
بہت ہے لیکن وہ مَیں نو لکھی کوٹھی میں چھوڑ آیا ہوں۔ یہاں خراب ہو جاتا۔
اگر انھوں نے ضائع کر دیا؟

یہاں اُس سے پہلے ضائع ہو جاتا۔ ویسے بھی اب مجھے اُن چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں۔
ہمیں کافی دیر ہو گئی تھی، شہزاد بھی اُکتا رہا تھا۔ اِس لیے ہم اُٹھ کھڑے ہوئے اور چلنے کی اجازت لی۔ ولیم بھی ہمارے ساتھ کرسی سے اُٹھ پڑا۔ لیکن اب وہ صرف ہمیں رخصت کرنے کے لیے اُٹھا تھا۔

یہ میری ولیم سے پہلی تفصیلی ملاقات تھی۔ اِس کے بعد پھر مَیں جب بھی رینالہ گیا، میرا معمول بن گیا۔ اِدھر اُدھر آوارگی کرتا ہوا ولیم کو ڈھونڈ نکالتا۔ اِس عرصے میں وہ میرا بہت ہی قریبی دوست بن چکا تھا۔ اُس کا وہاں پر ایک اور دوست ایک ڈسپنسر تھا، جو بوڑھے ولیم کی دیکھ بھال کرتا۔ وہ اُس ڈسپنسری میں کام کرتا رہا تھا، جو اُسی دور میں بنائی گئی

تھی، جب نہری کوٹھیوں کی آبادی قائم کی گئی تھی۔ ڈسپنسری اصل میں وہاں کے مقیم انگریز فیملیوں کے لیے بنائی گئی تھی۔ ڈسپنسری کی عمارت بھی انتہائی پُر شکوہ تھی اور ابھی تک اُس کی حالت اچھی تھی۔ اُس میں اب باقاعدہ ڈاکٹر بیٹھتا تھا۔ ڈسپنسر عزیز احمد اِسی ڈسپنسری سے ریٹائرڈ ہوا تھا۔ اب اُس کی عمر بھی پینسٹھ سال سے اُوپر ہو گئی تھی لیکن صحت ابھی تک اچھی تھی۔ ولیم اُس کے ساتھ کافی مانوس تھا۔ یا یہ کہیں کہ اُس کا سب سے پُرانا جاننے والا تھا اور اُس کی صحت کا خاص خیال رکھتا تھا۔ عزیز احمد کا گھر کافی کھلا اور بالکل ڈسپنسری کے ساتھ تھا۔ جس کے دائیں ہاتھ وہی آئس کریم کی چھوٹی سی فیکٹری تھی۔ جہاں سے آئس کریم خرید کر کھانا مَیں نے اپنے اُوپر لازم کر لیا تھا۔ یہیں سے شاید ولیم اور ڈسپنسر عزیز بھی آئس کریم لے کر کھاتے ہوں۔ لیکن مَیں نے اُنھیں خود نہیں دیکھا۔ ولیم مجھے اکثر اُسی کے پاس ایک لکڑی کی کرسی پر بیٹھا ہوا ملا۔ وہ دونوں آپس میں کافی گفتگو کرتے تھے۔

ساون آیا تو جامن کے پھلوں کا بہت زور ہو گیا۔ چونکہ یہاں جامن کے درخت سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ اِس لیے اُن کا گورنمنٹ کی طرف سے ٹھیکہ ہوتا اور ٹھیکیدار بانسوں والی لمبی لمبی سیڑھیاں درختوں کی شاخوں پر ٹکا کر، ہر وقت پھل توڑنے میں مصروف رہتے۔ اِس طرح یہ ایک مہینہ خوب رونق رہی اور بارشوں نے بھی بڑا اودھم مچایا۔ مَیں بھی جامن کھانے کے لیے ہر روز وہاں جا نکلتا۔ کبھی اکیلا اور کبھی کسی دوست کے ساتھ۔ ولیم سے میری ملاقات بھی روز ہونے لگی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ روز بہ روز کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اِس عرصے میں وہ مجھ سے کافی زیادہ کھل گیا اور مَیں قریب قریب سب کچھ اُس کے بارے میں جان گیا۔ کچھ اُس نے خود بتایا، کچھ ڈاکٹر عزیز احمد نے، باقی مَیں نے اِدھر اُدھر کے ذرائع سے معلوم کر لیا۔ مَیں یہ بھی جان گیا تھا، نولکھی کوٹھی ولیم نے بیچی نہیں، اُس سے چھینی گئی ہے۔ وہ بھی ایک ایسے شخص نے، جس کے خاندان کے بارے میں اب کوئی پردہ نہیں رہ گیا تھا۔ مجھے ولیم سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ لیکن اُس کے لیے کچھ بھی کر نہیں سکتا تھا۔ ہاں ایک بار مَیں اور میرے دوست شہزاد لالہ نے اُس کے بھوت بنگلے کو صاف کر کے پتوں کو آگ لگا دی تھی۔

یہ دسمبر کے آخری دن تھے۔ اُس دن کُہر یا دُھند تو نہیں تھی لیکن سردی ایسی کڑاکے کی، کہ ہاتھ چادر سے باہر نکالتے ہی برف کی طرح جم جاتے۔ اُس پر اُڑا دینے والی ہوا کے جھونکے تھے، جو نہر کے پانی کی سطح سے ہو کر اور بھی

ٹھنڈے ہو جاتے اور منہ پر سرد تھپیڑے لگاتے ہوئے دوسری سمت کے درختوں اور مکانوں سے جا ٹکراتے۔ نہر کا پانی بھی اتنا صاف تھا کہ تہہ میں بیٹھی ہوئی ہر چیز نظر آ رہی تھی۔ پانی کی سطح پر ہوا کے دباؤ سے لہریں بن بن کر تیرتی ہوئی نکل جاتیں، جو اِس قدر دلفریب تھیں کہ انسان دیکھتا رہ جائے۔ ایسے میں برگد کے سوا تمام درختوں کے زرد پتے نہر کی پٹڑی اور سڑکوں پر گر گر کے دوڑتے اور شور مچاتے ہوئے کبھی ایک طرف کو اور کبھی دوسری طرف کو سرکتے دور تک چلے جاتے۔ لوگوں نے سویٹر اور جرسیوں کے ساتھ اپنے اُوپر چادریں بھی لپیٹی ہوئی تھیں۔ ٹانگوں کا اڈا نہر کے پُل کے دائیں طرف تھا۔ وہاں ہر وقت تین چار ٹانگے کھڑے ہوتے تھے، جو شہر کی سواریاں ارد گرد کے گاؤں سے لاتے اور لے جاتے۔ ٹانگوں کے اڈے سے لے کر آئس کریم کی فیکٹری تک کہیں نہ کہیں آگ بھی جل رہی تھی اور دو دو چار چار لوگ اُسے بیٹھے سینک رہے تھے۔ خاص کر ٹانگے والے اپنے گھوڑوں کے آگے دانہ ڈال کر اور چادریں اوڑھ کر مسلسل کوئلے تاپ رہے تھے۔ اِس حالت میں کسی کو بھی اِس بات سے غرض نہیں تھی کہ موسم کی دلفریبی سے لطف لیا جائے۔ یہی موسم میرے لیے قیامت کی کشش رکھتا تھا۔ مَیں اِن تمام لوگوں اور کام میں مصروف یا آگ تاپنے والوں کو نظر انداز کر کے سیدھا نہر کے کنارے کنارے جامنوں کے درمیان کی روشوں پر چلتا چلا گیا اور تیز ہوا کے جھونکوں میں دوڑتے زرد پتوں سے لطف اندوز ہوتا جا رہا تھا۔ یہ وقت ایک بجے کا ہو گا۔ کیونکہ نہر کے پہلے پُل کے دائیں کنارے پر موجود سفید رنگ کی چھوٹی مسجد والے موذن نے ابھی ابھی ظہر کی اذان دی تھی۔ میرے جسم پر اُون کی ایک بڑی اور موٹی چادر کے ساتھ نیچے ہاتھ کی بنی ہوئی اُونی سویٹر بھی تھی۔ یہ اُس وقت کا زمانہ ہے، جب ولیم کو نولکھی کوٹھی چھوڑ کر نہری کوٹھی میں آباد ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ اُس سے میری متواتر ملاقاتوں کو بھی ایک سال ہو چلا تھا۔ اِس دوران مجھے اُس سے جو کچھ معلوم ہوا، مَیں اُسے اپنی یادداشت میں محفوظ کرتا گیا۔ میرے لیے یہ بات مسلسل گھبراہٹ کا سبب تھی کہ وہ تیزی سے کمزور ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی اُس کی زندگی دنوں کی بات لگتی تھی لیکن اُس کی آواز میں ابھی تک وہی جان تھی۔

یہ انیس سو نواسی کی سردیوں کا زمانہ تھا اور ولیم کم و بیش اسی سال کا ہو چکا تھا۔ اُس کو اِس دفعہ کی گرمی نے وہ ضرب لگائی تھی کہ اگست کے آخری دنوں میں اُسے لو لگ گئی، جس نے اُس کا کچومر نکال کے رکھ دیا۔ وہ تو بھلا ہو ڈسپینسر عزیز احمد کا، جس نے بروقت علاج کر کے اُسے موت کے منہ سے نکالا۔ لیکن اِس دھچکے نے اُسے نڈھال کر دیا اور وہ حد سے زیادہ کمزور ہو گیا۔ ایک دن مَیں اُس کے اُسی بوسیدہ مکان پر پہنچا، جسے اب مکان کہنا وضع داری ہو سکتی تھی۔

صحن سے ہوتے ہوئے، جو پہلے کی طرح زرد پتوں اور چھوٹی چھوٹی سوکھی ہوئی شاخوں سے بھراپڑا تھا، کمرے کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ صحن کی ویرانی اور ہوا کی تیزی سے مَیں نے اندازہ لگالیا تھا کہ ولیم اندر بستر میں دُبکا پڑا ہو گا۔ مَیں نے ہلکا سا دروازے کو کھٹکھٹایا لیکن اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ دستک دی تو ایک نحیف سی آہ سنائی دی۔ مَیں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ دیکھا تو ولیم چارپائی پر سیدھا لیٹا ہوا ہے۔ اُس کے اُوپر کمبل تھا، لیکن وہ اِتنا گندا اور بدبودار تھا کہ مجھے ہاتھ لگانے سے بھی کراہت ہوئی۔ مَیں نے ایک بار سوچا، ایسے ہی پلٹ جاؤں، لیکن پھر کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد غیر ارادی طور آگے بڑھ کر ہلکا سا کمبل اُوپر اُٹھا دیا۔ کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ اِس لیے پہلے مرحلے میں ولیم کا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ لیکن آہستہ آہستہ ہر چیز آنکھوں کے لیے مانوس ہونے لگی۔ اِس کمرے میں میری ولیم کے ساتھ اب کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ اِس لیے مجھے معلوم تھا، لال ٹین کہاں ہے اور کچن یعنی چولہا کس جگہ ہے؟ مَیں نے اندازے کے مطابق آگے بڑھ کر لالٹین ڈھونڈ نکالی اور اُسے جلانے کے لیے ماچس تلاش کرنے لگا۔ اُسی لمحے ولیم کی آواز سنائی دی، کیتلی کے ڈھکن کے اُوپر پڑی ہے۔ مجھے ولیم کی آواز سن کر ایک گونا سکون ہوا کہ ابھی نہ صرف زندہ ہے، بلکہ حواس بھی کام کر رہے ہیں۔ لال ٹین روشن کر کے ولیم کے پاس آیا، وہ بخار سے تپ رہا تھا۔ مَیں نے کچن کی طرف جا کر دیکھا، وہاں کیتلی میں کچھ دودھ اور ڈبل روٹی پڑی تھی۔ اُس کے پاس ہی کچھ دوائیاں بھی موجود تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد مَیں دودھ گرم کر کے بریڈ کے ساتھ ولیم کے سامنے لے آیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر آہستہ سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ بعد مَیں نے اُسے صحن میں آگ جلا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ ولیم آگ تاپنے لگا تو میں صحن سے باہر نکل کر سیدھا ڈسپنسر عزیز احمد کی طرف گیا اور اُسے تمام حالت کی خبر کی۔ عزیز احمد نے مجھے ساتھ لے کر دوبارہ ولیم کے پاس جانا چاہا لیکن نہ جانے کیوں میرا وہاں جانے کو جی نہ چاہا۔ میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب، مجھے جلدی گھر جانا ہے، آپ جا کر اُسے دیکھ لیں۔ اِس واقعے کے بعد مَیں جان بوجھ کر کئی دن وہاں نہیں گیا۔ اِس کی وجہ مجھے بھی معلوم نہیں۔

آج مَیں پھر اِن ٹھنڈی ہواؤں کا لطف لیتے ہوئے غیر ارادی طور پر اُس طرف بڑھ رہا تھا، مگر جیسے ہی اُس کوٹھی پر پہنچا وہاں اور ہی رنگ تھے۔ مسلّیوں کے بچے صحن میں اُچھل کود رہے تھے۔ ذرا غور کیا، تو پتا چلا وہاں کوئی اور ہی خاندان آباد ہے۔ مَیں نے جائزہ لینے کے لیے بھرپور نظر ماری لیکن مجھے ولیم نظر نہ آیا۔ بالآخر اُنہی میں سے ایک آدمی سے پوچھا،

'یہاں ایک بوڑھا انگریز تھا، وہ کہاں ہے؟'

اُس نے انتہائی لاپروائی سے جواب دیا، کاکا اُسے تو فوت ہوئے بھی ہفتہ ہو گیا۔ پنج چک کے عیسائی اُسے اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ وہیں کے گرجا گھر میں اُس کی قبر ہے۔

اُس کالے اور چیچک زدہ چہرے والے اَدھیڑ عمر آدمی کا جواب سن کر مَیں وہیں سے واپس ہو گیا۔ موسم خوبصورت اور ٹھنڈا تھا۔ میں نے اُس سے مزید بات کر کے لطف کو غارت کرنا مناسب نہ سمجھا اور نہر کے کنارے کنارے ہواؤں کے لمس لیتا ہوا پل پر آگیا۔ کچھ دیر اُنہی ٹانگے والوں کے پاس کھڑا رہا۔ وہاں چند لمحے رُکنے کے بعد واپس دیسی آئس کریم بنانے والی فیکٹری پر آیا۔ ایک آئس کریم لی اور بھری ٹھنڈ میں کھانے لگا۔ حالانکہ سردی کی وجہ سے میری ناک سُرخ ہو گئی تھی اور اُس سے پانی بہنے لگا تھا۔ آئس کریم بہت مزے کی تھی۔ دُور تک مکئی اور سرسوں کے وسیع کھیت آسمان تک پھیلے ہوئے تھے، نہروں کا پانی چل رہا تھا، جامنوں کی شاخیں ہل رہی تھیں، پیپلیوں اور برگدوں کے بھاری پیڑ مست ہاتھیوں کی طرح جھول رہے تھے اور درختوں سے زرد پتے مسلسل گر رہے تھے، جنہیں ٹھنڈی ہوا کے تیز جھونکے سڑکوں پر اِدھر اُدھر دوڑا رہے تھے۔ ہر چیز ویسی ہی خوبصورت تھی، جیسی پہلے تھی۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔

اگرچہ جرمن نے ہماری ہڈیوں سے گودا کھینچ لیا ہے لیکن ہمیں پھر بھی لنگڑانے کی اجازت نہیں۔ سبک روی سے چلنے میں تکلیف تو ہو گی، مگر آنے والے حادثوں کے پیشِ نظر اسی چال کو برقرار رکھنا ہے۔

ختم شد